

الانکار

طاہر جاوید معین

ان باتیں پر ایمان لایا کرتے ہیں جن کا ان کے دل سے انکار ہے

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئی بار کے طواف میں محسوس ہوتا ہے۔ مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی۔ وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے۔ جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے۔ کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ سر پہرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے۔ عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے۔ جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر۔ عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے۔ کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر۔ ایک للکار ہے۔

آنہو میں قسب

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گونہ جوان تھا۔ ثروت میری محبت اور معیشت تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھریاں گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سینہ سراج کے اوپاش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بھرت گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ میں جدائی کی آگ میں تڑپ تڑپ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ ثروت کہاں ہے۔ اسی دوران میں اپنے گھر کے قریب سینہ سراج اور اس غنڈوں سے میرا سامنا ہو گیا اور



”تیز چلاؤ۔“ میں نے گاڑی بان کے منگے سر پر راتقل کے آہنی بیرل کی ٹھوک لگائی۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باگوں کو جھٹکے دیے اور چابک لہرایا۔ گھوڑوں کی گردنیں اوپر اٹھیں اور رفتار ایک دم بڑھ گئی۔ گھوڑوں اور گھوڑا گاڑی کی رفتار میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ ایک دو منٹ میں ہی گھڑ سوار نزدیک آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گولیاں چلائیں۔ دھماکوں سے شعلے لپکے۔ گولیوں کی شامیں شامیں ہمارے سروں سے کافی اوپر سنائی دی۔

یقیناً یہ فائرنگ مارنے کے لیے نہیں ڈرانے کے لیے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم گھوڑا گاڑی روک لیں۔ میں نے ایک بار پھر راتقل، گاڑی بان کی گردن میں دھنسا لی اور سرسرائی آواز میں کہا۔ ”گاڑی روکو گے تو اسی جگہ گولی مار دوں گا۔“

گاڑی بان بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ یہ کھنکھرتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا تاریک اور نیم پختہ راستہ تھا۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ گھوڑا گاڑی کسی تناور درخت سے ٹکرا جائے گی مگر گھوڑے ان نشیب و فراز کے شناور تھے۔ وہ اپنے مالک کے اشاروں پر سر پٹ بھاگے چلے جا رہے تھے اور پھر گھڑ سوار بالکل قریب پہنچ گئے۔ ایک گھڑ سوار نے لکار کر کہا۔ ”اوئے! گاڑی روکو۔ نہیں تو یارے جاؤ گے۔“

گاڑی بان کی صورت دیدنی تھی۔ وہ دونوں طرف سے موت کی دھمکی سن رہا تھا۔ گہری تاریکی کے سبب اس کے تاثرات ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہے تھے تاہم اتنا پتا چلتا تھا کہ وہ دہشت زدہ ہے۔ اچانک سر پٹ بھاگتے گھوڑوں میں سے ایک کو ٹھوک لگی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گرا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا گھوڑا بھی گرا۔ گاڑی جیسے ہوا میں معلق ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں پہلے اوپر اٹھنے کے بعد اب تیزی سے نشیب کی طرف جا رہا ہوں۔ میں گھنی جھاڑیوں میں گرا اور پتلی پتلی شاخوں کو توڑتا ہوا جی زمین پر آیا۔ میں نے اپنے عقب میں گھوڑوں کی دردناک جھنہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ میں حیرت انگیز طور پر شدید چونٹوں سے محفوظ رہا تھا۔

میں اٹھتے ساتھ ہی پھر دوڑا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا رخ کس طرف ہے، میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں بس جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں مجھے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ارد گرد دیکر،

الارموں کی آواز بڑی تیز اور کریمہ تھی۔ جیسے کوئی بدبودار مکروہ جانور اپنے گروہ کو اکٹھا کرنے کے لیے چلا رہا ہو۔ یہ ڈوبتی ابھرتی آواز عمارت کے مین گیٹ اور جنوب کی باؤنڈری وال کی طرف سے ابھر رہی تھی۔ میری نگاہ گھوڑا گاڑی پر پڑی۔ میں سیدھا گھوڑا گاڑی کی طرف گیا۔ کیس لیپ کی مدھم روشنی میں گاڑی بان نے میرا حلیہ اور میرے تاثرات دیکھے تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ گاڑی سے چلا نکلا گاڑی بھاگ نکلتے گا۔ اگر وہ بھاگ نکلتا تو یہ گاڑی میرے لیے بے کار تھی۔ میں گھوڑوں کو ہانک نہیں سکتا تھا۔

میں نے راتقل گاڑی بان کی طرف سیدھی کی اور پتھر مار کر کہا۔ ”خبردار! نیچے نہ اترنا۔ گولی مار دوں گا۔“

زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے اس انداز میں کسی کو دھمکیاں دی تھیں اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس شخص نے میری بات نہ مانی تو میں اسے گولی مار دوں گا اور یہی بات شاید درمیانی عمر کے اس گاڑی بان کو بھی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میں جھست لگا کر گاڑی کے اگلے حصے پر سوار ہوا اور بے دریغ راتقل کی نال گاڑی بان کی فریہ گردن پر رکھ دی۔

”گاڑی بھاؤ۔“ میں نے نال اس کی گردن میں دھنساتے ہوئے کہا۔ غیظ و غضب کی شدت سے میری آواز اتنی گہری ہوئی تھی کہ خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں گئی۔

گاڑی بان نے ایک لچلے کے لیے تذبذب دکھایا۔ میں نے راتقل اس کے سر پر ماری۔ اس کی پگڑی اچھل کر دور جا گری۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں تمام کر چابک دکھایا۔ گاڑی کے دونوں گھوڑے ایک جھٹکے سے آگے بڑھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے عمارت کے آہنی گیٹ پر بالکل دیکھی۔ گارڈز افرا تفری میں باہر آ رہے تھے۔ بوکھلاہٹ اور تاریکی کے سبب انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ پہلے انہوں نے اندھا دھند ہوائی فائرنگ کی۔ پھر کسی نے تیزی سے درختوں میں اوجھل ہوتی ہوئی گھوڑا گاڑی کو دیکھا۔

”وہ دیکھو۔“ ایک پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

اسی دوران میں گھوڑا گاڑی نے درختوں کے درمیان ایک موڑ مڑا اور مل کھاتے راستے پر سر پٹ بھاگتی چلی گئی۔

مجھے پتا تھا کہ تعاقب کیا جائے گا۔ جلد ہی تعاقب کے آثار نظر آنے لگے۔ دور عقب میں تیزی سے حرکت کرتی مشعلیں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ وہ مسلح گھڑ سوار تھے جو جارج کی رہائش گاہ سے نکلے تھے اور تیزی سے میری طرف آرہے تھے۔

انہوں نے درختوں لوگوں کے سامنے مجھے بری طرح زد و کوب کیا۔ میری حساس طبع کے لیے یہ سب کچھ نہایت تباہ کن تھا۔ میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمدست شخص عمران دانش سے ہوئی۔ عمران ایک انوکھا کردار تھا۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے دہلی کا باب سیٹھ سراج نوادرات کی اسٹالنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دیگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیرہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول فن کار بھی تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیتا تھا۔ اس نے یہ جان لیا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ وہ میرے اندر بھی زندگی کی امنگ تریب اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ اسی دوران میں عمران اور اس کے دوست اقبال نے ایک مجید مٹھوٹا کی غنڈے کا سراغ لگایا۔ مجید مٹھو کو پکڑنے کے بعد عمران نے اس سے سوال جواب کیے تو پتا چلا کہ وہ بھی میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ابراہیم صدیقی سے بھی اس کا دوستانہ تھا۔ ابراہیم صدیقی کے پاس مہاتما جگدھ کا کوئی نادر مجسمہ تھا جسے میڈم صفورا ہر صورت خریدنا چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس جیسے کے پیچھے تھے۔ مجید مٹھوٹا کی شخص کی ہلاکت پر... شک کی بنا پر میڈم صفورا نے عمران کو اغوا کر لیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بانی سے صفورا کو قائل کر لیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابراہیم صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام اتنی خوش اسطوئی سے کیا کہ میڈم اشکرا بھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیرہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر جھٹکا آزماری تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیرہ نے عمران کی سردمہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل میں عمران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیرہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درختوں تماشاخیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہوسکا۔ نادیرہ شدید زخمی ہو گئی۔ میری دقوتی، کم ہمتی کی وجہ سے نادیرہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ عمران نے مجھے ان افراد کی گرفت سے بچھڑایا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ میں نے عمران کو پہلی بار تھوڑا پریشان دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم صفورا بہن کا انتقام لینے کے لیے شعلہ جوالا بن جائے گی۔ اور یہی ہوا۔ میڈم کے ہر کاروں سیٹھ سراج اور شیر سے وغیرہ نے میرا اور عمران کا پیچھا کیا۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر راتقل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک ٹائپ کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میڈم صفورا اب میری ماں، بہن اور بھائی کے لیے خطرہ بنے گی۔ میں انہیں بچانے کے لیے ڈیفنس کی ایک گھٹی میں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا کے لوگ دھناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے بھاگ دیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیر سے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسد خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سینہ صیاد اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک انجینی جگہ پایا۔ میرے دماغ میں عجیب دھند بھری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک کھنکھرتوں میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ پتا کر دیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم ایک کھوہ میں چلے گئے۔ سلطانہ کا تعاقب کرتا ہوا ایک ہارون نامی شخص کھوہ میں پہنچا اور سلطانہ کی کلباڑی سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ میں نے سلطانہ کے ساتھ مل کر اس شخص کو باندھ دیا۔ ہم اس کھوہ سے نکل گئے۔ راستے میں ہاشو نام کا ایک گونا گونا شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ حیرت کی شدت سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبد الغنی صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزین ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھاگل پور اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور مل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی مل پانی میں آئی ہے۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمنا تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ لیکن یہاں مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں نے چھوٹے سرکار کے اہل کاروں کے سامنے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کر دیا۔ سلطانہ کو پناہ ملنے کا امکان معدوم ہو گیا۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبد الغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سرکی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ ابھی میں اوپر چوہان باتیں کر رہا تھا کہ جنگل کی طرف سے کسی جانور کی آواز آئی۔ یہ آواز دراصل چھوٹے سرکار کے چھوٹے بھائی کونو بابو کے ہاتھی کی تھی جو ہستی میں گھس آیا تھا اور اس نے ایک نوجوان کو زخمی کر دیا تھا۔ بعد میں چھوٹے سرکار نے اپنے بھائی کو سزا دی۔ بہر حال مجھے چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں مجھے اور سلطانہ کو حکم جی کے لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی مگر حیرت انگیز طور پر پکڑا گیا۔ زرگاں میں مجھے جھوڑا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے جھوڑا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ سے اسٹبل میں کام لیا جانے لگا۔ ایک روز مجھے جارج کی رہائشی عمارت میں موجود دفعت نما کمرے میں بند کر دیا گیا اور مجھے کرنٹ لگا دیا گیا۔ یہ منظر ایک کھڑکی کے ذریعے سلطانہ نے بھی دیکھا۔ پھر جارج نے مجھے لڑائی کی پیشکش کی اور مجھے بہت موقع دیے۔ مگر میں اپنی کم ہمتی کی وجہ سے کچھ نہ کر سکا۔ سلطانہ نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس نے مجھے وہاں سے بھیج دیا اور خود وہیں رہ گئی۔ میرا یہ سوچ زبردست حال ہوئے لگا۔ میں بہت رویا اور پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے۔ میں بارود یا سر جاؤ کا عہد کرتے ہوئے اٹھا اور بالکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو گارڈز کو زخمی کیا۔ دو کتوں کو ہلاک کر ڈالا۔ میرے سینے میں آتشیں آگ تھی۔ ہاتھ میں راتقل تھی۔ میں جناح سے بے پروا ہوا ہر گھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجا شروع ہو گئے تھے۔

ناگ پھنی اور جنت کے درخت تھے اور وہ ساری نباتات تھیں جو جنگلی علاقے میں نظر آتی ہیں۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔ رائفل کے لمس نے میرے اعتماد میں اضافہ کیا۔ زندگی میں شاید پہلی بار مجھے ہتھیار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا تھا۔

ہوا بہت تیز تھی اور میرے عقب سے چل رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ ہوا مجھے دھکیل رہی ہے اور میں بھاگنے کے بجائے اڑتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ سب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ میں بہت سے خطروں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ درختوں سے ٹکرا کر زخمی ہونے کا خطرہ، کسی گڑھے میں گرنے کا خطرہ، عقب سے گولی چلنے کا خطرہ، کسی جنگی جانور کا ڈر... کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں بس نکلنا چاہتا تھا۔ نکل جانا چاہتا تھا اس سیاہی مائل جنگل کے حصار سے۔ میں اس منحوس نرغے کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ مجھے آزادی درکار تھی۔ بس آزادی... اور میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے عقب میں دو راftادہ آوازیں سنیں۔ ان میں کتوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ آوازہ کتے تھے یا خاص بویگر کتے جو گھڑ سواروں کے ساتھ میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں دو کتوں کو عمارت کے احاطے میں مار چکا تھا۔ میں مزید کو بھی مار سکتا تھا۔ اگر میرا راستہ روکا جاتا تو میں نے اس رائفل میں موجود ایک گولی بھی بچا کر نہیں رکھنا تھی۔ اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل میں کتنی گولیاں ہیں۔ یہ برسٹ مارنے والی رائفل تھی اور ایک بار عمران یا شاید اقبال نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی رائفلوں میں عموماً بیس پچیس تک گولیاں موجود ہوتی ہیں۔ میں نے اب تک بمشکل سات آٹھ گولیاں ہی استعمال کی تھیں۔

... میں اندھا دھند بھاگتا رہا۔ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر بھاگا۔ آٹھ دس منٹ یا بیس پچیس منٹ۔ بس مجھے یہ احساس تھا کہ میری سانس دھونکی کی طرح چل رہی ہے اور میری ٹانگیں شل ہوتی جا رہی ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ میں بھاگتے بھاگتے اچانک گر پڑوں گا اور تا دیر اٹھ نہیں سکوں گا۔ مگر میں پھر بھی ٹانگوں کو حرکت دیتا رہا۔ تسلی کی صرف ایک بات تھی۔ اب مجھے اپنے عقب میں تعاقب کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ کتوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تو کیا میں متعاقب افراد کو جل دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں؟ اس سوال کا یقینی جواب دینا تو ابھی مشکل تھا۔ بھاگتے بھاگتے میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہوا میرے عقب سے چل رہی

ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اگر تیز ہوا اسی سمت میں چل رہی ہو جس سمت میں کتوں کا ”شکار“ جا رہا ہو تو پھر کتوں کی حس شامہ کند ہو جاتی ہے۔ شاید یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے گھڑ سوار کی اور جانب نکل گئے تھے۔

میری ٹانگیں اب کسی بھی وقت جواب دینے والی تھیں... میں ایک جگہ برگد کے بڑے بڑے درختوں تلے بیٹھ گیا۔ درختوں کی جڑیں اوپر سے نیچے کی طرف آرہی تھیں اور اندھیرے میں یوں لگتا تھا کہ درجنوں سانپ ہوا میں جھول رہے ہیں۔ موسم میں خنکی تھی پھر بھی مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پنڈلیوں میں نئے نئے کانٹے چبھ گئے تھے اور جسم پر تازہ خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے آٹومٹک رائفل گود میں رکھ لی اور درخت سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ سلطانہ کی بے بسی کا خیال ذہن میں یوں آیا جیسے اندھیرے میں اچانک بجلی چمکتی ہے۔ اس کا مجھے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دینے کا انداز، دل کو لہو لہو کرنے والا تھا۔ پتا نہیں آج رات اس پر کیا ہوتی تھی اور اب وہ کہاں تھی؟ اور وہ جھوٹی جھوٹی گول آنکھوں والا معصوم صورت بالو... جسے وہ میرا بچہ کہتی تھی۔ وہ سلطانہ کے ساتھ ہی جیل میں گیا تھا لیکن جارج کی چار دیواری میں وہ سلطانہ کے ساتھ نہیں تھا۔ خبر نہیں وہ کہاں تھا؟ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سلطانہ جیسی نڈر لڑکی اگر جارج کے جال میں آئی تھی تو اس کی وجہ میں تھا۔ مجھے اذیت کے ناقابل برداشت شکنجے میں دیکھ کر سلطانہ نے جارج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس نے مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنے سے بہتر سمجھا تھا کہ وہ اپنی شوہر پرستی کو ایک نیا رخ دے دے اور اپنا آپ مجھ پر لٹا دے۔

اس منحوس دھاتی کمرے میں برقی رو کی ”اذیت رسائی“ میرے ذہن میں آئی تو روٹ گئے کھڑے ہو گئے۔ مجھے تین بار چند سیکنڈ کے لیے کرنٹ دیا گیا تھا اور اب مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں تین بار جان کنی کا عذاب سہہ کر اور موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہوں۔ جہاں جہاں سے کرنٹ میرے جسم میں داخل ہوا تھا، وہاں وہاں سے ابھی تک رگ رگ چھپوڑے کی طرح دکھتے تھے... اور سیاہی مائل داغ نظر آتے تھے۔

میں چار پانچ منٹ تک تاریکی میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ٹانگوں میں قدرے جان آگئی۔ میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ برگد کی لٹکی ہوئی جڑوں میں سے ایک جڑ میرے کندھے پر آئی اور سینے کی طرف رینگ گئی۔ یک لخت مجھے

محسوس ہوا کہ ”جڑ“ واپس میرے کندھے کی طرف آرہی ہے۔ سیکنڈ کے ہزاروں جیسے میں میرے ذہن نے کہا کہ یہ برگد کی جڑ نہیں ہے۔ ایک تیز اضطرابی حرکت کے تحت میں نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور پیچھے ہٹا۔ کئی فٹ لمبا سانپ میرے جسم سے جدا ہو کر دھپ سے بچی زمین پر گر گیا۔ میں نے اس کی پھنکار سنی۔ تاریکی میں اس کا ہیولا دیکھا۔ وہ چھن پھلائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ انکی ٹریگر پر رکھی لیکن پھر ایک دم دماغ نے کام کیا۔ اس سانپ سے زیادہ اس رائفل کا قاز میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ گولی چلنے کی آواز میرے دشمنوں کو میری طرف کھینچ سکتی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا چلا گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ اپنے شکار کا پیچھا بھی کرتا ہے۔ دادی کہا کرتی تھیں کہ بھڑکا ہوا سانپ کبھی کبھی گھڑ سوار کو بھی جالیتا ہے۔ میں اٹنے پاؤں پیچھے ہٹا رہا اور میری نظریں سانپ کے ہیولے پر مرکوز رہیں۔ وہ پیچھے نہیں آیا... میں نے رخ پھیرا اور... پھر ہوا کے رخ پر بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ میں کچھ دن پہلے بھی اسی طرح ایک تاریک جنگل میں بھاگا تھا اور خود کو بھانڈیل اسٹیٹ کے جنگل سے نکالنا چاہتا تھا لیکن تب اور آج کی صورت حال میں بہت فرق تھا۔ آج میرے ہاتھوں میں ایک مہلک ہتھیار تھا اور سینے میں... اس ہتھیار کو چلانے کی ہمت بھی تھی۔ آج میں بلا ترو کسی کو مار سکتا تھا اور مر بھی سکتا تھا۔ ہاں، کچھ اوقات ایسے ہی کا یا پلٹ ہوتے ہیں اور کچھ فکروں کی بازگشت اور کچھ مناظر کی یاد ایسے ہی زند گیوں کے رخ بدلتی ہے۔ عمران کا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر میری نگاہوں میں آیا۔ بے شک اس نے کہا تھا۔ ”مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمہ داری خود پر لیتا نہیں چاہتا۔ اس لیے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔“

میں بھاگتا رہا... اور چلتا رہا... اور دم لیتا رہا اور پھر بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا۔ رات بھر گھونسلوں میں دیکھے رہنے والے پرندے بیدار ہوئے اور چھپھانے لگے۔ پہلے ان کی آوازیں مدھم تھیں پھر بلند ہوتی چلی گئیں۔ اندھیرے میں سفیدی نکلی اور پھر غالب ہوتی چلی گئی۔ ہوا کا رخ بھی بدل چکا تھا۔ ارد گرد کے منظر واضح ہونے لگے۔ پتوں سے اٹنی ہوئی زمین، جھاڑیاں، درخت اور درختوں کی بلند شاخوں کے پیچھے سے جھٹک دکھاتا ہوا نیلگوں آسمان۔ میں ایک یکسر ویران جنگل میں تھا۔ آثار سے تو یہی لگتا تھا کہ درجہ کسی آدم زاد یا تنفس کا نشان نہیں۔ روشنی ذرا

Scanned and Uploaded By Nadeem

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ ماہنامہ

ستمبر 2010ء کا ایک دلکش روپ

روشنی

دوران سفر قدموں کی اغزشوں کا عبرت اثر احوال
آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا ایک اور انداز

دلکش سانس

ابتدائی صفحات کا ایک مخصوص رنگ اور تاریخ کا اپنا ہی
ایک ایسا ڈھنگ ہے جسے بار بار پڑھنے کو دل
چاہے... تو پھر پڑھیے اور معلومات میں اضافہ کیجیے۔

حضرت علامہ

ذہن کے تاریک گوشوں کو روشن کر دینے والی لازوال
داستانیں... رضوانہ ساجد کے قلم کی روانی

واپس

تجربہ، تجسس اور عشق کے دلغریب لحات پر مشتمل
پل پل رنگ بدلتی طویل داستان...

محی الدین نواب کے قلم کا جادو

مستحکم مسند

بہیدوں بھری اس دنیا میں طرح طرح کے لوگ بستے
ہیں... وہ بھی ایک ایسی ہی پہیلی تھی جسے

ایڈووکیٹ مرزا امجد بیگ

نے بالآخر بوجھ ہی لیا۔

لکھنے والے

اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

منزلت

نجمہ مودی، تنویر ریاض،
کاشف زبیر، مریم کے خان اور منظر امام
کی دلچسپ تحاریر

اور وہ سب کچھ جو آپ سینس میں دیکھنا چاہتے ہیں!
تازہ شمارہ نوری حاصل کیجیے

زیادہ ہوئی تو مجھے کہیں کہیں ہلکی زمین پر پنچوں اور کھروں کے نشان دکھائی دیے۔ میں جنگلی زندگی سے قطعی نا آشنا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کن جانوروں کے قدموں کے نشانات ہو سکتے ہیں... اور کہیں کہیں جو فضلہ بکھرا دکھائی دیتا ہے، وہ کن جانوروں کا ہے۔ رات گاہے بگاہے مجھے جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی رہی تھیں لیکن میں ان کے بارے میں بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

ایک جگہ بارشی پانی کا چھوٹا سا تالاب نظر آیا۔ اس کے گرد بھی پنچوں کے نشانات کثرت سے تھے۔ ایک طرف کسی ہرن سائز کے جانور کا ڈھانچا پڑا تھا۔ پانی تھرا ہوا تھا۔ پیاس کی شدت زیادہ تھی اور دھوپ نکلنے کے بعد مزید بڑھ سکتی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے تھوڑا سا پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اپنے کرتے کے گلے دامن سے رانقل پر لگا ہوا کچھڑ صاف کیا۔ یہ روی ساخت کی رانقل تھی۔ خم دار میگزین کافی لمبا تھا۔ میں میگزین علیحدہ کر کے گولیوں کی تعداد دیکھ سکتا تھا لیکن یہ تجسس مہنگا پڑ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں میگزین دوبارہ رانقل سے اسٹچ نہ کر پاتا۔

دس پندرہ منٹ وہاں سستانے اور اپنی چونوں کو سہلانے کے بعد میں پھر چل پڑا۔ گھوڑا گاڑی کے اٹنے سے کوئی زخم تو نہیں لگا تھا مگر جسم پر کئی جگہ نیل موجود تھے۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ان چونوں کا احساس ہو رہا تھا۔ خاص طور سے پاؤں بازو کو حرکت دینا دشوار لگ رہا تھا۔

اگلے تین چار گھنٹے میں مسلسل چلتا رہا۔ کبھی کبھی بھاگنا بھی شروع کر دیتا تھا۔ اس عرصے میں مجھے صرف ایک بھینس نما سیاہ جانور کی جھلک دکھائی دی یا پھر دو چیتل (نیل گاؤ) تھے جو تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ چاروں طرف درختوں کے لامتناہی سلسلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان درختوں میں سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے درمیان کہیں کہیں بارشی پانی کے گڑھے تھے یا کسی تیز آمدی سے اکھڑے ہوئے درختوں کے تنے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس روئے زمین پر اس گھنے جنگل کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

مجھے یہاں سے نکلنا ہے... مجھے اپنوں کے پاس واپس جانا ہے... مجھے ہر صورت اس گھیرے کو توڑنا ہے... میں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا اور چلتا جا رہا تھا۔

شاید سلطانہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ایک پر پھڑ پھڑاتا ہوا پیچھی ہی تھا۔ یہ پیچھی ایک مدت سے اپنا پنجرہ توڑنا چاہ رہا تھا۔ کسی کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کسی کی خوب صورت آنکھیں اسے شب و روز بے کل رکھتی

تھیں۔ وہ پنجرے کی سلاخوں سے ٹکراتا تھا۔ اب وہ ہلکا سا زخم مندمل ہوتے تھے تو وہ پھر پھڑ پھڑاتا اور ٹکراتا شروع کر دیتا تھا۔ ایک عرصے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ دھوپ اب جسم میں جھینے لگی تھی۔ مجھے درختوں کے درمیان ایک آبی گزرگاہ نظر آئی۔ اس کا پاٹ دس بارہ میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ کنارے کئے پھٹے تھے اور ان پر کثرت سے داب اگی ہوئی تھی۔ میں اس آبی گزرگاہ کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے ارد گرد سیکڑوں میل تک کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ جنگل سائیں سائیں کرتا تھا اور تیز دھوپ کے سبب نباتات کی مہک فضا میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس وقت یہاں کوئی سیاہ فام حبشی نظر آجائے تو اس جگہ کو کاغذ یا تنزانیہ وغیرہ کا جنگل تصور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

میں وہاں بیٹھا رہا اور دوپہر ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ کسی ٹیلی شاخ کے لگنے سے میری کلائی پر گہرا زخم آیا تھا۔ قریباً دو گانچ جگہ سے کھال اتر گئی تھی۔ اس تازہ زخم کی وجہ سے کلائی کے ایک بہت پرانے زخم کا نشان بھی معدوم ہو گیا تھا۔ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں ثروت اس طرح ٹوٹ کر یاد آ رہی تھی کہ دل کسی اہنی مٹی میں آگیا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ ہمارے والدین نے ہماری شادی کے وقت کا باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا تھا تاہم بین السطور یہ بات طے تھی کہ شادی کب اور کس موسم میں ہونی ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ ثروت نے اپنی فائل میں انتظار کے ماہ و سال کو دنوں میں تبدیل کر رکھا ہے اور ان دنوں کی تعداد کے مطابق کاغذ پر لکیریں لگا رکھی ہیں۔ وہ ہر صبح اٹھ کر ان لکیروں میں سے ایک لکیر کاٹ دیتی تھی۔ اس روز ہم ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ میری نظر ثروت کی فائل پر پڑی۔ وہاں لکیریں نظر آئیں تو میرا تجسس جاگ گیا۔ میں فائل دیکھنے کے لیے فائل پر چھپنا تو ثروت نے فائل ایک دم اپنے پیچھے چھپالی۔ میں نے اس سے فائل لینا چاہی۔ اسی دوران میں ثروت کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم، نب کی طرف سے میرے بازو میں چبھ گیا۔ کلائی اور کہنی کے درمیان سے خون نکل آیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے قلم اور فائل دونوں پھینک دیے اور میرا بازو دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

زخم کا وہ نشان انگریزی کے حرف ”ایس“ سے ملتا جلتا تھا۔ میں یہ زخم دکھا کر اسے اکثر ستایا کرتا تھا۔ کہتا تھا، دیکھو کتنی سبے رحم ہوں۔ لوگ درختوں کے تنوں کو چھیدتے ہیں، تم

نے اپنے نام کے لیے میرے بازو کو چھیدا ہے۔ وہ شرمندہ ہو جاتی تھی اور پھر کئی دفعہ تلافی کے لیے میرے بازو کے نشان کو چوم لیتی تھی۔ ایک دن جب اس نے ایسا کیا تو میں نے شرارت سے کہا تھا... اچھا ہوتا اگر اس دن تمہارا قلم کلائی کے بجائے میرے ہونٹوں پر لگا ہوتا۔ اس نے شولڈر بیگ میرے سر پر دے مارا تھا... وہ ذرا سا چوک کر میری ناک پر لگا۔ ”کھڑ جا... تیری تو...“ میں اس کے پیچھے لپکا۔

وہ اٹھلائی اور بل کھائی ہوئی بھاگی اور اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر سیدھی چھت پر چلی گئی جہاں خالہ صفیہ اور بھوپھو سیکند وغیرہ بیٹھی تھیں۔

وہ دن ایسی ہی خوب صورت یادوں اور شرارتوں سے عبارت تھے۔ آج کلائی کے اس تازہ زخم کے ساتھ اس پرانے زخم کا نشان معدوم ہو گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری کوئی نہایت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔

میں تھک گیا تھا۔ میرے چاروں طرف گنجان جنگل تھا۔ مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا... اب تو مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ میں کئی ہفتے بھی یہاں بھٹکتا رہوں تو باہر نکلنے کی راہ نہ پاؤں گا۔ میں اس چھوٹی ندی کے ساتھ ساتھ پھر چل پڑا۔ اندھیرا ہونے تک چلتا رہا۔ ہریالی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ بھوک سے برا حال تھا۔ شام ہوتے ہی پرندے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئے۔ جوں جوں تاریکی چھلکتی گئی، جنگل جاگتا گیا۔ گاہے بگاہے مختلف جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کے وقت مجھے کسی درخت پر ہونا چاہیے مگر درخت پر بھی کیڑوں مکوڑوں اور دیگر حشرات کے خطرات موجود تھے۔ پھر مجھے معلوم تھا کہ تیندوے اور جنگلی بے وغیرہ بھی جو اذہد خطرناک ہوتے ہیں، درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں زیادہ خوف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ وہ طاقتور رانقل تھی جو میرے ہاتھ میں تھی اور ایک وجہ وہ انقلابی کیفیت بھی تھی جو کل نیم شب سے میرے سینے میں موجزن ہو چکی تھی۔

وہ رات جیسے تیسے میں نے شاہ بلوط کے ایک بلند درخت پر گزاری۔ میں ساری رات نیم غنودگی کی کیفیت میں رہا۔ چھوٹی نال والی روی ساخت رانقل ایک قیمتی اثاثے کی طرح میرے کندھے سے لٹکی رہی۔ جنگلی حیات کی موجودگی صرف آوازوں تک محدود تھی اور یہ آوازیں مجھ تک پہنچتی رہیں۔

صبح میں ایک بار پھر اپنے خستہ جاں بدن کو سمیٹ کر چل پڑا۔ بھوک اب نقاہت بن کر جسم کے ہر ہریٹھے میں

اترنے لگی تھی۔ میں اس کٹی پھٹی گم راہ ندی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا... ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں اور سر چکر رہا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نیم جان ہو کر پھر اس مدام چلنے والے پانی کے کنارے شیشم اور جنتر کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں ڈھونڈتا تو مجھے ان رنگ رنگ کے درختوں، پودوں اور جھاڑیوں میں کہیں نہ کہیں نباتاتی خوراک مل سکتی تھی لیکن میں ابھی تک تذبذب میں تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کیا کھا سکتا ہوں اور کیا نہیں۔

عجیب سی مایوسی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کیا میں بھی یہاں سے نکل نہ سکوں گا؟ کیا میں پھر پڑا جاؤں گا؟ کیا بھاگنے کے جرم میں اس بار میری گردن اتار دی جائے گی؟

ذہن میں ایک بار پھر سوال جھوم کرنے لگے۔ دفعتاً میری نگاہ داب اور کچھڑ میں پھنسی ہوئی ایک شے پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ براؤن شیشے کی ایک بوتل تھی۔ نہ جانے یہ کہاں سے بہتی ہوئی آئی تھی اور کب سے یہاں دو پتھروں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس پر کائی جم چکی تھی۔ میں نے یہ بوتل نکال لی۔ یہ اندر سے خالی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف پھینک دیا اور ایک بار پھر درخت سے ٹیک لگالی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگس رہا تھا کہ میں اسی گنجان جنگل میں ہمیشہ چکراتا رہوں گا۔ کبھی یہاں سے نکل نہیں پاؤں گا۔ یا سیت کے سبب دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ اپنے کچھڑے ہوئے شدت سے یاد آنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے دل میں پتا نہیں کیا آئی، میں نے بوتل پھراٹھالی۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ میرے بازو کے زخم سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب سے ایک کرکسی نوٹ مل گیا۔ میں نے ایک پتلی سی شاخ ڈھونڈی جسے قلم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اپنے بازو کے زخم کو کرکسی میں نے اسے کچھ مزید خونچکاں کیا۔ شاخ کے قلم کو اس خون میں ڈبو کر کرکسی نوٹ پر لکھا۔

”میرے پیارو! میں زندہ ہوں۔ میرا انتظار کرنا... میں ایک دن ضرور آؤں گا... تابش۔“ اس سے آگے اپنا لاہور کا مختصر پتا لکھا۔

نوٹ کی دوسری طرف میں نے اپنے لبو سے تین نام لکھے۔ فرح... عاطف... ثروت۔ پھر میں نے اس نوٹ کو کلائی زدہ بوتل کے اندر رکھا۔ بوتل کا ڈھکن بند کیا اور اشک

تیواری کی منحوس، تلاشی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بچانے کے بعد میں نڈھال سا ہو گیا۔ ہانپا ہوا سا میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا لی۔ چالیس بجاس فٹ آگے ندی کا کنارہ تھا اور وہاں دوسری لاش پڑی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ کیا ان دونوں جیتے جاگتے انسانوں کو میں نے مارا ہے؟ اپنے ہاتھوں سے مارا ہے؟ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن حقیقت سامنے تھی... اور ابھی سینے میں آگ کی وہ دیو قامت لہر بھی، بلندی میں کم نہیں ہوئی تھی...

میں نے ندی کے کنارے مرنے والے محافظ کی لاش چیک کی۔ گولی اس کی فرہ گردن کی ہڈی توڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اس شخص کی رائفل اس کے پاس ہی پڑی تھی، اس رائفل میں بڑا میگزین لگا ہوا تھا اور یہ نسبتاً بڑی بھی تھی۔ میں نے یہ رائفل اٹھالی اور دوسری رکھ دی کیونکہ دونوں رائفلوں کو لے کر چلنا آسان نہیں تھا۔ یہ دوسری رائفل حاصل کرنے کا ایک فائدہ مجھے یہ بھی ہوا کہ گولیوں کی ایک بیلٹ بھی ملی۔ یہ بیلٹ مرنے والے کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے بیلٹ کھول کر جیسے تیسے اپنی کمر سے باندھ لی۔ اپنی والی چھوٹی نال کی رائفل پانی میں پھینک دی۔ تیواری لال کے پاس پڑا ہوا پستول بھی میرے کام آ سکتا تھا۔ یہ پستول بھی میں نے اٹھالیا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ڈیوڈ اور اس کا کلباڑی بردار سا بھی کمک لے کر واپس آ سکتے تھے۔ تیواری لال کی جامہ تلاشی میں کچھ کرنسی، سگریٹ اور دیگر اشیاء بھی ملیں جو میں نے اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد میں وہاں سے چل دیا۔ اپنا تک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ڈیوڈ اور کلباڑی بردار شخص گھوڑوں پر یہاں آئے تھے تو تیواری اور اس کا مرنے والا ساتھی بھی یقیناً گھوڑوں پر ہوں گے۔ ان کے گھوڑے بھی یہیں کہیں ہو سکتے تھے۔ میں تھوڑا آگے گیا اور دو گھوڑے درختوں میں بندھے ہوئے مل گئے۔ وہ بڑے انہماک سے ہری بھری گھاس پر منہ مار رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک گھوڑا منتخب کیا۔ میری گھڑ سواری صرف مری اور ایبٹ آباد وغیرہ تک محدود تھی۔ ہم اپنے والدین کے ساتھ ان ”مل اسٹیشنز“ پر جاتے تھے اور کرائے کے گھوڑوں پر تھوڑی بہت سواری کر لیتے تھے۔ کچھ تجربہ یہاں یاراج گورا کے وسیع و عریض اصطبل میں آ کر حاصل ہوا تھا۔ گھوڑوں کی عادات کا تھوڑا بہت پتا چلتا تھا۔

جان سے مار دو...“ اس کے ساتھ ہی میں نے کئی گولیاں چلا دیں اور ان کے پیچھے لپکا... وہ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں میں اوجھل ہو گئے۔

میں جنوبی انداز میں ان کے پیچھے دوڑتا رہا۔ میری آواز جنگل میں دور تک گونجتی رہی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں افراد گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ نکلے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں پاس سے کمک لینے گئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بدحواس ہو گئے ہوں۔

اچانک مجھے تیواری لال کا خیال آیا۔ وہ بوکھلاہٹ میں پیچھے ہٹا تھا اور نشیب کی جھاڑیوں میں گرا تھا۔ میں رائفل سونت کر اس نشیب کی طرف بھاگا۔ مگر میں پچیس میٹر آگے ہی گیا تھا کہ دائیں طرف سے مجھ پر دو فائر ہوئے۔ یہ پستول کے فائر تھے۔ ایک گولی میرے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ میں تملکا کر پلٹا۔ جھاڑیوں میں تیواری لال کی سفید دھوتی کی جھلک نظر آئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کئے۔ جنگل دھماکوں سے گونج اٹھا۔ دھوتی جیسے زمین پر پھینک گئی۔ پیش کے سبب میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ تیواری کے پاس پستول ہے اور وہ اب بھی مجھ پر جوابی فائر کر سکتا ہے، میں بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے صرف ایک گولی لگی تھی لیکن یہی کام دکھا گئی تھی۔ یہ گولی اس کے پیٹ میں داخل ہو کر پسلیوں کی طرف سے نکل گئی تھی۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ سر پر خون کیسے سوار ہو جاتا ہے۔ کس طرح ایک قتل کے بعد دوسرے قتل بائیں ہاتھ کا کھیل نظر آنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں میں جنون دیکھ کر تیواری لال کا سانولا چہرہ کالا سیاہ ہو گیا۔

وہ گھلپٹا۔ ”گولی مت چلانا... مم... میرا کوئی دوش نہیں... یہ گورا صاحب کا حکم تھا۔“

میں پھنکارا۔ ”گورا صاحب کے حکم پر ہی تو سلطانہ کو زرگاں لایا تھا۔ اسی کے حکم پر تو نے اسے جیل سے نکال کر اس کی کوٹھی میں پہنچایا ہوگا... اور اسی کے حکم پر تو نے کوٹھی کے باہر پھر ادیا ہوگا تا کہ وہ آسانی سے اس کی آبرو خراب کر سکے...“

”ناہیں... ناہیں...“ تیواری نے کرب کے عالم میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ”سلطانہ کو زرگاں لانے والا میں ناہیں، موہن کمار ہے۔ میں سوگند کھادت ہوں...“

نکرائی۔ ”بڑا شوق ہے مجھے بھاگنے کا... میرا خیال ہے کہ اگر بھگورڈوں کا عالمی مقابلہ کرایا جاوے تو... تو حرام جادہ پہلے نمبر پر تو آ ہی جاوے گا۔“

میں خاموش کھڑا تھا لیکن میرے جسم میں آج جو جداتم کی ہلچل تھی، اس سے تیواری اور اس کے ساتھی بے خبر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اذیت کی انتہا بالآخر بے خوبی میں بدل چکی ہے۔ درد کی بھٹی میں تپ تپ کر اور جل جل کر ایک خام دھات نے آخر کار اپنی شکل تبدیل کر لی ہے۔

”ہاتھ اوپر اٹھا۔“ تیواری کے پہلو میں کھڑے شخص نے میرے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے کرخ آواز میں کہا۔ لڑائی ایک فن بھی ہے... لیکن لڑائی ایک دیوانگی بھی ہے... یہ ایک آرٹ بھی ہے اور ایک ایسی سرکش لہر بھی ہے جو کسی ضابطے، قاعدے کو نہیں مانتی۔ ایسی سرکش لہر کو تجربہ درکار ہوتا ہے، نہ ماحول اور نہ حکمت عملی... اور میں ایک ایسی ہی لہر کے زیر اثر تھا۔

مجھے ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن میں اپنی رائفل کی طرف گیا۔ رائفل اٹھانے کے لیے میرا تیزی سے جھلکتا میری زندگی کا جواز بن گیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک گولی میرے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں رائفل پر گرا۔ تب رائفل بردار نے دوسری گولی چلائی۔ یہ گولی میرے پہلو کے پاس چکی زمین میں لگی۔ تب تک میں بھی ٹریگر دبا چکا تھا۔ میں نے دو فائر کئے۔ ان میں سے ایک گولی سیدی رائفل بردار کی گردن میں جا گئی۔ وہ جھاڑیوں میں گرا۔ کلباڑی بردار اور تیواری لال دونوں بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ تیواری لال کا پاؤں پھسلا اور وہ الٹ کر نشیب میں چلا گیا۔ اس کی دھوتی کے اندر سے اس کی کالی سیاہ ٹانگیں دور تک نظر آئیں۔ دوسرا رائفل بردار ڈیوڈ تھا۔ اس نے رائفل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی مگر اس کے چہرے پر شدید گھبراہٹ کے آثار تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ رائفل کو جھٹک رہا تھا۔ اس وقت تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن کئی دن بعد معلوم ہوا کہ ڈیوڈ نے مجھ پر گولی چلائی تھی مگر گولی چیمبر میں پھنس گئی تھی۔

ڈیوڈ برف کی طرح سفید چہرے کے ساتھ کئی قدم پیچھے ہٹا پھر اچانک رخ پھیر کر بھاگ نکلا۔ کلباڑی بردار اس سے دس قدم آگے تھا۔ میں نے بے دریغ، ڈیوڈ نامی اس بندے پر دو فائر کئے۔ ایک گولی تو ضائع ہو گئی، دوسری اس کی ٹانگ میں کہیں لگی لیکن وہ رکنا نہیں، لنگراتا ہوا بھاگتا رہا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں جنوبی لہجے میں چلا آیا۔

”مجھے مارو... مجھے مارو... بھاگتے کیوں ہو حرامزادو... مجھے

بار آنکھوں کے ساتھ اسے پانی میں بہا دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس بوتل کو کہیں نہیں پہنچتا... شاید وہ کچھ ہی آگے جا کر کہیں گھاس وغیرہ میں ایک جائے گی یا پھر اس بے کراں جنگل کے اندر ہی کہیں کسی بارشی جھیل میں جا پھریے گی... لیکن بوتل کو اس طرح بہتے پانی میں ڈالنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے خود کو کسی قدیم کہانی کے کردار کی طرح محسوس کیا۔ وہ کہانیاں جن میں انہونیوں کی امیدیں پالی جاتی ہیں۔ جن میں گہری تاریک راہوں پر آس اور انتظار کے دیپ جلائے جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں انہوں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے اور دور دراز کے جزیروں میں سدا کے لیے محصور ہو جانے والے لوگ، ساحلوں پر بیٹھتے ہیں اور افق کے پار دیکھتے ہیں۔ وہ پانیوں کو پار کرنے کے لیے بھی تنوں سے کشتیاں بناتے ہیں، کبھی درختوں کو آگ لگا کر دور دراز کے جہازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں... اور کبھی تارے لکھ کر اور انہیں بوتلوں میں بند کر کے لہروں کے سپرد کرتے ہیں...

میں نے بھی بوتل کو ندی کے بہاؤ میں بہا دیا۔ وہ تیرتی گئی اور مجھ سے دور ہوتی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا... اور سوچتا رہا... یہ دور دیس کے کسی ایسے پانی میں پہنچے گی جہاں کوئی کشتی ران، کوئی پھیرا اسے نکالے گا اور میرے پیاروں تک پہنچا دے گا۔ میری نگاہیں بوتل پر جمی رہیں... وہ دور ہوتی گئی۔ دھیرے دھیرے ایک نکتہ بنی اور پھر معدوم ہو گئی۔

میں نے رخ پھیر کر دیکھا۔ میرے سامنے چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں اور تیسرے کے ہاتھ میں خوفناک پھل کی کلباڑی تھی۔ بالکل یہی لگا کہ وہ اچانک زمین کے اندر سے نمودار ہو گئے ہیں یا درختوں کے تنے چیر کر باہر نکل آئے ہیں۔ میں اپنی جگہ پتھر کر رہ گیا۔ میری نگاہیں گہرے سانولے چہرے والے تیواری لال پر جمی تھیں... اس کی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے اپنی بصارت پر بھروسہ نہیں ہوا... دل و دماغ کی کچھ وہی کیفیت ہوئی جو چند روز پہلے اس وقت ہوئی تھی جب باد و باران کی رات میں ایک سنان جنگل کے اندر اچانک ہی ان لوگوں نے مجھے آدو چاٹا تھا۔ لیکن تب میں اور آج میں ایک فرق تھا... ایک سنگین اور مہلک فرق... اور یہ ”فرق“ آگ کی ایک دیو قامت لہر کی طرح میرے سینے میں موجزن تھا اور میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ میری رائفل مجھ سے تین چار فٹ دور گہری سبز گھاس پر پڑی تھی۔

تیواری لال کی زہریلی پھنکار میرے کانوں سے

میں نے ایک گھوڑا کھولا۔ اسے تھکیاں دے کر ذرا شانت کیا اور پھر سوار ہو گیا۔ حقیقی معنوں میں یہ میری زندگی کی پہلی گھڑ سواری تھی۔ میں گھوڑے کو پہلے آہستہ چلاتا رہا پھر تھوڑی تھوڑی ایذا لگانی شروع کی۔ میں نے ڈیوڈ اور اس کے ساتھی کو شمال کے رخ پر بھاگتے دیکھا تھا، میں نے جنوب کا رخ کیا۔

تجربے کے بغیر گھوڑے پر بیٹھنا اور گھٹنے درختوں میں ایک طویل سفر کرنا نہایت دشوار کام تھا مگر میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ جب مرنا تھا تو پھر ڈرنا کیا۔ بازو پر لگنے والی گولی نے مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یہ ایک قابل برداشت زخم تھا۔

میں نے قریباً ایک گھنٹے تک گھوڑے پر سفر کیا۔ اس دوران میں کوئی خاص واقعہ تو نہیں ہوا مگر میرا ذہن مسلسل سوچتا رہا اور تحیر کی لہریں مجھے اٹھل پھل کرتی رہیں۔ غنی صاحب نے، سلطانہ نے اور پھر جھکوشو ہمیش نے ملتی جلتی بات ہی کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے کسی سلفی عمل کے ذریعے اس راجاؤں کے حدود میں پابند کر دیا گیا ہے۔ میں ان گنجان جنگلوں کو پار نہیں کر سکتا اور جب بھی کوشش کروں گا، پکڑا جاؤں گا۔ اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میں ایسی کئی ایک ناکام کوششیں کر چکا ہوں۔ شروع میں مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر اب ذہن میں عجیب سی بے گلی تھی۔ چند دنوں کے اندر یہ دوسرا واقعہ ہوا تھا۔ اس گھٹنے ویران جنگل میں جہاں بیسیوں میل تک کسی آدم زاد کے آثار نظر نہیں آتے تھے... تیواری، ڈیوڈ اور ان کے ساتھی یوں وارد ہوئے تھے جیسے زمین سے نکل آئے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ کیونکر کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح مجھ تک آپہنچتے تھے... اور سلطانہ نے بتایا تھا کہ یہ کچھ میرے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اسٹیٹ کے وہ خاص قیدی جنہیں بہر صورت یہاں رکھنا مقصود ہوتا ہے، اس ”سحر“ کے اثر میں لائے جاتے ہیں اور پھر وہ بھی اس اسٹیٹ کو چھوڑ نہیں سکتے۔

میں اپنے ذہن کا کیا کرتا؟ میرا ذہن ایسی کسی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں گھوڑے پر سو سفر رہا۔ میرے لیے جو چیز سب سے زیادہ اطمینان کا باعث تھی، وہ یہ تھی کہ گھوڑے کے ساتھ خاکی گینوس کا ایک بڑا تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس میں کھانے پینے کا کافی سامان موجود تھا۔ خشک گوشت، بھنے ہوئے پنے، چاولوں کی بخیری، کوئی ایک درجن سیب اور صاف پانی۔ یہ سامان میرے لیے کئی دن تک کافی تھا۔ میں نے دلی چال چلتے گھوڑے پر ہی تھوڑی سی

پیٹ پوجا کی اور سفر جاری رکھا۔

نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں جہاں بھی چلا جاؤں گا، جتنی دور بھی نکل جاؤں گا... میرا تعاقب کرنے والے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اور قریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد یہی کچھ ہوا۔ ہانپتا ہوا گھوڑا، ایک ڈھلوان چڑھنے کے بعد بلندی پر آیا تو میری نگاہ اپنے عقب میں نشیب کی طرف اٹھ گئی۔ ایک ایک میں چونک گیا۔ مجھے دور نیچے اندازاً آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر درختوں کے درمیان متحرک چیزیں دکھائی دیں۔ یہ کچھ اور نہیں گھوڑے تھے۔ فاصلے سے ان کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا مگر وہ آٹھ دس سے کم ہرگز نہیں تھے۔ میں نے بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ لیا تھا، اب معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔ میری رگوں میں لہو کی گردش پھر بڑھ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ گنجان درختوں اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دو گھنٹے کا مسلسل سفر بھی مجھے میرے دشمنوں سے دور نہیں لے جا سکا تھا۔

ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ مجھ پر طاری ہو گئی۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ ان سارے حالات سے جھٹکارا پانے کے لیے خود کو گولی مار لوں۔ اپنی تھوڑی کے نیچے رائفل کی نال رکھ کر ٹریگر دبانا مجھے کوئی بہت زیادہ مشکل نظر نہیں آتا تھا لیکن تب ہی وہ ہمیشہ مسکراتا چہرہ پھر میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ غیر مرئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”جگر! مرنا تو ہے لیکن اس کی ذمہ داری خود پر نہیں لینی۔“

میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا، گھڑ سوار تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ سیدھے میرے رخ پر آرہے تھے۔ حالانکہ میں نے راستے میں کئی بار اپنا رخ تبدیل کیا تھا۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور گھوڑے سے اتر آیا۔ خوراک اور پانی والا تھیلا میں نے گھوڑے کی زین سے علیحدہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے گھوڑے کی پشت پر چند چھڑیاں رسید کیں۔ وہ گردن اٹھا کر ہنپتا ہوا اور دوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں جھاڑیوں سے اٹی ہوئی ایک دشوار ڈھلوان پر پاؤں بٹا بٹا کر اتر آیا اور بائیں رخ پر بھاگنا شروع کر دیا۔ اب رائفل کے علاوہ وزنی تھیلا بھی میرے پاس تھا۔ میں اپنی رفتار تیز نہیں رکھ سکتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر آگے جانے کے بعد راستہ مسدود نظر آیا۔ وہی آبی گزرگاہ میرا راستہ روکے کھڑی تھی جس کے ساتھ ساتھ میں نے پچھلے دو گھنٹے تک سفر کیا تھا۔ اب وہ ختم کھاتی ہوئی جاری تھی اور اس کے کنارے کافی بلند تھے۔ اگر

اب پھر میں اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتا تو گھر سواروں سے زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ میں اسے پار کر جاؤں۔ اسے پار کرنے کے لیے نہ جانے کب کسی نے ”لوگ پیر“ کے درخت کا کٹا ہوا تناس کے پاٹ کے اوپر پھینک دیا تھا۔ ندی اس کے نیچے قریباً پندرہ بیس فٹ کی گہرائی میں بہہ رہی تھی۔ میں تین چار فٹ قطر کے اس تنے کے اوپر سے گزر کر ہی ندی پار کر سکتا تھا۔

میرے ذہن میں وہی ڈیک نالے والا منظر پھر تازہ ہو گیا۔ دردی ایک لہری پورے جسم میں چل گئی۔ دو ڈھائی سال پہلے ایک ایسی ہی صورت حال میں تو عمران مجھ سے جدا ہوا تھا۔ کچھ ایسا ہی پانی تھا، کچھ ایسا ہی رستہ تھا اور عقب میں چلتے ہوئے کچھ ایسے ہی خطرات تھے۔ ”ہمت کرو تابی... تم یہ کر سکتے ہو۔ یہ زیادہ مشکل نہیں...“ عمران کی بے چین آواز تاریکی کا پسینہ چیر کر مجھ تک پہنچی تھی۔

میں نہیں کر سکتا تھا... لیکن آج میں کر سکتا تھا۔ آج دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ بے رحم خزاؤں کے تھپڑے سہم سہم کر اندر کے موسم بدل چکے تھے... اب کھونے کو کچھ باقی نہیں تھا اور جب کچھ نہ ہو تو ڈر بھی باقی نہیں رہتا۔ میں نے ایک ہاتھ میں رائفل، دوسرے میں بیک تھا۔ دونوں چیزوں کو دونوں کندھوں سے لٹکایا اور تنے پر پاؤں رکھ دیے۔ میرے پاؤں مستحکم تھے۔ جڑے بھنے ہوئے تھے اور نگاہیں دوسرے کنارے پر مرکوز تھیں۔ میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ گزر جاؤں گا۔ میں اگلے کنارے سے دس بارہ فٹ دور تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے ڈانواں ڈول کیا۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن توازن بگڑ چکا تھا۔ کوشش کے باوجود میں سنبھل نہیں پایا۔ میں پھسلا... دایاں کندھا بری طرح تنے سے ٹکرایا اور میں سر کے بل ندی کے پانی میں آیا... یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور بے خوفی کے عالم میں محسوس کیا۔ ڈر کے بجائے ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ مجھ پر طاری ہوئی۔ میں نے سرد پانی میں چند غوطے کھائے اور پھر سطح آب پر رہنے کے لیے ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ تیز بہاؤ مجھے اپنے ساتھ لیے چلا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنی رائفل کا خیال آیا وہ ابھی تک میرے کندھے پر تھی تاہم میرے ساتھ ہی پانی میں ڈبکیاں لے رہی تھی... گینوس کا بیک کندھے سے اتر کر ناپید ہو چکا تھا۔

میں بہت اچھا تیراک تو نہیں تھا تاہم ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو سطح آب پر رکھ سکتا تھا۔ اگلے دس منٹ تک میاے

سرد پانی نے مجھے تیزی سے اپنے ساتھ بہایا۔ اس پانی میں درختوں کی پتلی شاخیں، زرد پتے، جنگلی پھولوں کے آثار اور پتا نہیں کیا کچھ میرے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دس منٹ بعد پانی کی رفتار قدرے کم ہوئی۔ میں نے کوشش کی اور خود کو کنارے کی طرف لے آیا۔ یہاں کناروں کی بلندی بھی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں شرابور کپڑوں کے ساتھ باہر نکلا۔ عقب میں دیکھا، ایک بار پھر دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں خطرے سے باہر نہیں ہوں۔ میں نے ایک بار پھر تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ گا ہے بگا ہے دوڑنے لگتا تھا۔ میرا سامان کھو گیا تھا لیکن اس سے زیادہ نشوونما ناک بات یہ تھی کہ رائفل بری طرح بھیگ چکی تھی۔ اب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس طرح بھیگی ہوئی رائفل بد وقت ضرورت کام کر سکتی ہے یا نہیں۔ میں ٹریگر دبا کر ہی اسے ٹیسٹ کر سکتا تھا لیکن اگر گولی چل جاتی تو اس کی آواز بھی خطرناک تھی۔ میرا تعاقب کرنے والے تو پہلے ہی مقناطیس کی طرح میری طرف کھینچے چلے آتے تھے۔

میں اپنے زخم زخم جسم کو سیٹھ اسی طرح چلا رہا۔ ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں دو تین جانور دکھائی دیے۔ ان کی جسامت کیتے کی طرح تھی۔ اس معاملے میں میری شناخت کی قابلیت صفر تھی۔ وہ بھیڑیے ہو سکتے تھے، کومڑیا پھر جنگلی کتے جو اپنی جبلت میں بڑے خطرناک تصور کیے جاتے ہیں۔ بہر حال، انہوں نے مجھے نظر انداز کیا اور میں نے انہیں... میں تھوڑا آگے گیا تھا کہ جھاڑ جھکاڑ میں کوئی سیاہی مائل چیز نظر آئی... جیسے کوئی بڑا رینگھ یا سیاہ بھینسا چھپا ہوا مردھیان سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوئی ذی روح نہیں۔ یہ دراصل کسی کھوکھ کا دہانہ تھا۔ کچی زمین کے اندر ایک دراڑ کی سی شکل تھی جو نیچے سے پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اس دراڑ میں ٹھس گیا۔ خطرہ کہاں نہیں تھا؟ خطرہ یہاں بھی تھا۔ سائب، بچھو یا کوئی جانور۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا یہاں اور میری رائفل بھیگ چکی تھی۔ کہیں سنا تھا کہ کبھی کبھی انسان خوں خوار درندوں سے بڑھ کر خطرناک ہو جاتا ہے۔ آج یہ بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ درندہ تو صرف شدید بھوک میں ہی حملہ آور ہوتا ہے اور اس میں حکمت عملی کا بھی فقدان ہوتا ہے... لیکن یہ جان دار جس کا نام انسان ہے، جب درندگی پر اترتا ہے تو اس کے لیے سارے اوقات برابر ہو جاتے ہیں... اپنی خداداد صلاحیت سے وہ ایسی ایسی بھیاںک چالیں سوچتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

نکاحہ درست لگا۔ ریوا لور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل گرا۔

یہی وقت تھا جب دو تین سائے مجھ پر جھپٹے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں پرانی طرز کی تلواریں اور ایک کے ہاتھ میں لائچی تھی۔ وہ چٹکھاڑتے ہوئے مجھ پر آئے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ایک پر فائر کرنا چاہا لیکن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بری طرح بھیڑی ہوئی کیچڑ آلود رائل نے کام نہیں کیا۔ تلوار کا پہلا وار میں نے رائل پر ہی روکا۔ پھر رائل کو کسی لائچی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میں حملہ آوروں سے بچڑ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا، میں کیا کر رہا ہوں؟ کیوں کر رہا ہوں؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ بس میرے سینے میں آگ کی دیو قامت لہر تھی اور دماغ میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ لڑنے کے ساتھ ساتھ میں جنونی انداز میں دھاڑ رہا تھا۔ ”مار دو مجھے... جان سے مار دو۔ میرے کٹڑے کر دو۔“

اور جن کو میں یہ دعوت دے رہا تھا، وہ سخت بدحواس نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو سر پر شدید چوٹ کھانے کے بعد زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ سے تلوار نکل گئی تھی اور وہ چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، اس جگہ پر کہرام مچ گیا تھا۔ پھر بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک گرج دار آواز ابھری۔ ”ٹھہرو... یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ سلطانہ کا شوہر ہے۔“

میرے ارد گرد ایک دم سکوت سا ہو گیا۔ تلوار بردار اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اب آواز کے ماحذ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو تسلی دینے کے انداز میں ہلا رہا تھا اور میری طرف آ رہا تھا۔ ”رک جاؤ تاہش! یہ دوست ہیں۔“ اس نے پکار کر کہا۔

میں حیرت زدہ کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ اب بھی رائل پر تھے۔ میں نے اسے ہالی کی طرف سے بڑی مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ میں لڑنے مرنے کو بالکل تیار تھا۔

چوہان نے آگے بڑھ کر رائل میرے ہاتھ سے لے لی اور مجھے بھیج کر ایک طرف لے گیا۔ میرے شدید حملے سے زخمی ہونے والے دو افراد کو بھی دوسرے لوگوں نے سہارا دے کر اٹھالیا اور ایک طرف لے گئے۔ چوہان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور بولا۔ ”ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ تمہیں یہاں دیکھیں گے۔ یہ تو

مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ یہ ہم۔ ایک دروازہ اتنی گہرائی تک جائے گی۔ میں چلتا گیا اور وہ مجھے راستہ دیتی گئی۔ میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ذرا گہرائی میں بھی اتر رہا تھا۔ کہیں کہیں جالے لگے ہوئے تھے۔ جانوروں کی ٹینگنیاں اور گوبر وغیرہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ دروازے کی دیواریں پکی لیکن سخت مٹی کی تھیں۔ کافی آگے جا کر مجھے ایک جگہ تھوڑی سی راکھ اور کوئلے نظر آئے۔ یہاں آگ جلائی گئی تھی۔ اس واقعے کو کتنا عرصہ ہوا تھا، اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ فی الحال یہ دروازہ بالکل سنان نظر آ رہا تھا۔ کسی جگہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا لیکن کسی جگہ ہوا کی سی حرکت بھی محسوس ہوتی تھی۔ بھیگی ہوئی رائل میں دوونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ آگے جا کر دروازے دو شاخوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ میں دائیں شاخ میں داخل ہو گیا۔

”رک جاؤ تاہش تو گولی مار دوں گا۔“ ایک لاکڑی ہوئی آواز مجھے عقب سے سنائی دی۔

میں ایک بار پھر سکتہ زدہ رہ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں یہ ظاہر نہ تھا کہ کھائی نہیں دیا۔ ”بندوق پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ ایک بار پھر کراہت لہجے میں کہا گیا مگر اس بار آواز دوسری تھی۔ مطلب یہ تھا کہ یہاں ایک سے زیادہ افراد ہیں۔

”کون ہو تم؟“ میں نے رائل پھینکے بغیر کہا۔ ”سب کچھ بتا دیں گے۔ پہلے اپنی اس ماں کو پہچان لو۔“ پہلے شخص نے گرج کر حکم دیا۔

میرے دماغ میں چنگاریاں ہی چھوٹنے لگیں۔ یہ لوگ کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔

میں نے رائل نیچے پھینک دی لیکن کسی بھی کارروائی کے لیے تیار رہا۔ کرتے پا جائے اور ٹوپی والا ایک مقامی شخص میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوا لور تھا۔ اس نے ریوا لور کا رخ میری طرف رکھا اور رائل اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے عقب میں دو تین اور ہیولے سے دکھائی دے رہے تھے۔ جونہی اس نے رائل اٹھانی چاہی، میں نتائج سے بے پروا اس پر جا بڑا۔ میری ٹانگ بڑے زور سے اس کے چہرے پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر اس سرنگ نما دروازے کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی انگلی بے ساختہ ریوا لور کے ٹریگر پر دب گئی تھی۔ دھماکے کے ساتھ شعلہ نکلا اور ایک دیوار کی طرف چلا گیا۔ رائل کی نال میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ میں نے اسے لائچی کی طرح گھما کر ریوا لور بردار کے ہاتھ پر مارا۔

ایک کرشمہ ہے۔“
”یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ مجھے مارنے کی کوشش کی ہے۔“
”یہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر ان کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو سب سے زیادہ دکھ بھی ان لوگوں کو ہی ہوتا۔ یہ دشمن نہیں، دوست ہیں۔ تمہاری اور سلطانہ کی خاطر ہی یہاں اس جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ شاید تمہیں پتا نہیں، وہاں زرگاں میں اس رات کیا کچھ ہوا ہے۔“
”تم کس رات کی بات کر رہے ہو؟“
”جب سلطانہ کو جیل سے نکال کر جارج گورے کی رہائش گاہ پہنچایا گیا اور تم جارج کے دو ملازموں کو زخمی کر کے وہاں سے بھاگے۔“
میں سوالیہ نظروں سے چوہان کا چہرہ تک رہا تھا۔
وہ بولا۔ ”تمہیں پتا ہے، تم اب کس جگہ ہو؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ”تم ایک بار پھر مل پانی کے آس پاس پہنچ چکے ہو۔ اور یہ ایک بڑی اچھی پناہ گاہ ہے جہاں تم آگئے۔ یہ ایک زبردست اتفاق ہے۔ یہاں موجود لوگوں میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم از خود یہاں پہنچ جاؤ گے۔“
”تم اس رات کی بات کر رہے ہو... کیا ہوا تھا اس رات؟“
”میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے تم اپنا لباس درست کر لو۔ تمہیں مرہم بٹی کی ضرورت بھی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے تم نہالو۔“
میں ایک بار پھر شدید حیرت کی زد میں تھا۔ میں نے خود کو ایک جتنے کی طرح محسوس کیا جسے حالات کی ہوا اپنے ساتھ اڑائے لیے پھر رہی تھی۔
یہاں نہانے کا انتظام موجود تھا۔ میرے لیے ایک مقامی لباس بھی فراہم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر چوہان نے اپنے ہاتھ سے میرے مختلف زخموں اور خراشوں وغیرہ کی مرہم بٹی کی۔ اس دوران میں، میں دیکھتا رہا کہ میرے ارد گرد موجود لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی اور دوستی کی جھلک ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کم و بیش چالیس افراد تھے۔ ان میں عورت کوئی نہیں تھی۔ ایک خاص بات یہ بھی کہ یہ سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس آنکھیں اسلحے کے علاوہ تلواریں اور لٹھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ مجھے ان میں سے چند ایک کے چہرے اور جسم پر چوٹوں کے تازہ نشان بھی نظر آئے۔

یہ دراز یہاں آکر کئی سٹاروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ کئی جگہ گہری تاریکی تھی جہاں مشعلیں وغیرہ جل رہی تھیں۔ کئی حصوں میں ہلکا اجالا موجود تھا۔ ویسے بھی اب مجھے یہاں داخل ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری آنکھیں بتدریج نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ یہ جگہ زیر زمین ایک وسیع و عریض قدرتی غار کی طرح تھی۔ ایک تنہا گوشے میں چٹائی پھیٹی تھی اور دو موم بتیاں روشن تھیں۔ چوہان مجھے وہاں لے آیا۔ اس نے مجھے زبردستی تھوڑا سا پیٹر کھلایا۔ ساتھ میں خشک گوشت کے ٹکڑے اور بھنے ہوئے بھنے تھے۔ پانی پی کر قدرے میری جان میں جان آئی۔ میری نگاہوں میں وہ دو عدد لٹائیں کھونٹے لگیں جنہیں میں اپنے پیچھے آبی گزرگاہ کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ ناقابل یقین بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو میں نے مارا تھا اور اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔
چوہان نے مجھ سے پوچھا۔ ”جہاں تک میں جانتا ہوں جو راتفل تمہارے پاس ہے، وہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے استعمال میں ہوتی ہے۔ یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“
”میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس رات زرگاں میں کیا ہوا ہے؟“
”وہ کچھ جو بہت کم لوگوں نے سوچا تھا۔ دراصل جب عام لوگوں کے دلوں کے اندر لاوا پکڑا رہتا ہے تو پھر ایک روز اسے باہر تو نکلتا ہی ہوتا ہے۔ جبر، طاقت اور چال بازی سے ان جذبوں کو دبایا نہیں جاسکتا جو انسانوں کے اندر پلتے ہیں اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ پھلتے پھولتے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ حد ختم ہو جائے تو پانی جیسی نرم رقیق شے بھی بڑے بڑے مضبوط بند بھا کر لے جاتی ہے۔ زرگاں میں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ اس تازہ واقعے نے لوگوں کو اور زیادہ بدظن کر دیا ہے۔ جارج گورے نے جو کچھ کیا، بڑی رازداری سے کیا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ جارج گورے زرگاں کی جیل کا انچارج بھی ہے۔ وہ بڑی رازداری سے سلطانہ کو رات کے وقت جیل سے نکلوا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ لیکن یہ بات راز نہیں رہ سکی۔ جیل کا ایک ملازم مظفر جو یوں تو جارج کا وفادار ہے لیکن اس زیادتی کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بڑی مسجد کے امام صاحب کو جا کر سارا واقعہ بتا دیا۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پورا زرگاں سویا پڑا تھا لیکن یہ ایسی خبر تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان آبادی میں پھیل گئی۔ اگلے روز صبح منہ اندھیرے سیکڑوں لوگ جارج کے گھر کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ جوں

جوں دن چڑھتا گیا، یہ ہجوم بڑھتا گیا۔ لوگوں کے تیور دیکھ کر جارج نے بہت سے سگ گارڈز بلا لیے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی لوگوں نے جارج کے گھر پر ہلا بول دیا۔ گارڈز نے پہلے تو لاشی جارج اور ہوائی فائرنگ کے ذریعے لوگوں کو ڈرانا چاہا۔ جب بس نہیں چلا تو سیدھی فائرنگ شروع کر دی۔ وہاں بہت ہنگامہ ہوا مہرور... مم... میرا مطلب ہے تابش! کیا تمہیں اس کی کچھ خبر نہیں؟“ چوہان نے پوچھا۔
”نہیں... مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں اسی رات زرگاں سے نکل گیا تھا۔ میں نے یہ دو دن بالکل ویرانے میں گزارے ہیں۔“ میں نے کہا۔
چوہان نے بتایا۔ ”اس ہنگامے میں کم از کم آٹھ لوگوں کی جان گئی ہے۔ چھ بندے مظاہرہ کرنے والوں میں سے مرے ہیں۔ دو گارڈز بھی جان سے گئے ہیں۔ انہیں کلہاڑیوں اور چھریوں کے زخم لگے تھے۔ اسی دوران میں جارج اور اس کے دو قریبی ساتھی موقع دیکھ کر عقبی راستے سے گھنٹی سے نکل گئے۔ حکم جی تو زرگاں سے باہر ہے۔ اس کے قائم مقام نے گارڈز کی مزید نفری منگوائی اور بڑی مشکل سے اس ہنگامے پر کنٹرول کیا۔“
”سلطانہ کا کیا بنا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔
”لوگوں نے اسے اور تمہارے بچے بالو کو بھی گھنٹی سے نکال لیا۔“
”کہاں ہیں وہ؟“
چوہان نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔
”تمہارا کیا خیال ہے، اسے کہاں ہونا چاہیے؟“
”کیا... وہ یہیں پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔
چوہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”لیکن اس کی حالت ایسی نہیں کہ تم فوری طور پر اس سے مل سکو۔ اس نے ان سارے حالات کا بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ یہاں ایک بندے کے پاس افیون تھی۔ میں نے وہ اسے دی ہے تاکہ وہ کچھ دیر سکون سے رہ سکے۔“ چوہان کے چہرے پر دکھ کے تاثرات تھے۔
میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہی دل دوز منظر گھوم گیا جب میں بے بسی کی حالت میں جارج کے کمرے سے باہر آ رہا تھا اور سلطانہ دروازہ بند کر رہی تھی۔ یہ منظر جیسے میرے حافظے سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری سانس تیزی سے چلنے لگی اور رگ ہچکوں میں تناؤ محسوس ہوا۔
”کیا بات ہے؟“ چوہان نے میرا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔
اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کہیں دور سے

بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ بالو ہی تھا۔
”میں سلطانہ اور بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اٹل لہجے میں کہا۔
”لیکن اس سے سلطانہ اور ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔“
”اس نے جتنا ڈسٹرب ہونا تھا، ہو چکی ہے۔“ میں نے انتہائی رخ لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
”ٹھہرو... ٹھہرو... ایسے نہیں۔“ چوہان نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ ”پہلے مجھے سلطانہ کے پاس جا کر وہاں کی صورت حال دیکھنے دو۔“
وہ مجھے وہیں بٹھا کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ایک شخص دوستانہ انداز میں میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سلطانہ کا باپ اور بھائی زرگاں سے نکل نہیں سکے۔ اس بات کا سب کو بہت افسوس ہے۔ چند افراد ایک طرف چادریں بچھا کر نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کن آنکھوں سے میری طرف دیکھ بھی لیتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی تھی۔ لیکن اب پتا نہیں کیوں یہ ہمدردی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاری تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ہمدردی کے ساتھ ساتھ مجھ پر ترس بھی کھا رہے ہیں اور مجھے اب ترس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اب میں جتنے بھتے، دن یا گھنٹے زندہ رہوں، سراٹھا کر رہوں اور کوئی مجھے قابل رحم نہ سمجھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان چند دنوں کے اندر میری پوری کیمسٹری ہی بدل گئی ہے۔ ایک شخص دائیں طرف دیوار کے ساتھ بیٹھا کراہ رہا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا اور اب ایک پٹی میں بندھا ہوا گلے میں جھول رہا تھا۔ یقیناً یہ بھی اس خونی ہنگامے کا زخمی تھا جو تین دن پہلے جارج گورے کی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ ہمیش تھا۔ وہی جواں سیال بھکشو جس سے پکڑا میں پہلے ہی روز میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ محبت سے پیش آیا تھا۔ اس نے بھنے ہوئے چادلوں سے میری تواضع کی تھی... آج وہ یہاں اس مسلمان جتنے کے ساتھ موجود تھا جس نے حکم جی اور جارج وغیرہ کے خلاف بغاوت کا علم اٹھایا تھا اور اب یہاں اس زیر زمین پناہ گاہ میں موجود تھا۔
میری آنکھیں ہمیش کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ہمیش کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی... میں اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ”تم یہاں کیسے؟“ میں نے پوچھا۔
وہ بولا۔ ”میں کیوں ناہیں ہو سکتا؟“
”میرا مطلب ہے تم تو بودھی بھکشو ہو۔“
”بھکشو بھی تھانسان ہی ہوت ہے۔ غلام زیادتی دیکھ کر

اس کا سینہ بھی جلتا ہے اور پھر جس طرح کے ظلم حکم جی اور جارج دیگرہ کر رہے ہیں، یہ تو پتھر کو بھی رونے پر مجبور کر دیوت ہیں۔“ نو جوان بھکشو کی شفاف آنکھوں میں گہرا دکھ پھیل گیا۔

”تو تم بھی جارج کے گھر گھسنے والوں میں شامل تھے؟“
 ”ہاں... اور میرے دو اور دوست بھی تھے۔ جب ہمیں جانکاری ہوئی کہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کورات کے وقت جیل سے نکال کر جارج گورا کے گھر پہنچایا گیا ہے اور اب بہت سے لوگ جارج کے گھر کے سامنے جمع ہیں تو میں بھی نہ رہ سکا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں لوگ کے اندر آگ بھڑکتی تھی اور وہ غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اچانک جارج کے غنڈوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا، وہ ڈاکٹر چوہان نے ہمیں بتایا ہی ہووے گا۔“

میں خاموش رہا۔ ہمیشہ بھی خاموشی سے اپنے ٹوٹے بازو کو سہلاتا رہا۔ آخر اس نے ہولے سے کہا۔ ”تم وہاں سے کب نکلے تھے؟“

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”میرا وچار ہے کہ وہ رات دو ڈھائی بجے کا وقت ہووے گا۔ اس وقت ہم نے جارج کی کوٹھی کی طرف سے خطرے کے سائرن سنے تھے۔ پر اس وقت ہم کو بالکل پتا نہیں تھا کہ یہ سائرن تمہارے کارن بجائے جا رہے ہیں۔ یہ تو اگلے روز پتا چلا کہ تم بھی جیل کے بجائے جارج کی کوٹھی پر ہی تھے اور رات کو جارج کے دو بندے زخمی کر کے وہاں سے بھاگ نکلے ہو۔ جس گھوڑا گاڑی پر تم بھاگے تھے، وہ آگے جنگل سے ٹٹی تھی۔ بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ ایک گھوڑے کی ریڑھ ٹوٹی تھی اور وہ مر گیا تھا۔“

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس رات کے تہلکہ خیز مناظر ذہن میں تازہ ہونے لگے۔ ہمیشہ میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ تعریف کا مدھم سا عکس بھی تھا۔ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہا ہو۔ تم نے دلیری دکھائی ہے۔ تمہیں ایسے ہی کرنا چاہیے تھا بلکہ بہت پہلے سے ایسے کرنا چاہیے تھا۔

اسی دوران میں چوہان واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں اور چوہان پھر کونے میں پیچھے چٹائی پر جا بیٹھے۔ چوہان نے کہا۔ ”تاہم! ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ذہنی طور پر بھی بری طرح اپ سیٹ ہے۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ کم از کم کل تک۔“

”ہم یہاں کب تک رہیں گے؟“ میں نے چوہان سے پوچھا۔

”ابھی کچھ پتا نہیں۔ ویسے مل پانی میں چھوٹے سرکار کو ساری بات معلوم ہو چکی ہے۔ وہ جلد ہی کوئی فیصلہ لیں گے۔ اگر انہوں نے اس بار تمہیں اور سلطانہ کو پناہ دے دی تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر تمہیں پناہ ملی تو ان چالیس پینتالیس لوگوں کو بھی مل جائے گی جو تمہارے ساتھ یہاں موجود ہیں۔“

”اور اگر پناہ نہ ملی تو؟“
 ”پھر کافی مشکل ہوگی۔ یہ لوگ اس پناہ گاہ میں بہت دیر تک چھپے نہیں رہ سکیں گے۔ پھر ان سب کو...“ وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

بہر طور اس کا ادھورا فقرہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پھر ان سب کو مرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان سب میں سلطانہ اور میں بھی شامل تھے۔
 ”تمہارا کیا خیال ہے... چھوٹے سرکار کب تک فیصلہ کریں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس بارے میں دشواری سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چھوٹے سرکار کے لیے یہ بہت کھن فیصلہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کی پوری طرح ٹھن جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ جھگڑا سنگین شکل اختیار کر جائے۔“
 ”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ چھوٹے سرکار ہم لوگوں کی خیر خواہی میں اس حد تک چلے جائیں گے؟“

چوہان نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرائیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”بے شک دونوں بھائی ہیں اور کئی معاملوں میں ان کا مفاد ایک ہے۔ مثلاً دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اس راجواڑے میں باہر سے کوئی مداخلت نہ ہو۔ راجواڑے میں ایسے لوگوں کو سرنہ اٹھانے دیا جائے جو کل کو راج پاٹ کے لیے خطرہ بن جائیں یا اس قسم کی دوسری باتیں۔ مگر یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے سرکار میں حکم جی سے کہیں زیادہ رواداری اور انصاف پسندی ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی حکم جی کا جبر پسند نہیں کرتے اور جو لوگ اس جبر، نا انصافی کے ہاتھوں تک ہو کر قتل پانی کا رخ کرتے ہیں، انہیں پناہ دیتے ہیں۔ اب تمہارے اور سلطانہ کے معاملے میں بھی جو کچھ زرگاں میں ہوا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ سلطانہ کا وہ خدشہ بالکل درست ثابت ہوا ہے جو اس نے مقدمے کی کارروائی میں چھوٹے سرکار کے سامنے بیان کیا تھا۔ اس نے

کہا تھا کہ اگر اسے موہن کمار وغیرہ کے حوالے کر دیا گیا تو زرگاں میں اس کی آبرو اور جان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گی اور یہی کچھ ہوا ہے۔ اب اس میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بیسیوں لوگ گواہ ہیں۔ سلطانہ اور اس کا بچہ جارج کی رہائش گاہ سے برآمد ہوئے ہیں۔“

گہرے تاسف کے ساتھ چوہان خاموش ہو گیا۔
 جلد ہی شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ اس زیر زمین پناہ گاہ کے اندر گہری تاریکی پھیل گئی۔ اس تاریکی میں کہیں کہیں مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی تھی۔ جب دھوئیں سے گھٹن محسوس ہونے لگی تو مشعلیں بجھا دی گئیں اور لالٹینیں جلتی رہنے دی گئیں۔ ایک طرف سے شور اٹھا۔ پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے کسی تاریک گوشے میں چھپے ہوئے ایک خطرناک جنگلی بلی کو مارا ہے۔ رات کو بھی اس پناہ گاہ میں موجود لوگوں نے خشک راشن ہی استعمال کیا۔ چوہان نے میری کچڑا آلود رائفل کو ایک انورخاں نامی شخص کے حوالے کیا تھا۔ اس نے رائفل کے حصے بخرے کر کے اسے صاف کیا، پھر جوڑا اور تیل وغیرہ لگا کر چمکا دیا۔ گولیاں بھی بھگی تھیں تاہم انورخاں کا خیال تھا کہ یہ قابل استعمال ہیں۔

رات کو لوگ، کھوہ کے مختلف حصوں میں چادر میں وغیرہ بچھا کر سو گئے۔ کھوہ کے دہانے کی طرف انورخاں نے دو تین افراد کو مقرر کر دیا تھا۔ میں اور چوہان ساتھ ساتھ ہی لیٹے۔ چوہان کچھ دیر بعد سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ سینے میں مسلسل آگ سی روشن تھی۔ آدھی رات کے وقت مجھے پھر بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کراہا اور کچھ بولا۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ یہ سلطانہ کے سوا کسی کی آواز ہو سکتی تھی۔

میں آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نیم تاریکی میں احتیاط سے پاؤں رکھتا اور سوئے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا میں کھوہ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں سلطانہ اور اس کا بچہ موجود تھے۔ یہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں چٹائی پر ایک لڑکی نظر آئی۔ یہ سلطانہ تھی مگر یہ وہ سلطانہ تو نہیں تھی جسے چند روز پہلے میں نے دیکھا تھا... وہ دنوں میں ہی مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا رنگ زرد تر نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کے قدہ ہاری انار اس پر مردہ زردی میں دفن ہو چکے تھے۔ وہ بال کھولے ایک گھڑی پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور بالواس کے پہلو میں کسمار ہا تھا۔

میری طرف دیکھنے کے بعد بھی اس نے جیسے مجھے پہچانا

نہیں۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں عجب سے تاثرات ابھرے۔ کچھ دیر کے لیے تو ایسے لگا کہ وہ ایک دم کروٹ بدل کر اپنا چہرہ چھپالے گی یا پھر ویسے ہی اٹھ کر کسی طرف بھاگ جائے گی... مگر بتدریج اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے۔ یہ آنسو موٹی موٹی بوندوں کی صورت اس کے زرد رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوزھنی اپنے سر پر پھیلائی اور کسی شرمسار مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ میرا دل جیسے سینے میں کٹ کر سوکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ مجرم کون تھا؟ وہ تو نہیں تھی۔ اگر کوئی تھا تو پھر شاید میں تھا... اور میرے حالات تھے...

نہ جانے دل کی کیا کیفیت تھی کہ میں اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ روتا ہوا بالواس چپ ہو گیا تھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں سے ہر حیرت انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آنسو ابھی تک اس کی معصوم آنکھوں میں موجود تھے لیکن وہ انہیں یکسر بھول چکا تھا۔ میں نے اس کا گال سہلایا۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ اس درد و کرب سے یکسر بے خبر تھا جو اس کی ماں کو اپنے گھرے میں لیے ہوئے تھے۔

”مہرو! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“ سلطانہ کرب ناک انداز میں منمنائی اور اپنا سراپے گھٹنوں پر جھکا لیا۔
 ”کیوں چھوڑ دوں؟“ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اسے جیسے برقی رو چھو گئی۔ اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے مت چھو! مہرو! میں تمہارے خاں نہیں ہوں۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ خدا کے لیے۔“

”تمہارا کوئی قصور نہیں ہے سلطانہ! تم خود کو گناہ گار کیوں سمجھ رہی ہو؟“ میں نے بڑے کرب سے کہا۔

وہ رونے لگی۔ اس کی سسکیاں جلد ہی ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ ایک دم پٹٹی اور اس نے اپنا سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ ”مجھے معاف کر دینا مہرو! میں بے بس ہو گئی تھی۔ وہ تمہیں مار دیتا، وہ بالو کو مار دیتا اور تم دونوں آج دنیا میں ناہیں رہتے تو میرے چند رہنے کا کیا فائدہ تھا؟“

”سلطانہ... سلطانہ!“ میں نے اسے اپنے پاؤں سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ چپٹی رہی۔

”تم میرے سر تاج ہو مہرو۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت ناہیں کہ اپنی نحوست کو تمہاری جندگی کا روگ بنا کر رکھوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مہرو... کہیں چلے جاؤ... اور ہو سیکے تو بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کے بال میرے

آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ جو سب سے پریشان کن خیال بار بار میرے ذہن سے نکر رہا تھا، وہ یہی تھا کہ آخر میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جہاں جاتا ہوں، میرا پیچھا کرنے والے وہاں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ اگر وہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے تو پھر یہاں بھی پہنچ سکتے تھے۔ میں نے اب تک پیش آنے والے سارے واقعات سے چوہان کو آگاہ کرنا بہتر سمجھا۔ میں نے جب چوہان کو بتایا کہ حکم جی کا خاص ہرکارہ اپنے ایک ساتھی سمیت میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے تو چوہان ششدر رہ گیا۔

اس نے مجھ سے تفصیل پوچھی۔ میں نے اسے بتایا۔ ”وہ میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں جنگل میں بہت آگے نکل گیا تھا مگر وہ پھر بھی مجھے تک پہنچ گئے۔ وہ گھوڑوں پر آئے تھے۔ ان کے ساتھ وہ غیر ملکی ڈیوڈ بھی تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑنا چاہا تو میں نے گولی چلا دی۔ ڈیوڈ اور اس کا ایک ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیواری اور ایک دوسرا بندہ وہیں مارے گئے۔ میں ان کی لاشیں ندی کے کنارے چھوڑ آیا ہوں۔“

”یہ بات اب بہت آگے تک جائے گی۔“ چوہان نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ حکم جی کے لیے بڑے خاص لوگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت سی تبدیلیوں کا وقت ہے۔ یہاں کافی ہلچل مچنے والی ہے۔“ چوہان کی آنکھوں میں بدستور حیرت ناچ رہی تھی۔

اچانک ایک طرف سے پھر شور ابھرا۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید پھر کہیں سے کوئی جانور نکل آیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ صورت حال مختلف تھی۔ دو افراد آپس میں لڑ پڑے تھے۔ وہ جھگڑ رہے تھے۔ دوسرے افراد انہیں چھڑانے میں لگے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ تک یہ ہنگامہ رہا پھر دونوں متصادم افراد کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نوجوان کا نام فیروز اور دوسرے کا نام اکبر ہے۔ اکبر درمیانی عمر کا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھسکا ہوا تھا۔ وہ اب بھی بلند آواز سے بول رہا تھا۔ ”میں پھر کہتا ہوں، یہ فیروز اہم کو نقصان پہنچا دے گا۔ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔ اس کا دل اب بھی ان لوگوں کے ساتھ دھڑکتا ہے جن کا یہ نمک کھاوت ہے۔“

”بکواس بند کرو۔“ انور خاں زور سے دھاڑا۔ ”ثبوت کے بغیر کوئی بھی بات نہ کرے۔ جو بھی ثبوت کے بغیر بات کرے گا، میں اس کا گریبان پکڑوں گا۔“

اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر زیادہ بولنے والے شخص اکبر کو

اسے پھر دھکا دیا۔ اس مرتبہ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا کر آیا۔ وہ دوبارہ میرے سامنے آتا تو میں اس پر رائفل تان لیتا مگر اس سے پہلے کہ نوبت یہاں تک پہنچتی، کسی نے عقب سے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ ”نہیں تابش! ایسے نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک نہیں۔“

یہ چوہان کی آواز تھی۔ پتا نہیں وہ کب میرے پیچھے آن موجود ہوا تھا۔ میں نے زور مارا۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔“ میں چنگھاڑا۔ میری آواز فرط طیش سے جڑی ہوئی تھی۔ میرا اشارہ جارج کی طرف تھا۔

اسی دوران میں دو اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ ان میں سے ایک انور خاں تھا۔

”میں قتل کر دوں گا یا قتل ہو جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مرنے دو۔“ میں دھاڑ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ وہی آنسو جو بے بسی کی انتہا کو چھونے کے بعد جنگ آمد کی کیفیت میں آنکھوں میں آتے ہیں۔

کچھ دیر بعد میرے جہان میں کچھ کی آئی تو چوہان نے نرمی کے ساتھ رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور انور خاں کو واپس کر دی۔ وہ لوگ مجھے دلاسا دیتے ہوئے کھوہ کے اندرونی حصے میں واپس لے آئے۔

چوہان نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ اس موقع پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ ہماری کسی بھی جلد بازی سے حکم جی اور جارج وغیرہ کو فائدہ پہنچے گا اور وہ پہلے ہی کچھ کم طاقتور نہیں ہیں۔ اس نے مجھے انور خاں کے بارے میں بھی بتایا۔ اس نے کہا۔ ”انور خاں بڑا ہاکمال آدمی ہے۔ علاقے کے مسلمان باشندے اسے ایک ہیرو کی طرح مانتے ہیں۔ حکم جی وغیرہ کو بھی انور خاں کے ساتھ ہنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ انور خاں کسی بھی وقت مسلمان باشندوں کو بھڑکا بھی سکتا ہے اور ان کے جذبات کو ٹھنڈا بھی کر سکتا ہے۔ چند دن پہلے تک انور خاں کے تعلقات حکم جی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ٹھیک ہی تھے مگر اب سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ انور خاں نے سلطانہ کو جارج کے قتل سے چھڑانے میں باقاعدہ کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ لوگوں کو جارج کے گھر کے سامنے جمع ہونے اور پھر ہلا بولنے کی ہمت انور خاں کی وجہ سے ہی ہو پائی تھی۔“

چوہان نے مجھے انور خاں کے بارے میں کئی ایک باتیں بتائیں۔ میں سن تو رہا تھا مگر میرا دماغ کئی خیالات کی

اپنا شوہر سمجھا اور ایک جاں نثار شریک حیات کی حیثیت سے میری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئی۔ ایک مرتبہ اس نے میری حفاظت کی خاطر اپنے گھرانے کی سب سے قیمتی متاع، راجا پر تاپ بہادر کی بخشی ہوئی مہر داؤ پر لگائی اور اب اس نے میری زندگی کے لیے اپنا آپ ہی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کے بدلے میں نے کیا کیا؟

یہ سوال دہی ہوئی آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا۔ دماغ میں چلتی ہوئی آندھی مزید تند و تیز ہو گئی۔ عمران نے ہی تو کہا تھا ایک بار... جب مرنے کا ارادہ کر لو تو پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔ پیچھے دیکھنے سے زندگی کا کالا جادو چل جاتا ہے... ڈاکٹر چوہان، ہمیش اور انور خاں وغیرہ سب اپنی اپنی جگہوں پر سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک نظر ان سب پر ڈالی۔ پھر انور خاں کے پاس سے اس کی رائفل اٹھائی... اور ایک عجیب کیفیت کے زیر اثر وہاں سے چل پڑا۔ میرا رخ اس طویل کھوہ کے دہانے کی طرف تھا۔

میں کیا کرنا چاہتا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ فی الوقت بس ایک ہی خواہش تھی۔ سرخ و سپید چہرے والا جارج میرے سامنے ہو۔ میں رائفل اپنے اپنے اور اس کے درمیان پھینک دوں پھر چلا کر کہوں... ”چل کتے آ... تو مجھے مار دے یا میں تجھے مار دوں۔“ ایسی درندگی کے ساتھ اس پر جھپٹوں کے بس چند سیکنڈ میں میری یا اس کی موت کا فیصلہ ہو جائے۔

جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، کھوہ تاریک تر ہوتی گئی۔ مجھے ٹول ٹول کر آگے بڑھنا پڑا۔ بالآخر میں دہانے تک پہنچ گیا۔ یہاں تاریکی میں دو ہیو لے نظر آئے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہیں انور خاں نے پہرے پر مقرر کیا تھا۔

میں پاس پہنچا تو ان میں سے ایک بولا۔ ”کون؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکی۔ ”کیا بات ہے۔ تم کہاں جاؤ ہو؟“ ایک شخص نے ٹھٹھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے کوئی کام ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھنا چاہا۔ اس شخص نے میرا راستہ روکا۔ میں نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔

”دیکھو! تم ایسے نہیں جا سکتے ہو۔“ اس نے کہا اور دوبارہ میرے راستے میں آ گیا۔ اس مرتبہ دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔

”بکواس بند کرو۔“ میں نے وحشت کے عالم میں

پاؤں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کچھ فاصلے پر سوئے ہوئے دو تین افراد اٹھ بیٹھے اور تعجب سے دیکھنے لگے۔ میں نے پھونک مار کر لاشیں بچھا دی۔ کھوہ کے اس حصے میں تاریکی پھیل گئی۔

میں نے سلطانہ کے بالوں کو سہلاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ”تمہارا کوئی قصور نہیں سلطانہ... تم بالکل پاک صاف ہو۔ اسی طرح ہو جس طرح پہلے تھیں۔ تم خود کو...“

”ناہیں ناہیں مہر۔“ سلطانہ نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ”تم ناہیں جانتے، عورت کی عبت آبرو کا مالہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ میرے منہ پر جو کالک ملی گئی ہے، وہ اب مجھے کبھی چین سے ناہیں رہنے دے گی۔“ وہ رورہی تھی اور مسلسل میرے پاؤں سے چٹختی ہوئی تھی۔

اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ تم ناہیں جانتے عورت کی عبت آبرو کا مالہ کتنا نازک ہوتا ہے۔

وہ غلط کہہ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ میں نے اس نزاکت اور اس نزاکت کی بے مہر سنگینی کو بھگتا ہوا تھا۔ ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ حالانکہ غنڈوں کے چنگل سے نکل کر بغیریت گھر آگئی تھی لیکن ایک رات گھر سے باہر رہنے کی یاداش میں اس کے ساتھ اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ درد کا ناقابل فراموش ماجرا تھا۔ اور سلطانہ؟ سلطانہ تو ”بغیریت“ بھی واپس نہیں آ سکی تھی۔ ہر جگہ اندوہ کی وہی کہانی تھی۔ شکاریوں کے وہی جال اور شکار ہونے والوں کی وہی بے چارگیاں۔ آسمانی کتابوں کے مطابق عورت نے غلطی کی۔ اس نے آدم کو بہکایا اور جنت سے نکلوا یا۔ شاید اس غلطی کی سزا ہر بنت حوا آج تک بھگت رہی ہے۔

میں نے بمشکل سلطانہ کو اپنے پاؤں سے جدا کیا اور دیوار کے سہارے بٹھایا۔ تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔

تاریکی کی وجہ سے بالوں نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا تھا۔ سلطانہ اس سے قطعی بے پروا نظر آرہی تھی۔ وہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے بھی کتراتے تھی۔ میں ان دونوں کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ دماغ میں آندھی چل رہی تھی۔ ایسی بے کار زندگی کا کیا فائدہ تھا؟ اسے ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے پچھلے دو برس کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا لیکن لوگ جو کچھ بتا رہے تھے، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ جب میں ایک بار اس کا شوہر بن گیا تو پھر اس نے مجھے واقعی

Scanned and Uploaded By Nadeem

چپ کرادیا۔ دونوں طرف سے لوگ بول رہے تھے۔ انور خاں پانچ چھ افراد کو لے کر ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر تک وہاں میٹنگ ہوئی رہی۔ پھر لگا کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد میں دیکھ رہا تھا کہ فیروز اور اکبر نامی دونوں افراد آپس میں گٹھ مل رہے ہیں۔ انہیں گلے ملانے والا انور خاں ہی تھا۔

”یہ کیا معاملہ تھا؟“ میں نے چوہان سے پوچھا۔
”بس غلط فہمی تھی جس کی وجہ سے جھگڑا ہو گیا لیکن اس جھگڑے کی وجہ سے ایک اہم انکشاف بھی ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“
چوہان نے سستنی خیز لہجے میں بتایا۔ ”دراصل فیروز نام کا یہ لڑکا جس سے اکبر علی نے جھگڑا کیا ہے، حکم جی کے ملازموں میں سے ہے۔ فیروز کی والدہ ہندو تھی مگر شادی کے وقت مسلمان ہو گئی۔ پر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پھر بھی ہندو ہی رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ فیروز سے بھی عناد رکھتے ہیں جبکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اب بھی اسی بات پر جھگڑا ہوا ہے۔ اکبر نے فیروز پر الزام لگایا ہے کہ وہ جاسوسی کے لیے ان کے ساتھ موجود ہے۔ ورنہ وہ اب بھی حکم جی کے گھر میں اس کے پودوں کو پانی دے رہا ہوتا یا اس کی گاڑیاں صاف کر رہا ہوتا۔ جواب میں فیروز نے جو کہہا ہے، اس نے سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ فیروز نے کہا ہے کہ وہ اس بندے کی موت کی وجہ سے حکم جی کا باغی ہوا ہے جو کچھ دن پہلے سلطانہ کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔“

”تم ہارون کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
چوہان نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ”فیروز نے انکشاف کیا ہے کہ ہارون اس وجہ سے نہیں مرا تھا کہ اسے سلطانہ نے کھانڈی ماری اور پھر کھوہ میں اسے باندھ کر تل پانی چلی گئی۔ اس کی موت حکم جی کے اپنے بندوں کی وجہ سے ہوئی۔ اسے موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے مارا۔ اور اس وجہ سے مارا تا کہ ہارون کی موت کو سلطانہ کے سر تھوپ کر اسے تل پانی سے واپس لایا جاسکے۔“

میں سنائے میں رہ گیا۔ واقعی یہ سنسنی خیز انکشاف تھا۔ میں خود بھی کئی دن تک الجھن میں رہا تھا۔ بے شک سلطانہ کی کھانڈی سے ہارون کے سر کے پچھلے حصے پر گہرا زخم آیا تھا لیکن یہ ایسا زخم نہیں تھا کہ اس کی فوری موت کا باعث بن جاتا۔ یقیناً یہ سازش ہی تھی۔ بندھے ہوئے ہارون کو کھوہ کے اندر موہن کمار نے مارا تھا پھر اس کی لاش لے کر دہائی دیتا ہوا تل پانی جا پہنچا تھا۔ اس کی دہائی کارگر رہی تھی اور چھوٹے

سرکار نے مجھے اور سلطانہ کو پناہ دینے کے بجائے موہن کمار اور گرومودان وغیرہ کے سپرد کر دیا تھا۔

چوہان نے مدھم لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اصل میں یہ نو جوان فیروز اور ہارون ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ فیروز کو معلوم تھا کہ ہارون کی موت حقیقت میں کس طرح ہوئی ہے۔ وہ اپنے دل میں غم چھپائے پھر رہا تھا۔ اس دوران میں یہ دوسرا واقعہ ہو گیا۔ پتا چلا کہ خارج نے سلطانہ کو جیل سے نکال کر اپنے گھر پہنچایا ہے۔ دیگر لوگوں کی طرح فیروز بھی اپنے غم و غصے کو دبا نہیں سکا۔“

”یہ تو بالکل نئی صورت حال سامنے آئی ہے۔“ میں نے کہا۔
”ہاں اور اس نئی صورت حال میں ہمارا کافی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اب جب یہ ساری بات چھوٹے سرکار کے سامنے آئے گی تو مجھے پوری آشا ہے کہ ان کا رویہ بہت نرم ہو جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ موہن کمار وغیرہ کی یہ سازش بڑے اچھے وقت پر سامنے آئی ہے۔“

کچھ ہی دیر بعد انور خاں اپنے ساتھ فیروز نامی اس لڑکے کو لے آیا۔ اس کی عمر بائیس سٹیس سال تھی۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ ابھی تک یہاں ہونے والے جھگڑے کے اثرات سے ٹکلا نہیں تھا۔ انور خاں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بہت دلیری والا کام کیا ہے۔ اکبر علی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ تمہارا قد ہم سب سے اونچا ہو گیا ہے۔“

چوہان نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں فیروز کہ تم کل میرے ساتھ چھوٹے سرکار کے پاس چلو۔ تمہاری گواہی ہمارے لیے بڑی فائدے مند ثابت ہوگی۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ اس بار چھوٹے سرکار کا فیصلہ تم لوگوں کے حق میں ہوگا۔“

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ دھیمی نہیں ہوئی۔ وہ انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو ضرور رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں شاید کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ غالباً اس کو ہندو ماں کا بیٹا ہونے کا جو طعنہ دیا گیا تھا، وہ اسے آگ بگولا کیے ہوئے تھا۔ اور وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

اگلے سترہ اٹھارہ گھنٹے بھی کھوہ کے اندر ہی گزرے۔ کھوہ میں میرے اور سلطانہ سمیت قریباً پینتالیس افراد موجود تھے۔ انور خاں ان کا لیڈر تھا۔ ڈاکٹر چوہان ایک خیر خواہ اور مددگار کی حیثیت سے یہاں موجود تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ

کسی طرح ان پینتالیس لوگوں کو تل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پناہ مل جائے۔ اس سلسلے میں گفتگو اور پیغام رسانی کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی تک چوہان اور انور خاں وغیرہ خود اس کھوہ سے باہر نہیں نکلے تھے۔ یقینی بات تھی کہ کھوہ سے باہر سب کے لیے خطرات موجود ہیں۔ سلطانہ بدستور نیم غنود کی کیفیت میں تھی۔ چوہان اسے محفوظ مقدار میں افیون دے رہا تھا تاکہ وہ زیادہ دیر سوئی رہے اور اس کے ذہن کو نارمل ہونے کے لیے وقت ملے۔

آدھی رات کو جب سارے سوئے ہوئے تھے، ایک سایہ سا مجھ پر جھکا اور میرے شانے کو ہولے سے ہلایا۔ میں غنود کی میں تھا، جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے پہچان لیا۔ وہ کل اکبر نامی شخص کے ساتھ جھگڑنے والا فیروز ہی تھا۔ اس نے دوستانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں چند لمحوں تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے کھوہ کی دو تین تھک و تاریک شاخوں سے گزارنے کے بعد ایک حجرہ نما جگہ پر لے آیا۔ اس قدرتی حجرے میں ایک چھوٹی سی میلی چٹیلی لائٹس روشن تھی۔ یقیناً یہ لائٹیں اور اس طرح کا دیگر سامان چوہان اور اس کے ساتھی ہی یہاں لے کر آئے تھے ورنہ باقی لوگ تو افراتفری میں زرگاں سے بھاگے تھے۔ اس حجرہ نما جگہ پر پہلے سے دو نو جوان موجود تھے۔ ان کی عمریں بائیس چوبیس سال کے قریب رہی ہوں گی۔ ان دونوں کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ ان کا لباس اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصے کی سرفی نظر آتی تھی۔

انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”میرا نام اسحاق ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔
”اور میرا نام ماجد ہے۔ میں فیروز کا ماموں زاد بھی ہوں۔“ دوسرے نے بھی دھیمے لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔
”اور مجھے تو تم جانتے ہی ہو۔ میں فیروز ہوں۔ حکم جی کے غنڈوں کے ہاتھوں بے موت مارے جانے والے ہارون کا دوست۔“ فیروز بولا۔

”تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”آہستہ بولو۔“ فیروز نے سرگوشی کی۔ ”ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ہونے والی بات چیت کسی کے کانوں تک پہنچے۔“ اسحاق بولا۔ ”کل رات تمہارا جوش جذبہ دیکھا۔ تمہیں چوہان صاحب اور انور بھائی وغیرہ نے زور مار کر روک لیا

ورنہ تم نے یہاں سے نکل جاتا تھا۔ لگتا ہے کہ تم بھی اسی طرح سوچ رہے ہو جس طرح ہم سوچ رہے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ حد گزر چکی ہے۔ ہم تینوں نے آج رات ایک فیصلہ کیا ہے اور ہم چاہت ہیں کہ تم بھی اس فیصلے میں شامل ہو جاؤ۔“

”لیکن یہ تمہاری اپنی مرضی کی بات ہے، کوئی زور زبردستی ناہیں ہے۔“ فیروز بولا۔

”تم کس فیصلے کی بات کر رہے ہو؟“ اسحاق نے میری آنکھوں میں دیکھا اور ڈرامائی سرگوشی کی۔ ”ہم جارج گوراکوئل کر دیں گے۔“

میری رگوں میں ابوا چھل گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے فیروز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چنگاریاں تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، اب صبر کی حد گزر چکی ہے۔ یہ سفید بھیڑیا ہماری عورتوں کو کھادت ہے۔ ان کے جسم نوچت ہے۔ اس نے ہر طرف جال پھیلا رکھے ہیں۔ کہیں زور زبردستی کا جال، کہیں پیار محبت کا جال۔ اس کے پاس سو حیلے بہانے ہیں اور یہ اپنے شکار کو چھوڑنا نہیں ہے۔ اب اس بد نصیب سلطانہ کو ہی دیکھو۔ وہ کوئی ایسی خوب صورت ناہیں۔ ایک بچے کی ماں بھی ہے لیکن اس سفید سور نے اس کو بھی معاف ناہیں کیا۔ دو تین سال سے اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا اور کوشش میں لگا ہوا تھا۔ آخر کامیاب ہوا۔ اب ہم اس کی کامیابی کو آخری ناکامی میں بدل دیں گے۔ اس کے ناپاک بستر کے اوپر ہی اس کے ٹکڑے کر دیں گے۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے فیروز کے لہجے میں عجیب سی گرج آگئی۔ پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔

”ہاں... ہم جارج کو مار دیں گے یا خود مر جائیں گے۔“ ماجد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

فیروز بولا۔ ”ہم تینوں کل رات اس عہد کے ساتھ یہاں سے نکلیں گے کہ جارج گورے کو مار کر واپس آئیں گے یا ابھی واپس ناہیں آئیں گے۔“ اس نے کچھ لمحوں وقف کیا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم اس کام میں ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہتے ہو؟“

بے بسی کا منظر ایک بار پھر نگاہوں میں چکا۔ بڑی آن بان والی سلطانہ لا چاری کی تصویر تھی۔ وہ مجھے جارج کے بیڈ روم سے باہر نکال کر دروازہ بند کر رہی تھی۔

رائفیل پر میری گرفت مضبوط تر ہو گئی۔ سینے میں آگ کی دیو قامت لہر پھر حرکت میں آنے لگی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس سیکورٹی کا کیا کرو گے جس نے جارج

کے گھر کو گھیرا ہوا ہے؟ اب تو یہ سیکورٹی اور بھی سخت ہوگی۔“
”مہروز بھائی! جب جان پھیلی پر رکھ لی جاوے تو پھر کوئی رکاوٹ بھی آگے بڑھنے والے کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اب تم خود کو ہی دیکھو۔ جب تم نے جان پھیلی پر رکھ لی تو تم جارج کے کتوں اور اس کے رکھوالوں کو بولہبان کر کے اس کے گھر سے نکل آئے۔ نکل آئے یا ناہیں؟“ فیروز نے کہا۔
”کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، منصوبہ بھی ہے لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بات یہاں ہم چاروں کے درمیان ہوگی، اس کا پتا انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سمیت کسی کو ناہیں چلے گا۔“ فیروز نے کہا۔

میں خاموش رہا۔ اسحاق بولا۔ ”ایسی بات ناہیں کہ ہم انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سے علیحدہ سوچتے ہیں۔ سوچ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس راجوڑے میں سے جارج گورا جیسے کتوں کا خاتمہ کر دینا ہے۔ وہ یہ کام اور ڈھنگ سے کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم اور ڈھنگ سے کریں گے اور یہ حرامی جارج والا کام تو بس چند پہروں کے اندر ہی ہوگا۔ اور اگر ناہیں ہوگا تو پھر ہم ناہیں ہوں گے۔“

”لیکن ایک بات سوچنے کی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چوہان اور انور خاں وغیرہ کا خیال ہے کہ اس بار سلطانہ کو اور ہم سب کو مل پانی میں پناہ مل جائے گی۔ سب کو پتا ہے کہ جارج اور اس کے پشت پناہ حکم جی نے ظلم کیا ہے لیکن اگر ہماری طرف سے بھی کوئی بڑی کارروائی ہوگئی تو پھر کچھ لوگ اسے بھی ظلم قرار دیں گے۔ یوں، یہ پناہ والا معاملہ خطرے میں پڑ جائے گا۔“

اسحاق نے کہا۔ ”تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے مگر جارج کی موت ایک ایسا واقعہ ہووے گی جس پر شاید حکم جی اور اس کے قریبی ساتھیوں کے سوا ہر کوئی خوش ہوگا۔ جارج جو کچھ کرتا ہے اس سے صرف مسلمان ہی متاثر ناہیں، ہر کوئی متاثر ہے۔ اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ جارج مارا گیا تو حکم جی اور اس کے حواریوں کی کمر بھی ٹوٹ کر رہ جاوے گی۔ ایک دم سب کچھ اچھا ہو جاوے گا۔“

”مگر ایک دم سب بڑا بھی تو ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ فیروز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ ”اب اس سے بڑا اور کیا ہووے گا۔ ہم جیتے جی دفن ہو رہے ہیں۔ اب اور برداشت کریں گے تو پھر ہم بھی مجرم ہوں گے۔ ناہیں... اب ناہیں۔“ اس کا جوش اس کے

لہجے سے عیاں تھا۔
میں نے کہا۔ ”مجھے یہاں کے حالات کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں، لہذا اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جارج کو مارنے کے لیے یہ ٹھیک موقع ہے تو پھر میں تمہارے ساتھ ہوں۔“
”بہت اچھے۔“ اسحاق نے پُر جوش انداز میں کہا۔ پھر وہ اٹھا اور فیروز کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھا کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ہم وہاں لائین کی مدھم روشنی میں بیٹھ رہ گئے۔ رات خاموش اور بھیدوں بھری تھی۔

میرے اندازے کے مطابق ہم زمین کے نیچے کم از کم سو فٹ کی گہرائی میں موجود تھے۔ سرنگوں کا ایک شاخ در شاخ سلسلہ تھا۔ میرے قیافے کے مطابق اس کی طوالت ڈیڑھ دو میل کے قریب تو ہوگی۔ حکم جی اور جارج گورا کے کم از کم پینتالیس باغی اس وقت اس زیر زمین پناہ گاہ میں موجود تھے اور ایک خونچکاں منصوبے کے تانے بانے بن رہے تھے۔

میں نے فیروز سے پوچھا۔ ”اسحاق کہاں گیا ہے؟“
وہ سرگوشی میں بولا۔ ”اسحاق کے ذمے اسلحے کا انتظام ہے۔ وہ اسی کام کے لیے گیا ہے۔“
”راٹھلیں تو تم سب کے پاس موجود ہیں اور میرے پاس بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ہمیں کچھ اور کی ضرورت بھی پڑے گی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”یہ اسحاق بھی زرگاں کار ہائشی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں... اس کی سگی بہن بھی جارج گورا کا شکار ہوئی ہے۔ کوئی چار مہینے پہلے وہ بیمار ہو کر مر گئی تھی لیکن جانے والے جانتے ہیں کہ وہ مری ناہیں تھی، اس نے خود کو مارا تھا۔ کوئی زہریلی چیز کھائی تھی اس بد نصیب نے۔“

”کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟“
”اس کا معاملہ سلطانہ سے مختلف تھا۔ دراصل جارج جیسے شکاریوں کے پاس ہزار طرح کے جال ہوتے ہیں۔ جس رنگ کی زمین ہو، وہ اسی طرح کا جال بچھاوت ہیں۔ وہ لڑکی بڑی پیاری تھی، بالکل گڑیا کی طرح اور بہت ہنس مکھ بھی۔ روبینہ نام تھا۔ اس کی شادی اپنے ماموں زاد سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکا بے روزگار تھا۔ پھر ہیروئن اور گانجا وغیرہ بھی پینے لگا۔ اسی دوران میں پچی آبادی میں کہیں جارج کی نگاہ روبینہ پر پڑ گئی۔ اس نے اسے اپنے شکار کے طور پر منتخب کر لیا۔ اس نے روبینہ کے شوہر باسط کو اپنے پاس ملازمت دی اور اس کے ساتھ ہی دعویٰ کیا کہ وہ اس کی ہیروئن چھڑا کر اسے ایک

کارآمد شخص بنا دیوے گا۔ لیکن جو کچھ ہوا، وہ اس کے الٹ تھا۔ اس نے باسط کی ہیروئن تو چھڑا دی لیکن شراب کی پکی پکی لت لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکا جارج کی مہربانی کا غلام ہو کر رہ گیا۔ اسے قیمتی شراب درکار تھی اور عیاشی کا دیگر سامان بھی۔ یہ چیزیں اسے صرف اور صرف جارج کی جی حضوری سے ہی مل سکتی تھیں۔ جارج نے باسط کو رہنے کے لیے ایک سرخٹ کو انر بھی دے دیا تھا۔ اس کے بعد باسط کے ساتھ ساتھ روبینہ بھی جارج کی چار دیواری میں آگئی۔ اسے چار دیواری کے بجائے شکار گاہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ باسط نے خود نو بیاہتا بیوی کو مجبور کیا کہ وہ جارج گورا کی خواہش کے سامنے اپنا سر جھکائے۔ وہ بے آسرا لڑکی تھی۔ ایک بھائی کے سوا اس کا آگے پیچھے کوئی ناہیں تھا اور بھائی بھی مردوری کے لیے زرگاں سے بہت دور تھا۔ وہ جنگل کی کینائی کرنے والے ایک ٹھیکے دار کے پاس بھرتی تھا۔ وہ کیا کرتی؟ اس نے ہچکچاہٹ دکھائی تو شوہر نے اسے مارا پٹا۔ بالآخر وہ بے چاری اس غلاظت میں گر گئی جس میں اس کا شوہر اسے گرانا چاہت تھا۔ مگر اس کا دل اس کے ساتھ ناہیں تھا۔ وہ روز روز خود کو جارج کے بستر پر تاراج ہوتے ناہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے ایسے جیون سے موت بہتر سمجھی... ایک رات اس نے کچھ کھالیا۔ اس کا دم الٹ گیا۔ اس کے گلے میں ایک پھندا سا لگ گیا۔ وہ تین روز تک اس طرح سانس لیتی رہی کہ اس کے سانس کی آواز پورے گھر میں گونجتی تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور وہ بار بار بے ہوش ہوتی تھی۔ آخر وہ مر گئی۔ اس کی عمر صرف اٹھارہ بیس سال تھی۔ یہ اس کے بننے کھینے کے دن تھے۔ سکھیوں کے ساتھ مل کر گیت گانے، میلوں ٹھیلوں میں جانے اور تہوار منانے کا وقت تھا اور وہ بیماری کا بہانہ کر کے منوں مٹی کے نیچے جاسوئی۔ اسے کس جرم میں موت کی سزا ملی؟ اس کا کیا دوش تھا؟ شاید صرف یہی دوش تھا کہ بے سہارا عورت تھی اور ایک چالناز ہوس کار کی نگاہ میں آگئی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ایک رازداں سہیلی سے معلوم ہوا کہ روبینہ نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی ہے۔ پھر اس حکیم نے بھی اس بات کی تصدیق کی جس نے روبینہ کا علاج کیا تھا۔ بعد میں اس حکیم کی بھی جارج کے ہاتھوں بہت شامت آئی۔ اسے جان کے لالے پڑ گئے اور اسے زرگاں چھوڑنا پڑا۔ زور آور کے خلاف آواز اٹھانا بہت مشکل ہووت ہے۔ جو چند ایک آوازیں انھیں بھی، وہ جلد ہی دم توڑ گئیں۔“

اسی دوران میں اسحاق واپس آگیا اور اس کے آنے

سے فیروز خاموش ہو گیا۔ اسحاق کے پاس ترپال کا بنا ہوا ایک سیاہ تھیلہ تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اس تھیلے میں رائفٹوں کا ایمونیشن اور ہینڈ گرنیڈ وغیرہ تھے۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے ایک بار پھر سرگوشیوں میں بات چیت شروع کر دی۔ اس بات چیت سے اندازہ ہوا کہ کل کا دن جارج گورا پر ایک کارگر حملہ کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ جارج گورا اپنے کے دن شام کے وقت سورج ڈھلنے سے کچھ پہلے اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلتا تھا اور زرگاں کی پرانی آبادی میں پرانے پگوڑا کے سامنے لوگوں میں خوراک تقسیم کرتا تھا۔ بظاہر جارج اور خیرات دو متضاد چیزوں کی طرح نظر آتے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جارج اور حکم جی جیسے دنیا پرست لوگ اکثر عوام الناس کو دھوکا دینے کے لیے ایسے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ شاید وہ اپنے طور پر اپنی زندگی کے کھاتے میں اپنے گناہوں کو ”بیلنس“ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنگیز، بلا کو اور ہٹلر جیسے ان گنت جابر لوگوں کی زندگیوں میں کہیں نہ کہیں اس قسم کی ڈراما بازی موجود رہی ہے۔ غالباً یہ بھی ایسے ہی منافق روئے کا عکس تھا۔ جارج جیسا ظالم شخص ہر ہفتے ایک خاص دن میں غربا کی ہستی میں پہنچتا تھا اور ان کے دکھوں میں شریک ہونے کی نمائش کرتا تھا۔ وہ جس راستے سے گزر کر جاتا تھا، وہیں پر ایک خاص جگہ ایسی تھی جہاں اس کے مختصر قافلے پر گھات لگا کر حملہ کیا جاسکتا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز وغیرہ اس حملے کے بارے میں ساری تفصیلات پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

☆☆☆
ابھی شام ہوئی نہیں تھی مگر گھنے درختوں کی وجہ سے نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ شام ہوتے ہی یہ جگہ گھٹا ٹوپ تاریکی میں ڈوب جائے گی۔ ہم اپنی زیر زمین پناہ گاہ سے کل رات کو ہی نکل آئے تھے۔ ہم نے ساری رات اور تقریباً سارا دن سفر کیا تھا۔ اس سفر کے لیے فیروز اور اسحاق وغیرہ نے گھنے جنگل میں شارٹ کٹ راستے استعمال کیے تھے۔ یوں وہ اندازاً دس پندرہ میل کا سفر کم کرنے میں کامیاب رہے تھے اور اب ہم اس خاص مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ہمیں گھات لگانا تھی۔

یہاں اسحاق وغیرہ کو درختوں میں ایک ٹوٹی پھوٹی گھوڑا گاڑی بھی مل گئی۔ یہ چار پہیوں والی گاڑی تھی۔ اس کے اگلے ہانس ٹوٹ چکے تھے۔ ایک پہیہ بھی علیحدہ پڑا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے مشورہ کیا اور اس گاڑی کو حملے میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسحاق اور فیروز تیزی سے گاڑی

کا پیہہ جوڑنے میں مصروف ہو گئے۔

”اس گاڑی کا کیا کرو گے؟“ میں نے فیروز سے پوچھا۔
”اس کو راستہ روکنے کے لیے استعمال کریں گے۔“

فیروز نے جواب دیا اور مجھے لے کر ان گھنے درختوں میں آگیا جہاں سے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک کچا لیکن بالکل ہموار راستہ تھا۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ زرگاں کی نئی آبادی بائیں طرف تھی اور بلند درختوں کے اندر سے کہیں کہیں اس کے آثار نظر آتے تھے۔ عمارتوں کے سنہری اور سفید کلس اور مندروں کی چوٹیاں ڈوبتے سورج کی روشنی میں جھلک دکھا رہی تھیں۔ راستے تک ایک چھوٹی سی ڈھلوان جاتی تھی۔ فیروز نے ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جب جارج کا قافلہ قریب آوے گا تو ہم اس چار پیہوں والی گاڑی کو ڈھلوان کی طرف دھکیل دیں گے۔ وہ گاڑی دوسرے کنارے کے درختوں سے ٹکرائے گی اور راستے کے عین اوپر رک جاوے گی۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم دوطرف سے جارج کی گاڑی پر حملہ کریں گے۔ چھلنی کر دیں گے حرامزادے کو اور اس کے ساتھیوں کو۔“
”اس کی گاڑی کی پہچان کیا ہے؟“

”سفید گھوڑوں والی لال گاڑی۔ وہ چار گاڑیوں کے قافلے میں سب سے الگ نظر آوے گی۔ اس کے آگے سبز گارڈز کی گاڑی ہوگی۔ اس کے پیچھے والی گاڑی میں دو چار مصاحب بیٹھے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خبیث موہن کار بھی موجود ہو۔ آخری گاڑی میں بھی گارڈز کا دستہ ہوگا۔ ان لوگوں کے پاس جی تھری گن موجود ہوتی ہے۔ اس آخری گاڑی کے عقب میں دو گھڑسوار ہوں گے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ ہوگا۔ تاہم یہ اسلحہ صرف نمائشی ہوتا ہے۔ یعنی تلووار، آرائشی رائفل اور جگر وغیرہ۔“

مجھے موقع دکھانے کے بعد فیروز واپس گھنے درختوں کے تاریک جھنڈ میں لے آیا۔ وہاں ماجد اور اسحاق بھی بالکل تیار تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہلاکی چمک تھی۔ رگ پٹھے تنے ہوئے تھے۔ ہم چاروں نے اپنی پوری پلاننگ پر ایک بار پھر غور کیا۔ یہ طے ہوا کہ پکڑے جانے کے بجائے ہم لڑتے ہوئے جان دینا بہتر سمجھیں گے اور اگر خدا نخواستہ کسی شخص کی گرفتاری یقینی ہو جائے تو وہ خود اپنی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ یہ بے حد جذباتی صورت حال تھی اور جو باتیں ہم ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے، انہیں کہنے کے لیے

لوہے کا جگر اور فولاد کا دل درکار تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ میں اس جانباز ٹوپی کا حصہ ہوں اور آج میں نے اپنی جان محاورتا نہیں حقیقتاً تھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ ہاں، آج میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو جھوٹ ہوگا کہ میرے دل میں زندگی کی خواہش نہیں تھی لیکن جس طرح کی ذلت آمیز زندگی میں گزار رہا تھا، اس سے موت بہتر نظر آتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں عمران کو یاد کیا اور کہا۔ ”دیکھو عمران! میں نے اب تمہارے بغیر زندہ رہنے اور مرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ میں اب وہی بننا چاہتا ہوں جو تم چاہتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تمہاری کی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کیا جانو، ان گزرے ماہ و سال میں، میں نے کس کس طرح تمہیں یاد کیا ہے۔ تم میری زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکے ہو میرے بار۔ میں ایک بل کے لیے بھی تمہیں بھول نہیں سکتا۔ اور آج اس گھنے جنگل کی اس دھواں دھواں شام میں جب میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہوں اور آنے والے لمحوں میں میرے قدم کسی بھی سمت میں اٹھ سکتے ہیں، میں ایک بار پھر تمہیں بڑی شدت سے یاد کر رہا ہوں۔ دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ کاش! اس وقت تم میرے ساتھ ہوتے۔ میرا کندھا تمہارے کندھے سے ملا ہوتا۔ ہم اس دھواں دھواں شام میں ایک ساتھ لٹکار بلند کرتے اور اپنے دشمن پر جا پڑتے۔“

میری آنکھوں میں آنکھیں نمی تھی۔ میں ہر دلعزیز عمران کو یاد کر رہا تھا کہ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں فرح اور عاطف کو یاد کر رہا تھا کہ ان کے ساتھ میرا بچپن گزرا تھا اور میں ثروت کو یاد کر رہا تھا کہ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ اپنے ملک سے، اپنے شہر سے ہزاروں میل دور اس دور دراز خطے میں اس دھواں دھواں شام میں، میں زندگی اور موت کی بازی لگانے جا رہا تھا۔ حالات کی ستم ظریفیوں نے میرے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔

ہم چاروں نے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر ”مارو یا مار دو“ والے عہد کو دہرایا اور اپنے اپنے کام کے لیے بالکل تیار ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے چہرے صاف کپڑوں میں چھپائے پھر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ فیروز اور میں راستے کے دائیں کنارے پر تھے جبکہ ماجد اور اسحاق بائیں کنارے پر۔ جارج کی آمد کے آثار دیکھ کر فیروز نے چار پیہوں والی گاڑی کو ڈھلوان پر دھکیلا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھیل شروع ہو جاتا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا، ہماری دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں بار بار جارج کا کمرہ

چہرہ نگاہوں کے سامنے لا رہا تھا تاکہ میرے اندر غیرت و غضب کی وہ بلند لہر رواں دواں رہے جس نے چند دن پہلے میرے سینے میں جنم لیا تھا اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس لہر کو رواں دواں رکھنے کے لیے مجھے کوئی خلیص کوشش کرنا نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ لہر ایک عجیب سی زہرناک گچی کے ساتھ مکمل مل کر میرے لبوں میں شامل ہو چکی تھی اور میری شریانوں میں مستقل بسیرا کر چکی تھی۔

شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ درختوں پر پرندوں کی چہکاریں تھیں۔ پچھلے ایک گھنٹے میں اس راستے پر سے چند گھوڑا گاڑیوں، چند گھڑسواروں اور ایک عدد سیاح جیپ کے سوا کوئی سواری نہیں گزری تھی۔ ہماری نگاہیں مغرب کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں سے کسی بھی وقت گرد و غبار اٹھ سکتا تھا۔ یہ گرد و غبار جارج کے قافلے کی آمد کا اعلان ہوتا۔

شام گہری ہوتی گئی لیکن قافلے کے آثار نظر نہیں آئے۔ فیروز کے لیے یہ تاخیر بڑی تعجب خیز تھی۔ فیروز کو اور اس کے دونوں ساتھیوں کو معلوم تھا کہ جارج کے معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ پچھلے دو تین برسوں میں شاید ہی ایک آدھ بار ایسا ہوا ہو کہ وہ مقررہ وقت پر پرانے پگوڈا پر نہ پہنچا ہو۔ جب شام کا ملگجنا تاریکی میں بدل گیا تو فیروز اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ فیروز مایوسی کے عالم میں بڑبڑایا۔ ”اتنی دیر تو پہلے بھی تاہیں ہوئی۔“ اسی دوران میں اسحاق بھی راستہ پار کر کے ہماری طرف آگیا۔ وہ بھی مایوس تھا۔ اس نے فیروز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”غور سے سنو... ڈھول کی آواز آرہی ہے۔“

فیروز نے بھی ہمت تن متوجہ ہو کر سنا۔ چند لمبے بعد ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی مدھم آواز ہماری سماعتوں تک پہنچی۔ یہ ڈھول نہیں تھا، غالباً کوئی بہت بڑا نقارہ تھا۔ اسے ایک خاص روحم سے بجایا جا رہا تھا۔

اس آواز کو سننے کے بعد فیروز اور اس کے دونوں ساتھی بے دم سے ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی ان کی تقلید کی۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے فیروز سے پوچھا۔
”وہ حرامی کسی دوسرے راستے سے ہو کر پگوڈا پہنچ گیا ہے۔ یہ ڈھول کی آواز سنائی دے رہی ہے؟ یہ اس کی پگوڈا میں آمد کا اعلان ہے۔“

نقارے کی دور افتادہ تھر تھراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اندازاً یہ کوئی دو ڈھائی میل کے فاصلے سے آرہی تھی۔ فیروز اور ماجد آپس میں جھگڑنا شروع ہو گئے۔ ماجد کا

خیال تھا کہ انہوں نے یہاں گھات لگا کر غلطی کی تھی۔ انہیں قریباً ایک میل پیچھے گھات لگانی چاہیے تھی جہاں سے دور رہا پھوٹتا تھا۔

فیروز ترخ کر بولا۔ ”مگر وہاں کون سی جگہ تھی چھپنے والی؟ کھلے میدان میں بیٹھتے تو اب تک دھریے گئے ہوتے۔“ اس سے پہلے کہ فیروز اور ماجد کا یہ تنازع شدت اختیار کرتا، ایک آواز نے سب کو چونکایا۔ یہ گھوڑے کی ہنہناہٹ تھی اور ہمارے عقب سے ابھری تھی۔ پھر ایک ساتھ ایسی کئی اور آوازیں ابھریں۔

”میرا خیال ہے یہ حکم جی کے گارڈز ہیں۔“ فیروز نے سرسراہٹ آواز میں کہا۔

”رائفلیں چھپا دو۔“ اسحاق نے فوراً تجویز پیش کی اور اپنی رائفل خشک پتوں کے ایک ڈھیر میں گھسیڑ دی۔ فیروز اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ماجد کی رائفل پہلے ہی جنگلی گھاس میں پڑی تھی اور تاریکی کے سبب نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل تھی۔ ہینڈ گریبنڈز اور گولیوں والا تھیلا بھی وہیں تھا۔ ہم چار پیہوں والی خستہ حال گھوڑا گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ اندازاً ایسا ہی تھا جیسے گھوڑا گاڑی کو قابضی استعمال بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد چودہ پندرہ گھڑسوار محافظ موقع پر آن موجود ہوئے۔ یہ سب باوردی اور مسلح تھے۔ ”کون ہو تم؟“ ایک فریبہ جسم کے شرابی گھڑسوار نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

”ٹھا کر کیدار ناتھ کے ملازم ہیں جی۔ اس گاڑی کو ٹھیک کر رہے تھے۔“ فیروز نے پتا نہیں کس ٹھا کر کا نام لیا تھا کہ گارڈز کے کڑے تیور ذرا نرمی اختیار کر گئے۔

”یہ کس کی گاڑی ہے؟“ انچارج گارڈ نے شرابی لہجے میں پوچھا۔

”ٹھا کر صاحب کے ایک دوست کشوری لال جی کی تھی۔ عرصے سے یہاں خراب پڑی ہے جی۔ ہم نے ان سے مانگ لی ہے۔ صبح سے اسے ٹھیک کر رہے تھے۔ اب اندھیرا ہو گیا ہے۔ اب کل آویں گے۔“ فیروز نے مسکین لب و لہجے میں کہا۔

اندازہ ہوا کہ فریبہ اندام شرابی انچارج فیروز کے جواب سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا ہے۔ وہ اپنے سات آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ باقی پانچ چھ محافظ وہیں موجود رہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو ایک بار گچی گڑھے میں سے پانی پلانے لگے۔ ایک دراز قد گارڈ یونہی گھوم پھر کر چار پیہوں والی مرمت طلب گھوڑا گاڑی کا جائزہ لینے لگا۔ اس

Scanned and Uploaded By Nadeem

کے ہاتھ میں نارنج تھی جس کی روشنی وہ بے پروائی سے گاڑی کے مختلف حصوں پر ڈال رہا تھا۔ گاڑی پر لگی ہوئی ایک زنگ آلود پلیٹ دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے نارنج کا روشن دائرہ پلیٹ پر مرکوز کیا۔ پھر فیروز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم کیسے کہوت ہو کہ یہ ٹھاکر کیدار ہاتھ کے دوست کی گاڑی ہے؟“

یہی وقت تھا جب ایک گاڑی نے چلا کر کہا۔ ”یہاں گڑبڑ ہے جی۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ فیروز ہے جی، حکم جی کا ملازم۔“ اس کے ساتھ ہی چلانے والے نے اپنی نارنج کا روشن دائرہ فیروز کے چہرے پر مرکوز کیا۔

دراز قد گاڑی بھی ٹھنک گیا۔ اس کے ساتھ ہی تین چار رائفلیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ ان میں دراز قد گاڑی کی اپنی رائفل بھی شامل تھی۔ وہ باقی گاڑیوں میں سے سینئر لگتا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنی جدید رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”خبردار... اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ جلدی کرو۔“

فیروز اور ماجد نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ چند لمحے بعد میں نے اور اسحاق نے بھی تقلید کی۔ کم از کم تین نارنجوں کے روشن دائرے ہمارے چہروں پر پڑ رہے تھے۔ گاڑی کی انگلیاں رائفلوں کے ٹریگزر پر تھیں۔ اس شدید تناؤ کی کیفیت میں کسی لمحے بھی کچھ ہو سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ ہمارے درمیان طے تھا کہ پھنس جانے کی صورت میں ہم گرفتاری نہیں دیں گے اور فی الحال ہم پھنس گئے تھے۔

”زمین پر لیٹ جاؤ اور ہمارے جلدی کرو۔“ دراز قد گاڑی دہڑا۔

پہلے ماجد لیٹا، پھر فیروز اور آخر میں، میں اور اسحاق۔ ہم نے اپنے ہاتھ دونوں طرف پھیلا لیے تھے۔ لیٹتے ہوئے میں تھوڑا سا بائیں طرف ہو گیا تھا۔ ایسا کرنے سے میں اپنی اس رائفل کے قریب تر ہو گیا جو خشک پتوں کے ڈھیر کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میرے ہاتھ رائفل کے تقریباً اوپر تھے۔ میرے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ میں رائفل اٹھاؤں اور کچھ کرگڑوں۔ ایسا کام کرنے کے لیے جس قسم کی ہمت درکار تھی، وہ آج میں اپنے اندر موجود پارہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں یہ کرگڑوں گا اور اگر نہ کر سکا تو کیا ہوگا؟ وہی کچھ ہوگا جس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ تخت یا تختہ۔

میں نے زرد زم پتوں کے نیچے رائفل کی سختی کو محسوس کیا۔ دراز قد گاڑی گالیاں بک رہا تھا۔ وہ رائفل سونے ہوئے آگے بڑھا۔ غالباً وہ ہماری جامہ تلاشی لینا چاہ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ ہمارے لباس میں کوئی ہتھیار وغیرہ ہوگا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ مجھے اوندھالینے کا حکم دے کر وہ خود مجھے میرے ہتھیار کے قریب پہنچا چکا ہے۔ وہ سامنے کی طرف سے آ رہا تھا۔ ابھی وہ مجھ سے پانچ چھ قدم دور تھا کہ میں نے پتوں کے ڈھیر میں چھپی ہوئی رائفل نکالی۔ اس کا سیٹھی کچ پہلے سے ہٹا ہوا تھا۔ وہ برسٹ مارکتی تھی لیکن فی الوقت سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ایک لمبے کے لیے دراز قد گاڑی پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ گولی دراز قد گاڑی کے سینے پر کہیں لگی۔ وہ اچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے دوسرا فائر اس شخص پر کیا جو پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ”ریکال“ رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ میرا پہلا فائر خالی گیا۔ مد مقابل نے گولی چلائی جو میرے سر کے بالوں کو چھوئی ہوئی عقب میں درخت کے تنے پر لگی۔ میں نے تیسری بار ٹریگر دبایا۔ اس مرتبہ گولی نے مد مقابل کو زخمی کیا۔ وہ پیٹ پکڑ کر جھٹکا چلا گیا۔ اس کی کراہ دردناک تھی۔

اسی اثنا میں اسحاق، ماجد اور فیروز بھی پتوں میں سے رائفلیں برآمد کر چکے تھے۔ ماجد کو تو فائر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ رائفل کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لے سکتا، بارہ بور کی ایک گولی اس کے جڑے اور سر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تاہم میں، اسحاق اور فیروز درختوں کے پیچھے پناہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ گاڑی بھی مختلف درختوں کے عقب میں پناہ لے چکے تھے۔ ان میں سے دو نے خستہ حال گھوڑا گاڑی کے پیچھے پوزیشن لی تھی۔ قریباً ایک منٹ تک اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ دھماکوں سے جنگل گونج اٹھا۔ تاریکی میں ہر طرف شعلے لپکتے نظر آئے۔ یہ شعلے مخصوص آوازوں کے ساتھ درختوں کے تنوں میں ہوسٹ ہو رہے تھے اور شاخوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں ایک تناور درخت کی اوٹ میں تھا۔ میں لڑائی کے داؤ پیچ سے زیادہ واقف نہیں تھا لیکن میرے اندر کی بیجانی کیفیت مجھے راستہ دکھا رہی تھی۔ میں نے تناور درخت کی اوٹ چھوڑی اور تیزی سے بھاگ کر بارشی گڑھے میں کود گیا۔ ایسا کرنے سے میں ان دو افراد کو ٹارگٹ بنانے میں کامیاب ہو گیا جو گھوڑا گاڑی کے عقب سے گولی چلا رہے تھے۔ میری فائرنگ سے ان میں سے ایک شدید زخمی ہو کر گر اور دوسرا ہپا ہو کر تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

”شاباش مہروز!“ فیروز کی پُر جوش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اسی دوران میں اسحاق بھی اپنی پوزیشن تبدیل کر کے

کچھ آگے جا چکا تھا۔ اس کی رائفل برسٹ پر سیٹ تھی۔ اس کے چلائے ہوئے دو تین برسٹس نے گاڑی میں کھلبلی مچا دی۔ ہم نے انہیں تاریکی میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان کو بھاگتے دیکھ کر ہمارے حوصلے سوا ہوئے۔ ”مارو حرامزادوں کو۔“ اسحاق کی لاکڑاتی ہوئی آواز تاریکی میں گونجی۔

ہم نے اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر جارج گورا کے رکھوالوں پر گولیاں چلائیں۔ اس فائرنگ سے ایک اور گاڑی نشانہ بنا، باقی تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔

بارشی گڑھے میں کودنے سے میں سینے تک بھیگ چکا تھا۔ مجھے گڑھے کے پاس ہی ایک گاڑی کی نارنج بڑی نظر آئی۔ میں نے نارنج اٹھا کر روشن کی۔ ہمارا سا بھی ماجد اپنا عہد بھانچا تھا۔ وہ پہلو کے بل پکی زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سر کے آس پاس خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ اسحاق نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے ساتھی کا ہاتھ چوما اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ”گھبرا مت! آج ہم جارج کو مار دیویں گے یا خود بھی تیرے پاس پہنچ جاویں گے۔“

سوگ منانے کا وقت نہیں تھا۔ یہاں تقریباً دو منٹ تک لگا تار فائرنگ ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آوازیں ان گاڑیوں کے باقی ساتھیوں کو کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی تھیں۔ یقیناً وہ بھی یہیں کہیں درختوں میں گشت کر رہے تھے۔ جس گاڑی پر میں نے پہلی گولی چلائی تھی، وہ جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس کا لہبا جسم کسی گھڑیال کی طرح جھاڑیوں میں مبردہ پڑا تھا۔ جس گاڑی کے پیٹ میں گولی لگی تھی، وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور بے ہوش ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے گاڑی کی لاش بھی جھاڑیوں میں پڑی تھی۔ اس گاڑی کی رائفل اور گولیوں والی پلیٹ فیروز نے اٹھالی۔ ”ہمیں یہاں زیادہ دیر ناہیں ٹھہرنا چاہیے۔“ وہ تیزی سے بولا۔

اسحاق نے چند گریبنڈز والا تھیلا اٹھایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ گاڑیوں کے تین چار گھوڑے جھاڑیوں میں اوجھل اوجھل چکرارے تھے۔ ہم انہیں نظر انداز کرتے ہوئے تاریکی میں لپکتے چلے گئے۔ ماجد کی موت نے اسحاق کو کچھ زیادہ ہی بیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے قراری سے رائفل کو اپنے ہاتھوں میں حرکت دے رہا تھا۔ جیسے اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو مار دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ فیروز نے تیز تیز چلتے ہوئے پوچھا۔ ”میں تو کہوت ہوں، آج جارج کو ڈھونڈ نکالیں۔ اسے مار ڈالیں یا خود مر جاویں۔“ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب اس تک پہنچنا بڑا مشکل

ہو دے گا۔ وہ بہت چوکس ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس حرامی نے پگوڈا تک جانے کے لیے بھی دوسرا راستہ استعمال کیا ہے۔ اور اب یہاں ہونے والی فائرنگ کے بعد تو وہ اور بھی چوکنا ہو گیا ہو دے گا۔“

”مگر ہم نے اسے مارنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ اسحاق بولا۔

”قسم تو کھا رکھی ہے اور اللہ کو منظور ہو تو ہم اس کا قصہ تمام بھی کریں گے... لیکن اگر ہم نے جلد بازی کی تو ہماری جان ضائع چکی جاوے گی اور یہ ہم کو منظور ناہیں ہے۔“ فیروز نے کہا۔

”تو کیا ہم ماجد کو گنوا کر یہاں سے خالی ہاتھ واپس چلے جاویں گے؟“

چلتے چلتے فیروز چند لمحے کے لیے رک گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”ناہیں... ہم بالکل خالی ہاتھ واپس ناہیں جاویں گے۔ آج ہم جارج تک نہیں پہنچ سکے لیکن اپنے دوسرے بہترین نشانے پر ضرور پہنچیں گے۔“

”دوسرا بہترین نشانہ... کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہم ماریا تک پہنچیں گے۔ ماریا جارج کی سوتیلی بہن ہے لیکن ماں کی طرف سے سگی ہے اور وہ اس سے بہت محبت بھی کرتا ہے۔ ہم جارج کو ایسا زخم دیں گے جو اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیوے گا۔ مر سکے گا نہ جی سکے گا۔“

”وہ بد ذات ہمیں کہاں ملے گی؟“ اسحاق نے دانت پیس کر پوچھا۔

”میں اچھی طرح جانت ہوں، وہ اس وقت کہاں ہووے گی۔ وہ اپنی ایک دوست کے گھر آئی ہوئی ہے۔ ٹھاکر کیدار ہاتھ کی بیٹی کا منی دیوی کی سگائی کی رسم ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہاں بہت زیادہ لوگ ناہیں ہوں گے۔ حفاظت کا بھی کوئی خاص انتظام ناہیں ہووے گا۔ ہم اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ماریا کو عدم آباد روانہ کر سکتے ہیں... بالکل کر سکتے ہیں۔“

”اگر ایسا ہو جائے تو واقعی یہ بہت بڑی بات ہووے گی۔“

”یہ بات ہووے گی اور ابھی ہووے گی۔“ فیروز کے لہجے میں سخت بیجان تھا۔ ہم نے درختوں کے درمیان تیزی سے سفر کیا۔ ہمارے پاس نارنجیں موجود تھیں لیکن ہم انہیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اسحاق اور فیروز یہاں کے راستوں کے شناسا تھے۔ وہ بڑی مہارت سے محفوظ اور شارٹ کٹ راستے استعمال کر رہے تھے۔ ایک جگہ وہ ایک برساتی ٹالے کے

اندر سے بھی گزر رہے۔ جب اس نالے سے باہر نکلے تو میں نے بالکل غیر متوقع طور پر خود کو اس خوشبودار نہر کے کنارے پایا جو زرگاں کے راج بھون کو تقریباً چھوٹی ہوئی گزرتی تھی۔ لیکن ہم راج بھون کے پاس نہیں تھے بلکہ بارونق آبادی کے پاس بھی نہیں تھے۔ یہ زرگاں کا مضافاتی علاقہ نظر آتا تھا۔ ہم تینوں نے اپنے چہرے ڈھانوں میں چھپا لیے۔ فیروز نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز سرگوشی کی۔ ”وہ دیکھو، ان پیڑوں کے پیچھے جو نیلی روشنیاں نظر آرہی ہیں، یہ ٹھاکر کیدار ناتھ کی حویلی ہے۔ ٹھاکر ذرا عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کا عادی ہے۔ آج یہیں پر اس کی بیٹی کی رسم ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کرتا ہے فوراً کرنا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ سیدھے اندر گھس جاوت ہیں۔ جو بھی راستہ روکے گا، بھون ڈالیں گے اس حرامی کو۔“

کچھ دیر بعد اسحاق نے عجیب جذباتی انداز میں فیروز کا کندھا تھاما۔ ”میں نے تمہاری بات مانی ہے فیروز! اب تم میری بھی ایک بات مانو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر وہ حرام کی جنی مار یا ہمارے ہاتھ آگئی تو ہم اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کریں گے۔“

”وہ کیوں؟“

”اس بارے میں، میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔ لیکن مجھ سے وعدہ کرو۔“

تاریکی میں فیروز نے چند لمحوں کے لیے اسحاق کو بغور دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“

ہم شیشم، نیم اور کچھار کے پیڑوں میں سے نکل کر نیلی روشنیوں والی حویلی پر یوں حملہ آور ہوئے جیسے شکاری جانور اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ حویلی سے باہر سات آٹھ خوب صورت گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو تین موٹریں بھی نظر آرہی تھیں۔ گاڑی بان۔ ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ یہاں وہاں بٹل رہے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک اس طرح کی افتادان کے سر پر ٹوٹ پڑے گی۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکے۔ ہم تینوں دندناتے ہوئے حویلی میں گھس گئے۔ صرف ایک ملازم نے برآمدے میں ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ فیروز نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری، وہ ڈکراتا ہوا نہانے والے تالاب میں جا گرا۔ اس حویلی کو جزیرہ کی عمارت سے جگمگایا گیا تھا۔ اندرونی حصے میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ لیکن آج کل لہرا رہے تھے۔ ڈھولک کی تھپ تھپ گونج رہی تھی۔ پکوانوں کی خوشبو بھی۔ پہلے تو فائر کی آواز نے

لوگوں کو چونکایا پھر جب ہم اسلحہ لہراتے ہوئے اچانک اندر گھس آئے تو ہر طرف کھرام مچ گیا۔ مرد و زن چلاتے شور مچاتے چاروں طرف بھاگے۔ کرسیاں الٹ گئیں۔ کھانوں کی میز قیمت رکابیں فرش پر بکھرتی نظر آئیں۔ جس لڑکی کی سنگائی تھی، وہ سرخ ساڑی پہنے سولہ سنگھار کیے اسلحہ پر بیٹھی تھی۔ اس کے گرد بھی خوش رنگ لڑکیوں کا جھوم تھا۔ یہ سب بھی حواس باختہ ہو کر اٹھیں، ان میں دو تین سفید فام بھی تھیں۔ فیروز اور اسحاق نے ان میں سے اپنا شکار پہچان لیا تھا۔ یہ سرخی مال مالوں والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ اس کی عمر تیس چوبیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سفید فام ہونے کے باوجود اس نے مقامی لباس ہی پہن رکھا تھا۔ یہ چمکیلی کام دار ساڑی پر مشتمل تھا۔ لڑکی مضبوط جسم اور قوی اعصاب کی مالک نظر آتی تھی۔ اسلحہ پر سے اترنے والیوں میں وہ سب سے آخر میں تھی اور وہ منہ پھیر کر بھاگی بھی نہیں تھی، لٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ تاہم دیگر لوگوں کی طرح اس کے چہرے کا سارا خون بھی چڑچکا تھا۔

فیروز اور اسحاق عقابوں کی طرح اس پر جھپٹے اور پکڑ لیا۔ ”ہیلپ... ہیلپ۔“ وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی لیکن فی الحال یہاں اس کی پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔

شاید لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہمارے سروں پر خون سوار ہے اور ان لمحوں میں ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اسحاق نے انگریز لڑکی کی پشت سے رائفل کی نال لگا دی تھی اور فیروز اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لا رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب دو نومند افراد جو یقیناً گارڈز تھے، ہمارے سامنے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ حق نمک ادا کرنا چاہتے تھے مگر یہ کوشش انہیں مہنگی پڑی۔ اسحاق نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ دونوں افراد کے چہرے اور سینے پر گولیاں لگیں۔ وہ ٹریگر دبانے کی حسرت دل میں لیے مردہ چھپکیوں کی طرح دہلیز پر جا گرے۔ ایک گولی ایک بھاگتی ہوئی فریہ اندام خاتون کی ٹانگ میں لگی۔ میں نے اسے برآمدے کے بڑے بڑے گول ستونوں کے پاس گرتے ہوئے دیکھا۔

ہم ماریا کو کھینچتے ہوئے حویلی کے لان میں پہنچے۔ ہر طرف وحشت کا عالم تھا۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپ گئے تھے اور وہیں سے واہلا کر رہے تھے۔ ”ہوائی فائرنگ کرو۔“ فیروز نے مجھے مشورہ دیا اور خود بھی رائفل کی نال اوپر اٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔

ترتر کی لرزہ خیز آوازوں نے ماحول کو مزید دہشت ناک کر دیا۔ میں نے بھی فیروز کی تقلید کی اور اندھا دھند

گولیاں چلائیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ”پاہل“ کرنے کے فائدے کیا ہوتے ہیں اور کسی ماحول پر اچانک چھا جانے اور اسے تسخیر کر لینے کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارے ارد گرد کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ ٹھاکر تھے، رائے اور کنور تھے اور پتا نہیں کیا کچھ تھے لیکن اس وقت وہ جان بچانے کے لیے معمولی کچھوں کی طرح کونے کھدروں میں رہ چکے تھے اور چھپ رہے تھے۔ ان کی بھاری پکڑیاں، قیمتی جوتیاں اور ان کے بلوری جام ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

جس وقت ہم ماریا کے ساتھ بیرونی گیٹ پر تھے، حویلی کی چھت سے ہم پر پھر ایک فائر ہوا لیکن اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس فائر کے جواب میں، میں نے چھت کے بائیں کنارے کی طرف تین چار فائر کیے۔ اور فیروز وغیرہ کے ساتھ بھاگتا ہوا حویلی سے نکل آیا۔

حویلی سے باہر ایک لینڈر دور جیب موجود تھی۔ ڈرائیور بھی پاس ہی موجود تھا اور ہمیں سکتے زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم انگریز لڑکی کو کھینچتے ہوئے جیب میں لے آئے۔ فیروز نے رائفل کی نال ڈرائیور کی طرف اٹھائی اور پھنکارا۔ ”گاڑی اشارت کر۔“

ڈرائیور کسی معمول کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیب سے چابی نکال کر گاڑی اشارت کر دی۔ فیروز نے اسے بھاگ جانے کا حکم دیا۔ وہ اس حکم کو ماننے کے لیے ایک سو ایک فیصد تیار تھا۔ وہ گاڑی سے نکل کر درختوں کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ فیروز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پلک جھپکتے میں جیب کو نیلی روشنیوں والی حویلی سے دور لے آیا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں فیروز نے درختوں کے درمیان کیے راستوں پر طوفانی ڈرائیونگ کی۔ لڑکی کو اسحاق نے دبویچ رکھا تھا اور ٹریل ٹور رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا رکھی تھی۔ ہم جیب کے ساتھ ہی فٹ فٹ بھر اوپر اچھل رہے تھے اور ہمارے سر بار بار جیب کی چھت سے ٹکراتے تھے۔ لڑکی سمجھ چکی تھی کہ اب شور مچانے اور مزاحمت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ فیروز کی ڈرائیونگ بھی اس کے لب و لہجے کی طرح سخت بیجانی تھی۔ اس نے جیب کو طوفانی انداز سے ایک برسائی نالے میں سے گزار دیا اور پھر ایک نہایت خطرناک ڈھلوان پر اندھا دھند دوڑاتا چلا گیا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ جنگل نہایت دشوار ہو گیا اور جیب نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ درختوں سے ٹکرا کر اس کا فرنٹ برباد ہو چکا تھا اور ایک طرف کے شیشے

میں دراڑیں آگئی تھیں۔ جب جیب رک گئی تو ہم اس میں سے نکلے اور لڑکی کو لے کر نہایت گھنے تاریک درختوں میں گھس گئے۔ ایک ٹارچ کی مدد سے راستہ دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ لڑکی کی ساڑی اس کے بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور اس کے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ اسحاق نے اسے تیز دھار چاقو سے کاٹا اور پھر بھاڑ کر علیحدہ کر دیا۔ اب لڑکی کی ساڑی کا بالائی حصہ اس کے جسم پر موجود نہیں رہا۔ اسحاق نے اسے اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ کچھ آگے جا کر لڑکی پھسلی اور گر گئی۔ اسحاق نے اسے اٹھانا چاہا لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی اور ہانپتی رہی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ”ہام کا تمہارا کوئی دشمنی نہیں، تم ہام کے ساتھ ایسا کیوں کرتا؟ اگر تم کو مٹی چاہیے تو ہام تم کو دینے کو تیار ہے۔ آئی ایم شیور۔ مائیکل تمہارا ہر مطالبہ پورا کر دے گا۔“

”ہمیں تمہاری دولت تائیں چاہیے۔ کچھ اور چاہیے۔“ اسحاق سفاک لہجے میں بولا۔

”بتاؤ کیا چاہیے... میں مرنا نہیں چاہتی۔“

”بس یہی ہماری مجبوری ہے۔ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتے۔“ اسحاق نے اس کے سرخی مال مالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکے دیے اور پھر طیش کے عالم میں اس کا چہرہ نیلی زمین میں دھنسا دیا۔

وہ کچھ بول رہی تھی مگر اس کی آواز ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یقیناً وہ منت ساجت ہی کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مائیکل کا نام بھی لیا۔

”یہ مائیکل کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کتیا کا شوہر... اور جارج حرامی کا یار... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔“

چہرہ کچھڑ میں دھنس جانے کی وجہ سے ماریا کا سانس بند ہو رہا تھا۔ جب وہ ہاتھ پاؤں پھینکنے لگی تو اسحاق نے اس کی گردن پر سے دباؤ ہٹا دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ماریا کا چہرہ دہشت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کا کچھڑ صاف کیا اور ڈری ڈری آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ یہ وہی خوف تھا جو ہر اس جوان لڑکی کی آنکھوں میں نظر آ سکتا ہے جسے مسلح افراد نے اغوا کر لیا ہو اور کسی تنہا جگہ پر لے آئے ہوں۔ یہ اپنی آبرو کا خوف ہوتا ہے۔

ماریا بھی غالباً یہی سمجھ رہی تھی کہ آنے والے منٹوں یا گھنٹوں میں اس کے ساتھ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔

ہم نے جنگل میں قریباً ایک گھنٹا مزید سفر کیا اور ایک ایسی جگہ پر آ گئے جو فیروز اور اسحاق کے خیال کے مطابق

کرتے والوں سے اپنا فاصلہ بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ مسلسل ہمارے پیچھے آرہے تھے۔

اچانک فیروز رک گیا۔ اس نے دھیان سے میری طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک دم بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بظاہر یہی لگا کہ وہ ہانپ کر بیٹھا ہے لیکن میں اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ چکا تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

”کیا ہوا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کچھ تو ہے۔ شاید تم چھپا رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ تاریکی میں اس کے تاثرات پوری طرح تو دکھائی نہیں دیتے تھے، تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم سخت پریشان ہو گیا ہے۔ اس نے ایک نظر اسحاق پر ڈالی۔ وہ رائفل ماریا کی پشت سے لگائے جو کس کھڑا تھا۔ اس نے ٹرپل ٹو رائفل ایک ہاتھ سے تھام رکھی تھی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ ماریا کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی گرہ ٹول رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بجا طور پر یہ خطرہ موجود تھا کہ ماریا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔ اس حوالے سے میرا اپنا تجربہ بھی یہی کہتا تھا کہ ماریا ٹاپ کے سفید فام غیر ملکی زیر ہونے کے باوجود بھی زیر نہیں ہوتے اور اپنی ذہنی برتری کے زعم میں چالاکی دکھانے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔

فیروز مجھے ایک طرف لے گیا اور ہولے سے بولا۔

”کیا تمہیں اس بات پر وشواس ہے جو عام طور پر تمہارے بارے میں اور کچھ دوسرے بندوں کے بارے میں کہی جاوت ہے؟“

”کون سی بات؟“

”یہی کہ... تم لوگ کہیں بھی اپنی مرضی سے نہیں جا سکتے ہو اور نہ ہی اس اسٹیٹ سے باہر نکل سکتے ہو۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک سرد لہری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

”تمہارا مطلب ہے... کہ یہ لوگ... میری وجہ سے... ہمارے پیچھے آرہے ہیں؟“ میں نے انک انک کر پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ بس اسی طرح بے حرکت بیٹھا رہا اور ان دو واقعات آوازوں کو سنتا رہا جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بہت مدھم صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ اسحاق کو شاید ماریا کے ہاتھوں کی کمزور بندش کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ دوبارہ سے باندھنے میں مصروف تھا۔ فیروز نے کھوئی

میری طرح کھانس رہی تھی۔ فیروز نے پھندا کھولنے میں اسحاق کی مدد کی۔

پھندا کھل گیا تو اسحاق نے اسی کپڑے سے ماریا کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیے۔ ماریا اب بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ جب اسحاق اس کے ہاتھ باندھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس پر لعن طعن کر رہا تھا، میں نے سرگوشی میں فیروز سے پوچھا۔ ”کیا فیصلہ ہوا؟“

فیروز بولا۔ ”بس وہ یہاں تک راضی ہوا ہے کہ راستے میں لڑکی کو کچھ نہیں کہے گا۔“

”مطلب ہے کہ وہاں سرگم میں جا کر مار دے گا؟“

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر اپنے راستے پر رواں تھے۔ مجھے فیروز اور اسحاق کی مہارت کی داد دینا پڑ رہی تھی۔ وہ اس تاریک گھنے جنگل میں بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹارچ بھی بس وہ کہیں کہیں خاص ضرورت کے وقت ہی روشن کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اس دشوار گزار راستے کے نشیب و فراز کو اپنے ہاتھ کی پھٹی کی طرح جانتے ہیں۔ فیروز سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے ماریا، اس کے پیچھے اسحاق اور آخر میں، میں تھا۔ ماریا جہاں کہیں ست پڑتی، اسحاق بے رحمی سے اسے رائفل کے بیرل سے ٹھوکا دیتا اور لعن طعن کرنے لگتا... اچانک ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ دور افتادہ آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ یہ آوازیں چونکا دینے والی تھیں۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا۔ جارح کی بہن اغوا ہوئی تھی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کی بازیابی کے لیے جارح اور حکم جی نے اپنے ہر کارے جنگل میں پھیلا دیے تھے۔ یہ لوگ ابھی کافی فاصلے پر تھے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ زیادہ دیر فاصلے پر نہیں رہیں گے۔

”امید نہیں تھی کہ یہ لوگ اتنی جلدی ہماری راہ پر لگ جاویں گے۔“ اسحاق نے دانت پیسے۔

”اب اس حرازدی کے زندہ ہونے کا فائدہ ہووے گا ہمیں۔“ فیروز نے بھی جلتی ہوئی سرگوشی کی۔

واقی یہ لڑکی اب ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثے کی طرح ہو گئی تھی۔ فیروز کو یقین تھا کہ جارح اور اس کے ہر کارے کسی صورت بھی ماریا کی زندگی کا رسک نہیں لیں گے۔ اب ہم نے ٹارچ مستقل طور پر بجھا دی اور بہت احتیاط مگر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں فیروز اور اسحاق نے کئی موڑ مڑے اور شارٹ کٹ راستے استعمال کیے۔ لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم تعاقب

Scanned and Uploaded By Nadeem

چاہیے یا نہیں۔

میں نے فیروز کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں اپنا دل دماغ ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ یہ لڑکی ہمارے ہاتھ میں آگئی ہے۔ ایک طرح سے یہ جارح کی دکھتی رگ ہے۔ وہ اس لڑکی کو چھڑانے کے لیے ہماری کئی باتیں مان سکتا ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

فیروز چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ ہووے گی تو ہمیں یہاں سے نکلنے میں آسانی ہووے گی اور اس کے بعد بھی ہم جارح کی ناک میں تھوڑا لال سکیں گے۔“

”تو پھر اسے روکو۔“ میں نے کہا۔

فیروز نے مجھے رائفل بدست، لڑکی کے پاس کھڑا کیا اور خود اسحاق کو لے کر ایک طرف درختوں میں چلا گیا۔

میں لڑکی سے دو تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور اس کا روشن دائرہ لڑکی پر مرکوز تھا۔ وہ قابل رحم حالت میں تھی۔ چہرہ ایک طرف سے سیاہ کیچڑ میں تھڑا ہوا تھا۔ گلے میں مضبوطی سے بندھے ہوئے کپڑے کی وجہ سے اس کے ماتھے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ پاؤں سے ایک سینڈل غائب تھا۔ بالائی جسم برفقط چولی رہ گئی تھی۔ ہاں وہ قابل رحم نظر آرہی تھی مگر قابل رحم نہیں تھی۔ مجھے اس کی شکل میں جارح کی شکل کی جھلکیاں نظر آئیں۔ وہی جارح جو اس بھانڈیل اسٹیٹ کی عورتوں کا دشمن تھا۔ نہ جانے مختلف جیلے بہانوں سے کتنی زندگیاں تباہ کر چکا تھا۔ یہ اسی کی بہن تھی۔ عورت ہونے کے باوجود وہ اپنے جیسی عورتوں کو برباد ہوتے دیکھتی تھی اور اس کے کان پر جوں نہیں رہتی تھی۔ شاید وہ بھی ان سفید فاموں میں سے تھی جو دیگر رنگ و نسل کے لوگوں کو انسان کا درجہ ہی نہیں دیتے۔ آج وہ اپنے بھائی کے کرتوتوں کے سبب خود ایک سخت مصیبت میں تھی۔ جھاڑیوں کی دوسری طرف فیروز اور اسحاق کا مکالمہ جاری تھا۔ ابھی ان کی آواز مدھم پڑ جاتی تھی، کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسحاق فوری طور پر بدلہ لینے پر تیار ہوا ہے، وہ ماریا کی جان بخشی کے لیے تیار نہیں۔ یہ گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی پھر دونوں واپس آگئے۔ ماریا نے ڈری ڈری نظروں سے اسحاق کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی وحشت جوں کی توں تھی... یہ حال اس کی آنکھوں کی بیجانی کیفیت کچھ ماند پڑی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ماریا کی گردن سے کپڑے کا پھندا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ

رکھنے کے لیے محفوظ تھی۔ یہ جگہ نباتات سے اٹی ہوئی تھی۔ یہ تو رات تھی، غالباً دن میں بھی یہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں گھٹان درختوں کے درمیان ٹھوڑی سی خالی جگہ تھی۔ رات کے وقت ایسی جگہوں پر جنگلی جانوروں کا بہت ڈر ہوتا ہے اور آگ جلانا پڑتی ہے لیکن ہم آگ جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یقینی بات تھی کہ اب تک ہماری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ ہمیں صرف ٹارچ کی روشنی پر ہی انکشاف کرنا تھا۔

اسحاق کی آنکھیں انکاروں کی طرح دھپک رہی تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی وہ جیسے انگریز لڑکی ماریا پر پل پڑا۔ اس نے ماریا کی ساڑی کا وہ حصہ اپنی کمر سے کھولا جو بھاڑ کر علیحدہ کیا تھا۔ اس کی لمبائی دو ڈھائی میٹر رہی ہوگی۔ اس نے یہ کپڑا ایک رسی کی طرح ماریا کے گلے میں ڈالا اور اسے گرہ دے دی۔ ماریا خوف سے چلانے لگی۔ ”ہیلپ، ہیلپ! کوئی ہے؟“

یہاں کس نے ہوتا تھا؟ کپڑے کا دوسرا سرا اسحاق کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں کوئی ایسی مناسب شاخ ڈھونڈ رہا تھا جس پر لٹکا کر سفید فام ماریا کو پھانسی دے سکے اور وہ یہ کام کرنے کے لیے سو فیصد تیار تھا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ پھنکارنے لگا۔ ”میری بہن جس طرح مری تھی، مجھے بھی اسی طرح مرنا ہوگا۔ بس اتنی رعایت تجھ سے ضرور کریں گے کہ تیری عزت خراب نہیں کریں گے۔“

اس نے ساڑی کے کپڑے کو زوردار جھٹکا دیا۔ سانس ماریا کے گلے میں اٹکنے لگی۔ وہ ہوا کے لیے تڑپنا شروع ہو گئی۔ ”ہاں، اسی طرح... اسی طرح۔“ اسحاق نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ”وہ بھی ایسے ہی سانس کے لیے تڑپ تڑپ کر مری تھی۔ زہر کے سبب اس کا گلا اندر سے سوج گیا تھا۔ وہ ہوا سانس نہیں لے سکتی تھی، آج تو بھی تاہیں بھی سانس ملے گی۔“

اس نے شیشم کی ایک موٹی شاخ پکڑ کر نیچے جھکائی اور ساڑی کے کپڑے کا دوسرا سرا شاخ کے اوپر سے گزار دیا۔ اب وہ زور لگا کر کسی بھی وقت ماریا کو ہوا میں لٹکا سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آرہی تھی کہ کچھ دیر پہلے اسحاق نے فیروز سے یہ وعدہ کیوں لیا تھا کہ جارح کی بہن کو زندہ پکڑنا ہے۔ وہ اسے اپنے طریقے سے قتل کرنا چاہتا تھا اور وہ آگ ٹھنڈی کرنے کا خواہاں تھا جو کئی ماہ سے اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

میں نے فیروز کی طرف دیکھا۔ فیروز تذبذب میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ لڑکی کو مار دینا

کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بدستور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ”کیا تم جادوؤں اور عملیات وغیرہ پر دشواں رکھتے ہو؟“

”کیا تم رکھتے ہو؟“ میں نے جوابی سوال کیا۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”رکھتا بھی ہوں اور تاہیں بھی... لیکن ایک بات سچ ہے۔ جو بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی انہونی وجہ تو ضرور ہوتی ہے۔“

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ روحانیت اور مادیت وغیرہ پر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے پیچھے آتے ہوئے دشمن سے خطرہ تھا اور یہ خطرہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آوازیں دو مختلف اطراف سے آرہی تھیں۔

فیروز خاموش تھا اور اس کی خاموشی گہری تھی۔ آخر میں نے پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟ اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو میں تم لوگوں سے علیحدہ ہو جاتا ہوں۔“

”تاہیں نہیں... ایسی بات دماغ میں بھی نہ لانا۔ ہم ساتھ چلے ہیں۔ ہم نے اکٹھے جیتے مرنے کا عہد کیا ہے اور یہ عہد پورا ہووے گا۔“

”لیکن یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ یہ عہد پورا کرتے کرتے ہم سارے ہی دھڑلے جاویں۔“

”تاہیں، اس کا کوئی حل نکالتے ہیں۔“ وہ بے تابی سے بولا اور پھر اٹھ کر اسحاق کے پاس چلا گیا۔

اسحاق اور وہ ایک طرف جا کر مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں ماریا کی نگرانی کے لیے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور بار بار میری رائفل کی طرف متوحش نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔

اسحاق اور فیروز کا مکالمہ دو تین منٹ میں ختم ہو گیا۔ وہ دونوں جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اگر وہ اپنے اندیشوں کے پیش نظر مجھے خود سے علیحدہ ہونے کا کہتے تو میں فوراً ہو جاتا لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

فیروز بولا۔ ”ہم کالی مٹی والے راستے کی طرف سے جاویں گے۔ یہاں ندی بہت تیز چلتی ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے پار کر گئے تو ہمارے بچنے کی آشا پیدا ہو جاوے گی۔“

”وہاں ندی پار کرنے کا کوئی انتظام ہے؟“

”ہاں، انتظام تو ہے۔ اب اللہ کرے یہ انتظام ہمارے کسی کام آسکے۔“ اسحاق نے کہا۔

ایک بار پھر بھگی بھگی سی تاریکی میں ہمارا سفر شروع ہوا۔ اب سمت بدل گئی تھی۔ ہم قدرے ڈھلوان راستے پر بائیں طرف جا رہے تھے۔ یہاں درختوں اور خودرو جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے بار بار ہمارا راستہ مسدود ہو رہا تھا۔ کئی جگہ ہمیں درختوں کے درمیان سے بیٹھ کر اور رینگ کر گزرتا پڑا۔ کپڑے الجھ رہے تھے اور جسم کے عریاں حصوں پر گہری خراشیں آرہی تھیں۔ ماریا کے لیے سفر زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس کے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ اب اسحاق نے اس پر سے رائفل ہٹائی تھی اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ سہارا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھے۔ گاہے گاہے آوازوں کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے تک ہم نے یہ نہایت دشوار سفر ایک ڈھلوان پر طے کیا۔ یہ ڈھلوان غیر محسوس لیکن مسلسل تھی۔ ہم بوقت ضرورت صرف چند سیکنڈ کے لیے نارچ روشن کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ایسے ہی اسحاق نے نارچ روشن کی تو ہمیں خود سے صرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دو نہایت چھیلی آنکھیں نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی خطرے کا شدید احساس ہوا۔ یہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا کوئی جانور تھا۔

ہم اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ ”تیندو!...“ فیروز کے منہ سے بے ساختہ سرسراہٹ ہوئی آواز نکلی۔

ہم اپنی جگہ پتھر بنے کھڑے تھے۔ تب فیروز نے پھرتی دکھائی۔ اس نے تیزی کے ساتھ رائفل پوزیشن کی اور فائر کر دیا۔ رائفل سے شعلہ نکلا اور جنگل دھماکے سے گونج اٹھا۔ وہ تیندو ایا جو کچھ بھی تھا، جھٹکے سے پیچھے گیا۔ یقیناً اسے گولی لگی تھی۔ ایک کرب ناک آواز بلند ہوئی اور روشن آنکھیں... جو چھوٹے چھوٹے سرخ بلوں کی طرح نظر آئی تھیں، تیزی سے تاریکی میں ادھل ہو گئیں۔ کسی درندے کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

درست کہتے ہیں کہ بڑے خطرے کے وقت نسبتاً چھوٹے خطرے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ فیروز کو بھی معلوم تھا کہ فائر کی آواز ہمارے دشمنوں کو ہمارے مزید قریب لے آئے گی لیکن خوں خوار جانور کو اپنے روبرو دیکھ کر وہ پیچھے آنے والے خطرے کو بھول گیا تھا۔ اور اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب جانور تو زخمی ہو کر راہ فرار اختیار کر گیا تھا لیکن جو ”جانور“ ہمارے پیچھے آرہے تھے ان کو واضح راہنمائی مل گئی تھی۔

”ندی کتنی دور ہے؟“ میں نے فیروز سے پوچھا۔

”بس اب پہنچتے ہی والے ہیں۔“ فیروز نے ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

واقعی لگ رہا تھا کہ ہم نباتات کے اس گھنے جال سے نکل کر کسی کھلی جگہ پر پہنچنے والے ہیں۔ ڈھلوان قدرے بڑھ گئی تھی۔ سامنے سے ہوا کی آمد بھی محسوس ہو رہی تھی... ذرا آگے گئے تو پانی کا مدھم شور بھی سنائی دینے لگا۔ یقیناً یہ چوڑی پاٹ والی ایک تیز رفتار ندی تھی۔ ہمارے تھکے ہارے جسموں میں نئی توانائی آگئی۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، پانی کا شور بلند ہوتا گیا۔ آخر ہم لمبے سرکنڈوں میں سے گزر کر ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس تیز رفتار آبی گزرگاہ کا پاٹ خاصا وسیع نظر آتا تھا۔ کنارے دلدلی تھے اور یہاں بہت سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑ رہا تھا۔ قریب ہی گھاس پھوس کی ایک جھوپڑی نظر آئی۔ یہاں دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور رکھوالی کا کتا تھا۔ کتے نے ہماری آمد محسوس کرتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا... اور بے چینی سے اپنے کھونٹے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر ساتھ ساتھ تین کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا بڑی تھی اور اس پر تریال تین ہوئی تھی۔ یہ غالباً پھلیاں پکڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ دو کشتیاں عام سائز کی تھیں۔

جلد ہی کتے کا شور شرابا رنگ لے آیا۔ جھوپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک سایہ متحرک دکھائی دیا۔ فیروز نے نارچ کی روشنی اس پر ڈالی۔ یہ بڑھی ہوئی سفید شیو والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بد حال سی دیسی بندوق تھی۔ وہ فی الوقت صرف ایک لنگی میں دکھائی دے رہا تھا۔

”کون ہو بھئی؟“ وہ دباؤ کر بولا۔

”بندوق نیچے کرلو۔ تاہیں تو اتنی گولیاں لگیں گی کہ شکل پہچاننا مشکل ہو جاوے گی۔“ فیروز بھی جوابا گرجا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نارچ کے روشن دائرے کو حرکت دے کر میرے اور اسحاق کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی جدید رائفلوں کو ہائی لائٹ کیا۔

بات ادھیڑ عمر شخص کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بندوق کی نال نیچے جھکا لی۔ اس کا کتا مسلسل اچھل اچھل کر شور مچا رہا تھا۔ اچانک اس نے کھونٹا اکھاڑ لیا اور تیر کی طرح ہماری طرف لپکا۔ یہ نمک حلائی اسے مہنگی پڑی۔ اسحاق نے اپنی ٹریل نوکا ٹریگر دبا یا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا نشانہ کافی اچھا ہے۔ پہلی گولی نے ہی کتے کو ڈھیر کر دیا۔ وہ ہم سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دوڑ چکیاں کھا کر بے سدھ ہو گیا۔ دھماکے سے جہاں قرب و جوار گونجے، وہیں جھوپڑی کے اندر سے

چلانے کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ جھوپڑی میں ایک یا ایک سے زائد عورتیں موجود ہیں۔

کتے کو گولی لگنے کا منظر ادھیڑ عمر شخص کو سکتہ زدہ کر گیا۔ فیروز پھر گرجا۔ ”بندوق نیچے پھینک، تاہیں تو آوت ہے گولی تیرے کھوپڑے میں...“ نقرے کے آخر میں ایک زوردار گالی بھی تھی۔

اس مرتبہ ادھیڑ عمر شخص نے بندوق پھینک دی۔ فیروز نے اسے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جب وہ چار پاؤں قدم پیچھے ہٹ گیا تو فیروز نے اس کی بندوق اٹھالی۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ ہم جھوپڑی کے پیچھے سیاہ جنگل میں چند جگہوں سے چمکتے دیکھ سکتے تھے۔ یقیناً یہ ہمارے عقب میں آنے والوں کی ٹارچیں تھیں۔

فیروز مجھ سے مخاطب ہو کر تیزی سے بولا۔ ”مہر د! تم دیکھو جھوپڑی میں اور کون ہے۔ ہم کشتیوں کو دیکھتے ہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فیروز اور اسحاق تیز قدموں سے کشتیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ماریا ان کے ساتھ تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ عقل مند دیکھا رہی تھی کہ بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی، ورنہ اسے اب تک اسحاق کی طرف سے کئی چوٹیں سہنا پڑ چکی ہوتیں۔

میں نے رائفل کے زور پر ادھیڑ عمر شخص کو اس کی جھوپڑی سے کچھ مزید پیچھے ہٹا دیا پھر جھوپڑی کے دروازے کو لات مار کر کھولا۔ یہ چوٹی دروازہ تھا اور اس پر ٹین کا پتر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے نارچ کا روشن دائرہ جھوپڑی میں پھینکا تو اندر ایک سکری مکئی مقامی لڑکی نظر آئی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد چادر پلیٹ رکھی تھی اور ایک گوشے میں دبی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر دوا دیا کرنے لگی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور رات کے اس پہر رومانی موڈ میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا لیکن اس فرق کی وجہ جاننے اور تفصیل میں جانے کا وقت ہرگز نہیں تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے جھوپڑی کی تلاشی لی۔ وہاں اب ایک کلباڑی کے سوا کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ یہ عجیب سے پھل والی تیز دھار کلباڑی تھی۔ میں نے یہ کلباڑی بھی قبضے میں لے لی اور جھوپڑی سے باہر نکل آیا۔

ادھیڑ عمر شخص جو یقیناً کنارے پر کھڑی تینوں کشتیوں کا مالک تھا... حکم کا منتظر کھڑا تھا۔ ہمارے لب و لہجے اور انداز نے اسے تقریباً دہشت زدہ کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں

مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو یہ شخص کمزور اعصاب کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس تیز رفتار ندی اور گھنے جنگل کے خطرناک سنگم پر ایک جھوپڑی میں اپنے کتے اور بندوق کے ساتھ تھرا رہنے والا شخص کمزور اعصاب کا مالک تو نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے معلوم ہوا تھا کہ طاقت کیا ہوتی ہے اور منہ زور روٹیوں کے سامنے اچھے بھلے لوگ کیسے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

ادھیر عمر شخص ڈگمگاتا ہوا جھوپڑی میں داخل ہوا تو میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”اپنی بیوی کے ساتھ لیٹ جا اور اوپر چادر لے لے۔ خبردار! جو تم دونوں میں سے کسی نے چادر سے منہ باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ایسا ہوا تو تم دونوں کی لاشیں بھی کتے کے پاس پڑی نظر آئیں گی۔“

ان دونوں نے لیٹ کر چادر اپنے اوپر تان لی۔ میں جھوپڑی کا دروازہ باہر سے بند کر کے کنارے کی طرف آ گیا۔ میرے پہنچنے تک فیروز اور اسحاق نے دو چھوٹی کشتیوں کی رسیاں کاٹ کر انہیں پانی کے تیز بہاؤ میں بہا دیا تھا۔ تیسری کشتی میں ہم خود سوار ہو گئے۔ اب دور دور تک اور کوئی کشتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فیروز نے لمبے بانس نما چوبی مدد سے کشتی کو تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف کھینا شروع کر دیا۔

رواں دواں بہاؤ کی وجہ سے ہم پلک جھپکتے میں جھوپڑی سے بہت دور نکل آئے۔ جھوپڑی کے ساتھ ساتھ... درختوں میں جھپکتے ہوئے جگنو بھی ہم سے بہت دور رہ گئے۔ ہمیں ایسے تیز رفتار اور کامیاب فرار کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق صرف پانچ چھ منٹ میں ہم علاج کی جھوپڑی اور اس کے گھاٹ سے قریباً دو میل آگے نکل آئے۔ کشتی بتدریج دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی، تاہم کنارہ ہنوز بیس تیس میٹر دور تھا۔ کشتی کے اندر سے مچھلیوں کی بو اٹھ رہی تھی۔ مچھلیاں پکڑنے کے جال اور دیگر لوازمات بھی کشتی میں نظر آ رہے تھے۔ کشتی کے پینڈے کو مچھلیاں استور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس پینڈے کو ایک چھوٹے سے تہ خانے کی شکل دے دی گئی تھی۔

ایک گول سوراخ کے ذریعے اس چار پانچ فٹ گہرے تہ خانے میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ میں نے تارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ استور نما تہ خانہ فی الحال خالی تھا۔ اس میں مچھلیاں صاف کرنے اور انہیں نمک وغیرہ لگا کر محفوظ کرنے کا انتظام موجود تھا۔

فیروز نے بہت کوشش کر کے ندی کا دوسرا کنارہ پکڑا۔

ورنہ ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ تاریک پانی کا سرس بہاؤ ہمیں مزید کئی میل آگے لے جائے گا۔ اب کشتی کو روکنے کا مسئلہ تھا۔ وہ کافی وزن دار تھی اور اس کا موٹیم تھا۔ ایک من سب جگہ پر فیروز اور اسحاق چھلانگیں لگا کر کنارے پر پہنچے اور انہوں نے رستوں کی مدد سے کشتی کو سنبھالا۔ اس دوران میں، میں رائفل بدست ماریا کے پاس موجود رہا۔

کشتی رک گئی تو میں نے اور اسحاق نے ماریا کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے وہ اوندھے منہ ریت پر گر گئی۔ اس سے پہلے کہ میں بھی ماریا کے پیچھے کنارے پر اتر جاتا، ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا کہ کشتی کے چھوٹے سے تہ خانے میں کوئی موجود ہے۔ ”کیا بات ہے... تم نیچے کیوں نہیں آ رہے؟“ فیروز نے پوچھا۔

”ایک منٹ... مجھے شک سا ہو رہا ہے۔“ میں نے سرگوشی کی اور پلٹ کر تہ خانے کے سوراخ کی طرف آیا۔ تارچ میرے ہاتھ میں تھی۔

تب دوسری مرتبہ آہٹ ہوئی۔ میں نے تارچ کا روشن دائرہ تہ خانے کے اندر اتارا۔ بظاہر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں ہمت کر کے نیچے چلا گیا۔ یہاں بدبو بھی۔ لکڑی کا فرش گھلا ہوا تھا۔ اس تہ خانے کی چھت اتنی پتلی تھی کہ میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی تارچ کو دائیں بائیں گھمایا۔ اور اچانک سکتہ زدہ رہ گیا۔

لکڑی کے اس غلیظ تہ خانے میں، مچھلیاں پکڑنے والے جالوں، رستیوں اور مختلف اوزاروں کے درمیان ایک جیتا جاگتا شخص موجود تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک لنگوٹ تھا۔ اس کے عریاں جسم پر چند چھوٹے بڑے زخم موجود تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس جوان سال شخص کی ایک ٹانگ اور ایک بازو نڈا رہا تھا۔ وہ چلنے کے لیے جس لکڑی کو پیسا کھی کے طور پر استعمال کرتا تھا، وہ بھی پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔

تہ خانے میں مچھلی کی ناگوار بو کے علاوہ ایک اور بو بھی موجود تھی۔ یہ شراب کی تھی۔ لکڑی کے فرش پر دو تین خالی بوتلیں اڑھکی ہوئی تھیں۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ”کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

جواب نہیں ملا۔ کیچوے کی طرح لیٹا ہوا شخص بالکل بے حرکت رہا۔ بس اس کی سوجی سوجی ہڈیوں میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ وہ شکل و صورت سے نیپال کی طرف کا لگتا تھا۔

جسم کمزور اور میلہ پھیلا تھا۔ اسی دوران میں اسحاق بھی چھلانگ لگا کر واپس کشتی پر آ گیا۔ اس نے کشتی کے تہ خانے میں جھانکا اور پھر تارچ کی روشنی میں میرے تاثرات دیکھ کر اندر آ گیا۔

وہ بھی اس عجیب الخلقیت تنگ دھڑنگ شخص کو دیکھ کر حیران ہوا۔ ”کون ہے یہ؟“ اسحاق نے پوچھا۔

”میں بھی دو تین بار پوچھ چکا ہوں۔ کچھ بتائیں رہا۔ ڈھیٹ بنالینا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اسحاق نے آگے بڑھ کر تارچ کا روشن دائرہ اس کے چہرے پر پھینکا اور پھر غصیلے لہجے میں بولا۔ ”اوائے، کون ہو تم؟ بوتلے کا ہے تاہیں؟“

اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھول کر بے نیازی سے اسحاق کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسحاق نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں لگائی۔ پھر دوسری ٹھوکر پھر تیسری۔

مجھے یوں لگا جیسے یہ شخص بلبلا اٹھے گا مگر حیرت انگیز طور پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شاید اس نے کچھ زیادہ تکلیف ہی محسوس نہیں کی تھی۔ کیا یہ نشے کی وجہ سے تھا یا کوئی اور بات تھی۔ ”اٹھ جاؤ۔“ اسحاق دہاڑا۔

اس مرتبہ عجیب الخلقیت شخص نے اپنے سیاہی مائل ہونٹ ہلائے اور انگریزی میں بولا۔ ”دفع ہو جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ اس کی آواز بھی اس کی طرح عجیب تھی۔

”تمہاری تو ایسی کم تہیسی۔“ اسحاق نے دانت پیس کر رائفل سیدھی کر لی۔ ”اٹھ جا حرامی! ناہیں تو میں گولی چلاؤں۔“ حیرت انگیز طور پر اس بار بھی اجنبی شخص کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اسحاق دہاڑا۔ ”میں پانچ تک گنوں گا پھر گولی بارودوں گا۔“

اس نے کشتی شروع کی... اور پھر ختم بھی کر دی۔ مدقوق شخص اسی طرح پڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا اکلوتا بازو پکڑا اور اسے سیدھا کر کے بٹھانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار تو بیٹھا لیکن پھر منی کے ڈھیر کی طرح ڈھے کر لیٹ گیا۔ اسحاق کا بیانیہ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ اس پر جنونی کیفیت تو پہلے ہی طاری تھی۔ اجنبی شخص کے اڑیل پن نے اسے مزید مشتعل کر دیا۔ اس نے اسے اکلوتے بازو سے پکڑا اور بے دردی سے کشتی کے ڈیک کی طرف کھینچنے لگا۔ اب اس تنگ دھڑنگ شخص نے مزاحمت کی اور تہ خانہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ اب اسحاق کی مخالف سمت میں زور لگا رہا تھا۔ مدقوق ہونے کے باوجود اس کے جسم میں مناسب طاقت موجود تھی۔

Scanned and Uploaded By Nadeem

اسحاق اسے کھینچنے کے ساتھ ساتھ ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اچانک تنگ دھڑنگ شخص نے بھنا کر اسحاق کو لات ماری۔ یہ لات اسحاق کی ناف میں لگی اور وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ بہر حال، یہ جرات تنگ دھڑنگ شخص کو کافی مہنگی پڑی۔ اسحاق نے اس کی جسمانی حالت کی پروا کیے بغیر اسے روٹی کی طرح دھنک دیا۔ دو چار ٹھوکریں میں نے بھی رسید کیں۔ اتنا کچھ کسی صحت مند و توانا شخص کے ساتھ ہوا ہوتا تو وہ بھی تکلیف کے سبب دہائی دینے لگتا، مگر اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا جسم گوشت پوست کے بجائے ربڑ یا پلاسٹک کا بنا ہوا ہے یا پھر وہ اس قدر نشے میں ہے کہ درد کا احساس ہی ختم ہو چکا ہے۔

کشتی بری طرح ڈگمگاتی تھی۔ باہر سے فیروز چلا چلا کر پوچھ رہا تھا۔ ”کیا ہو رہا ہے... کون ہے یہ؟“ وہ ماریا کو اکیلا چھوڑ کر کشتی پر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے تہ خانے میں سے سر باہر نکال کر فیروز کو سلی دی اور بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے دوبارہ تہ خانے میں دیکھا تو تنگ دھڑنگ شخص بالکل بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اسحاق نے رائفل کے وزنی کندھے سے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے نیم جان کر ڈالا تھا۔ ”مر گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ اسحاق نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ باہر نکل گیا۔ میں تذبذب میں کھڑا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ کون تھا؟ اس کے ساتھ کیا گزری تھی اور یہ کشتی چھوڑنے سے کیوں انکار کر رہا تھا؟ اگر ہم اسے اس حالت میں یہاں چھوڑ کر چلے جاتے تو یہ مر بھی سکتا تھا۔ میری تارچ کا روشن دائرہ اجنبی کے چہرے پر تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس شخص کے چہرے میں کہیں اپنے یار عمران کے چہرے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ خاص طور سے اس کی پیشانی، بھوئی اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں... بے شک یہ عمران نہیں تھا۔ اس کے بال ٹھنڈے تھے، قد بھی ذرا چھوٹا تھا... لیکن اپنے پیارے دوست کی ایک ہلکی سی جھلک بھی میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس شخص کے لیے میرے دل میں جو نرم گوشہ شروع سے موجود تھا، کچھ اور وسیع ہو گیا۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ہم اسے یہاں اس حال میں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں۔

میں نے دیکھا، اس کے اکلوتے بازو پر انست روشنائی سے اس کا نام لکھا ہوا تھا... یہ کچھ عجیب سا نام تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا۔

اسی دوران میں فیروز بھی کشتی میں آگیا۔ وہ باہر اسحاق کو ماریا کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بھی دلچسپی سے اس ننگ دھڑنگ شخص کو دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”فیروز! یہ زخمی ہے۔ ہمیں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔“

”لیکن ہمارے پاس وقت بالکل ناہیں ہے۔ ہم گھاٹ سے بہت زیادہ دور نہیں آئے۔ وہ لوگ کسی بھی سے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ عمران نہیں تھا... بالکل نہیں تھا... لیکن اس میں عمران کی ہلکی سی جھلک تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل اس کی طرف کھینچا چلا گیا۔ میں نے پُر زور لہجے میں کہا۔ ”فیروز! شاید یہ مسلمان ہے۔ لگتا ہے کہ ہماری ہی طرح کسی مصیبت میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ حالت بھی حکم جی یا جارج وغیرہ کی وجہ سے ہوئی ہو۔ ہمیں اسے اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

فیروز جڑ بڑ ہو گیا۔ ”لیکن ہم اسے لے جائیں گے کیسے؟“

”چلو، یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے اٹھا لیتا ہوں۔ اس کا وزن ہی کتنا ہے۔“

فیروز نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالباً میرے تاثرات نے اسے سمجھا دیا کہ میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر تم اسے لے جا سکتے ہو تو لے جاؤ۔“

میں نے اپنی رائفل اور نارنج فیروز کو تھمائی۔ ایک کپڑا جلدی سے مدقوق شخص کے سر کے زخم پر باندھا اور اسے اٹھا کر باہر لے آیا۔ کشتی سے اتر کر میں نے اسے کندھے پر لادنا تو وہ بالکل ہلکا محسوس ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کے جسم میں ایک ٹانگ اور ایک بازو کا بوجھ شامل نہیں تھا۔

بارشی جو ہڑ کے اندر پھینک دی تھی۔ وہاں سے مٹنے والی کپکپاہٹ جیو بالکل چھوٹے دستے کی تھی، اسحاق کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس کے عجیب وضع کے پھل سے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے جھاڑ جھکاڑ کو کاٹ رہا تھا۔ ہمارے قدموں میں ایک طرح کی تیزی تو اب بھی موجود تھی لیکن تعاقب کا شدید خطرہ معدوم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا جب ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہ درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے عین درمیان ایک ابھری ہوئی جگہ تھی جیسے کوئی ٹیلا ہو۔ ہم اس چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اسحاق وغیرہ نے ذرا ستانے کے لیے اس ٹیلے کو منتخب کیا ہے لیکن معاملہ کچھ اور تھا۔ فیروز اور اسحاق میں ایک بار پھر کھسر پھر شروع ہو گئی۔ ماریا ایک لاپرواہی کی طرح درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی اکلوتی جوتی اتار چکی تھی۔ اس کے پاؤں بڑی طرح زخمی تھے۔ دشوار گزار سفر نے ہماری طرح اس کے چہرے پر بھی کئی خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس کے کانوں میں ڈانمڈ کے بڑے بڑے آویزے تھے۔ یہ راستے میں شاخوں سے الجھتے رہے تھے اور اس کے ایک کان سے خون رسنے لگا تھا۔

وہ منمنائی۔ ”ہام کو سخت پیاس لگا۔“

میں نے کہا۔ ”پیاس تو ہم کو بھی لگی ہے لیکن یہاں کہیں پانی نظر نہیں آتا۔“

”ڈھونڈو۔ شاید کہیں مل جائے۔“ وہ انگلیں لہجے میں بولی۔ اس کی آواز میں احتجاج تھی۔

”کیا بکتی ہے یہ؟“ اسحاق نے دور سے پھنکار کر پوچھا۔

”پانی مانگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”پلاؤت ہیں۔ ابھی پلاؤت ہیں تجھے پانی۔ ہم بکری کو پانے پلائے بغیر ذبح نہیں کرتے۔“ اسحاق کی آواز میں زہر تھا۔

”یہ کیا کہتا؟“ ماریا نے مجھ سے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ میں نے بے زحمتی سے جواب دیا۔

فیروز بولا۔ ”دیکھ لو، میرے دماغ میں تو جواوت تھا، میں نے جنہیں بتا دیا ہے۔ مشورے سے جو کام ہو، وہ اچھا ہوتا ہے۔“

”ہم مشورے سے ہی چلے تھے۔“ اسحاق ترخ کر بولا۔ ”اور مشورہ یہ تھا کہ اس کتے جارج کو مار کر آویں گے یا خود بھی وہیں رہ جاویں گے۔ وہ حرامی تو بیچ گیا۔ اب کم از کم اس سفید سورنی کی گردن تو توڑیں۔ کچھ نہ کچھ تو ٹھنڈک پڑے ہمارے کپچے میں۔“ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ فیروز ٹھیک کہتا تھا۔ اسحاق نے وقتی طور پر ماریا کی جان بخشی کی تھی۔ اب چونکہ ہم خطرناک حدود سے نکل آئے تھے اور اس زمین دوز دراز کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جہاں انور خاں، چوہان اور دیگر بینیتیں چالیں افراد موجود تھے۔ لہذا اسحاق چاہتا تھا کہ ہمیں اسی جگہ پر ماریا کا کام تمام کر دیا جائے۔ ساڑی کا وہ کپڑا اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ اس سے پہلے رسی کے طور پر استعمال کر چکا تھا۔ اب وہ پھر اسے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ماریا پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ اسے اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اس کے لیے میرے دل میں بھی کسی طرح کا رحم یا ترس موجود نہیں تھا۔ اس کی رگوں میں وہی زہریلا خون دوڑ رہا تھا جو جارج کی رگوں میں تھا اور جارج کی درندگی میں اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس خبیث نے اپنے بیڈروم میں سلطانی کے سامنے مجھے دو بدو مقابلے کا موقع دیا تھا۔ اس نے بھرا ہوا پٹل میرے پاؤں میں پھینک دیا تھا اور مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں ان لحوں کو یاد کرتا تھا تو پسینے میں ڈوب جاتا تھا۔ شاید وہی لمحے تھے... وہی وقت تھا جب میرے اندر تبدیلی کی داغ بیل پڑی تھی۔ میں پستی اور ہزیمت کی انتہا کو چھوونے کے بعد ابھرنا شروع ہو گیا تھا اور اب میں تہ دل سے محسوس کرتا تھا کہ میں ابھر چکا ہوں... بدل چکا ہوں... اور یہ کوئی عارضی تبدیلی نہیں تھی۔ میری کیمسٹری میں مستقل طور پر کوئی رد و بدل ہو چکا تھا۔ میں نے حسرت سے سوچا... کاش ایک بار پھر ”وقت“ اسی طرح مجھے جارج کے روبرو کر دے۔

وہ پٹل میرے سامنے پھینکے اور میری مزاحمت کو لاکارے۔

فیروز نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے گڑ کی شراب پی رکھی ہے جسے ”رم“ کہا جاتا ہے۔ بے خبری کی حالت میں وہ گاہے بگاہے کراہ اٹھتا تھا۔ اس طویل ہنگامہ خیز رات کے بطن سے نمودار ہونے والا یہ انوکھا کردار تھا۔ وہ اس بدبودار کشتی سے کسی جو تک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھے اس کی سخت جانی یاد آئی۔ اس نے اسحاق کے تند و تیز حملے یوں جھیلے تھے جیسے نشانہ اس کا اپنا جسم نہ ہو کسی اور کا جسم ہو۔ اس کی شابست میں کہیں عمران کی ہلکی سی جھلک موجود تھی اور یہ جھلک سیدھی میرے دل پر اثر انداز ہوتی تھی۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، محبوب چیزوں کی طرف تو انسان کا دل کھینچتا ہی ہے، ان سے ملتی جلتی چیزوں پر بھی پیارا جاتا ہے۔ یہ دل کے معاملے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

یہ ایک اسحاق اور فیروز کے درمیان ہونے والا مکالمہ ختم ہو گیا اور اسحاق ایک بار پھر غصے سے بھرا ہوا ماریا کی طرف بڑھا۔ ”پلیز! ایسا مت کرو... پلیز!“ ماریا نے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔

”تیری تو...“ اسحاق پھنکارا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ گر گئی۔

اسحاق جیسے دیوانگی کے عالم میں اس کے اوپر چڑھ بیٹھا اور ساڑی کے کپڑے کو اس کی لمبی گردن کے گرد ایک بل دینے کے بعد بھینچنے لگا۔ ماریا کی آواز گلے میں دب کر رہ گئی... وہ بری طرح چل رہی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ مزاحمت کے قابل بھی نہیں تھی۔ فیروز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر اسحاق کو روکوں۔

میں نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ اسحاق میری بات پر اتنا مشتعل نہیں ہوتا۔ میں نے آگے بڑھ کر ماریا کی گردن اسحاق کے ہاتھوں سے چھڑائی اور اسے ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ وہ اونڈھی ہو گئی۔ بری طرح کھانسنے اور ہانکیاں لینے لگی۔ اسحاق نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟“ وہ دہاڑا۔

”میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تمہارا جو جی چاہے کرنا۔“

”کیا کہتے ہو؟“

میں اسے ایک طرف لے گیا۔ ماریا نے اب بلند آواز سے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ہمت اب جواب دہی جا رہی تھی۔ میں نے اسحاق سے کہا۔ ”مجھے صرف ایک بات بتا دو۔ ہم جارج کو مارنے کے لیے کیوں نکلے تھے... اور یہ سب لوگ جو حکم جی کے مجرم بن کر اب سرنگ میں چھپے ہوئے

Scanned and Uploaded By Nadeem

ہیں، کیوں مجرم بنے ہیں؟

”تم کیا کہنا چاہت ہو؟ یہ سامنے کی بات ہے۔ سلطانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد ہمارا صبر ختم ہو گیا ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ ہماری بہن ہے۔ ہم اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ ہم ان سارے سفید کتوں کو رونے چلانے پر مجبور کر دیں گے۔“

”تم نے بڑی اچھی بات کہی ہے... ہم سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ اب ذرا غور کرو۔ کیا سلطانہ کی آنکھوں میں اس وقت آنسو نہیں آئیں گے جب اسے پتا چلے گا کہ اس کے بوڑھے باپ اور بیمار بھائی کو جارج نے زندہ درگور کر دیا ہے... یا تکلیفیں دے دے کر جان سے مار دیا ہے...“

اسحاق ذرا اٹھکا۔ ”تم کیا کہنا چاہت ہو؟“

”بالکل سامنے کی بات ہے۔ تم لوگ سلطانہ اور اس کے بچے کو تو زرگاں سے نکال لائے ہو لیکن اس کے گھر والے وہیں ہیں۔ یہی بات ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کے شکنجے میں آ چکے ہوں گے یا آنے والے ہوں گے۔ ہم انہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ ہم سب تو وہاں سے نکل آئے ہیں۔ لیکن اب ہم کر سکتے ہیں... اگر چاہیں تو ہم کر سکتے ہیں۔ اس لڑکی کی شکل میں ہمارے ہاتھ ایک بہت خاص پتا آ گیا ہے۔“

اسحاق کی آنکھوں کے شعلے کچھ مدھم پڑ گئے تاہم چہرے کی سختی برقرار رہی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اسحاق... اور بات صرف سلطانہ کے گھر والوں ہی کی نہیں ہے۔ ہم اس لڑکی کے زور پر اور بھی کئی باتیں جارج اور حکم جی سے منوا سکتے ہیں۔ اس لڑکی کو فوری طور پر مار کر ہم بہت کچھ نوا دیں گے۔“

ایسا لگا کہ میری بات اسحاق کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہے۔ اس کا تپا ہوا جسم ذرا ڈھیل پڑ گیا۔ یہ بدلی ہوئی صورت حال دیکھ کر فیروز بھی ہمارے پاس چلا آیا اور اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔

☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم زمین دوز دروازے میں واپس پہنچ گئے۔ اس دروازے کا دہانہ حیران کن حد تک پوشیدہ تھا۔ رات تو رات، دن کی روشنی میں بھی اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ دہانے کی سیاہی دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی ریچھ جھار یوں میں چھپا بیٹھا ہو۔ ہم جس وقت دہانے پر پہنچے، پیدل سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جنگل سے جانوروں کی آوازیں معدوم ہو گئی تھیں اور اس کی جگہ پرندوں کی

چچہاٹ سے بھر رہی تھی۔

غیر متوقع طور پر دروازے کے دہانے پر کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ کچھ عجیب سا لگا، کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے اور تب یہ انکشاف ہوا کہ سرنگ خالی ہے۔ ہم جن چالیس بیالیس ساتھیوں کو یہاں چھوڑ کر گئے تھے، وہ اب یہاں موجود نہیں تھے۔ ان کا سامان وغیرہ بھی ناپید تھا۔ شواہد سے پتا چلتا تھا کہ وہ شاید چند گھنٹے پہلے یہاں سے جا چکے ہیں۔ ایک طرف ٹوٹے ہوئے دستوں والی دوزنگ آلود تلواریں پڑی تھیں۔ ان کے پاس ہی زخموں سے اتاری جانے والی کچھ خون آلود پٹیاں اور خوراک کے بچے گچھے تھے۔ ہاں... یہاں کے مبین یہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ یہ صورت حال خاص طور سے فیروز کے لیے مایوس کن تھی۔ اسے ہندو ماں کا طعنہ دینے والا اکبر بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ شاید فیروز، اکبر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہونا چاہتا تھا اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو، میں نے جان کی بازی لگائی ہے اور دشمن کے گھر میں گھس کر اسے گھاؤ لگایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔

ابھی ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ایک طرف سے آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے گرج دار آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

فیروز نے یہ آواز پہچان لی۔ وہ زور سے بولا۔ ”یہ ہم ہیں انور بھائی... کہیں گولی شولی ناہیں چلا دینا۔“

چند سیکنڈ بعد انور خاں ہمارے سامنے آ گیا۔ فیروز نے گرج کا روشن دائرہ انور خاں کی طرف کیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس کے پیچھے ہمیش بھی باہر آ گیا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ بھکشو ہمیش کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔ یہ ٹیکس چوٹیں سال کا نوجوان تھا اور ان پہرے داروں میں سے تھا جنہوں نے پرسوں مجھے دروازے سے باہر نکلنے سے روکا تھا۔

”یہ سب کیا ہے انور بھائی! باقی سب لوگ کہاں گئے؟“ فیروز نے پوچھا۔

”میں سب بتاتا ہوں لیکن پہلے میری حیرت دور کرو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کہیں میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟ یہ جارج گورے کی بہن ماریا ہی ہے نا؟“

”بالکل انور بھائی! یہ وہی ہے۔ اس حرای نے ہماری مسلمان بہن سلطانہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد وہ

کسی رو رعایت کا حق دار ناہیں ہے اور نہ یہ سفید کتیا ہے۔“

اسحاق نے کہا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر بڑی طرح جھجھوڑا۔ ”ل... لیکن... یہ تم نے کیا کس طرح؟ اور... یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟“

”نتیجہ کچھ ناہیں نکلے گا انور بھائی۔“ اسحاق بولا۔ ”ہم نے یہ سب کچھ سامنے آئے بغیر کیا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر ناہیں کہ اس مسم کو اٹھا کر لے جانے والے کون ہیں؟“

انور خاں کی حیرت برقرار تھی۔ وہ اسحاق کے جواب سے پوری طرح مطمئن بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ ایک ٹانگ اور ایک بازو والے مدقوق شخص پر پڑی۔ اس نے پوچھا۔ ”اور یہ کون ہے؟ اسے کہاں سے اٹھالائے ہو؟“

”یہ بھی ایک عجوبہ سا ہے جی۔ یہ راستے میں ملا ہے۔“ فیروز نے جواب دیا اور مدقوق شخص کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائی۔

انور خاں اور ہمیش حیرت آمیز دلچسپی سے سن رہے تھے۔ انور خاں نے میرے ہاتھ سے گرج لے لی تھی اور اس کی روشنی میں مدقوق شخص کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

مدقوق شخص اب مکمل ہوش میں آ رہا تھا۔ فیروز نے احتیاط کے طور پر اسے ایک گوشے میں لٹایا اور اس کی اکلوتی ٹانگ کو ایک زنجیر سے باندھ کر اس طرح موڑ دیا کہ وہ گھٹنے پر مکمل طور پر مڑ گئی اور سیدھی ہونے سے قاصر ہو گئی۔ ہمارے اور انور خاں کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انور خاں اس بات پر ناراض تھا کہ ہم اسے بتائے بغیر یہاں سے نکل گئے۔ تاہم ماریا کی شکل میں جو ایک ہتھیار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تھا، وہ اس پر خوش بھی تھا۔ اس موقع پر فیروز نے انور خاں کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ماجد بھی ہمارے ساتھ تھا اور وہ زندہ واپس نہیں آ سکا۔ انور خاں، ماجد کو لاپتا سمجھ رہا تھا۔

انور خاں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر کار چھوٹے سرکار نے ایک دلیری کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ انہوں نے سلطانہ، بالو اور مہروز سمیت سب لوگوں کو تل پانی میں پناہ دے دی ہے۔ آج صات دوسرے پہر وہ سب لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔“ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمہیں بھی مبارک ہو مہروز! چھوٹے سرکار کسی کو پناہ دیتے ہیں تو پھر اس پناہ کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ اب تم ہر طرح محفوظ ہو اور جس وقت چاہو تل پانی جا سکتے ہو۔“

”لیکن... تم کیوں نہیں گئے؟ اور ہمیش بھی یہیں ہے... اور اس کے ساتھ یہ تیسرا بندہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمیں پناہ نہیں ملی۔“ انور خاں نے جواب دیا۔ ”اور میرے خیال میں چھوٹے سرکار کا فیصلہ صحیح ہے۔ اگر وہ ہمیں بھی رکھ لیتے تو پھر معاملہ بہت زیادہ بگڑ جاتا تھا۔“ ہمیش بولا۔ ”لوگ تو انور بھائی کے بغیر جانا ہی ناہیں چاہت تھے۔ انور بھائی نے بڑی مشکلوں سے انہیں رضامند کیا۔ یہ انور بھائی کی بڑائی ہے۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم تین بندوں کی وجہ سے باقی لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ میں نے ہمیش اور احمد سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی میری رائے سے رائے ملائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا ہے۔“ انور خاں نے کہا۔

میں سوالیہ نظروں سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انور خاں نے میرے تجسس کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام احمد ہے۔ یہ مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہے۔ پہلے الہ آباد کا چیمپئن تھا، اب الہ آباد سے باہر بھی اس کو مانا جاتا ہے۔“

”اس کے یہاں رہنے کی وجہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”بس سمجھ لو کہ یہ بھی ہم دونوں کی طرح حکم جی کا خاص مجرم ہے۔ اس کا ناقابل معافی قصور میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ انور خاں نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹا بات چیت ہوئی۔ اس میں آئندہ کالائیک عمل طے ہوا۔ اس لائحہ عمل میں میرے لیے یہ تجویز تھی کہ میں خود کو ملنے والے موقع کو ضائع نہ کروں اور فوراً تل پانی کا رخ کروں۔ انور خاں کا کہنا تھا کہ مجھے پناہ مل چکی ہے اور مجھے اپنی بیوی بچے کے پاس ہونا چاہیے۔

میرے اندر کچھ اور طرح کی آندھی چل رہی تھی۔ مجھے پناہ نہیں چاہیے تھی۔ مجھے راستے چاہیے تھا۔ وہ راستہ جو مجھے اس راجواڑے کی حدوں سے نکال سکتا۔ میرے اندر اس قیدی پرندے کی روح تھی جو سدا پر پھڑپھڑاتا ہے اور اپنے دیس میں اپنے پیاروں میں واپس پہنچنا چاہتا ہے۔ مجھے سلطانہ کی حالت پر ترس تو آتا تھا اور میں اسے خطروں سے باہر دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس سے بااس کے بچے سے میری کوئی دلی وابستگی نہیں تھی۔ میری وابستگی تو میری زمین سے تھی۔ میرے گلی کوچوں سے۔ انہی گلی کوچوں میں میرا پیار بھی تھا اور میری نفرت بھی۔ ہاں، میری نفرت بھی۔ انہی گلی کوچوں میں وہ بدذات شخص موجود تھا۔

”کس سوچ میں کھو گئے؟“ ہمیش نے اپنے صفا چٹ سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ وہ ابھی تک بھکشوؤں کے سرخی مائل لباس میں تھا۔

Scanned and Uploaded By Nadeem

”میں تل پانی نہیں چاہوں گا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ ہم ہر مشکل کا مقابلہ اکٹھے کریں گے۔“

”یہ کیا بات کر رہے ہو؟“ انور خاں نے مجھے سرزنش کی۔ ”ہم تمہیں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ ہم نے تم میاں بیوی کو خطرے سے نکالنے کے لیے تو یہ سب کچھ کیا ہے۔“

”اگر تم میرے لیے خود کو خطرے میں ڈال سکتے ہو تو میرا بھی یہ فرض ہے کہ تمہارے خطروں میں جسے داربنوں۔“

ہمارے درمیان چند منٹ تک بحث ہوئی۔ بہر حال، میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ میری خود اعتمادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اب میں جو بات کرتا ہوں اس پر مستحکم رہتا ہوں۔ میرے لیے زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ انور خاں نے مجھے کچھ مزید سوچنے کا مشورہ دیا۔

اسحاق نے ماریا کے پاؤں میں زنجیر ڈالی اور اسے سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اس طرح مقید کر دیا کہ وہ کوئی چالاکی، ہوشیاری نہ دکھا سکے۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ انور خاں کا کہنا بھی یہی تھا کہ یہ بہت ہوشیار و شاطر لڑکی ہے۔ اس کی طرف سے بہت چوکنی رہنے کی ضرورت ہوگی۔ ہم تھکے ہوئے تھے لیکن سوناٹکی چاہتے تھے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ جب ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، دہانے کی طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم جو کس ہو گئے۔ امکان یہی تھا کہ یہ کوئی اپنا بندہ ہی ہو گا۔ یہ خیال درست نکلا۔ یہ چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو تھیلے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ان میں خوراک بھی اور ضرورت کی دیگر اشیاء تھیں۔

ہم ایک دوسرے سے گلے ملے۔ فیروز کو دیکھ کر چوہان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بولا۔ ”میں راستے میں دھانسا مانگتا آ رہا تھا کہ میں یہاں پہنچوں تو تم واپس آ چکے ہو۔ میری دعا قبول ہوئی ہے۔ وہاں تل پانی میں تمہاری بہت زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن تم لوگ چلے کہاں گئے تھے؟“

فیروز بولا۔ ”اس بارے میں بھی آپ کو سب کچھ بتاتے ہیں لیکن تل پانی میں میری کیا ضرورت پڑی ہے؟“

ڈاکٹر چوہان نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے دونوں طرف سے بڑے سخت بیان آرہے ہیں۔ پچھلی بار سلطانہ کو پناہ اس لیے نہیں مل سکی تھی کہ اس پر گارڈ ہارون کی موت کا الزام آ گیا تھا۔ اب یہ بات سامنے آگئی ہے کہ ہارون کو خود حکم جی کے بندوں نے ہی قتل کیا تھا اور اس قتل کے اہم ترین گواہ تم ہو۔ تمہاری گواہی حکم جی اور ان کے ساتھیوں کے منہ بند کر کے رکھ دے گی۔“

فیروز اور اسحاق بھاگ کر گئے اور اپنی رائفلیں اٹھا لائے۔ میری رائفل پہلے ہی میرے پاس تھی۔ ہم نے ٹارجٹس روشن کیں اور چاروں طرف پھیل گئے۔ اچانک تاریکی میں سے فائر ہوا۔ دھماکے کے ساتھ ہی میں نے فیروز کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ کوئی تاریکی میں سے نکل کر دہانے کی طرف بھاگا۔ میرے سینے میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔

خطروں کے دانروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

جائے حکم جی کے اہلکاروں سے مذہبیز ہو گئی۔ وہاں فارنگ ہوئی اور ہمارا ایک ساتھی اور حکم جی کے اہلکار مارے گئے۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی سہیلی کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب و غریب آرمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا اس کی حالت خراب تھی۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارا ساتھی اسحاق ماریا کو مار کر اپنا بدن لپٹا چاہتا تھا مگر ہم لوگوں نے سمجھا بچھا کر اسے اس عمل سے روکا۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے جہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ماریا کو جہاں باندھ کر رکھا گیا تھا، وہ وہاں سے غائب تھی۔ پھر اچانک فارغ ہوا اور فیروز کو کھڑا کر گرا۔ کوئی تاریکی میں سے نکل کر بھاگا۔ وہ ماریا ختمی۔ میرے سینے میں چند گاریاں سی بکھر گئیں۔

۳۔ اب آپ مزید واقعات سے مطلع فرمائیے

میں اس کے پیچھے لپکا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی بڑا ہتھیار نہیں۔ شاید پستول یا ماؤزر ہے۔ وہ پلٹ کر مجھ پر گولی چلا سکتی تھی لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ ابھی میں اس سے دس پندرہ قدم دور تھا کہ وہ حسب اندیشہ پلٹی۔ اس نے فار کیا لیکن نشانہ چوک گیا۔ اسی دوران میں وہ کسی شے سے ٹکرا کر گر گئی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے چھاپ لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ پوری طرح میرے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ انور خاں اور احمد وغیرہ بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے عقب میں ڈاکٹر چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔ ماریا کو بے بس کر دیا گیا۔ وہ بڑی طرح بانپی ہوئی تھی اور ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ ”یو باسٹرڈ! تم کو پتا نہیں کہ تم کیا کر رہا ہے۔ تم کو بہت بُرا نتیجہ بھگتنا پڑیں گا۔ تم لائف اور ڈیٹھ کے درمیان لٹک جائے گا۔“ اسحاق نے اسے چند تھپڑ مارے تو اس کا بیجان قدرے کم ہوا اور اس نے ریوتا شروع کر دیا۔ اس کے ایک پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور جب وہ پھاگ رہی تھی تو وہ اس کے ساتھ ہی گھسٹ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے لٹک رہی تھی۔ اسحاق اور احمد اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے واپس مرکزی جگہ پر لائے۔ فیروز دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں ٹانگ ران پر سے دبا رکھی تھی۔ گولی ران میں لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر اسحاق کا غصہ سوا ہو گیا۔ وہ گالیاں دیتا ہوا ماریا پر پل پڑا۔ اس نے اسے نیچے گرا دیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا بالائی جسم بالکل عریاں ہو گیا۔ وہ چلا رہی تھی اور ”ہیلپ“ پکار رہی تھی۔ اسحاق اپنی بیجانی کیفیت میں شاید اسے بالکل ہی برہنہ کر ڈالتا لیکن میں اور ڈاکٹر چوہان آڑے آئے۔ میں نے اسحاق کو تقریباً گھسیٹ کر ماریا سے پیچھے

بٹایا۔ چوہان نے اسے جسم ڈھانپنے کے لیے چادر دی۔ میں نے کہا۔ ”اسحاق! اگر ہم بھی ایسا ہی کریں گے تو نعران میں اور ہم میں فرق کیا رہ جائے گا؟“ وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔ ”آنکھ کا بدلہ آنکھ، کان کا بدلہ کان ہے۔ یہ سفید ٹانگیں کسی رعایت کی حق دار تھیں۔ اسے اس کا سر نہیں کچل دینا چاہیے۔“ ”دیکھو، تم یہ بھول رہے ہو کہ ہم اس سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ہم اسے زندہ رکھ کر جارج کو کہیں زیادہ تکلیف دے سکتے ہیں۔“ میں نے اسحاق کو بمشکل سنبھالا۔ اس سلسلے میں انور خاں اور احمد نے بھی میری مدد کی۔ ہم اسحاق کو ماریا سے دور لے گئے۔ چوہان، زخمی فیروز کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ اسحاق ڈراٹھنڈا ہوا تو ہم ماریا کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے اس کے لیے لباس کا انتظام کیا گیا۔ زنانہ لباس ملنا تو یہاں مشکل تھا، مجبوراً مردانہ لباس سے ہی کام چلایا گیا۔ پاجامے کرتے پر مشتمل یہ لباس اس سامان میں موجود تھا جو چوہان اپنے ساتھ لایا تھا۔ ماریا چونکہ لمبی تزنگی تھی، یہ لباس اس کے جسم پر پورا آ گیا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اس کے ہاتھ پاؤں دوبارہ باندھ دیے۔ ہاتھ پاؤں تو پہلے بھی باندھے گئے تھے لیکن ماریا نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس کے ہاتھ ساڑی کے کپڑے سے باندھے گئے تھے۔ ماریا نے موم بتی کے شعلے سے اس کپڑے کو جلایا تھا اور ہاتھ آزاد کر لیے تھے۔ اس کوشش میں اس کی ٹانگیوں پر چند زخم بھی آئے تھے۔ بعد ازاں اس نے پاؤں کی زنجیر ایک طرف سے کھول لی تھی۔ دراصل اس زنجیر کو لاک کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اسے رسی کی طرح دو گرہیں دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ گرہیں ماریا نے کھول لیں۔ چھوٹے سائز کا پستول حیرت انگیز طور پر ماریا کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ لیڈی پستول اس کے لباس میں ہی چھپا ہوا تھا۔ جب ہم نے ماریا کو پکڑا تھا تو اس خیال سے اس کی تلاشی نہیں کی تھی کہ وہ ممکنہ میں ایک تقریب میں شرکت

وہ اپنی ”گھر بدری“ کے لیے ملاح سیوک رام کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ سیوک رام تو خود گن پوائنٹ پر رہا ہے اور اسے اپنی تین کشتیوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔ انور خاں ابھی تک اس باروندا نامی شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ انور خاں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس نے چوہان کے توسط سے باروندا سے چند سوال پوچھے تاہم ان سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوا۔ انور خاں نے فیروز سے مخاطب ہو کر بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے شک ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے میں نے اس بندے کو زرگاں میں کہیں دیکھا ہے۔ شاید راج بھون میں ہی دیکھا ہے۔ کوئی خاص موقع تھا شاید۔ ہو سکتا ہے کہ ساتویں کے جشن کا ہی ہٹا لگا ہو۔“

باروندا نامی اس شخص کا شور شرابا جب زیادہ بڑھ گیا تو ڈاکٹر چوہان نے سلطانہ کی طرح اسے بھی معقول مقدار میں افیون کھلا دی اور لمبا لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ باروندا کو زبردستی افیون کی خوراک دینے کے لیے ڈاکٹر چوہان، اسحاق اور انور خاں کو کافی زور آزمائی کرنا پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شخص غلی

ہا حرف جی یا پھر بے لکھا ہوا تھا۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ”مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے میرے گھر سے کیوں نکالا ہے؟ مجھے واپس لے جاؤ۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے واپس لے جاؤ۔“ چوہان بولا۔ ”ہم تمہیں کسی گھر سے نہیں لائے، کشتی میں سے لائے ہیں۔ تم اس بدبودار کشتی کو اپنا گھر کہہ رہے ہو؟“ ”ہاں، وہی میرا گھر ہے۔ مجھے وہاں لے جاؤ۔“ وہ کراہا پھر بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانسنے کھانسنے بولا۔ ”میرا گلابا لکل خشک ہو گیا ہے۔ مجھے تھوڑی سی شراب دو۔“ اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی۔

چوہان نے احمد کو اشارہ کیا۔ وہ ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ عجیب الخلقت شخص نے ایک گھونٹ بھرا پھر کلی کردی اور گلاس ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا بدبودار چیز لے آئے ہو۔ مجھے شراب دو۔ میری سانس رک رہی ہے۔ جلدی کرو۔“

مجھے یاد آیا کہ کشتی میں جہاں ہم نے اس شخص کو پایا تھا، وہیں پر ”رم“ کی بہت سی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ شخص شراب خانہ خراب کا زبردست رسیا ہے۔ نشہ ٹوٹنے کے سبب اب اس کی بری حالت ہو رہی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں شراب موجود نہیں تھی۔ یہاں پناہ لینے والے تقریباً سب ہی مسلمان تھے اور اس لت سے دور تھے۔ چند منٹ کے اندر ہی اس شخص کی بری حالت ہو گئی۔ اس کا مدقوق جسم لرزنے لگا اور سانس جیسے اس کی ہڈیوں بھرے سینے میں الجھنے لگی۔ وہ بار بار کہیں ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ”میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔“

چوہان کے متعدد بار پوچھنے کے بعد اس نے فقط اتنا بتایا کہ اس کا نام باروندا ہے اور وہ طویل عرصے سے اس کھلیاں پکڑنے والی کشتی کے اندر رہ رہا ہے۔ اس رہائش کے لیے اور شراب، خوراک وغیرہ کے لیے اس نے ادھیڑ عمر ملاح سیوک رام کو معقول معاوضہ دیا ہوا ہے۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس حرامی سیوک نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اس نے مجھے کشتی سے نکالنے کے لیے یہ سارا دھوکہ رچایا ہے۔ تم سارے کرائے کے ٹوہو۔ تم نے اس حرامی سیوک سے پیسے لیے ہیں۔“

اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ بول رہا تھا اور بار بار اپنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کوشش اس کی بندھی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے ناکام ہو جاتی تھی۔

میں اپنے کسی ساتھی کا انتظار کر رہا تھا، موہن کمار نے اپنا سر سیدھا کرنے کے لیے اسے بے دردی سے قتل کر دیا۔ اور یہ قاتل موہن کمار اب بھی حکم جی کی ٹانگ کا بال ہے۔ اگر ہارون کے ساتھ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو حکم جی کے کسی وفادار کا جیون محفوظ نہیں ہے۔“ فیروز بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اسے اپنی گواہی کی اہمیت کا احساس ہوا ہے اور وہ جلد از جلد یہ گواہی چھوٹے سرکار کے کانوں تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ میرا اپنا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ اہم گواہی چھوٹے سرکار تک پہنچ گئی تو وہ ضرور اسے متاثر کرے گی۔ وہ ایک انصاف پسند شخص تھا اور یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عدالت میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کا بے لاگ رویہ مجھے یاد تھا۔

سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اسحاق اور انور خاں میں کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ گاہے بے گاہے ان کی آواز قدرے بلند بھی ہو جاتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس بحث میں میرا نام بھی بار بار آرہا ہے۔ کچھ دیر بعد فیروز اور چوہان بھی اس بحث میں شریک ہو گئے۔ اس خیال سے کہ الفاظ مجھ تک نہ پہنچیں، ان چاروں نے اپنی آوازوں کو دبا رکھا تھا۔ صرف اسحاق ہی تھا جو کسی وقت بھڑک کر بولتا تھا اور اس کے الفاظ مجھے سنائی دے جاتے تھے۔ اس نے فیروز کی کسی بات کے جواب میں تیز لہجے میں کہا۔ ”ہم کو چاہیے کہ سچ کو سچ مان لیں اور اس کے ساتھ یہ بھی مان لیں کہ اس وجہ سے ہم سب خطرے میں ہیں۔“

جواب میں چوہان نے کچھ کہا۔ اسحاق کی بھڑکی آواز پھر سنائی دی۔ ”آپ پڑھے لکھے لوگن ہو۔ ظاہر ہے آپ نے پڑھے لکھوں والی بات ہی کرنی ہے مگر جو کچھ سامنے نظر آرہا ہے اس کو ہم کیسے جھٹلا دیں گے اور اگر جھٹلا دیں گے تو اپنے پاؤں پر خود کھڑا ڈی چلا دیں گے۔“

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہی، اسی دوران میں عجیب الخلقت شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی انگوٹھی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر میں باندھ دی گئی تھی اس لیے وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سرنگ کی ناہموار دیوار سے ٹیک لگائی اور سوئی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں عجیب سی لالچلی اور ناراضی تھی۔ اس کے بازو پر امنٹ روشنائی سے لکھا ہوا نام ہمارے لیے اب بھی ناقابل فہم تھا۔ یہ بارید سے یا بارود سے بڑھا جاتا تھا۔ اس کے آگے انگریزی

کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہاں اسلحے کا کیا کام تھا۔ ویسے بھی اس کے عورت ہونے کی وجہ سے ہم نے جامہ تلاشی لینا ضروری نہیں سمجھا تھا مگر اب پتا چل رہا تھا کہ یہ غلطی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ اسحاق نے راستے میں ماریا سے کسی طرح کی رعایت نہیں کی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھے رکھے تھے، ورنہ کئی موقعے ایسے آئے تھے جب وہ بے آسانی ہمیں اپنے اس ننھے سنے لیکن طاقتور پستل سے شوٹ کر سکتی تھی۔

اب ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ یہ لڑکی ہماری توقع سے زیادہ خطرناک ہے۔ احمد نے زنجیر کے لیے ایک چھوٹے سے تالے کا انتظام کر لیا۔ اس کے علاوہ طے ہوا کہ ہم اس لڑکی کو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں گے۔

چوہان نے بڑی مہارت سے ایک تیز دھار خنجر سے نشتر کا کام لیا۔ فیروز نے بھی بہت برداشت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی ران میں سے پستل کی گولی نکال لی گئی۔ کچھ ایلو پیٹھک دوائیں چوہان کے چھوٹے سے بیک میں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان کی مدد سے فیروز کی مرہم پٹی کر دی گئی۔

احمد نے کہا۔ ”فیروز بھائی! آپ کے بچنے سے دہری مسرت ہو رہی ہے۔ آپ سچ گئے اور آپ کی قیمتی گواہی بھی بچ گئی۔“

”اسی لیے کہتا ہوں کہ اس گواہی سے جتنی جلدی فائدہ اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ اگر کوئی انتظام ہو جاوے تو میں ابھی چھوٹے سرکار کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔“

”خیر، اب ایسی جلدی بھی نہیں۔ رات ہو لینے دو۔ اندھیرا ہوتے ہی نگل چلیں گے۔“ چوہان نے کہا۔

”اور اگر اندھیرا ہونے سے پہلے میرے ساتھ کچھ اور ہو گیا تو؟“ فیروز نے کہا۔

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ چوہان نے اثبات میں سر ہلا کر فیروز کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ”تمہیں اپنی جان کی نیس اپنی گواہی کی فکر ہے۔ گھبراؤ مت۔ تمہاری جان اور گواہی دونوں اب سلامت رہیں گی۔“

”میں موہن کمار کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہارون کے قتل میں سب سے بڑا مجرم وہی بد ذات ہے۔ اس نے بے رحمی کی انتہا کی ہے۔ ہارون حکم جی کا وفادار تھا۔ ان کے لیے درجنوں بار اپنا جیون خطرے میں ڈال چکا تھا۔ اس کی قربانیوں کا موہن کمار کی طرف سے یہ صلہ ملا۔ جب وہ زخمی تھا، مرہم اور دوا کے لیے ترس رہا تھا اور اس کھو

کچھ یادیں..... کچھ باتیں

سپنس کے صفحات پر قارئین کے لیے ایک خوبصورت تحفہ

”معراج رسول صاب“

سے ایک خوشگوار ملاقات کا احوال

آپ سب کے بے حد اصرار پر

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کے بانی کی دلچسپ اور ہمہ گیر گفتگو

پر مشتمل انٹرویو اگلے ماہ ملاحظہ کریں

زمین پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ زور آزمائی کی وجہ سے اس کا لنگوٹ عریانی کی حد تک کھسک گیا تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے یہ لنگوٹ پوری طرح کھول کر دوبارہ سے اس کے مد فوق جسم پر باندھ دیا۔

باروندا والا یہ ہنگامہ ختم ہوا تو توجہ پھر اس بحث و مباحثے کی طرف چلی گئی جو کچھ دیر پہلے انور خاں اور اسحاق کی گفتگو سے شروع ہوا تھا۔ چوہان کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آرہی تھی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ہم سرنگ کی اسی حجرہ نما جگہ پر جا بیٹھے جہاں تین دن پہلے فیروز اور اس کے دونوں ساتھیوں نے جارج گورا کو جان سے مار دینے کا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ کسی بھی طرح کی اہم گفتگو کے لیے یہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ یہاں چھوٹی سی لائٹن روشن تھی اور زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی پر میل کی ہلکی سی تیلی تھی۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے چوہان سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ میرے بارے میں کوئی خاص بات چیت ہوئی ہے۔“

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ چوہان نے کہا۔

”شاید اسحاق نے مجھ پر کچھ اعتراضات کیے ہیں؟“

چوہان نے میری سنی آن سنی کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایک بات بتاؤ مہرور۔ میرا مطلب ہے تابش اس بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ میری بات سمجھ رہے ہو؟

تم؟ یہ جو حکم جی کے لوگ سامنے کی طرح تمہارے پیچھے رہتے ہیں اور تم کسی جگہ بھی ان سے محفوظ نہیں ہو۔ اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟“

کچھ دیر پہلے ہونے والی بحث کے موضوع کے بارے میں میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر چوہان! کیا میں یہ سمجھوں کہ اب تمہارے ذہن میں بھی جادوؤں سے والی باتیں آنا شروع ہو گئی ہیں؟“

”نہیں تابش! میں چاہوں بھی تو اس انداز سے نہیں سوچ سکتا۔ لیکن... کچھ لوگ ایسا سوچ رہے ہیں اور اپنی جگہ شاید وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اب تک جو کچھ ہوتا آیا ہے اس کی وجہ سے اچھے بھلے بندے کا ذہن چکر اسکتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے ذہنوں نے ایسی باتوں کو پہلے سے قبول کر رکھا ہو، وہ تو

اور زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اب اس اسحاق ہی کو لو۔ یہ بندہ پہلے سے تعویذ گندے اور تعلیمات وغیرہ پر وشواس رکھتا ہے۔

اب جب یہ تمہارے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دل میں عجیب سے اندیشے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ تمہاری وجہ سے ہم یہاں اس

سرنگ میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے ہر کارے کسی بھی وقت تمہارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”میں نے تو پہلے ہی یہ کہا تھا کہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ آپ سب لوگوں نے مجھے زبردستی روکا تھا۔“

”ہم اب بھی تمہیں زبردستی روکیں گے۔ یہ بات دل سے نکال دو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا۔ لیکن بات یہ ہے تابش کہ ہمیں حقیقت کی حد تک پہنچنا چاہیے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

چوہان خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔

اس کا ذہن جیسے کسی دور دراز کے سفر پر روانہ تھا۔ چھوٹی لائٹن کی مدد سے اس حجرہ نما جگہ کو نیم روشن کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر فیروز اور احمد وغیرہ باتوں میں مصروف تھے۔ ان کی آواز اس شاخ در شاخ سرنگ میں بولے ہوئے گونجتی تھی۔ اس سرنگ سے باہر دھیرے دھیرے شام اتر رہی تھی اور شام کی سیاہی میں سے تھوڑا تھوڑا احمر سرنگ کو بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔

چوہان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا تم دو منٹ کے لیے اپنی قمیص اتار دو؟“

”کیا دیکھنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں، تم قمیص تو اتارو۔“ چوہان لائٹن کو میرے بالکل پاس لاتے ہوئے بولا۔

میں نے قمیص اتار دی۔ وہ اپنا چہرہ میرے سینے کے بالکل نزدیک لے آیا اور بہت فور سے کچھ دیکھنے لگا۔ وہ میری جلد پر ہاتھ پھیر رہا تھا، بڑے دھیان سے وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس نے پنڈلیوں پر سے میرے پا جاے کو اونچا کیا اور گھٹنوں سے اوپر تک معائنہ شروع کر دیا۔

”کچھ مجھے بھی بتاؤ۔“ آخر میں نے زنج بو کر کہا۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔

”تابش! مجھے کئی دنوں سے ایک شک ہے۔ حکم جی اور جارج جیسے لوگوں سے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ یہ یقین ممکن ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے جسم کے اندر کچھ چھپا دیا ہو۔ جس کی وجہ سے انہیں ہر جگہ تمہاری موجودگی کا پتا چل جاتا ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”تمہیں پتا ہی ہوگا، جدید ٹیکنالوجی آج کل کیا کیا کر شے دکھا رہی ہے۔ جنگی اور سمندری حیات پر ریسرچ کرنے والے لوگ جانوروں کے جسم میں چھوٹی چھوٹی چھپیں رکھ دیتے ہیں۔ یہ جیسے ہی توڑ ستور دیتی ہیں اور ان سنگنز کے ذریعے جانوروں کو گتے جنگل اور گہرے سمندر میں بھی دوبارہ کھوج لیا جاتا ہے۔“

میرے پورے جسم میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑ گئیں۔ چوہان نے ایک انوکھا نکتہ بیان کیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے سوچا۔ تو کیا واقعی میں اپنے جسم میں کوئی ”CHIP“ لیے پھرتا ہوں جو حکم جی کے اہل کاروں کو میری لوکیشن کی خبر دیتی رہتی ہے؟

چوہان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ چپ چھپوٹے سے آپریشن کے ذریعے جانور کے جسم میں رکھی جاتی ہے یا پھر اسے ایک ایسا کارٹر پہنا دیا جاتا ہے جس میں چپ موجود ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ حکم جی اور جارج وغیرہ یہ طریقہ ان قیدیوں پر استعمال کرتے ہوں جنہیں وہ ہر صورت اس اسٹیٹ کی حدود میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ماریا کا شوہر سرجن ہے اور جارج کا گہرا دوست بھی ہے۔“ اپنے لہجے میں حیرت کی لہر خود مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”ہاں، میرا اپنا ذہن بھی اس رخ پر سوچ رہا ہے۔“

چوہان نے فوراً کہا۔ ”یہ بات عین ممکن ہے کہ قیدیوں کے اندر چپ رکھی جاتی ہو اور یہ کام ماریا کا شوہر اسٹیل انجام دیتا ہو۔ میں نے اس سے پہلے بھی اندازہ لگایا ہے کہ یہ لوگ یہاں اسٹیٹ میں بڑی رازداری سے مختلف کاموں کے لیے جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کام جارج اور اس کے دو چار ساتھیوں کے ذمے سے لیکن مقامی لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور ان کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسے کاموں کا سہرا حکم جی کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔

مقامی لوگ چونکہ حکم جی کو روحانی پیشوا بھی مانتے ہیں اس لیے انہیں فوراً وشواس ہو جاتا ہے کہ فلاں کام حکم جی نے اپنی اندرونی شکتی کی مدد سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قیدیوں والا معاملہ ہی دیکھ لو۔ یہاں کے سادہ لوح لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان قیدیوں کو جادو کے ذریعے ”کھیل“ دیا گیا ہے اور وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“

میں نے پہلی بار اپنے جسم کو تحقیقی نظروں سے دیکھا۔ اگر واقعی میرے اندر کوئی ”چپ“ وغیرہ رکھی گئی تھی تو پھر اس کا کوئی نشان ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ چپ گہرائی میں نہیں تھی، بالائی جلد کے نیچے تھی تو پھر ٹوٹنے سے اسے محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں چکر میں پڑ گیا۔

چوہان بولا۔ ”ایسا کرتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ وہاں موٹر پر کھڑا ہو کر میں یہ دھیان

Scanned and Uploaded By Nadeem

رکھوں گا کہ کوئی اس طرف نہ آنے پائے۔ تم اپنے سارے کپڑے اتار لو اور بڑے دھیان سے دیکھو کہ کہیں کوئی کٹ وغیرہ کا نشان تو نہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوہان اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے خود کو بے لباس کیا اور جہاں جہاں تک میری نگاہ جاتی تھی، خوب اچھی طرح اپنی جلد کا جائزہ لیا۔ جسم کو ٹٹول کر اور دبا کر بھی کسی چیز کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جسم پر جو چند ایک زخم مندل ہو چکے تھے، ان کے نیچے بھی کچھ چھپایا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر ٹوٹنے اور دبانے سے کچھ نہ کچھ محسوس ہونا لازمی تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد چوہان واپس آ گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کٹ کا نشان تو کہیں نہیں۔ نہ ہی کہیں کوئی اسٹیمپک وغیرہ ہے۔“

میں نے پا جا مہ پہن لیا تھا لیکن بالائی جسم ابھی تک عریاں تھا۔ وہ باریک بینی سے ایک بار پھر میری کمر اور کندھوں وغیرہ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ اگر چوہان کی تھوڑی درست ہے اور میرے جسم میں واقعی کوئی چیز رکھی گئی ہے تو پھر جسم پر سرسری کا نشان ہونا چاہیے تھا۔ دو ڈھائی سال میں تو اس طرح کا نشان معدوم نہیں ہو سکتا۔

شام سے ذرا پہلے جب میں چٹائی پر لیٹا تھا اور اسی معاملے پر غور کر رہا تھا، اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جسم میں ایک جگہ ایسی بھی ہوتی ہے جہاں سرجری کے نشان چھپ سکتے ہیں۔ اگر سر میں کسی جگہ کٹ لگایا جائے یا اسٹیمپک کی جائے تو بعد ازاں بال اسے مکمل طور پر ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے اپنے سر کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

”کیا بات ہے، سر درد کر رہا ہے؟“ میرے قریب لیٹے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لیے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لیے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لیے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لیے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لیے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لیے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لیے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دبے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک نارنج

لے آیا تھا۔ حجرہ نما جگہ پر پہنچ کر میں نے ٹارچ چوہان کے ہاتھ میں تھمائی اور اس سے کہا کہ وہ میرے سر کا معائنہ کرے۔ چوہان نے ٹارچ کی تیز روشنی میں میرے سر کو دیکھنا شروع کیا۔ جب وہ گدی کی طرف آیا تو اس کی انگلیاں ایک دم ٹھک گئیں۔ گدی پر نیچے کی طرف جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں، اسے کچھ نظر آیا تھا۔ ”اوہ گاڈ!“ اس نے سر سرستے لہجے میں کہا۔ ”یہاں کچھ ہے۔ ایک، دو، تین... ہاں، تین ٹائٹل ہیں۔“

اس نے سر کے پیچھے اس نرم جگہ کو چند بار زور سے دبایا اور پھر لرزرتے لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے تابش... ہم نے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہاں گوشت کے نیچے کچھ ہے... کیا تمہیں محسوس ہو رہا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گدی کے پُر گوشت حصے پر رکھا اور میری انگلیوں کی پوروں کو کچھ محسوس کرانے کی کوشش کی۔ میں فوری طور پر تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکا لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ یہاں کچھ ہے۔

ٹارچ کی روشنی میں چار پانچ منٹ کے بغور معائنے کے بعد چوہان نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”ہمارا اندازہ درست نکلا ہے تابش! یہاں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ یہ چیز تھوڑی سی گہرائی میں پلانٹ کی گئی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ... وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔“

”چپ کیوں ہو گئے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے آسانی سے نکالنا نہ جاسکے۔“

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اندیشے جھلک دکھانے لگے۔ اس جھلک نے مجھے بھی متاثر کیا۔ واقعی اگر کوئی شے یہاں موجود تھی اور ہم اسے آسانی سے نکال بھی نہیں سکتے تھے تو پھر مسئلہ گمبھیر تھا۔

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ چوہان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ”اگر یہ چیز یہاں تمہارے جسم کے اندر موجود ہے تو پھر... ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے اہل کار اس چپ کے سگنل پکڑ کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا، میں نے کہا۔ ”ایک بات غور کرنے کی ہے ڈاکٹر چوہان... میں اس سرنگ میں کئی راتیں گزار چکا ہوں اور اب تک کا یہ سارا وقت بخیریت ہی گزرا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس زمین دوز سرنگ میں میرا پتا چلانا مشکل ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر

میرے جسم میں واقعی کوئی چپ موجود ہے تو پھر زیر زمین اس کے سگنل کمزور بھی تو پڑ سکتے ہیں یا ویسے ہی ختم ہو سکتے ہیں۔“ چوہان کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ بولا۔ ”تم نے پتے کی بات کی ہے۔ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، زمین کی سطح سے کم از کم سو فٹ نیچے ہے۔ اور شاید... یہی وجہ ہے کہ یہاں تمہارا کھونچ نہیں لگایا جاسکا۔“

اس نے ایک بار پھر ٹارچ پکڑی اور مزید توجہ کے ساتھ میری گردن کے پچھلے حصے کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تین چار منٹ کے بعد اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تنا نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ہم معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں تمہارے اندر کوئی سگنل دینے والا ڈیوائس رکھا گیا ہے اور یہ ایک چپ ہی ہے۔“

”کیا ہم کسی طرح اسے نکال سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارا یہ سوال غور طلب ہے۔ چھوٹا موٹا آپریشن تو میں خود کر سکتا ہوں لیکن اگر یہ چیز زیادہ گہرائی میں ہے اور ریڈھ کی ہڈی کو چھو رہی ہے تو پھر مشکلات ہو سکتی ہیں۔“

”میرا تو خیال ہے کہ تم ابھی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں، اتنی جلدی نہیں۔ اور نہ ہی اتنی جلدی کی ہمیں کوئی ضرورت ہے۔ یہ بات تو تقریباً کفرم ہے کہ اس سرنگ میں تم محفوظ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم جی کے گارڈز بہت پہلے یہاں بلا بول چکے ہوتے۔“

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی فیروز بھی لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویا تھی۔ اس نے کہا۔ ”اسحاق اب احمد اور انور بھائی کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تابش کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تابش کو چھوٹے سرکار نے ٹل پانی میں پناہ دے دی ہے تو پھر اسے فوراً وہاں چلے جانا چاہیے۔“

چوہان نے کہا۔ ”یہاں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں فیروز! اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہے کہ اس سرنگ میں ہم تابش کے ساتھ بھی بالکل محفوظ ہیں۔“

”آپ کیا کہنا چاہت ہیں؟“ فیروز نے پوچھا۔

جواب میں چوہان نے فیروز کو سب کچھ بتا دیا۔ میرے جسم کے اندر کسی چپ کے بارے میں جان کر فیروز ششدر رہ گیا۔ پہلے تو اسے اس بات پر یقین نہیں آیا لیکن جب ساری تفصیل اس کے سامنے آئی تو وہ ہماری باتوں کو اہمیت دینے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ باقی قیدی بھی جن کے بارے میں کہا جاوے ہے کہ وہ حکم جی کے سر کے اثر میں ہیں، دراصل اسی طرح سے جکڑے گئے ہیں؟“

”اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ چوہان نے کہا۔ ”ان قیدیوں میں سے کوئی اگر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو سگنل پکڑنے والے آلے کے ذریعے اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ہو، دھریا جاتا ہے۔ تابش کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ یہ جب بھی زرگاں کی حدود سے نکلا ہے، فوراً اس کا پیچھا کیا گیا ہے اور یہ جہاں کہیں بھی گیا ہے اس کو گھیر لیا گیا ہے۔“

”ایک بات اور بھی سمجھ میں آرہی ہے۔“ فیروز نے تفصیلی انداز میں سر ہلایا۔ ”کسی بھاگنے والے کو جب بھی پکڑا جاوے تھا، پکڑنے والے تیواری لال اور ڈیوڈ ہی ہووت تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کی خاص طور پر تربیت دی گئی ہو۔ ڈیوڈ تو جارج گورا کا قریبی ساتھی ہے اور بہت ہنرمند بھی سمجھا جاوے ہے۔“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔“ چوہان نے تائید کی۔ ”عین ممکن ہے کہ ان لوگوں کے پاس سگنل ریسیور کرنے والا ڈیوائس اور اثینا وغیرہ ہوتا ہو۔ اس کی مدد سے وہ کسی بھی جگہ پر اپنے شکار کو ڈھونڈ لیتے ہوں۔“

”لیکن کیا دوسرے لوگ ان باتوں پر وشواس کر لیں گے؟ جیسے یہ اسحاق ہے۔ اس کو پورا پورا یقین ہے کہ حکم جی جادو ٹوٹنے اور عملیات کا ماہر ہے۔ وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو عام لوگ نہیں کر سکتے۔ اس کے دل میں عجیب طرح کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم آسانی سے اس خوف کو نکال سکیں گے۔“

”جج کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود کو منوا لیتا ہے۔ اگر ہم کوشش کریں گے اور حکم جی کی سازشوں کے مناسب ثبوت دیں گے تو لوگ بھی حقیقت کو تسلیم کرنا شروع کر دیں گے۔“ چوہان نے وثوق سے کہا۔

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ سرنگ کے دہانے کی طرف کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر گھنٹیاں سی بجنا شروع ہو گئیں۔ ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں اور دہانے کی طرف لپکے۔ خطرے کا احساس میرے دل کو طوفانی رفتار سے دھڑکایا کرتا تھا لیکن آج کل ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ آج کل اس طوفانی دھڑکن کے بجائے سنسنی کی ایک لہری سراپا میں دوڑتی تھی اور دل میں مرنے یا مار دینے کی امنگ پیدا ہوتی تھی... ہاں، موسم بدل چکے تھے۔ جس اور ٹھن کی ایک طویل رست نے

بالآخر دل و دماغ کو ایک آشوب سے آشنا کر دیا تھا۔

ہم قریباً دوڑتے ہوئے دہانے پر پہنچے۔ یہاں چند بکریاں نظر آئیں۔ وہ جیسے زبردستی اس قدرتی سرنگ میں گھس آئی تھیں۔ سانولے رنگ کا ایک ادھیڑ عمر چرواہا انہیں واپس لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ بکریوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں کی آواز پوری سرنگ میں گونج رہی تھی۔

چرواہے کو دیکھ کر چوہان ٹھک گیا اور بولا۔ ”میں اسے جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اتفاق سے یہاں نہیں آیا۔ یہ کوئی چکر ہے۔“

احمد دہانے کی نگرانی پر موجود تھا۔ وہ چرواہے سے الجھ رہا تھا۔ چوہان تیزی سے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ادھیڑ عمر چرواہے نے چوہان کو دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ بھی اسے پہچانتا ہے لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ چوہان اور چرواہے میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہ دونوں ایک گوشے میں چلے گئے۔ کم عمر لڑکا بکریوں کو سمیٹ کر دہانے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ شکل سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ چرواہے کا بیٹا ہے۔ دونوں کا لباس دھوئی، کڑتے اور پکڑی پر مشتمل تھا۔ چوہان اور چرواہے کے درمیان پانچ دس منٹ بات ہوئی پھر چوہان، چرواہے کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ چرواہے نے اپنے کندھے سے ایک گھڑی سی لٹکار رکھی تھی۔

چوہان نے سنسنی آمیز لہجے میں چرواہے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام زیندر سنگھ ہے۔ یہ دراصل چھوٹے سرکار کے مصاحب خاص مرادشاہ صاحب کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر آیا ہے۔“ پھر چوہان نے اس چرواہے زیندر سنگھ سے کہا کہ وہ اپنی زبان سے سب کچھ بتائے۔

زیندر سنگھ کا رنگ سانولا تھا۔ اس نے سرمیہ لگا رکھا تھا۔ اس کی مہندی لگی داڑھی دھول مٹی سے لٹی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایسی مقامی زبان میں بولنا شروع کیا جس کے بہت کم الفاظ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہر حال فیروز، اسحاق اور انور خاں وغیرہ اس کی بات خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران میں انہوں نے دو چار سوال بھی زیندر سے کیے۔ آخر میں فیروز نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”مرادشاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہم جارج کی بہن ماریا کو اٹھا کر یہاں سرنگ میں لے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارا یہ فعل کافی سخت ہے اور ہم اس کی مذمت کرنے پر مجبور ہیں... لیکن وقت اور موقع کل کے لحاظ سے یہ فعل ٹھیک بھی ہے کیونکہ ماریا کی وجہ سے کسی حد

ہم اب ماریا کے اغوا کو راز میں نہ رکھیں اور اس کی ذمہ داری قبول کر لیں۔

”اس کی وجہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وجہ وہی ہے جو ہمارے ذہن میں بھی آئی تھی۔ زرگاں میں حکم جی نے سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ اس وقت جارج کی جیل میں ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زرگاں کے مختلف علاقوں سے پچاس ساٹھ لوگ پکڑے گئے ہیں۔ ان پر جارج کے گھر کے سامنے مظاہرہ کرنے، گولی چلانے اور توڑ پھوڑ مچانے کا الزام ہے۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ ان میں انور خاں کے تین چار رشتے دار بھی شامل ہیں۔ اگر ہم ان سب لوگوں کی جان بچانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے۔ ہم اعلان کر دیں کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کی زندگی تب ہی محفوظ رہ سکتی ہے جب حراست میں لیے گئے لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں حکم جی تک یہ پیغام پہنچانا ہوگا کہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور اس کا کوئی ثبوت بھی دینا ہوگا؟“ احمد نے کہا۔

”بالکل، اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔“ انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”پیغام کس طرح پہنچایا جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے لیے کوئی بندہ ڈھونڈنا ہوگا جو پیغام رسائی کر سکے اور اس کی جان کو بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔“ انور خاں نے کہا۔

”کیا ہم اپنے اس ٹھکانے کو اب بھی خفیہ رکھیں گے؟“ اسحاق نے پوچھا۔

”ہمیں ایسا کرنا تو چاہیے لیکن میرے خیال میں اب ہم کر نہیں سکیں گے۔“ چوہان بولا۔ ”جب پیغام رسائی شروع ہوگی تو پھر اس ٹھکانے کو چھپایا نہیں جاسکے گا۔ ویسے بھی چھوٹے سرکار اور مراد صاحب کی طرف سے اطلاع ہے کہ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے آس پاس پہنچ چکے ہیں اور چپے چپے پر ہماری تلاش ہو رہی ہے۔ وہ لوگ کسی بھی وقت سرنگ کا حوج لگا سکتے ہیں۔“

نریندر سنگھ اب جلدی جانے کی فکر میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بارشی جھیل ڈول کے کنارے پر رہتا ہے اور اسی علاقے میں بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے جیسے جیسے موقع ملے گا، وہ چھوٹے سرکار کا پیغام ان تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

تک جارج وغیرہ کو لگام ڈالی جاسکتی ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہم ماریا کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے ذریعے جارج وغیرہ سے کچھ باتیں منوانے کی کوشش کریں۔ لیکن ہماری یہ کارروائی اس طرح ہونی چاہیے کہ یہ ہمارا اپنا ہی کام نظر آوے۔ اور اس کا الزام مل پانی والوں پر بالکل دھرا نہ جاسکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز ناہیں کہ ہم اس کام میں بے آسرا ہوویں گے۔ ہمیں اندر خانے چھوٹے سرکار کی حمایت و ہمدردی حاصل رہے گی اور جس طرح ہو سکا، وہ ہماری مدد بھی کریں گے۔“

یہ بڑی غیر متوقع صورت حال تھی۔ بہر طور اس سے چھوٹے سرکار کی فہم و فراست بھی سامنے آ رہی تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے کھلم کھلا کر لیے بغیر اس کی نا انصافی و من مانی کا زور توڑنا چاہ رہا تھا۔

چوہان نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ چھوٹے سرکار حکم جی کی چال بازیوں کا مقابلہ حکمت عملی سے کرنا چاہ رہے ہیں اور اب بھی ان کی خواہش ہے کہ کھلم کھلا تصادم سے بچا جائے۔ انہوں نے کہا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت انہیں ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ صرف دکھاوے کے لیے ہوگا اور ہمیں اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”اس کا کیا مطلب ہے؟“ احمد نے پوچھا۔ ”کیا چھوٹے سرکار بھی ماریا کو چھڑوانے کے لیے ہم پر کسی طرح کا دباؤ ڈالیں گے؟“

”ہاں، کوئی اس قسم کی صورت حال ہو بھی سکتی ہے۔“ چوہان نے کہا۔

چوہان نے نریندر نے رازداری کے انداز میں دائیں بائیں دیکھا پھر اپنے کندھے سے لٹکی ہوئی گھڑی ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس نے گھڑی کی گرہ کھولی۔ گھڑی کے اوپر جامن کے پتے، چوکر اور گز وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی پونلیاں تھیں۔ ان پونلیوں کے نیچے دو تین بڑی خاص چیزیں تھیں۔ ایک فوجی طرز کی طاقتور دوربین تھی۔ ایک اسٹائپرکین تھی جس کو کھول کر تین چار ٹکڑوں میں رکھا گیا تھا۔ اس پر بھی چھوٹی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا بس تھا۔ اس میں مرہم پٹی کا سایاں تھا۔ کچھ ایلو پیٹھک اور ویسی دوائیں بھی بکس میں موجود تھیں۔

نریندر سنگھ نے مقامی زبان میں چوہان سے کچھ کہا۔ چوہان نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ”نریندر بتا رہا ہے کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب یہ چاہتے ہیں کہ

ستے رکھ کر ایک محفوظ آڑ بنائی گئی۔ اس آڑ میں کم از کم تین راکٹل بردار پوزیشن لے سکتے تھے۔ یہاں سے نشیب میں بھی کافی آگے تک نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ اس سے پیچھے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایک اور مورچا بنایا گیا۔ ہنگامی حالت میں اسے دوسری دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ دوربین کے بہتر استعمال کے لیے دہانے سے باہر ایک آڑ تلاش کر لی گئی۔ اس مورچا بندی میں انور خاں نے اہم کردار ادا کیا۔ لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اس کا تجربہ کافی وسیع لگتا تھا۔

رات آخری پہر ہم نے کچھ دیر کے لیے آرام کیا۔ ہم اپنے ساز و سامان سمیت اب دہانے کے قریب ہی قیام پذیر ہو گئے تھے۔ میں چوہان اور اسحاق سرنگ کی گہرائی میں تھے۔ میرے گہرائی میں رہنے کی وجہ وہی چپ والا معاملہ تھا۔ میری آنکھ ایک شور کی وجہ سے کھلی۔ یہ شور دہانے کی طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں تھیں اور گھڑ سواروں کی بلند آوازیں تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ دہانے سے باہر چاروں طرف چکرارہے ہیں۔ انور خاں دہانے کی طرف سے بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی لائسنس بھجادی اور بیجانی لہجے میں بولا۔ ”یہ حکم جی کے لوگ ہی ہیں۔ میں نے آوازوں سے پہچان لیا ہے۔ ان کی تعداد چالیس پچاس سے کم نہیں ہے۔ یہ سب سرج ہیں اور ان کے پاس بڑی ٹارچیں ہیں۔ نریندر سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ لوگ جنگل کا چپا چپا چھان رہے ہیں۔“

اسحاق بھڑک کر بولا۔ ”میں نے جو بات کہی تھی وہ آپ لوگوں کی سمجھ میں ناہیں آئی تھی۔ اب آپ نے دیکھ لیا نا کہ یہ لوگوں یہاں پہنچ گئے ہیں۔“

”تم نے غلط کہا تھا اسحاق۔۔۔ اور تم اب بھی غلط کہہ رہے ہو۔“ چوہان نے برزور لہجے میں کہا۔ ”ان لوگوں کے یہاں پہنچنے کا تابش سے کوئی تعلق نہیں۔ خود کو خواخواہ و اہموں کا شکار نہ کرو۔ حکم جی کے کارندوں کی ٹولیاں ہر جگہ بھگ رہی ہیں اس لیے یہاں بھی پہنچ گئی ہیں۔“

اسحاق نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر منہ بنا کر رہ گیا۔ دس پندرہ منٹ اسی طرح شدید تناؤ میں گزر گئے۔ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے دہانے تک نہیں پہنچ سکے لیکن وہ یہاں سے گئے بھی نہیں۔ وہ اس علاقے کے بارے میں اپنی پوری تسلی کر رہے تھے۔ آخر گھوڑوں کی کھڑکی بکھری ٹاپیں اور گھڑ سواروں کی آوازیں ایک جگہ جمع ہوئیں۔ آثار سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اب آگے روانہ ہو رہے ہیں۔ کچھ

وہ کافی تناؤ بھری اور پرجوش رات تھی۔ ماریا کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسا ترب کا پتا آیا تھا جس سے ہم حکم جی جیسے شخص کے پسینے چھڑا سکتے تھے۔ چھوٹے سرکار اور مراد صاحب نے برملا انہیں یقین دلایا تھا کہ زرگاں والے ماریا کی جان کا خطرہ کسی بھی صورت میں نہیں لیں گے۔ اب اسحاق کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ماریا کو مار ڈالتا تو یہ کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ آدھی شب کے وقت لائسنس کی مدد ہم روشنی میں ہم ساتوں کے درمیان پھر طویل گفتگو ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ حکم جی تک یہ پیغام کس طرح پہنچایا جائے کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کے بدلے میں ہمارے مطالبے یہ ہیں۔ احمد نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام میں کرنا چاہت ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حکم جی اور جارج مجھے کوئی نقصان ناہیں پہنچائیں گے۔ میرے پیچھے میری برادری کا ہاتھ ہے اور سب جانت ہیں کہ حکم جی کے سپاہیوں میں میری برادری کے لوگوں خاص عہدوں پر ہیں۔“

”لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس پیغام رسائی کے لیے کوئی غیر جانب دار بندہ استعمال کیا جائے اور تم غیر جانب دار نہیں ہو۔“ چوہان نے کہا۔

”اس جنگل میں آپ کو ایسا غیر جانب دار کون ملے گا جو اچھی طرح سے ہمارا پیغام بھی پہنچا سکے؟“

اس سے پہلے کہ احمد اور چوہان میں تکرار شروع ہو جاتی، انور خاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”پیغام بر چھننے سے زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ پہلے ہم اپنا مورچا مضبوط کر لیں۔ ہمارے پاس اتنا انتظام ہوتا چاہیے کہ ہم اس لڑکی کے ساتھ آٹھ دس یا پندرہ بیس روز بھی اس سرنگ میں گزرا سکیں۔“

”ہمارے پاس پانی اور خشک لکڑیوں کی کمی ہے۔ باقی چیزیں تو گزرا رہے مابق موجود ہیں۔“ چوہان نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ پانی اور لکڑی کا انتظام کیا جائے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہم دہانے کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اس جگہ کو ایک اچھے مورچے کی شکل دے دیں۔“ انور خاں نے کہا۔

کسی کو انور خاں کی بات سے اختلاف نہیں تھا۔ اگلے دو تین گھنٹے اسی انتظام و انصرام میں گزارے گئے۔ کچھ مدتوں اور چند بڑے شاپرز میں پچھ پانی جمع کیا گیا۔ اس کے علاوہ سرنگ کے دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے چند بڑے

اب واپس آ رہے تھے۔ جلد ہی ان کے گھوڑوں کی ہینا ہٹ اور ان کی ڈینی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ”کون ہے یہاں... کون ہے؟“ ایک کڑک دار آواز گونجی۔

مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ موہن کمار ہی کی آواز تھی۔ وہ لوگ سرنگ کے ارد گرد گھوم رہے تھے لیکن ابھی تک دہانہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ انور خاں نے دلیرانہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنی ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی دہانے کی طرف پھینکی۔ اب موہن کمار اور اس کے گھڑسواروں کے لیے دہانے کا کھوج لگانا مشکل نہیں رہا۔ وہ چاروں طرف سے سمت کریوں دہانے کی طرف آئے جیسے مقناطیس کی طرف لوہا چون آتا ہے۔ ان گنت ٹارچیں سرنگ کے دہانے کے ارد گرد چمکنے لگیں۔

موہن کمار گرجا۔ ”کون ہو تم لوگ؟“

انور خاں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”کہنے کو تو ہم تمہارے باپ ہوتے ہیں لیکن لوگ ہمیں شہنشاہ کہتے ہیں۔“ تاریکی میں سے موہن کمار کی آواز ابھری۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم انور خاں ہو۔ میں یہاں اس کھوہ میں تمہاری آواز سن کر حیران ہوں۔“

”ابھی تمہیں اور حیران ہونا ہے موہن کمار... اتنی حیرت داخل ہونے والی ہے تمہارے دماغ کے اندر کہ تمہاری حیرت دانی ایک دم چوڑی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ پھٹ بھی جائے۔“ انور خاں ہر قسم کے تناؤ سے بالکل آزاد نظر آتا تھا۔ وہ دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے تنوں کے عقب میں کھڑا تھا جبکہ موہن کمار دہانے کے سامنے ہیں تیس میٹر کی دوری پر تھا۔

”تم سامنے آؤ انور خاں اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟“

”میرے ساتھ بڑے خاص لوگ ہیں موہن کمار... وہ سامنے آئیں گے تو تمہاری سٹی گم ہو جائے گی۔“

”پہیلیاں نہ بھجواؤ انور خاں۔ تم جانتے نہیں ہو کہ تم لوگوں کے لیے حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ تم نے غداری کی ہے، جس تھالی میں کھانا ہے اسی میں چھید کیا ہے۔ وہاں زرگاں میں جارج صاحب کی کوٹھی پر جو کچھ ہوا ہے، اس کے سب سے بڑے ذمے دار تم ہو... لیکن... لیکن... اگر تم خود کو قاتلوں کے حوالے کر دو... تو اب بھی تم سے رعایت ہو سکتی ہے۔ حکم جی اب بھی تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کر سکتے ہیں۔“

”نرمی کا معاملہ تو تمہارے حکم جی کو کرنا ہی پڑے گا اور رعایتیں بھی دینی پڑیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تمہارے

ہی دیر بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگیں۔ چوہان نے سوالیہ انداز میں اسحاق کی طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہا ہو... اب کیا خیال ہے؟ حکم جی کے جادو کا زور ان گھڑسواروں کو سرنگ کے اندر کیوں نہیں لایا؟

ظاہر ہے کہ اگر چوہان یہ سوال پوچھتا بھی تو اسحاق کے پاس اس کا جواب موجود نہیں تھا... انور خاں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اب ہم کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہم ان کو اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں یا نہیں؟“

سب خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ نازک فیصلہ تھا۔ خود کو عافیت سے نکال کر شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا... بلکہ ہم اس حوالے سے پیغام بر بھیجنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جب تک ہم اپنے پاس ماریا کی موجودگی کا اعلان نہ کرتے حکم جی اور جارج سے کوئی مطالبہ کیسے منوا سکتے تھے؟ انور خاں بولا۔ ”لگتا ہے کہ تم سب کے لیے یہ فیصلہ کافی مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ چلو اگر تم چاہتے ہو تو سب کی طرف سے میں ہی فیصلہ کیے دیتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی انور خاں نے اپنی رائفل کا رخ دو دہانے کی طرف کیا اور اوپر تلے تین چار فارکر کر دیے۔ راست کے سناٹے میں دھماکوں کی آواز جنگی میں دور تک گونجی۔ اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ یہ آواز گھڑسواروں کے جتنے تک بھی پہنچی ہوگی۔ ”چلو، اب اپنی اپنی پوزیشن سنبھالو۔“ انور خاں نے پکار کر کہا۔

ہم سب دہانے کی طرف دوڑے اور اپنی اپنی طے شدہ جگہ پر بیٹھ گئے۔ فیروز چونکہ زخمی تھا اس لیے وہ اپنی رائفل کے ساتھ ماریا اور باروندا کے قریب موجود رہا۔ ماریا کے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی شکار کیے ہوئے پرندے کی طرح کچی زمین پر پڑی تھی۔ پچھلے پالیس گھنٹوں میں وہ اپنی تمام شان و شوکت، نفاست اور نخوت سمیت عرش سے فرش پر آ گئی تھی۔ اس کے دکتے چہرے پر کچھ سوکھ کر سفیدی مائل ہو چکا تھا اور اس کے نازک پاؤں زخم زخم تھے۔ وہ یہ پاؤں ہلاتی بھی تھی تو سسک اٹھتی تھی۔ احمد نے اس کے نیچے چٹائی بچھانا چاہی تھی مگر اسحاق نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ جارج کی اس خود سربہن کو تھوڑی سی رعایت یا عزت دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

ہم دہانے پر پہنچے اور رائفلیں سونت کر تیار ہو گئے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق گھڑسوار رک گئے تھے اور

حکم جی اور جارج گورا کے بیٹوں ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ زیادہ زور لگائیں گے تو ان کی گردنیں کڑک ہو جائیں گی۔“

”تم کیا بک رہے ہو... ہوش میں تو ہو؟“ موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”تمہارے گورا صاحب کی بہن ماریا اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا جیون نس اسی صورت میں محفوظ رہے گا جب گورا اور حکم ہمارے حکم کے مطابق چلیں گے۔ اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے موہن کمار! ہم ماریا کو مارنے کے لیے اتنے ہی تیار ہیں جتنے تم اپنی اگلی سانس لینے کے لیے تیار ہو۔ اور میں تمہیں بتا دوں، اس سلسلے میں ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔ ماریا کی لاش کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا... کچھ بھی نہیں۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے انور خاں کی آواز میں عجیب ورنہ کی درا آئی۔ دہانے سے باہر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ تاریکی میں ٹارچوں کی روشنیاں تو چمکتی رہیں لیکن کہیں کوئی حرکت نظر آئی اور نہ آواز سنانی دی۔

”کیا ہوا موہن کمار! اسکتے میں چلے گئے ہو یا دل کا دورہ پڑ گیا ہے؟“

موہن کمار کی لرزاں آواز ابھری۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ماریا صاحبہ تمہارے پاس ہیں؟“

”کیا ثبوت چاہتے ہو؟ اس کا ہاتھ کاٹ کر بھیجوں، ناک کاٹوں یا کچھ اور؟“

”تم... تم اپنے لہجے کو بدلو انور خاں۔“ موہن کمار نے شہنائے ہوئے انداز میں کہا۔

”اب لہجہ نہیں بدل سکتے موہن کمار! اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب حکم جی سے اور اس کے پالتو کتوں سے ہماری فحش جنگ ہے۔“

ایک بار پھر دہانے سے باہر سناٹا چھا گیا۔ اسحاق آگے آیا اور گرجا۔ ”موہن کمار! جا کر اپنے آقا کو بتا دے کہ اس کے پاپوں کا گھڑا بھر چکا ہے۔ اب یہ گھڑا بیچ چور ہے پر ٹوٹے گا اور سارا سنسار دیکھے گا۔ اب اسے اور اس کے ٹوٹے کو بھاگنے کے لیے راستہ نہیں ملے گا۔ ہم انہیں جن جن کر ماریں گے اور اس راہواڑے کو ان کے گندے وجود سے پاک کر دیں گے۔“

”لگتا ہے کہ تم سب نشے میں ہو اور اسی نشے کی حالت میں مارے جاؤ گے۔“

”ہم ہوش میں ہیں... اور اب تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا وقت ہے۔“ انور خاں گرجا۔ ”جو کچھ تم نے سلطانی

کے ساتھ کیا ہے، وہ ہم بھی جارج گورے کی بہن کے ساتھ کر سکتے تھے... اور ایک بار نہیں بیسیوں بار کر سکتے تھے لیکن وہ بیٹی ہوئی ہے... ہاں، اس کی جان شدید خطرے میں ہے اور یہ خطرہ تب ہی مل سکتا ہے جب حکم اور جارج غیر مشروط طور پر ہماری کچھ باتیں مانیں گے۔“

”تم بکواس کر رہے ہو۔ کہاں ہیں ماریا صاحبہ؟“

موہن کی آواز تاریکی میں ابھری۔

انور خاں نے اسحاق کو اشارہ کیا۔ وہ پھرا ہوا گیا اور ماریا کو گھسیٹ کر دہانے کے قریب لے آیا۔ دہانے کے بالکل پاس پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک خم دار خنجر کی تیز نوک اچانک ماریا کے بازو میں اتار دی۔ اس کے عریاں بازو میں خنجر کا یہ انجکشن کارگر رہا۔ وہ بُری طرح چلائی اور ”ہیلپ ہیلپ“ پکارنے لگی۔ اس کی یہ آوازیں یقیناً باہر کھڑے گھڑسواروں تک بھی پہنچیں۔

انور خاں نے پکار کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اپنی میم صاحبہ کے پُر جوش نعرے تم نے اچھی طرح سن لیے ہوں گے۔ وہ یہاں بہت خوش ہیں اور اس طرح کے نعرے اکثر لگاتی رہتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو اس طرح کے مزید نعرے بازی بھی تمہیں سنانی جاسکتی ہے۔“

چند لمحے تک گہرا سناٹا رہا پھر موہن کمار کے کسی ساتھی کی نہایت بوجھل آواز سنانی دی۔ ”اگر یہ واقعی ماریا صاحبہ ہیں تو تم لوگ جاننا چاہو کہ اپنے لیے مٹی بڑی مصیبت کو دعوت دے چکے ہو۔ تم لوگ کی بد نصیبی پر ترس آ رہا ہے۔“

”یہ واقعی تمہاری میم صاحبہ ہی ہے۔“ انور خاں نے تاؤ دلانے والے لہجے میں کہا۔ ”اور عتق رب ہم اسے زمین پر بکری کی طرح لٹا کر کند چھری سے ذبح کرنے والے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے تم ایک دفعہ اپنے والد صاحبان یعنی حکم جی اور جارج سے بات کر لو۔“

اسحاق نے ایک اور چرکہ ماریا کے بازو پر لگایا۔ وہ پھر دردناک انداز میں چلائی۔ ”پلیز ہیلپ... پلیز... یہ مجھے مار ڈالیں گے۔“

یہی وقت تھا جب دو افراد اپنی میم صاحبہ کے لیے بے تاب ہو کر دہانے کی طرف بڑھے۔ انور خاں نے بے دریغ برست چلایا۔ ان دونوں افراد کے قدموں کے آس پاس چنگاریاں پھٹ گئیں۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ انور خاں بے رحم لہجے میں دہاڑا۔ ”کسی دھوکے میں نہ رہنا موہن! ہم مرنے اور مارنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اگر کوئی حماقت فرماؤ گے تو کل شام تک تمہاری چتا کے پھول تیار ہو چکے ہوں گے۔“

”کک... کیا چاہتے ہو تم؟“ موہن کمار کی مری مری آواز سنانی دی۔

”چاہتے تو بہت کچھ ہیں۔ اور انسان کی چاہتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، لیکن فی الحال ہماری دو چار معصوم معصوم سی خواہشیں تمہارے حکم جی اور اس کے لعلتی چمچے جارج کو پوری کرنی ہوں گی۔“

”تم نے جو کچھ کہنا ہے سامنے آ کر کہو۔“ موہن کمار کا نامعلوم ساتھی غصیلی آواز میں بولا۔

”سامنے بھی آ جاؤ گے۔ فی الحال ہمارے سروں پر خون سوار ہے۔ ہمارے متھے نہ ہی لگو تو اچھا ہے۔ اچھے بچوں کی طرح جو کہتے ہیں، وہ سنو اور اپنے دونوں والد صاحبان کو جا کر بتاؤ۔“

”جو بکواس کرنا چاہت ہو جلدی کرو۔“ موہن کمار نے کہا۔

”ہم تمہیں صرف دو دن دیتے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بھائی کو پوری حفاظت کے ساتھ قتل پانی پہنچا دو۔ ہمارے پاس بیچاس ناموں کی ایک فہرست ہے۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر جارج گورا کی جیل میں ہیں۔ ان کو فوراً رہا کر کے یہاں ہمارے پاس پہنچایا جائے۔ زرگاں کے راج بھون میں ہونے والی ساری شرمناک رسمیں، خاص طور سے جشن بہار اور ساتویں کا جشن ختم کرنے کا کافی الفوراً اعلان کیا جائے۔ جارج گورا کو فوری طور پر جیلر کے عہدے سے ہٹایا جائے۔“

”مجھے پھر شک ہو رہا ہے کہ تم نشے میں ہو۔ تم اپنی اوقات میں رہ کر بات نہیں کر رہے ہو۔“ ایک بار پھر موہن کمار کی آواز ابھری۔

”اپنی اپنی اوقات کا پتا ہم سب کو بہت جلد چلنے والا ہے۔ فی الحال تم بی بی بے نیچے بنو اور جو کچھ تمہیں کہا گیا ہے اپنے بزرگوں تک پہنچاؤ۔ بڑوں کے معاملے میں جھوٹے نیچے بولیں تو ان کو مر غائب دیا جاتا ہے۔“

”ناموں کی فہرست کہاں ہے؟“ موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں نے فہرست نکال کر ہماری طرف دیکھا۔ ”کون جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں جاؤں گا۔“ سب سے پہلے میں نے جواب دیا۔

اسحاق اور چوہان نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں اپنا حوصلہ آزمانے پر تیار ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھے کوئی نیا اختیار ملا ہے اور میں اس اختیار کو مکمل میں لا کر اپنی بے جگری

کو پرکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے انور خاں کے ہاتھوں سے ناموں والی فہرست لی اور سرنگ کے دہانے سے باہر نکل آیا۔ ایک عجیب سسکی کا احساس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرف درجنوں رائفلیں اٹھی ہوئی ہیں، بہت سی خوں خوار نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں اور میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس ہو سکتے اور نہ ہو سکتے کے درمیان کی کیفیت بڑی مزے دار تھی۔ میری نگاہوں میں عمران کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی جب کوئی پرخطر کام کرتا تھا، اس کے چہرے پر بھی ایسی ہی لذت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں سینہ تان کر آگے بڑھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ تاریکی میں سے ایک سایہ نکل کر میرے رو برو آیا۔ اپنے ڈیل ڈول اور شکل سے یہ کافی خطرناک شخص لگتا تھا۔ اس نے بھی اپنی رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ میں نے ناموں کی فہرست والا کاغذ اسے تھمایا اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق کہا۔ ”ہمارے چاروں مطالبے اس کاغذ کی پشت پر لکھے ہوئے ہیں۔“

اس شخص نے چھیننے والے انداز میں کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے انور خاں کی دی ہوئی ایک طلائی چوڑی اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ تمہاری میم صاحبہ کی نشانی ہے۔ جا کر اپنے بڑوں کو دکھا دینا۔“

اس شخص نے چوڑی مجھ سے لی اور ایک شعلہ فشاں نگاہ مجھ پر ڈال کر واپس چلا گیا۔

اس کی آنکھوں میں، مجھے دیکھنے کے بعد بے پناہ حیرت اٹھ آئی تھی۔ یقیناً وہ مجھے پہچانتا تھا اور اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں بھی انور خاں اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ اسی سرنگ میں پایا جاؤں گا۔

موہن کمار نے تاریکی میں سے پکار کر کہا۔ ”انور خاں! تو آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس سے تجھے ایک بُری موت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔“

”ہم موت کے لیے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں موہن... سمجھ لے کہ اپنے کفن اپنے سروں سے باندھے ہوئے ہیں اور اپنا کہا سنا معاف کرایا ہوا ہے۔ اگر قبریں نصیب ہوئیں تو ٹھیک ہے، نہ بھی ملیں تو کوئی پروا نہیں۔ لیکن ایک بات پتھر پر لکیر سے موہنے! مرنے سے پہلے ہم تمہاری اس میم صاحبہ کو ذبح ضرور کریں گے۔“

اسحاق نے کہا۔ ”اور یہ مت سمجھنا موہنے کہ ہم سودے بازی کر رہے ہیں۔ ہم تو اس میم کا سراتارنے سے پہلے صرف جہت پوری کر رہے ہیں... یاد رکھ اگر ہمارے ان

مطالبوں میں سے کسی مطالبے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی تیرے حکم جی کو قبول نہیں ہوا تو پھر یہ میم سرے گی اور یہ کوئی اچھی موت نہیں ہووے گی۔“

اسحاق کے لہجے کی درندگی محسوس کر کے موہن کمار کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ انور خاں بولا۔ ”چلو اب پھوٹ جاؤ یہاں سے۔ اس میم کو بچانے کے لیے تم لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اور جاتے جاتے آخری بار سن لو۔ اگر زرگاں کی طرف سے پائل پانی کی طرف سے ہمارے خلاف کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی گئی تو ہم دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اس معاملے کو فوراً انجام تک پہنچا دیں گے۔“

انور خاں نے قل پانی کا نام جان بوجھ کر لیا تھا۔ اس طرح وہ حکم جی وغیرہ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ ماریا فرنگوں کے اغوا والے معاملے سے چھوٹے سرکار یا اس کے ساتھیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر داویلا شروع کر دیا۔ وہ انگلش اور گلابی اردو میں پتا نہیں کیا کچھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز میں جھلاہٹ آمیز بے چارگی تھی اور کرب تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے قریب جا کر اس کی بات سنی اور واپس آ کر انور خاں کو بتایا۔ ”وہ کہہ رہی ہے، میری ماں بلند پریشی مریضہ ہے۔ موہن کمار وغیرہ میری ماں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے تو تھ پیسٹ، برش، صابن اور کپڑوں کا ایک جوڑا منگوانا چاہتی ہے۔“

اسحاق پھنکارا۔ ”کوئی ضرورت نہیں حرازدی کے لیے یہ چیزیں منگوانے کی۔ یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ ہاں، ایک جوڑا منگوا سکتی ہے یہ۔“

انور خاں نے اسحاق کو نرمی سے سمجھایا۔ وہ نیم رضامند ہو گیا اور منہ بنا کر دوسری طرف چلا گیا۔ انور خاں نے ماریا کا پیغام بلند آواز میں موہن کمار اور اس کے ساتھیوں تک پہنچا دیا۔

تاریکی میں موہن کمار اور اس کے تقریباً چار درجن ساتھیوں کا واضح رومل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تاہم اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم پوری طرح چوکس تھے۔ لکڑی کے تنوں کے پیچھے ہم نے پوزیشنیں لی ہوئی تھیں۔ انگلیاں رائفلوں کے ٹریگزر پر تھیں۔ اسحاق نے ہینڈ گرینینڈز والا تھیلہ بھی ہمارے پاس رکھ دیا تھا۔ اس نے پانچ دس منٹ صرف کر کے مجھے بڑی اچھی طرح سمجھایا تھا کہ ہینڈ گرینینڈ کو کس طرح اور کس پوزیشن میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بہر حال، ابھی تک مجھے یقین نہیں

تھا کہ میں بوقت ضرورت اچھے طریقے سے اس بارودی گولے کو پھینک سکتا ہوں۔ اسحاق خود رائفل بدست ماریا کے سر پر موجود تھا۔ مجھے پتا تھا کہ خطرے کے وقت وہ ماریا کو شوٹ کرنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائے گا۔ بلکہ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ خطرے کے پوری طرح سامنے آنے سے پہلے ہی ماریا کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

وہ بڑے تناؤ کے لمحے تھے لیکن آخر وہ گزر گئے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ ان چار درجن گھڑسواروں میں سے دس پندرہ گھڑسوار یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ امکان تھا کہ موہن کمار بھی روانہ ہونے والوں میں شامل ہو گا۔ باقی افراد دہانے کے ارد گرد پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ ان کی رائفلوں کے روشن دائرے چاروں طرف حرکت کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد پیدہ سحر نمودار ہونے لگا۔ جنگل میں شب بیدار جانوروں کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ دہانے کے ارد گرد کے نشیب و فراز دھیرے دھیرے نمایاں ہو گئے۔ بظاہر دہانے کے ارد گرد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ہم جانتے تھے، دو تین درجن مسلح افراد یہاں موجود ہیں اور ان کی رائفلوں کے رخ اس دہانے کی طرف ہیں۔ بہر حال، اب ان مسلح افراد کی جانب سے اچانک ہلا بولے جانے کا خطرہ مل گیا تھا۔ اگر انہوں نے ایسا کچھ کرنا ہوتا تو اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے کرتے۔

ماریا کراہنے لگی۔ ”ہام کو بہت تکلیف ہوتا۔ ہام کا ہاتھ کھولی دو۔“

”تا کہ تمہارے شیطانی دماغ کو پھر کوئی چالاکی دکھانے کا موقع مل سکے۔“ اسحاق نے اس کی پشت پر ایک ٹھوکریں کر کے ہونے کہا۔

وہ رونے لگی۔ انور خاں نے کہا۔ ”چلو اس کے ہاتھ آگے کی طرف باندھ دو۔ اس نے کھانا دانا بھی تو کھانا ہو گا۔“

اسحاق پہلے تو جزبہ نظر آیا پھر اس نے ماریا کے ہاتھ پشت کی جانب سے کھولی کر سامنے کی طرف باندھ دیے۔

”ہام کا منہ بہت کڑوا ہوتا۔ ہام پیسٹ کرنا مانگتا۔“ وہ منمنائی۔

اسحاق پھنکارا۔ ”یہ تیرے پوکا ہاتھ روم نہیں ہے۔ یہ جنگل ہے۔ یہاں اگر تو نے پیسٹ کرنی ہے تو پھر وہی کرنی ہوگی جو زرگاں کی ساری غریب آبادی کرتی ہے۔“

پاس ہی چولہے کی راکھ پڑی تھی۔ اسحاق نے اس میں سے چند ٹکے نکالے۔ انہیں ماریا کے سامنے رکھا پھر انہیں

رائفل کے دستے سے پیس کر باریک کیا اور بولا۔ ”یہ ہے وہ پیسٹ جو ہم لوگ کرتے ہیں۔ آج تو بھی یہی کریں۔“

وہ تجب سے اسحاق کو دیکھنے لگی۔

”ایسے دیدے کیا پھاڑت ہے۔۔۔ چل انگلی پر لگا اس کوئلے کو اور دانت صاف کر۔“ ماریا اپنی جگہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ اسحاق نے بھنا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ اس کی ایک انگلی کو پیسے ہوئے کوئلے میں لتھڑا اور یہ انگلی زبردستی اس کے منہ میں گھسا دی۔ ”چل کر یہ پیسٹ۔۔۔ چل کر۔۔۔ تاہیں تو منہ پھاڑ ڈالوں گا تیرا۔“

ماریا چلانے لگی۔ انور خاں نے مداخلت کر کے اسحاق کو پیچھے ہٹایا اور اسے گھور کر بولا۔ ”تم ایک ٹھیک کام بھی غلط طریقے سے کرتے ہو اور وہ غلط لگنے لگتا ہے۔“ پھر وہ ماریا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میم صاحبہ! یہ کوئلہ بڑے کام کی چیز ہے اس کا رنگ کالا ہے تو کیا ہوا۔ ہر کالی چیز بُری نہیں ہوتی اور نہ ہر سفید چیز اچھی ہوتی ہے۔ آپ اس کو دانتوں پر مل کر دیکھیں۔ یہ آپ کی دلائی تو تھ پیسٹ کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔“

”دس کول؟ واٹ نان سینس۔“ ماریا نے تیوری پڑھائی۔

”یہ نان سینس نہیں ہے میم صاحبہ! اس سے تو ہم لوگ بڑے کام لیتے ہیں۔ اس سے ہماری عورتیں برتن مابھیتی ہیں۔ کہیں زخم لگ جائے تو اس کو پیس کر خون بند کیا جاتا ہے۔ اس سے دانت چکائے جاتے ہیں۔ کئی طرح کی دواؤں میں ڈالا جاتا ہے۔“

انور خاں نے اپنے مخصوص بلکے پھلکے انداز میں کافی کوشش کی لیکن ماریا دانت صاف کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے پانی سے بس چند کلیاں کرنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ زندہ ہو رہا تھا۔ پچھلے تقریباً بارہ پہرے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لیکن فی الوقت ہمارے پاس کھانے کے لیے خشک جنوں، مکی کے بھنوں اور گڑ وغیرہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جب کھانے کے نام پر یہ چیزیں ماریا کے سامنے رکھی گئیں تو اس نے ایک بار پھر ناک بھوں پڑھائی۔ وہ انگلش اور چائینیز کھانے کھانے والی لڑکی اس خشک راشن پر کیسے منہ مار سکتی تھی۔ ”اب کھائی کا ہے تاہیں ہو؟“ اسحاق نے پھر آنکھیں نکال کر پوچھا۔

”یہ ہام تاہیں کھا سکتا۔“

”تمہارا تو باپ بھی کھائے گا۔“ اسحاق نے کہا اور زبردستی مکی کا بھنا اس کے ہاتھ میں دیا۔

اس نے بھٹا دور پھینک دیا اور چلائی۔ ”تاہیں کھائے گا۔۔۔ تاہیں کھائے گا۔ ہام کو اکیلا چھوڑ دو۔“ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔

چند لمحے کے لیے لگا کہ اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع کر دے گا مگر اسی دوران میں انور خاں نے معاملہ سنبھال لیا۔ اس نے کھانے پینے کی اشیاء ماریا کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیں۔ ”میم صاحبہ! جب تم کو زیادہ بھوک لگے گی تو یہی چیزیں ڈبل روٹی، مکی، پیسنی، اور فرانی انڈے سے زیادہ مزے دار لگیں گی۔ اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لیتا۔“ پھر انور خاں نے اسحاق کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ شانت رہے۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

عجیب الوضع باروندا ابھی تک سرگ کے اندرونی حصے میں موجود تھا۔ میں نے اندر جا کر اسے ناشتا کرایا۔ اس کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ مسلسل شراب کی ڈیمانڈ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جلد از جلد اس کہنہ سال کشتی میں بھی واپس جانا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جس طرح شراب کے لیے تڑپ رہا ہے، اسی طرح اس کشتی کے لیے بھی تڑپ رہا ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس کشتی سے اس کا کیا ناتا ہے۔ اس کے ساتھ میری ہمدردی صرف اتنی تھی کہ مجھے اس میں اپنے بچھڑے یار عمران کی ہلکی سی جھٹک نظر آئی تھی۔ لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے اسے یہاں لا کر غلطی تو نہیں کی؟ وہ ان شرابیوں میں سے لگتا تھا جو نشے کے بغیر جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو اس کا ذمے دار میں ہوتا۔ وہ لاغر اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس کی جلد سیاہی مائل ہو چکی تھی۔

باروندا کو ناشتا کرانے کے بعد میں سرگ کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھ گیا۔ میری بے چین روح پھر پُر پھر پھڑپھڑا رہی تھی۔ مجھے میرے اپنے یاد آرہے تھے۔ میرے مکی کوچے۔۔۔ میری دھوپ چھاؤں۔۔۔ میرے موسم۔۔۔ اور وہ چہرہ جو شاید میرے اب تک زندہ رہنے کا جواز تھا۔ میں اپنے ہاتھ سے ہولے ہولے اپنی گردن کے عقبی حصے کو سہلا رہا تھا۔ چوہان کو یقین تھا کہ مجھے قید کرنے والوں نے یہاں میرے جسم میں کچھ رکھا ہوا ہے۔ کچھ ایسا جو فوراً میری نشان دہی کرتا ہے اور میرے گمراہ اندھی طوفان کی طرح مجھ تک آن پہنچتے ہیں۔ میرا اپنا دل بھی اب گواہی دینے لگا تھا۔ چوہان کے خیال کی تائید کرنے لگا تھا۔ ورنہ وہ سب کچھ کیسے ہو سکتا تھا جو اب تک ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میرے پاس کوئی تیز دھار چاقو ہو۔ میں ابھی اپنی گردن کے عقبی حصے کو چیر ڈالوں۔ وہ شے باہر نکال پھینکوں جو میرے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ آزاد

اس دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ کنڈی کھولی۔ دونوں بھکشو تو دوڑتے ہوئے آگ میں سے گزر گئے لیکن تم دوڑنا ہیں سکتے تھے۔ تمہیں سلطانہ اور چوہان نے اپنے درمیان رکھا اور کمبلوں میں چھپا لیا۔ چوہان کے کمبل کو آگ لگ گئی تھی۔ وہ تمہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا لیکن سلطانہ تمہارے ساتھ چٹی رہی اور تمہیں باہر نکال ڈالی۔ وہ ایک بہادر ماں کی بہادر بیٹی ہے تابش! اس روز اس نے ثابت کیا تھا کہ حوصلہ مندی اور جی داری صرف مرد کا ورثہ ہی نہیں ہوتی ہے۔ اس روز لوگ سلطانہ کی ہمت پر اس اش کر اٹھے تھے۔“

ایک بار پھر سلطانہ کا اجڑا بچہ چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں لیکن وہ جا چکی تھی اور جاتے جاتے اپنے گلے کی چین مجھے دے گئی تھی۔ خبر نہیں کہ ایسا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ شاید یہ چین میں نے ہی اسے دی ہوا اور اس کے ساتھ کوئی وعدہ منسلک ہوا اور وہ جاتے جاتے یہ وعدہ ختم کر گئی ہو۔

بھکشو ہمیش نے ماریا کی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ پورے زرگاں میں سب سے زیادہ نخرے والی میم مشہور ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطی پر اپنے ملازموں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آوتی ہے۔ پچھلے سال اس نے اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ اس قدر مار پیٹ کروائی تھی کہ اس کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ملازمہ کا دوش صرف اتنا تھا کہ اس نے غلطی سے میم صاحبہ کے بستر پر آن دھلی چادر بچھا دی تھی۔ اور اسی سال عید سے پہلے اس نے ایک ملازم لڑکے کو چھ دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا۔ لڑکے کا دوش یہ تھا کہ اس نے ماریا کے پالتو افریقن طوطوں کو تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے ان کے پنجروں میں خوراک ڈالنا بھول گیا تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ لڑکا بعد میں کبھی کچھ کھاپا نہیں سکا اور چند ہفتے بیمار رہ کر مر گیا۔“

”اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی؟“

”اسحاق کی بہن بھی تو زہر کھا کر مر گئی تھی۔ سب کو پتا تھا کہ وہ کیوں مری ہے۔ اس کی موت پر بھی تو کسی نے آواز نہیں اٹھائی تھی لیکن جب آواز نہیں اٹھائی جاتی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا تھا کہ لوگ کے دلوں میں غم اور غصہ بھی نہیں ہے۔ یہ اندر ہی اندر پلٹا رہتا ہے، بڑھتا رہتا ہے اور پھر ایک روز اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ کوئی

زبردستی عام لوگ سے خالی کرایا۔ عبادت کرنے والے کئی گھنٹے تک پگوڈا سے باہر دھوپ میں کھڑے رہے۔ وہ عبادت کا خاص دن تھا۔ تمام بڑے گرو حضرات عبادت میں مصروف تھے۔ اس لیے جب ماریا پگوڈا میں آئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نہ آ سکے۔ پگوڈا کے خادموں نے ماریا کی موجودگی میں ایک دو تلخ باتیں بھی کہہ دیں۔ ماریا نے ان سب کا بہت برا منایا اور پانچ دس منٹ کے اندر پگوڈا سے واپس چلی گئی۔ اس واقعے کے صرف دو دن بعد رات کے وقت اچانک پگوڈا کے سڑھیوں والے حصے کی طرف زبردست آگ بھڑک اٹھی۔ بہت سے لوگوں کو پورا وشواس ہے کہ یہ آگ ماریا نے ہی لگوائی تھی۔ اس کا کوئی کارندہ بچاری کے روپ میں اندر آیا تھا اور چراغوں کے تیل والے پیپے الٹ کر انہیں آگ دکھا دی تھی۔ اس آگ میں ہمارے ایک بہت پیارے گرو زروانی جل کر بھسم ہو گئے تھے۔ تم دو بھکشوؤں سمیت آگ میں بڑی طرح گھر گئے تھے۔ ان دنوں تمہارے دونوں پاؤں رسی کی ایک بیڑی میں رہتے تھے۔ تم چل تو سکتے تھے لیکن بھاگ نہیں سکتے تھے۔ تمہیں یاد ہے جب میں نے تمہیں آوازیں دی تھیں اور کہا تھا کہ تم اپنا کمبل لپیٹو اور دوڑ کر آگ میں سے گزر جاؤ۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ تم دوڑنا نہیں سکو گے۔ تمہیں یاد ہے؟“

”نہیں... مجھے کچھ یاد نہیں۔ اور تم مجھے یاد بھی نہ کراؤ۔ ایسی باتیں سوچ کر میرا دماغ چھٹنے لگتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نہیں یاد کراتا لیکن میں تمہیں ماریا کی ہٹ دھرمی اور بے رحمی کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ اس لڑکی نے ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا میں پگوڈا کے ایک حصے کو جلا کر خاکستر کروا ڈالا تھا۔ کئی قیمتی نوادرات ضائع ہوئے۔ ایک بزرگ بچاری کے پران چلے گئے اور تم سمیت تین بندوں کی جان شدید خطرے میں پڑ گئی۔ یہاں ایک بار پھر سلطانہ کی بات کرنی پڑ جاتی ہے۔ جب آگ لگنے کے بعد سب لوگ پگوڈا سے بھاگ گئے تھے اور میں بھی وہاں نہیں ٹھہر سکا تھا، سلطانہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے ایک کمبل بھگو کر اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ وہ آگ کے درمیان میں کھڑی تھی اور پکار رہی تھی۔ ”اندرو لوگ ہیں۔ ان کی مدد کرو۔ ان کو بچاؤ۔“ پھر میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا تھا۔ اس نے بھی ایسے ہی ایک بیچکا ہوا کمبل اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ سامنے والے دروازے کی طرف سے نکلنے والا راستہ آگ نے بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ دونوں آگ میں سے گزر کر پہلو والے دروازے تک پہنچے۔

”مجھے میرے نام سے پکارو۔ میں مہروز نہیں تابش ہوں۔ اگر کوئی مہروز تھا بھی تو وہ بس ایک دھوکا تھا اور وہ دھوکا ختم ہو چکا ہے۔“

میرے حتمی لہجے کو محسوس کر کے ہمیش بھگ سا گیا۔ ”ٹھیک ہے مہروز... ہم، میرا مطلب ہے تابش! تم اپنے اندر کے حالات کو بہتر سمجھتے ہو۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ تم خود کرو گے، وہی اچھا ہوگا۔ میں نے تو بس ایک امانت تمہارے حوالے کر لی تھی۔“

اسی دوران میں دہانے کی طرف سے ماریا فرگوں کے چلانے چنگھاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی بات پر اسحاق سے پھر اس کی تکرار ہو گئی تھی۔ وہ بڑے غصیلے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ سچ سچ میں اسحاق یا انور خاں کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ہمیش بولا۔ ”میرا خیال ہے، اب یہ جان گئی ہے کہ اس کی جان ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہم اس کے ذریعے اپنی شرطیں منوانا چاہتے ہیں۔ اس لیے فوری طور پر اس کی جان تباہ نہیں لیں گے۔ اسی لیے اب یہ ہر بات پر اڑ رہی ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، حکم جی اور جارج وغیرہ اس کی رہائی کے لیے ہماری شرطیں ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے؟“

”آشاً تو ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ایک بہت بڑا کام ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ماریا کا یہاں پہنچ جانا۔ شاید تم لوگ جارج گورا کو مار بھی دیتے تو اسٹیٹ میں اتنا تھلکہ نہیں مچتا جتنا اب مچے گا۔ بہت کھٹلی مچی ہوگی اور ابھی اور مچے گی۔ یہ نہ صرف جارج کی بہن ہے بلکہ اسٹیل کی چیتھی بیوی بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ماریا کی ماں لندن میں ایک بہت بڑی جائداد کی مالک ہے۔ اس جائداد کی وجہ سے بھی اسٹیل صاحب نے اپنی بیوی کو آنکھ کا تارا بنا رکھا ہے۔ انہوں کی بہت زیادہ محبت اور توجہ نے اس لڑکی کو بہت خود سیر رکھا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہ خود کو زمین کی شے ہی نہیں سمجھتی... تمہیں وہ پگوڈا میں آگ لگنے والا واقعہ یاد ہے؟“

ہمیش نے کہا۔

”نہیں... مجھ کو کچھ یاد نہیں۔“

”تم بہت خاص باتیں بھی بھول چکے ہو۔ اس واقعے میں تمہاری جان بڑی مشکل سے بچی تھی۔ سب لوگ جان بچ گئے کہ وہ آگ ماریا کی وجہ سے ہی لگی تھی۔“

”ماریا کی وجہ سے؟“

”ہاں، یہ میم صاحبہ ایک روز پگوڈا کی سیر کے لیے گئی تھیں۔ ان کے گارڈز نے ان کی آمد کے وقت پگوڈا کو

زمینوں تک پہنچنے کے لیے میری ہر کوشش کو ناکام کر دیتی تھی۔ ایک عجیب سی بے چینی کسی گاڑھے دھوئیں کی طرح میرے سینے میں بھرنے لگی اور میرا دم گھٹنے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے جواں سال بھکشو ہمیش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کی منگی میں کوئی شے دبی ہوئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے منگی کھولی۔ اس میں چاندی کی ایک باریک سی زنجیر تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ جاتے جاتے تمہاری بیوی سلطانہ نے دی تھی۔ کہتی تھی کہ میں تم تک پہنچا دوں۔“

ایک دم مجھے یاد آیا کہ چاندی کی یہ مہین سی زنجیر میں نے سلطانہ کے پاس دیکھی تھی۔ میں نے ہمیش سے پوچھا۔

”وہ یہ مجھے کیوں دے گئی ہے؟“

”اس کا پتا تو تمہیں ہوگا۔“ ہمیش بولا۔ وہ کچھ دیر تک جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”وہ یہاں سے جاتے وقت بہت پریشان تھی۔ مسلسل رو رہی تھی اور دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ یقینی بات ہے کہ وہ تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے بھی پوچھا لیکن میں کیا بتاتا۔ مجھے خود پتا نہیں تھا کہ تم، فیروز اور اسحاق وغیرہ اچانک کہاں نکل گئے ہو۔ اس نے مجھے یہ زنجیر دی اور کہا کہ میں تمہیں دے دوں۔“

میں نے خاموشی سے زنجیر کرتے کی جیب میں ڈال لی۔ نہ جاننے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس زنجیر سے میرے اور سلطانہ کے تعلق کی کوئی یاد وابستہ ہے لیکن کیا ”یاد“ ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہمیش کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

”وہ تمہیں بہت چاہت ہے مہروز! وہ ان عورتوں میں سے ہے جو جب شادی شدہ ہو جاتی ہیں تو پھر ان کا شوہر ہی ان کے لیے سب کچھ ہوتی ہے۔ اس نے تمہاری رکھشا کے لیے بہت دھک جھیلے ہیں مہروز! اور اب بھی اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہارے جیون کی رکھشا کرتے ہوئے ہی ہوا ہے۔ اب اسے تمہارے سہارے اور پریم کی سخت ضرورت تھی لیکن اسوس کہ اب تم اس کے ساتھ نہیں ہو۔“

”لیکن... میں کیا کروں ہمیش! میں اس کے لیے ہمدردی تو رکھتا ہوں لیکن اسے اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔“

”مگر مہروز! اگر تم...“

”ایک منٹ ہمیش۔“ میں نے ہمیش کی بات کاٹی۔

شے اس کا راستہ تا ہیں روک سکتی۔“
یہ ان پڑھ بھٹسوا اپنے سیدھے سادے انداز میں بڑی فلسفیانہ بات کر رہا تھا۔ اس کی بات میں بہت وزن تھا۔ میں اپنا تجربہ یہ کرتا تو میری صورت حال بھی تو اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ میں نے ایک عرصے تک بے پناہ دباؤ جھیا تھا، بے شمار جسمانی و ذہنی اذیت برداشت کی تھی۔ مجھے ذلت و شرمندگی کے پانی میں غرق کر دیا گیا تھا۔ میں اس پانی میں نیچے اور نیچے جاتا گیا لیکن آخر کار میرے پاؤں زمین سے چھو گئے اور میں اوپر ابھرنا شروع ہو گیا۔ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے کمزور لوگوں کے پاؤں بھی اب شاید زمین سے لگ گئے تھے۔ ان کے تئیر بدلے ہوئے تھے۔ اب وہ ہتہ قدروں کی دیواریں توڑ دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسکی دیواریں توڑنے کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور شاید یہ قربانیاں دینے اور تلکغیں برداشت کرنے کا موسم ہی تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ اس کی فخری چین میری منہ میں دنی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ چین تپ گئی ہے اور میرے ہاتھ کو جلاسنے لگی ہے۔ میں نے چین پھر جیب میں ڈال لی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ انور خاں اور ڈاکٹر چوہان تھے۔ انور خاں نے بتایا۔ ”دہانے کے آس پاس چالیس سے کم بندے نہیں ہیں۔ انہوں نے پوزیشنیں لے رکھی ہیں اور پوری طرح چوکس ہیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ہمیش نے پوچھا۔

”پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہم فیروز کو جلد از جلدل پانی پہنچانا چاہتے تھے تاکہ وہ چھوٹے سرکار کے سامنے موہن کمار وغیرہ کے خلاف گواہی دے سکے لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ یہ لوگ کسی کو باہر نہیں جانے دیں گے۔ اگر کوئی جائے گا بھی تو اسے یرغمال بنائیں گے۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

”وقت کا انتظار۔“ انور خاں نے جواب دیا۔

”اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس سلسلے میں کسی طرح کی مدد کر سکتا ہوں تو میں تیار ہوں۔“ میں نے دل کی گہرائی سے پیشکش کی۔

انور خاں کا چہرہ چمک گیا۔ ”تمہارے اتنا کہنے سے ہی میرا حوصلہ ڈبل ہو گیا ہے لیکن ابھی کسی طرح کا رسک لینے کی ضرورت ہمیں نہیں ہے۔“

اچانک دہانے کی طرف سے ایک بار پھر ماریا کے

چلانے کی آوازیں آئے نکلیں۔ چوہان نے کہا۔ ”وہ کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے پریشان ہے۔ اب اس کے لیے یہاں کیڑے مار دوا کا انتظام کون کرے؟“
انور خاں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”میں جا کر دیکھوں، کہیں اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع نہ کر دے۔“

رات کو ہم نے باری بھرالی۔ آدھی رات تک فیروز، اسحاق اور ہمیش نے دہانے کی پہرے داری کرتا تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ شامل ہونا تھا۔ آدھی رات کے بعد ہم نے سو جانا تھا اور انور خاں، چوہان اور احمد نے پوزیشن سنبھال لینی تھی۔

پروگرام کے مطابق ہم آدھی رات تک جاگتے رہے۔ جنگل جانوروں کی آوازوں سے گونجتا رہا۔ ان آوازوں میں گاہے بگاہے لیپارڈ کی تیندوے کی دور افتادہ آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ تاہم ہمیں ان آوازوں سے زیادہ انسانی آہٹوں سے خطرہ تھا۔ ہم پر شب خون مارا جانا خارج از امکان نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ عجم جی کے پاس خطرناک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی شامل تھا۔ بڑے پٹوڈا میں میڈم معذور نے مجھے اس شخص کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے جو پانچ نہایت خطرناک کمانڈوز بدھا کے نادر جسے کو پاکستان سے انڈیا واپس لانے کے لیے گئے تھے، ان کا سربراہ یہی رنجیت پانڈے تھا۔ وہ انڈین ایشل فورسز کا ایک سابقہ افسر تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت کا دوسرا نام ہے۔

گاہے بگاہے دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی کوئی چاپ ابھرتی تھی۔ کبھی کوئی رائفل کا کھونے کی آواز کانوں میں پڑتی تھی۔ رات قریب ایک بجے ہم نے انور، چوہان اور احمد کو جگا دیا۔ ان کی چٹائیوں پر ہم سوئے کے لیے لیٹ گئے۔ ماریا بھی ایک طرف بندھی پڑی تھی۔ خبر نہیں کہ سوری تھی یا جاگ رہی تھی۔ وہ ہٹ کی پٹی نکلی تھی۔ ابھی تک اس نے کچھ بھی کھایا نہیں تھا۔ وہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ میں تھا کہ ہوا تھا، کچھ ہی دیر بعد سو گیا۔ میں کسی کے ہلانے سے جاگا۔ مجھے ہمیش نے جگایا تھا۔ وہ میرے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ لائین بچہ چلی گئی اور اس جھے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ”کیا ہے؟“ میں نے ہمیش سے پوچھا۔

”وہ دیکھو، میم صاحبہ کیا کر رہی ہے؟“ ہمیش نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ ماریا کا ہیولا صاف نظر

آ رہا تھا۔ وہ تاریکی میں دنگی ہوئی اس تھیلے تک پہنچی تھی جس میں بھنے ہوئے پننے، گڑ اور بھنے وغیرہ رکھے تھے۔ وہ تھیلے کو ٹٹول رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چور نظروں سے دہانے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر ہم نے آوازیں سنیں جن سے اندازہ ہوا کہ وہ پننے چبا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ بھوک انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اگلی صبح انور خاں نے کھانا پکانے کے لیے ایک چولہا تیار کر لیا تھا۔ روٹی پکانے والا ایک تو ابھی چوہان دیگر سامان کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ انور خاں ایک ہرن مولہ شخص کی طرح تھا۔ وہ زبردست اسلحہ شناس تھا۔ اس نے میری کچیز زدہ بھیگی ہوئی رائفل کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ چرواہا زبردست گھج جو دور مار رائفل لے کر آیا تھا، وہ مکڑوں میں تھی۔ انور نے اسے بھی منٹوں میں جوڑ کر تیار کر لیا تھا۔ اس میں لیڈر شپ کی خصوصیات موجود تھیں۔ وہ لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ان کے بھگڑے نمٹانا جانتا تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کھانا پکانے میں بھی زبردست مہارت حاصل ہے۔ ہمیش نے آٹا گوندھا۔ انور خاں نے آلو کا سالن تیار کیا اور ساتھ زبردست پراٹھے بنائے۔

یہ معقول کھانا ہمیں کئی دنوں بعد نصیب ہوا اور یہ انور خاں ہی کے مہربان منت تھا۔ انور خاں نے ایک پراٹھا، کچھ سالن اور دودھ ماریا کے سامنے بھی رکھا۔ ماریا کی آنکھوں میں بھوک چمک رہی تھی مگر اس سے تہیلے کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتی؟ اسحاق اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے کھانا ماریا کے سامنے سے اٹھا لیا۔ ”ہم اس کی سیوا کرنے اور اس کے سامنے کھانے کی ٹرے سجانے کے لیے اسے یہاں نہیں لائے۔ یہ اپنا کھانا خود پکاوے گی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ یہ پکاوے اور ہمیں بھی کھلاوے۔“

”چلو چھوڑو یار! ابھی تو کھانے دوا ہے۔“ انور خاں نے پھر مدخلت کی۔

اسحاق جھنجھلا گیا۔ ”انور بھائی! اگر تم نے اس طرح اس کتیا کے نازخے دے دیتے ہیں تو پھر مجھ کو بولنا پڑے گا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے آج تک ہم کو اور ہماری عورتوں کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اب تک اس کو لٹکا کر اس کی گردن کو دھنک لیا کرتے ہوئے لیکن اگر ہم نے یہ نہیں کیا تو پھر ہم اس کی مہمان نوازیوں بھی نہیں کریں گے۔“

”لیکن اسحاق...“

”ناہیں انور بھائی۔“ اسحاق نے تیزی سے انور کی

بات کاٹی۔ ”میں سچ کہوت ہوں، مجھ سے یہ سب برداشت ناہیں ہوتا۔ میرے دل پر آرے چل جات ہیں۔ مجھے اپنی بہن کا مرنایا و آ جات ہے۔ میں اس کو گولی مار دوں گا اور خود کو بھی مار لوں گا۔“ اسحاق کے لہجے میں تپش بڑھتی جا رہی تھی۔

اس تپش کو محسوس کر کے انور خاں ایک دم مسکرا دیا۔ شاید یہ اس کی عادت تھی اور یہ بہت اچھی عادت تھی۔ جب صورت حال لمبیھر ہوتی تھی اور تناؤ بڑھ جاتا تھا تو وہ ایک دم مسکراتا تھا اور اپنا لب و لہجہ تبدیل کر لیتا تھا۔ اس کے ایسا کرنے سے لگتا تھا کہ پوری صورت حال اور صورت حال کے سارے اسباب اچانک بدل گئے ہیں۔

انور خاں نے اپنی رائفل ایک طرف رکھی اور ماریا کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنے سامنے سے کھانا اٹھائے جانے پر سخت بھٹائی ہوئی تھی۔ انور خاں نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور بولا۔ ”چلو، اس میں برائی ہی کیا ہے؟ اپنا کھانا تم خود بنا لو۔ کسی کا احسان لینا کون سی اچھی بات ہے۔“

احسان والی بات شاید ماریا کے دل کو ٹپکی۔ ویسے بھی وہ پچھلے قریب ساٹھ گھنٹے سے بھوک تھی۔ رات کو اس نے تھوڑے سے چنے ضرور کھائے تھے لیکن یہ خشک چنے اس کے گلے میں پھنس گئے تھے اور وہ دیر تک کھانسنے کے بعد بے سدھ ہو کر لیٹ گئی تھی۔ اب نقاہت کے سبب اس کا رنگ ٹھیکے کی طرح سفید ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں میں لرزش نظر آتی تھی۔ انور خاں نے اسے سہارا دے کر چولھے کے نزدیک پہنچایا اور گندھا ہوا آٹا اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ سخت جھنجھلائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جیسے یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ وہ اتنی ناکارہ نہیں۔ اپنا کام خود کر سکتی ہے۔ انور خاں نے چولھے میں آگ جلا دی۔ تو پہلے ہی اوپر رکھا ہوا تھا۔ ماریا اپنے لیے روٹی بنانے لگی۔ یہ عمل اس کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ چار پانچ منٹ کی کوشش میں وہ پہلی روٹی بھی توڑے پر نہیں ڈال سکی۔ اس کے ہاتھ تھڑگے اور بہت سا آٹا ضائع ہوا۔ بالآخر جو ایک روٹی اس نے توڑے پر ڈالی بھی، وہ عجیب نقشے کی تھی اور وہ بھی توڑے سے چپک کر رہ گئی۔ ایک دم ماریا جھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے خشکے والی تھالی دور پھینک دی اور انگریزی میں سب کو صلواتیں سناتے لگی۔

اسحاق نے اسے ہالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”حرامزادی! آج تک تو کبھی پکائی کھاتی رہی ہے۔ نوکروں کی فوج تیرے خڑے، چوپٹے اٹھانے کے لیے تیرے آگے پیچھے گھومتی رہی ہے۔ آج تجھے پتا چلا ہووے گا کہ تو اس قابل

ناہیں کہ اپنے بل بوتے پر اپنا پیٹ بھی بھر سکے۔ لعنت ہے تیرے مال دولت پر۔“

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ شاید چیزیں اٹھا اٹھا کر بھی پھینکنا شروع کر دیتی لیکن اب وہ اسحاق کی شعلہ مزاجی سے ڈرتی بھی تھی۔ انور خاں نے اسحاق کو سمجھا بھجا کر پیچھے ہٹایا اور خود ایک روٹی پکا کر ماریا کو دی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نہیں کھائے گی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ کھا رہی ہے۔ اس کے پاؤں بدستور زنجیر میں تھے۔

اسحاق ترخ کر بولا۔ ”انور بھائی! آج تم نے اپنی من مانی کر لی ہے لیکن اس کے بعد ناہیں۔ یہ جب تک مرنے سے بچی ہوئی ہے، اپنا کام خود کرے گی۔ بلکہ اس کو ہمارے کام بھی کرنے پڑیں گے۔ میں نے اس کی گردن کو ہمیشہ اکڑا ہوا دیکھا ہے۔ اگر یہ اب بھی اکڑی رہی تو پھر میں اس کو توڑ دوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں، توڑ دوں گا۔“

اگلے روز دوپہر سے کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ زرگاں سے کچھ لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں حکم جی کا خاص مشیر گرو مودان اور جارج گورا کا بہنوئی یعنی ماریا کا شوہر اسٹیل بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھاری مقدار میں اسلحہ اور تازہ دم سپاہی بھی موقع پر پہنچائے گئے تھے۔ ہمیں دہانے کے ارد گرد تازی گھوڑے، بوگیرکتے اور ایک عدد جیب بھی نظر آئی۔ یہ جیب نہایت دشوار راستوں سے گزار کر پتا نہیں کیسے یہاں پہنچائی گئی تھی۔

ایک شخص نے دہانے کے سامنے آکر اعلان کیا کہ گرو مودان اور اسٹیل صاحب بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری طرف سے جو لوگ بات کرنا چاہتے ہیں، وہ باہر آجائیں یا پھر ہمیں اندر آنے کی اجازت دی جائے۔

انور خاں اور چوہان وغیرہ نے مشورہ کیا۔ دونوں صورتوں میں خطرہ موجود تھا۔ بہتر تھا کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ سرنگ کے دہانے سے پندرہ بیس گز آگے درختوں کے درمیان بات چیت ہو اور اس گفتگو کے دوران میں دونوں طرف سے کسی طرح کی کوئی کارروائی نہ کرنے کا عہد کیا جائے۔ دس پندرہ منٹ کے اندر شرائط طے ہو گئیں۔ فیصلہ ہوا کہ انور خاں بیس سرنگ میں رہے گا جبکہ چوہان اور فیروز آگے جا کر بات کریں گے۔ فیروز زخمی تھا، اس کے باوجود وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے اندر جو آگ جل رہی تھی، اس نے اسے اضافی توانائی دے دی تھی۔

سہ پہر ہونے والی تھی۔ درختوں کے سائے طویل

ہورہے تھے۔ چوہان اور فیروز اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے باہر نکلے۔ دوسری طرف سے سرخ لباس میں گرو مودان اور اسٹیل نمودار ہوئے۔ گرو مودان چھوٹے قد کا فربہ اندام شخص تھا جبکہ اسٹیل چھریرے جسم اور نہایت اونچی ٹاک والا دراز قد انگریز تھا۔ عقین صورت حال کے باوجود اسٹیل کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ ان انگریزوں میں سے تھا جو جب تیسری دنیا کے ملکوں میں آتے ہیں تو نسلی برتری اور اپنی شان و شوکت کا احساس مستقل طور پر ان کے چہروں سے چمک جاتا ہے۔

وہ لوگ چند بلند قامت درختوں کے درمیان بیٹھ گئے اور بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ دونوں طرف کے رائفل بردار گفتگو کرنے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ انور خاں اپنی پوزیشن پر بالکل چوکس تھا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور اسٹین پگن بھی اور انگلی لٹبی برقی۔ وہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں ایک ٹائیپ کے اندر انکیشن لے سکتا تھا۔ اسحاق مسلسل ماریا کے سر پر موجود تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ اگر حکم جی کے کارندوں کی طرف سے کسی طرح کی کارروائی کی گئی تو ہم ماریا کو شوٹ کر دیں گے۔ انور خاں، احمد اور میں دہانے پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ہم نے صورت حال پر عقابانہ نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

درختوں کے نیچے ہونے والی گفتگو دس پندرہ منٹ ہی جاری رہ سکی۔ دونوں طرف برقی نظر آرہی تھی۔ اسٹیل بار بار ایک کاغذ چوہان کے سامنے لہرا رہا تھا اور بلند آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف چوہان بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ یہ گفتگو کلاسی پر ہی ختم ہوئی۔ جب چوہان اور فیروز واپس آنے لگے تو گرو مودان نے ایک تھیلیا چوہان کو دیا۔ اس تھیلے میں ماریا کی ضروریات کا سامان تھا۔

”کیا ہوا؟“ انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

”ابھی ان میں بہت اکڑفوں ہے۔ دماغ درست ہونے میں ابھی کچھ دن لگے گا۔“

”کیا کہتے ہیں؟“ انور خاں نے پوچھا۔

”وہ صرف ایک مطالبہ مان رہے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو حفاظت کے ساتھ نل پانی پہنچانے پر تیار ہیں۔“

”اور جو پچاس بندوں کی فہرست دی تھی؟“

”ان کا کہنا ہے کہ ان میں سے بس پندرہ ہیں ہمارے پاس موجود ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جن پر دشمنین قسم کے کیس ہیں۔ انہیں اس طرح چھوڑا نہیں جاسکتا۔“

”بلکواس کرتے ہیں۔“ انور خاں پھنکارا۔ ”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ پچاس کے پچاس لوگ حکم جی کے قبضے میں ہیں۔ ان کو اس وقت بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہوگا۔“ انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

”جارج گورا کو سزا دینے کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟“

”گرو مودان کا کہنا ہے کہ جارج کے خلاف اگر ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت اور گواہی ہے تو پیش کی جائے۔ اس کے خلاف اسی طرح کارروائی ہوگی جس طرح اسٹیٹ کے کسی عام بندے کے خلاف ہو سکتی ہے۔ اور اگر الزام ثابت ہوئے تو پھر سزا بھی ملے گی۔“

انور خاں نے دانت میں کر حکم جی اور اس کے مشیروں کو ایک غائبانہ گالی دی اور بولا۔ ”جس عورت کی عزت خراب کی جاتی ہے اس کی گواہی سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور پھر ایک دو نہیں، سیکڑوں لوگوں نے سلطانہ کو جارج کے گھر سے اجڑی بجڑی حالت میں برآمد کیا ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ لیکن یہ لوگ جانتے ہیں کہ قانون کے محافظ بھی اپنے ہیں، عدالت بھی اپنی اور قاضی بھی اپنے۔ یہ دن دھاڑے ہزاروں لوگوں کے سامنے بھی کسی کو ناحق نکل کریں گے تو پھر بھی کسی نہ کسی شق کی وجہ سے سچ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سینہ تان کر قانون کی بات کرتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں کہ جب قانون، انصاف نہیں کرتا تو پھر کچھ اور راستے کھلتے ہیں، کچھ اور طرح کی عدالتیں نکلتی ہیں۔ اور شاید اب ایسی ہی عدالتیں لگیں گی۔“ انور خاں کی آواز طیش سے پھٹ رہی تھی۔

”تم نے آخر میں کیا کہا ہے؟“ اسحاق نے چوہان سے پوچھا۔

”میں نے انہیں جو بیس گھنٹے کی مہلت اور دی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہم ماریا کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکیں گے۔“

”اس بیگ میں کیا ہے؟“ انور خاں نے پوچھا۔

چوہان نے کیٹوس کے بیگ کی زپ کھولی۔ یہ کافی بڑا بیگ تھا۔ اس میں ماریا کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ایک شال، کپڑوں کا ایک جوڑا۔ ٹوتھ پیسٹ، صابن، تولیہ، پرفیوم، شراب، بسکٹ، نیچے بچھانے کے لیے ایک خاص قسم کی میٹ اور اس طرح کی دیگر اشیا۔

اسحاق نے بھی یہ چیزیں دیکھیں اور اس کا چہرہ سرفخی مائل ہو گیا۔ ”میں اسے یہ سب کچھ استعمال تا ہیں کرنے دوں

گا۔“ وہ دانت میں کر بولا۔ ”یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ وہی کھاوے گی جو ہم کھاویں گے۔ یہ آسمان سے ناپیں اتری ہوئی۔ ہزاری ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں یہ سب کچھ جلا دوں گا۔ اس کے سامنے جلا کر رکھ کر دوں گا۔“ وہ ایک دم پھر گیا۔

اس نے تھیلیا پکڑا اور جلتے ہوئے چولھے کی طرف بڑھا۔ انور خاں لپک کر گیا۔ ”کیا کرتے ہو اسحاق! کچھ ہوش کی بات کرو۔ یہ چیزیں کل ہمارے کام آسکتی ہیں اور ان میں دوائیاں بھی ہیں۔ کیا پتا ہمیں اس لڑکی کے لیے ان دوائیوں کی ضرورت ہی پڑ جائے۔“

اس نے اسحاق کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا لیکن اسحاق نے نہیں چھوڑا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”پہلے تم کو وعدہ کرنا ہو گا انور بھائی۔ دواؤں کے علاوہ ان میں سے کوئی شے اس حرازدادی کے لیے استعمال نا ہیں ہووے گی۔“

”ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔“ انور خاں نے کہا اور تھیلیا اسحاق سے لے لیا۔

ماریا ایک گوشے میں بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ماحول میں سخت تناؤ پایا جا رہا تھا۔ دہانے سے باہر حکم جی کے اہل کاروں کی نفری بہت بڑھ گئی تھی۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم بھی زیادہ جو کسی کا مظاہرہ کریں۔

اچانک شور سنائی دیا لیکن یہ شور دہانے کی طرف سے نہیں اندرونی حصے کی طرف سے تھا۔ وہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں باروندا کے زخموں پر مرہم وغیرہ لگا کر آیا تھا۔ اس کی اگلی ٹانگ کو انور نے دہرا کر کے زنجیر سے باندھ دیا تھا۔ اب یہ ٹانگ کھل نہیں سکتی تھی۔ میں نے اس کی دہلی پٹی پنڈلی کے زخم پر دوا لگانے کے لیے اس کی زنجیر کو تھوڑا سا ڈھیلا کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تھوڑی سی ڈھیل اس شخص کے لیے کافی زیادہ ثابت ہوگی اور وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

ہم آوازوں کی سمت دوڑے۔ عجیب الخفقت باروندا ایک لکڑی کے سہارے تیزی سے ایک سمت دوڑا جا رہا تھا۔ احمد اس کے پیچھے تھا اور انگریزی میں پکار رہا تھا۔ ”رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔“

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے احمد نے باروندا کو دبوچ لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب باروندا احمد کی گرفت میں بے بس ہو گیا ہے۔ احمد اسے آسانی سے سنبھال لے گا مگر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باروندا نے جنوبی انداز میں چلاتے ہوئے زور مارا اور خود کو احمد کی گرفت سے چھڑا لیا۔ احمد لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور دوبارہ باروندا کی طرف بڑھا۔ جب باروندا نے

Scanned and Uploadeed By Nadeem

اپنی بیساکھی کو لانچی کی طرح استعمال کیا اور اس کی دھکیل سے ایک بار پھر احمد کو لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ احمد سے مقابلے پر آمادہ ہے۔ احمد کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک پروفیشنل لڑاکا تھا۔ وہ کمرانے میں اللہ آباد کا ٹیمپل تھا اور کئی اہم مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا۔ اس کے لیے باروندا جیسے معذور و مدقوق شخص پر غالب آنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ اس نے بھٹا کر کھڑے کھڑے ایک زوردار لات باروندا کے منہ پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ یوں لگا کہ اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی، مگر کچھ بھی تھا اس شخص کی سخت جانی ہم بدبودار کشتی میں دیکھ چکے تھے۔ میری اور اسحاق کی کئی سخت ضربات وہ بآسانی پھیل گیا تھا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ چوٹ کھا کر مردہ چھپکلی کی طرح گرا ضرور لیکن پھر اپنے اگلوتے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں احمد سے اندازے کی غلطی ہوئی یا شاید اسے غلطی نہیں کہنا چاہیے۔ احمد کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو باروندا جیسے لاغر و مدقوق شخص کے سامنے اسی طرح کارڈنگل ظاہر کرتا۔ احمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر باروندا کو گردن سے دوپچتا چاہا۔ باروندا نے اس کی ناف پر گھٹنے کی ضرب لگائی پھر اس کے جڑے پر ایک کارگر مکار رسید کر کے دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا۔

احمد کے لیے یقیناً یہ صورت حال سبکی اور طیش کا باعث تھی۔ وہ ایک مانا ہوا فائٹر تھا۔ وہ اپنی طرف سے اب تک اس لاغر شخص کو رعایت دیتا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر باروندا کو ایک بار پھر دوپچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں میں زبردست جدوجہد شروع ہوئی۔ آنے والے دو تین منٹ بے حد حیرت ناک تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ لاغر باروندا نے نہ صرف احمد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ آخر میں اچانک اس کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے احمد کے دو تین وار بچائے، پھر دفعتاً کمرانے کے ہی انداز میں گھوم کر لات چلائی۔ اس کی ایڑی احمد کی کٹھنی کے آس پاس نہیں گئی۔ اس سے پہلے کہ احمد اس ضرب سے سنبھل سکتا، اس کی بیساکھی نے ایک بار پھر لانچی کا کام کیا۔ اس کی بھرپور ضرب احمد کی پیشانی پر لگی، احمد پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

اسحاق نے اپنی ٹریل ٹو رائفل سیدھی کی اور صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے باروندا کو نشانے پر لے لیا۔ ”خبردار... شوٹ کر دوں گا۔“ وہ چلا یا۔

میں نے بھی رائفل باروندا کی طرف سیدھی کر لی۔ اس موقع پر وہ مزید ”ایفی ٹینسی“ دکھانے کی کوشش کرتا تو ہم

یقیناً اس پر گولی چلا دیے۔ جان سے نہ بھی مارنے تو رضی ضرور کر دیتے۔ وہ ایک دم بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر انگریزی میں دہائی دینے لگا۔

”مجھے شراب دو۔ نہیں تو میں مرجاؤں گا۔ میری موت کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔“ پھر وہ سب کو مشترکہ گالیاں دینے لگا اور اس بات پر صلواتیں سنانے لگا کہ ہم اسے اس کے گھر سے نکال کر کیوں لائے ہیں۔

وہ اس خستہ حال سڑی ہوئی مٹتی کو اپنا گھر قرار دے رہا تھا۔ انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی باروندا اور احمد کی لڑائی کے آخری مناظر دیکھ چکا تھا۔ ہم سب کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی تعجب تھا۔ انور اردو میں بولا۔ ”یارو! اس کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوئی ہیں پھر بھی اس نے احمد کو لہا لہا دیا ہے۔ اگر یہ خدائی خوار صحت مند ہوتا تو کیا کرتا؟“

انور خاں اس بات پر مجھ سے تھوڑا سا خفا بھی ہوا کہ میں نے مرہم پٹی کے وقت اس کی زنجیر تھوڑی سی ڈھیلی کر دی تھی۔ میں نے اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا۔ باروندا کو دیوچ کر ہم نے ایک بار پھر اس کی اگلی ٹانگ کو دہرا کیا اور اسے زنجیر میں کسا۔ چونکہ ہم زیادہ تھے اس لیے باروندا کوئی خاص مزاحمت نہیں دکھاسکا۔ اسے دوپچتے وقت میں نے اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی عجیب سی سختی محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ اس کی ہڈیوں پر کسی انسان کی نہیں کسی بھینسے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ سوکھی سڑی ہونے کے باوجود وہ جلد اپنے اندر عجیب سا کھوپڑ پن رکھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ بظاہر مدقوق و بیمار شخص کئی ایک سخت ضربات آسانی سے سہہ گیا تھا۔

احمد کا پھیلا ہوا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ کے پتے پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ، میں تمہاری بینڈج کر دوں۔“

احمد لنگراتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ بھی واضح طور پر حیران نظر آ رہا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ چل دیا۔

”یار! یہ کیا بلا ہے؟“ چوہان نے پوچھا۔

”مجھے امید تھی کہ یہ اتنا سخت جان نکلے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کسی وقت مارشل آرٹ کا ٹھیک ٹھاک کھلاڑی رہا ہے۔ دفاع اور حملے کی ہر باریکی کو سمجھتا ہے یہ۔“ احمد کے لہجے میں بدستور حیرت موجزن تھی۔

”وہاں کشتی میں بھی اسحاق نے اسے بری طرح مارا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”دو چار ٹھوکریں میں نے بھی لگائی تھیں۔ لگتا تھا کہ ہم کسی جیتے جاگتے بندے کو نہیں، لکڑی کے پتلے کو مار رہے ہیں۔ اس وقت یہ سخت نشے میں تھا۔ ہم نے سمجھا تھا،

”شاید نشے کی وجہ سے یہ ساری چوٹیں پھیل گیا ہے۔“

”اس کا کوئی اتنا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ پھر ہی کوئی جانکاری ہو سکتی ہے اس کے بارے میں۔“ انور خاں نے پرسوج لہجے میں کہا۔

انور خاں جب بھی باروندا کے بارے میں کوئی بات کرتا تھا یا اس کی طرف دیکھتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی باروندا کو کبھی دیکھ چکا تھا۔

ڈاکٹر چوہان نے احمد کی مرہم پٹی کر دی۔ احمد عجیب مگو مگو کی کیفیت میں تھا۔ ایک طرح کی شرمندگی بھی اسے محسوس ہو رہی تھی تاہم اس شرمندگی پر حیرت اور انجمن کے تاثرات غالب تھے۔

چوہان نے کہا۔ ”اپنی شکل و صورت اور لہجے سے یہ شخص نیپال کا لگتا ہے لیکن جہاں تک میری جانکاری ہے، نیپالی تو مارشل آرٹس کے کوئی ایسے شوقین نہیں ہوتے۔“

”ڈاکٹر چوہان! مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں۔“ احمد نے کہا۔ ”کھٹنڈو وغیرہ میں، میں نے خود کنگ باکسنگ اور کمرانے وغیرہ کے بڑے بڑے کلب دیکھے ہیں۔ اور پھر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ جیسا خوفناک فائٹر جس نے یورپ تک تہلکہ مچایا تھا اور اسٹریٹ فائٹنگ میں ایشیائی چیمپئن مانا جاتا تھا، نیپال سے ہی تعلق رکھتا تھا۔“

مارشل آرٹس میں جینی کا نام تو میں نے بھی سن رکھا تھا۔ لاہور میں جب گاہے بگاہے مجھ پر مارشل آرٹ کا جنون سوار ہوتا تھا اور میں نئے سرے سے اپنے پرانے کلب میں جانا شروع کرتا تھا تو پھر مارشل آرٹ کی سرگرمیوں کے حوالے سے بہت سی خبریں میرے کانوں تک بھی پہنچا کرتی تھیں۔ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، بین الاقوامی مقابلے کہاں کہاں منعقد ہو رہے ہیں، کون کون سے بڑے کھلاڑی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مارشل آرٹس سے متعلق رسائل و جرائد بھی کلب میں آتے تھے جو معلومات میں اضافے کا سبب بنتے تھے۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک عجیب الخلق باروندا کے بارے میں بات ہوئی رہی... پھر انور خاں نے ہمیں دہانے کی طرف بلا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اپنے مورچے سے زیادہ دور نہ جائیں۔ اور وہ ٹھیک ہی کہتا تھا، حالات نہیں اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ احمد بھی اپنی پوزیشن پر میرے برابر آکر بیٹھ گیا لیکن وہ چپ چپ تھا۔ وہ واضح طور پر ہزیمت محسوس کر رہا تھا۔ فن حرب اس کی شناخت تھا اور آج

ایک لاغر شخص نے اس فن میں اسے نچا دکھایا تھا۔

شام کے وقت میں سرنگ کے عقبی حصے میں گیا تو یہاں دھپ دھپ کی آوازیں آئیں۔ آگے جا کر دیکھا تو احمد پسینے میں شرابور شوق میں مصروف تھا۔ دو دن پہلے اس نے ایک بیگ میں ریتی مٹی بھر کر اسے سرنگ کی چھت سے لٹکا دیا تھا اور صبح کے وقت اس پر طبع آزمائی کرتا تھا لیکن آج وہ چونکہ تناؤ میں تھا اس لیے شام کے وقت بھی لگا ہوا تھا میں اس کو نیڈ بیگ پر ٹکس برساتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی ٹکس میں جان بھتی۔ جو ضربات وہ نیڈ بیگ کو لگا رہا تھا، وہ واقعی ایک ٹیمپل کی ضربات نظر آتی تھیں۔ اس کا اسٹیمنا بھی قابلِ تعریف تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں بھی کمرانے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور لاہور میں کئی سال تک ایک کلب سے منسلک رہا ہوں۔ ہم جب باتیں کر رہے تھے، تھوڑے ہی فاصلے پر موجود باروندا نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ ٹکٹ آواز میں سب کو گالیاں دے رہا تھا اور اپنے لیے شراب طلب کر رہا تھا۔ انگریزی کے علاوہ وہ گاہے بگاہے نیپالی میں بھی بولنے لگتا تھا۔ اس کی نیپالی سننے کے بعد اب اس میں شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ نیپال سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ انگریزی میں بولا۔

”اپنی یہ رائفل یہاں... یہاں میرے دل پر رکھو اور گولی چلا دو۔ میں اب جلدی مرنے چاہتا ہوں۔ شراب کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ تم سب کے سب اپنے بال بچوں سمیت جہنم میں جاؤ گے... کیونکہ تم نے ایک بندے کو جیتے جی جہنم میں ڈال دیا ہے۔“

میں نے ادھر ادھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ”تم تسلی رکھو۔ میں رات کو تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا۔ لیکن شور شرابا کرتے رہو گے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم شراب کی بات کر رہے ہو؟“

”کہا ہے نا آہستہ بولو۔“ میں نے اسے سرگوشی میں ڈنٹا۔

وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

رات کو پھر دوسرے پہر تک ہماری ڈیوٹی تھی۔ یعنی میں، فیروز، اسحاق اور ہمیش۔ ایک بجے کے قریب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میرے پہلو میں ہمیش جلد ہی سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھا اور اس تاریک گوشے میں پہنچ گیا جہاں کیونوں کا بڑا بیگ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں آج

ماریا فرعون کے لیے ضروری اشیا آئی تھیں۔ ان ضروری اشیا میں، میں نے اعلیٰ درجے کی شراب کی دو بوتلیں بھی دیکھی تھیں۔ میں نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے ایک بوتل نکالی اور سرنگ کے اس عقبی حصے میں پھنک گیا جہاں ایک چٹائی پر ایک بازو اور ایک ٹانگ والا باروندا دراز تھا۔ میرے ہاتھ میں لائین تھی۔ اس لائین کی روشنی میں باروندا کسی کچھوے کی طرح حقیر اور بے جان نظر آ رہا تھا لیکن اس کچھوے کے اندر جو بجلی چمکتی تھی، اس کا مشاہدہ آج سہ پہر ہم نے کیا تھا۔

مجھے دیکھ کر باروندا کی نقابت بھری آنکھیں چمک اٹھیں۔ پھر جب اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑی بوتل پر پڑی تو وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے کسی طاقتور اسپرنگ نے دھکیلا ہو۔ میں جانتا تھا کہ وہ بلا نوش ہے اور اگر میں نے بوتل اسے تھمائی تو ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں ہی اسے ختم کر ڈالے۔ ”مجھے دو۔“ میرا گلا بالکل خشک ہو رہا ہے۔ ”وہ تڑپ کر بولا۔

”لیکن تمہیں صرف اتنی ہی پینی ہوگی جس سے تمہارا کام چل جائے۔ میرے پاس صرف ایک ہی بوتل ہے۔“

وہ اتنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے دو۔“ میں مر رہا ہوں۔ ”اس کی بے تابی دیدنی تھی۔

میں نے اسے گلاس میں ڈال کر دی۔ وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے غناخت چڑھا گیا اور ایک بار پھر کسی بھک مگے کی طرح میلا کچھلا گلاس میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دوبارہ اس کا گلاس بھرا۔ وہ یہ بھی سانس لیے بغیر پی گیا۔ وہ بالکل ”زیت“ پی رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ پانی پی رہا ہو۔ تیسرے پیگ کے بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہو گئی۔ اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نشہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ لائین کی روشنی میں اس کے چہرے کا دایاں رخ نظر آ رہا تھا۔ اسی رخ میں عمران کے چہرے کی جھلک تھی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ مجھے عمران کی مسکراہٹ یاد آئی۔ اس کی آواز، اس کے بالوں کا اسٹائل۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ جا چکا تھا۔ اس خوبی رات میں ڈیک ٹائے کے قاتل پانی نے اسے نگل لیا تھا۔

کچھ دن پہلے کچھوڈا میں میڈم صفورا نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ عمران کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یعنی وہ مجھے عمران کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں۔۔۔

کسی وقت میرا دل پکار پکار کر یہ کہنے لگا تھا کہ میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ کم از کم ایک بار ضرور دیکھوں گا۔ کہیں نہ کہیں۔۔۔

کسی نہ کسی جگہ، کسی چھپائی جگہ کو، کسی سرمئی شام کو یا کسی دسکی

ہی تاریک رات کو جب اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس خیال کی کوئی تجھی وجہ نہیں تھی لیکن یہ ایک دیوانی آس بن کر میرے دل میں پیوست رہتا تھا۔ رات کے اس پہر جب چار سو خاموشی تھی، اس سرنگ سے باہر جنگل میں جانوروں کی آوازیں گونجتی تھیں اور کبھی کبھی دہانے کی طرف آسمانی بجلی کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میرے دل کی کیفیت عجیب ہو گئی اور یہ کیفیت اکثر طاری ہو جاتی تھی۔ پچھلے دنوں والے اتنی شدت سے یاد آتے تھے کہ دل کی رگیں ٹوٹنے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ جانکاہ خیال دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں واپس لوٹنے میں بہت دیر کر چکا ہوں۔ دو ڈھائی سال کا عرصہ میں نے مکمل بے خبری میں گزار دیا ہے، حالانکہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ میرے لیے بے حد قیمتی تھا۔

میں جاگتا رہا۔ میری بے تابی بڑھتی رہی۔ میں اٹھ کر سرنگ میں ٹھلنے لگا۔ جسم جیسے بخار میں پھنک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ساری دیواریں توڑ کر سارے قاتلوں سے منہ موڑ کر آندھی طوفان کی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ سامنے ہی وہ نیڈ بیگ جھول رہا تھا جس پر احمد ایکس سائز کرتا تھا۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میں اس نیڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ مارشل آرٹس کے حوالے سے میں نے جو کچھ سیکھ رکھا تھا، وہ میرے اندر موجود تھا۔ بس اس پر وقت کی گرو پڑی ہوئی تھی۔ میں نے نیڈ بیگ پر طبع آزمائی شروع کی تو جیسے وقت کی پڑی ہوئی گرد صاف ہونے لگی۔ سب کچھ تازہ ہو گیا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ تازگی کچھ اور طرح کی ہے۔ گئے برسوں میں بھی میں نیڈ بیگ کے ساتھ بہت وقت گزار چکا تھا لیکن آج کی ملاقات کچھ اور طرح کی تھی۔ اس ملاقات میں وہ بے پناہ حرارت بھی شامل تھی جو پچھلے چند ہفتوں میں میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس حرارت کے کچھ ماخذ تھے۔ اپنی ماں کا مرا ہوا چہرہ۔ عمران کے سینے پر لگتا ہوا راتل کا برست۔ سیٹھ سراج کا سنخوس چہرہ۔ اور پھر آخری منظر۔۔۔ جو شاید اپنی تازگی کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف دیتا تھا۔۔۔ جارج گورا کے بیڈروم کا بند ہوتا دروازہ اور اس کے پیچھے اوجھل ہوتا سلطانہ کا زرد چہرہ۔

میں نیڈ بیگ پر اندھا دھند کے اور ٹھوکریں برساتا چلا گیا۔ میری لگائی ہوئی ضربات کی آواز سرنگ میں دور تک جاری تھی لیکن میرے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ کچھ تو سو رہے تھے اور جو جاگ کر پہرہ ادا رہے تھے، انہوں نے بھی سمجھا کہ شاید احمد اپنی ورزش میں مصروف ہے۔ میں جب بائپ جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رک جاتا۔ سانس بحال ہوتی

تو پھر زور آزمائی شروع کر دیتا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے قریب اندھیرے میں موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ باروندا تھا۔ وہ کھٹکتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور نہ جلتے کب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”تم یہاں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ اگر تم مجھے اپنی بوتل میں سے ایک بڑا پیگ اور پلا دو تو میں تمہیں تمہارے اس مارشل آرٹ کے بارے میں ایک بڑے کام کی بات بتاؤں گا۔“ وہ انگریزی میں بولا۔

”پہلے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟“ میں نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کا ٹنگ وچر ٹنگ جسم دیکھا۔ اس کی ٹانگ بدستور زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔

”اس بات کو چھوڑو۔ پیاسا کنوئیں کے پاس پہنچ ہی جاتا ہے۔“ شراب پینے کے بعد اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ کافی کم ہو گئی تھی اور وہ قدرے توانا بھی نظر آتا تھا۔

”تم مجھے کام کی بات کیا بتاؤ گے؟ کیا تمہارا تعلق فائننگ آرٹ سے رہا ہے؟“

”بس تھوڑا بہت۔ کھٹنڈو میں استاد کھلاڑیوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ تم مجھے چند گھنٹہ دو، میں تمہیں کچھ شان دار پٹیں دوں گا۔“ وہ لپکانے والے انداز میں بولا۔

پتا نہیں کیوں میں اس سے ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ عمران کی شہادت کی جھلک بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی لیکن شاید اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

میں نے اسے ایک درمیانے سائز کا پیگ اور دیا۔ یہ پیگ اس نے ذرا غل جیسے پیا اور خاصا مسرور نظر آنے لگا۔ اس کے اندر کی بے پناہ تخی اور جھٹا ہٹ بھی قدرے کم نظر آنے لگی۔ وہ اپنے لنگوٹ کے اندر اپنی دہلی پٹی رانوں کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو۔۔۔ تم جب مکا چلاتے ہو تو اس میں صرف اپنے بازو اور کندھے کی طاقت استعمال کرتے ہو۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تم اپنی طاقت کا صرف چوتھا پانچواں حصہ استعمال کرتے ہو۔ تمہارے کٹے میں تمہارے پورے جسم کی طاقت استعمال ہونی چاہیے۔ پاؤں سے لے کر سر تک پورے جسم کی۔“

وہ خود کوز مین پر کھسکا تا ہوا نیڈ بیگ کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے مجھے نیڈ بیگ پر مکا چلا کر دکھایا۔ ”اس طرح۔“ وہ بولا۔ وہ مذہبوں کا ڈھانچا تھا لیکن واقعی میں نے محسوس کیا کہ اس کے کٹے میں کوئی بات ہے۔

اس نے جیسے بائپ کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ ذرا دیر کھانتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ماہرانہ انداز میں بولا۔ ”توازن۔۔۔ فائننگ آرٹ میں توازن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔ جب تم ضرب لگاتے ہو تو یہ تصور کر لیتے ہو کہ یہ ضرب تمہارے مقابل کو ضرور لگے گی۔ نیڈ بیگ کی حد تک تو یہ سوچ درست ہے لیکن جب تمہارا مد مقابل متحرک ہوتا ہے تو پھر کوئی ضرب اس کو لگتی ہے، کوئی نہیں لگتی۔ تم جس انداز میں ضرب لگاتے ہو، وہ خطا ہونے کی صورت میں تمہارے توازن کو بری طرح بگاڑ دے گی اور ہوشیار مد مقابل اس سے فوراً فائدہ اٹھائے گا۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شراب ملنے کے بعد وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ بُری شے اس کے جسم میں پہنچ کر اثر دکھا رہی تھی۔ وہ بڑے یقین سے بولا۔ ”اگر تم مقابلوں میں حصہ لیتے رہے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے سر کے پچھلے حصے اور دائیں کندھے پر ضرور سخت چوٹیں آئی ہوں گی اور اس کی وجہ یہی توازن کی کمی ہے۔“

میں ایک دم سناٹے میں رہ گیا۔ باروندا نے یہ بات سو فیصد درست کہی تھی۔ کلب اور انٹر کلب مقابلوں میں اکثر میرے دائیں کندھے پر چوٹ لگ جاتی تھی۔ ایک ایسی ہی چوٹ کی وجہ سے ایک مرتبہ میں ایک فائل مقابلے میں پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ یہ کئی برس پرانی بات تھی۔

میں تعجب سے اس عجیب وضع مدقوق شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”تم کہتے ہو کہ تم کھٹنڈو میں استاد کھلاڑیوں کے مقابلے دیکھتے رہے ہو۔ انہیں دیکھ کر تمہیں خود بھی تو کھیلنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا؟“

”ہاں، کسی وقت میں خود بھی کھیلتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”نیپال کے ایک کھلاڑی جسکی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔ ہمارے کلب میں ”انٹرنیشنل کراٹے پلیئرز“ کے ساتھ جسکی کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ کیا تم نے بھی اس کو بھی دیکھا؟“

”ہاں ہاں جسکی۔۔۔ وہ تو نیپال کا چمکتا ستارہ تھا۔ اس نے تھائی اور جاپانی فائٹرز کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ زبردست کھلاڑی۔۔۔ زبردست کھلاڑی تھا۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

”اب وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب وہ نیپال چھوڑ چکا ہے۔ ویسے بھی اب وہ اس فیلڈ میں نہیں ہے۔“

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد دہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

جی جیسے شیطان ہوں، جہاں جارج اور اسٹیل جیسے بھیڑیے ہوں، وہاں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن تمہیں ان چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بالکل ضرورت نہیں۔“ میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے وہ مناظر یاد آئے جب اسحاق اور میں اسے بدبودار سستی میں بری طرح پیٹ رہے تھے اور وہ ہماری ضربوں کو حیران کن آسانی سے جھیل رہا تھا اور پھر یہاں اس سرنگ میں آج صبح کا واقعہ نکا ہوں میں تازہ ہوا۔ جواں سال صحت مند احمد اس لاغر معذور کو دست بدست لڑائی میں زیر کرنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ نشے کی ترنگ میں بولا۔ ”اگر تم مجھ سے آنو گراف لینا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی۔ دراصل میں بائیں ہاتھ سے لکھتا تھا اور میرا بائیں ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔ ہاں، اگر تم میرا اندر دیکھنا چاہو تو لے سکتے ہو۔ تم یہ انٹرویو کسی اخبار یا ٹی وی چینل کو دے کر بہت پیسے بنا سکتے ہو۔ جیک کے آخری انٹرویو کے طور پر یہ بڑی شہرت پاسے گا۔ ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر کھانسنے لگا۔

میں نے اس کے برہنہ بازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تمہارے بازو پر تو تمہارا نام باروندا لکھا ہوا ہے۔“ لیکن باروندا کے آگے ”بے“ بھی تو لکھا ہوا ہے۔ یہ جیک کے لیے ہے۔ میرا پیدا کنی نام باروندا ہے لیکن جس نام نے شہرت پائی وہ جیک ہے۔“

میں حیرت آمیز تجسس سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس مشہور و معروف شخص سے میری ملاقات بھانڈیل اسٹیٹ کے اس جنگل کی اس زمین دوز سرنگ میں ہوگی اور اس حال میں ہوگی۔ یہ میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہارا بازو... اور ٹانگ کاٹے گئے تھے؟“

”تو تمہارا کیا خیال ہے، میں نے شوقیہ انہیں اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا۔“

”لہلہ... لیکن... میرا مطلب ہے کہ تم حکم اور جارج کا نام لے رہے ہو... کیا یہ کام انہوں نے کیا ہے؟“

”دیکھو دوست! میں نے دو پیگ کے بدلے میں تمہیں جو کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا، وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اگر تم کچھ اور پوچھنا چاہو گے تو پھر اس کے لیے تمہیں کچھ اور مہیا کرنی پڑے گی۔ ویسے بہتر تو یہی ہے کہ اس موضوع کو نہ چھیڑو۔ تمہارا دل دکھے گا اور میرا تو بہت زیادہ دکھے گا۔ دیکھو، کتنی پیاری رات ہے، ہوا ٹھنڈی ہے۔ باہر سے جنگلی

بول میں فقط تین چار کچ شراب ہی باقی رہ گئی تھی... بول میں نے ایک طرف چھادی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عام شرابیوں کی طرح ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی مانگے گا لیکن اس نے کچھ نہیں مانگا۔ شاید اس کی سانسوں کی ذوریں شراب کے ساتھ ہی بندھی ہوئی تھی۔

وہ دوسرے گلاس میں سے نصف ”آگ“ اپنے اندر اندر چکا تو میں نے کہا۔ ”تم مجھے جیک کے بارے میں کچھ بتانے جا رہے تھے۔“

”تم... اس سے ملنا... چاہتے ہو؟“ وہ لاکھڑائی آواز میں بولا۔

”ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایسا موقع آ ہی جائے۔“ وہ عجیب ترنگ آمیز آواز میں بولا۔ ”تم کہتے ہو کہ تمہارے کلب میں جیک کی تصویر لگی ہوئی تھی، کیا تم اس تصویر کو غور سے دیکھا کرتے تھے؟“

”ہاں... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ”میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی جیک تمہارے سامنے آئے تو تم اسے پہچان سکتے ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ پہچان سکتا ہوں۔“ ”لیکن میرا خیال ہے کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ وقت کے ساتھ چہرے بہت بدل جاتے ہیں۔“ ”تم... کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے بڑی طرح چونک کر پوچھا۔

”میں کہتا ہوں کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ جیسے دوسرے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جیک ان کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکتے۔“ لائین کی زرد روشنی میں وہ عجیب ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ میرے بدن کا سارا خون تیز رفتاری سے میرے سر کی طرف دوڑ پڑا ہے۔ پورے جسم پر چوینیاں سی ریگ گئیں۔ میں ساکت نظروں سے باروندا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس کے لمبے بالوں اور چہرے کے جھاڑ جھکاڑ میں مجھے کچھ جانے پہچانے خدوخال نظر آئے۔

وہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پُر درد انداز میں مسکرایا۔ ”ہاں... تم میرے بتائے بغیر ہی ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ میں تمہارے سامنے ہے۔ نیپال کا درخشاں ستارہ، ایشیائی چمکپن، انٹرنیشنل کرائے پیرا سٹار، اسٹریٹ فائٹنگ کا بادشاہ۔ ہاں ہاں، وہ سب کچھ میں ہی ہوں۔“

”لیکن... یہ... کیسے ہو سکتا ہے؟“ ”یہ دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جہاں تم

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ مارشل آرٹ کو خیر باد کہہ چکا ہے؟“ ”نہیں۔“ اس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر جھونٹے لگے۔ ”جو شخص ایک بار سچے دل کے ساتھ مارشل آرٹ سے نشتی ہو جاتا ہے، وہ پھر کبھی بھی اسے مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ناٹ ایٹ آل۔ اور جیسی تو ایسا شخص ہے جس کے خون میں یہ آرٹ رچ بس چکا ہے... وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑا انوکھا شخص ہے۔“

”اگر کوئی شخص اس سے ملنا چاہے تو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں... میں تمہیں اس کا مکمل پتا بتا سکتا ہوں۔ یہ پتا... یہ پتا شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ لیکن اس کے لیے اس کے لیے... تمہیں تھوڑی سی اور مہربانی کرنا پڑے گی۔“ اس نے دور کونے میں رکھی ہوئی واٹ 69 کی بوتل کو لپکائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”تم حد سے بڑھ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ وہ ہنسا اور چہرے کے جھاڑ جھکاڑ بالوں میں سے اس کے میلے دانت جھلک دکھانے لگے۔ میں نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ”تم حد کی بات کر رہے ہو... اور حد تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔ لیکن مجبوری ہے، تم دو ڈبل پیگ اور دس دو تو میرا گزرا رہا ہو جائے گا۔“

”اسپرٹ نے تمہارا بیڑا غرق کر دیا ہے... اور بیو گے تو تمہاری بڑیاں بھی کھوکھلی ہو کر ٹوٹنے لگیں گی۔“

”یہی تو میں چاہتا ہوں کہ یہ بڑیاں جلد نوٹا شروع ہو جائیں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا پھر بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانسنے کھانسنے دہرا ہو گیا۔ ”دیکھو... میرا پہلا نشہ بھی غارت ہو رہا ہے۔ اگر میں دو پیگ اور لگا لوں گا تو میرا پہلا نشہ بھی بچ جائے گا اور میری آخری راتوں کی یہ رات بھی تھوڑی سی خوب صورت ہو جائے گی۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بدلے میں تمہیں نیپال کے اکلوتے ”سپر اسٹار مارشل“ کا پتا بھی بتاؤں گا۔“ وہ شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر میں نے بوتل اٹھائی اور قریباً نصف گلاس بھر کر اس کے سونکے سڑے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ گلاس اس نے غناٹ چڑھانے کے بجائے گھونٹ لے لے کر پیا۔ اس کے نیم مردہ چہرے پر عجیب سی تہمت آتی جا رہی تھی۔ حسب وعدہ مجھے دوسرا گلاس بھی دینا پڑا۔ اب

بھولوں کی خوشبو بھی آ رہی ہے۔ یہ سنو... یہ سنو... کہیں دور شاید کوئی چیتا چبک رہا ہے۔“

میں خاموش رہا۔ وہ خود ہی بولا۔ ”تم کہو گے، چیتا چبکتا نہیں، چلاتا اور چٹکھڑتا ہے لیکن مجھے تو اس وقت چبکتا ہی لگ رہا ہے۔ ہر شے خوب صورت ہے۔ یہ سرنگ بھی اب اتنی بڑی نہیں لگ رہی۔ میرا خیال ہے کہ باہر چاند بدلیوں میں سے جھانک رہا ہوگا۔ کاش! میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتا، اپنی کشتی میں... کیا تم کسی طرح اپنی کشتی تک جانے میں میری مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے اپنے سارے ساتھیوں میں سے بہتر لگے ہو۔ تم میری زبان بھی سمجھتے ہو۔ شاید میرے دل کی زبان بھی کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آ رہی ہو۔ میں اپنی کشتی میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسی بھی وقت کام ختم ہو سکتا ہے۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے میری کشتی اور میری شراب تک پہنچا دو تو میں... تو میں...“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا لیکن پھر اسے خیال آیا ہوگا کہ ابھی وہ اپنی زندگی کے مختصر ترین ہونے کا ذکر کر چکا ہے۔

اچانک دہانے کی طرف سے بلند آوازیں سنائی دیں۔ ان میں نمایاں آواز انور خاں کی تھی۔ وہ چلانے والے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ خطرے کی کھنٹی تھی۔ میں نے باروندا کو وہیں نیڈ بیگ کے قریب چھوڑا۔ بوتل اور رائفل تھامی۔ قریب آجیاس ساتھ میٹر کا فاصلہ طے کر کے میں تیزی سے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہاں صورت حال واقعی تشویش ناک تھی۔ انور خاں ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ سر تاپا ایک جنگجو بیٹھان تھا۔ اس نے ماریا کو سر کے بالوں سے بری طرح جکڑا ہوا تھا اور اپنی رائفل کی نال اس کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ ماریا کو بالکل سرنگ کے دہانے پر لے آیا تھا۔ انور خاں اور ماریا دونوں کا رخ باہر کی طرف تھا۔

انور خاں واپس رہا تھا۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ... میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ... نہیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ابھی ختم ہو جائے گا۔“

جلدی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دہانے سے باہر حکم جی کے رخ گارڈز نے پیش قدمی کی کوشش کی ہے۔ وہ دہانے کے عین سامنے قریب پندرہ میٹر کی دوری پر دو بڑے پتھروں کے پیچھے پوزیشن لینے کی کوشش میں تھے۔

انور خاں نے ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ماریا کو

دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فائر کی آواز سے ماریا چلا کر رہ گئی۔ انور خاں گر جا۔ ”میں صرف پانچ تک گنوں گا... تم لوگ واپس نہیں گئے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”بات کرنا چاہتے ہو تو پہلے پیچھے جاؤ۔ ہم کوئی ہوشیاری نہیں چلنے دیں گے... میں پھر کہتا ہوں، ابھی تمہارے سامنے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“ انور خاں کی آواز میں ایسی دہانہ تھی کہ ارد گرد کی ہر شے لرزتی محسوس ہوئی۔ ماریا دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں پکاری۔ ”خدا کے لیے پیچھے چلے جاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔“ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا مگر انور خاں نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ بلند آواز میں وقفہ وقفہ سے بولا۔ ”ایک... دو... تین...“

ماریا پھر چلائی۔ ”چلے جاؤ... واپس چلے جاؤ۔“ ہم نے صاف دیکھا کہ پتھروں کے پیچھے سے مسلح گارڈز اٹھے اور اٹنے قدموں چلتے پیچھے ہٹنے لگے۔ مدھم چاندنی میں ان کی موومنٹ اور ان کے ہاتھوں کا جدید اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ جب تک نگاہوں سے اوچھل نہیں ہو گئے انور خاں، ماریا کو دو بچے اپنی جگہ بالکل الٹ کھڑا رہا۔ اس کے عقب میں احمد تھا۔ شور سن کر اسحاق اور فیروز بھی اٹھ کر آ گئے تھے۔ ان سب کی رائفلوں کا رخ باہر کی طرف تھا۔

دو چار منٹ بعد یہ ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ انور خاں نے سب کو تفصیل بتائی کہ کس طرح اسے اور چوہان کو درختوں کے پیچھے حرکت محسوس ہوئی اور کس طرح وہ الٹ ہوئے... ماریا کو دہانے سے ہٹا کر دوبارہ اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ احمد پوری طرح چوکس اس کے سر پر کھڑا رہا۔

اس واقعے کے بعد کوئی بھی سونے کے لیے نہیں گیا۔ ڈاکٹر چوہان مسلسل نیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اپنی پوزیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیش نے خشک دودھ سے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے ہم باتوں میں مصروف رہے۔ ایک زبردست تناؤ کے بعد سب کے اعصاب قدرے پرسکون تھے۔ میں نے انور خاں اور چوہان کو بتایا کہ مدقوق نیپالی باروندا دراصل کون ہے۔

میرے انکشاف نے سب کو حیران کیا پھر ایک دم انور خاں کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ اس نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے لرزنا

آواز میں بولا۔ ”اوہ خدایا... اسی لیے میں بار بار سوچ رہا تھا کہ اس بندے کی شکل اور آواز کی وجہ سے کچھ یاد کیوں آرہا ہے۔ اب میں سب کچھ جان گیا ہوں... سب کچھ جان گیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ چوہان نے پوچھا۔ ”میں نے اس بندے کو دو سال... تقریباً دو سال پہلے راج بھون میں دیکھا تھا۔ اس نے چٹلون قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بڑی چمک دار سیاہ جوتی تھی اور شاید ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ ہاں، بہت اسمارٹ اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ راج بھون کے بڑے ہال میں شاید کوئی پارٹی تھی۔ کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے وہاں اس بندے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے موہن کمار سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک چیمپئن فائٹر ہے۔ جوڈو کرانے کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔ ہاں، مجھے سب کچھ یاد آرہا ہے۔“

”اس کی راج بھون میں آمد کا مقصد کیا تھا؟“ چوہان نے نیلی اسکوپ سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے موہن کمار سے یہی سوال کیا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا۔ بعد میں موہن کمار کے بھائی نے بتایا تھا کہ چارج گور صاحب کی بہن کو مارشل آرٹ وغیرہ سیکھنے کا شوق ہے۔ اس بندے کو بھاری معاوضہ دے کر اسی کام کے لیے یہاں بلایا گیا ہے۔ یہ چارج گور صاحب کی بہن کو ٹریننگ دینے کے علاوہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے دستے کو بھی ٹریننگ دے گا۔ اس ٹریننگ کے لیے حکم جی اپنے گارڈز کے دستے میں سے ایک سو بندے چنیں گے۔ مجھے وہ ساری باتیں اب اچھی طرح یاد آرہی ہیں۔“

چوہان نے نیلی اسکوپ ایک طرف رکھتے ہوئے بے حد حیران لہجے میں پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ ماریا فرگوسن کو سکھانا دینے کے لیے یہاں آیا تھا؟“

”صرف ماریا کو سکھانا دینے کے لیے نہیں... حکم جی کے ذاتی گارڈز کو ٹرینڈ کرنے کے لیے بھی۔ اس بندے سے ان دونوں کاموں کا معاوضہ طے ہوا تھا... مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن اندازہ ہے کہ یہ بہت بھاری معاوضہ رہا ہوگا... لیکن پھر...“

”پھر کیا؟“ چوہان نے پوچھا۔ ”کچھ دن تو یہ بندہ راج بھون میں نظر آیا تھا پھر اچانک ہی اوچھل ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب زیادہ ہار شوں کی وجہ سے بڑی ندی کے دو بند ٹوٹ گئے تھے اور اسٹیٹ میں زبردست سیلاب آ گیا تھا۔ نل پانی میں بھی کافی

Scanned and Uploaded By Nadeem

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اکتوبر 2010ء... کچھ غم اور کچھ خوشیوں کے رنگ

مذاب آب

سیلاب کے ریلے اور... دھراش واقعات کی جھلک... آخری صفحات پر عبدالرب بھٹی کے قلم کی نشتر زنی

طاق نسیان

ابتدائی صفحات کا ایک مخصوص رنگ اور تاریخ کا اپنا ہی ایک ایسا ڈھنگ، جسے بار بار پڑھنے کو دل چاہے... تو پھر پڑھیے اور معلومات میں اضافہ کیجیے۔

حضرت ادریس

ذہن کے تاریک گوشوں کو روشن کر دینے والی لازوال داستانیں... رضوانہ ساجد کے قلم کی روانی

واپسی

تجربہ تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات پر تل پل بل رنگ بدلتی طویل داستان... محی الدین نواب کے قلم کا جادو

منہ خالک

سینس سے بھرپور مجرم کی ہوشیاریوں اور ملک صفدر حیات کی حاضر دماغی کا دلچسپ قصہ

انوار

کاشف ذبیر، مریم کے خان، ثمر عباس، ڈاکٹر شیر شاہ سید، منظر امام اور سلیم انور کی دلچسپ تحاریر

وہ سب کچھ جو آپ سینس میں دیکھنا چاہتے ہیں! دیر نہ کیجیے تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

اس نے میری بات کو بکسر نظر انداز کر دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ سامنے نیڈ بیک کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے کھڑا ہونے میں مدد دو۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹانگ انور خاں کی ہدایت کے مطابق بدستور زنجیر میں بھی اور گھٹنے سے مڑی ہوئی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”میری یہ ٹانگ کھول دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے کسی کو نقصان پہنچے یا تمہیں شرمندگی ہو۔“

میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اگر یہ چند روز پہلے کی بات ہوتی تو شاید میں ایسا رکب کبھی نہ لیتا۔ لیکن اب دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ مجھے خطرات ہیچ محسوس ہونے لگے تھے۔ اگر دل میں کوئی اندیشہ ابھرتا بھی تھا تو میں خود کو سمجھاتا تھا۔ موت سے بڑھ کر تمہارے لیے کیا برا ہوگا۔ اور یاد رکھو کہ تم خود کو موت کے لیے آمادہ کر چکے ہو۔

میں نے جیپ کی زنجیر کھول دی۔ اس نے میرا سہارا چھوڑ دیا اور اپنی اکلوتی ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بیسٹا کی نمائندگی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی پیچنی اور عجیب انداز میں بولا۔ ”طاقت اس مٹھی میں نہیں، یہاں ہوتی ہے۔ یہاں۔۔۔ دماغ کے اندر۔۔۔ اگر دماغ میں طاقت نہیں تو پھر یہ مٹھی چاہے ایک پہلوان کے جسم کا حصہ ہو، وہ کمزور ہی رہتی ہے۔ دوسری صورت میں مجھ جیسا لاغر آدمی بھی نیڈ بیک مار کر مگا پھاڑ سکتا ہے۔۔۔ سس سوری۔ مگا مار کر نیڈ بیک پھاڑ سکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔“

”دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔
اس نے آہستہ آہستہ مٹھی پیچنی جیسے انگلی کے ایک ایک جوڑ کو علیحدہ علیحدہ موڑ رہا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دیر تک اپنے خیالات کو مرکوز کرتا رہا۔ تب اس نے اپنی بیسٹا کی اور ٹانگ پر اچھلتے ہوئے نیڈ بیک کو مارا سید کیا۔ نیڈ بیک پھٹا تو نہیں لیکن ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ دور تک گیا اور واپس آیا۔

”ونڈر فل۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”تمہاری جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ ضرب کافی زوردار ہے۔“
”یہ ضرب میں نے اپنے جسم کی طاقت سے نہیں، دماغ کی طاقت سے لگائی ہے۔ میری ساری ذہنی توانائی اس ضرب میں لگی ہے اور جب ذہنی توانائی نکلتی ہے تو جسمانی توانائی خود بخود نکلتی ہے۔ چلو اب تم خود کو کوشش کرو۔“

اگلے چار یا پانچ منٹ میں، میں نے باروندا جیپ کی ہدایات کے مطابق کچھ ضربیں لگائیں اور مجھے لگا کہ اس شخص

کیا ہے۔ اس ظلم کے نتیجے میں زرگان کے بہت سے لوگوں نے بغاوت کر دی ہے۔ ہم بھی ان باغیوں میں شامل ہیں اور پناہ کے لیے یہاں تل پانی کے نواح میں چھپے ہوئے ہیں۔ میری اس گفتگو کا باروندا پر اچھا اثر ہوا لیکن اگر میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ بولے گا تو یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنی کشتی اور کشتی میں رکھی ہوئی شراب کے علاوہ کسی شے سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ اس کو ابھی تک اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ ہم اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟

میں نے اسے بتایا۔ ”تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہمیں ڈر لگا تھا کہ کہیں اسی بے ہوشی میں تمہاری جان نہ چلی جائے۔ ہم وہاں رک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہمارے لیڈر انور خاں کو یہ مناسب محسوس ہوا کہ تمہیں ساتھ لے لیا جائے۔“

”بہت بُرا کیا۔ میں جتنی جلدی فارغ ہو جاتا تھا ہی اچھا تھا۔“ وہ فارغ کو میرے کے معنی میں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

”لگتا ہے تمہیں بھی حکم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بہت اذیت اٹھانی پڑی ہے۔“ میں نے اسے افسوس کیا۔ ”نہیں، کوئی اذیت نہیں۔“ وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ”تم نے وہ مقولہ نہیں سنا۔۔۔ محبت میں گزاری ہوئی چند گھنٹیاں، بے محبت زندگی کے سو برسوں سے بہتر ہوتی ہیں۔۔۔ نہیں، کوئی اذیت نہیں۔“ اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا تو اس کے بال چہرے پر جھولنے لگے۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ وہ پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ در تہ تھا۔ اس کے اندر جھانکتا آسان نہیں لگتا تھا۔ میں اسے گھیر گھاڑ کر ایک پوائنٹ پر لایا لیکن وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ شراب کے نشے میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ”چھوڑو ان باتوں کو۔ ایسی باتیں تو تم کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔ دیکھو، تمہارے سامنے ایک چمپین بیٹھا ہوا ہے۔ ایک سپر اسٹار انٹرنیشنل فائٹر۔ تم مارشل آرٹ میں دیگی رکھتے ہو۔۔۔ اور میں تمہیں جو کچھ بتا سکتا ہوں، روئے زمین پر اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہرگز نہیں بتا سکتا۔ مجھ سے فائدہ اٹھاؤ۔۔۔ میں اب زیادہ دیر رہنے والا نہیں ہوں۔“

وہ اپنے مرنے کی بات بڑے تواتر اور یقین سے کر رہا تھا۔

”تم اتنے مایوس کیوں ہو؟ تم اس قدر بیمار نہیں کہ زندگی کی طرف پلٹ ہی نہ سکو۔“

انج ران، جسم کے ساتھ موجود تھی۔ بازو کھنی کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں زخم یقیناً ڈیڑھ دو سال پرانے تھے۔ ٹانگ کا زخم تو بالکل مندرج ہو چکا تھا لیکن کھنی کے زخم کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ یہاں میکی جیپ کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور کسی دوا کی بو بھی آتی تھی۔

ہم خاموشی سے واپس لوٹ آئے۔ راستے میں انور خاں نے کہا۔ ”پتا چل رہا ہے کہ یہ حکم جی کے ظلم کا ایک اور شاہکار ہے۔ لیکن یہ اس حال تک پہنچا کیسے۔۔۔ اور پچھلے دو سال میں رہا کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ تھوڑا تھوڑا مجھ سے کھل رہا ہے۔ اگر کہیں سے شراب مل جائے تو میں اس سے سب کچھ اگوا سکتا ہوں۔“

”شراب کی ایک اور بوتل ماریا دالے بیک میں موجود ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے کہ اتنی سے کام نہ چلے۔ یہ بلا نوش ہے۔ پانی کی طرح پی جاتا ہے۔“

”یہ تو اس کی حالت سے ہی ظاہر ہے۔۔۔ بہر حال اگر اور کی ضرورت پڑے تو ہم باہر سے بھی منگوا سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ماریا کو چاہیے۔“

شام سے ذرا پہلے میں ایک بار پھر باروندا کے پاس جا بیٹھا۔ اس بار جانی واکر کی چم چم کرنی بوتل اور گلاس میرے پاس تھے۔ باروندا کا نقشہ نونے اب کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ بوتل دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں اس کے لیے تھوڑا سا ہنر بیف بھی لایا تھا۔ یہ بیف بھی ماریا کے سامان میں ہی آیا تھا۔

کل والا عمل پھر شروع ہوا اور تین چار گلاس ”سیال آتش“ اپنے اندر اٹھانے کے بعد باروندا جیپ کی پھر ترنگ میں آگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک مُردہ مرتے مرتے پھر زندہ ہو گیا ہے۔ وہ پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا اور میری منت کرنے لگا کہ میں اس کی مدد کروں اور اسے واپس کشتی میں پہنچا دوں۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم اسے پکڑ کر یہاں کیوں لے آئے ہیں اور اس سے کیا چاہتے ہیں۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں کیونکہ اس کی صورت میں مجھے اپنے ایک بہت ”پیارے“ کی جھٹک نظر آتی تھی۔ لیکن اگر میں اسے یہ بتاتا تو وہ مجھے اپنی مصیبت کا ذمے دار قرار دے سکتا تھا۔ لہذا میں اس حوالے سے خاموش رہا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ حکم کے غیر ملکی دوست جارج گورانے ایک مسلمان لڑکی پر ظلم

نقصان ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے وقتی طور پر رنجش بھلا دی تھیں اور ایک دوسرے کے علاقے میں امدادی کاموں کے لیے رضا کار بھیجے تھے۔ میں بھی ڈیڑھ دو ماہ تک دن رات مصروف رہا تھا۔ انہی دنوں میں یہ بندہ کہیں اوجھل ہوا تھا۔ بعد میں جب حالات ٹھیک ہو گئے تو میں نے ایک دو دفعہ موہن کمار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔“

چوہان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن وہ واپس نہیں گیا تھا۔ وہ یہیں پر تھا۔۔۔ اور بری حالت میں تھا۔۔۔“

”ہاں، یہ گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔“ انور خاں نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ انور کی داستان گوئی طرح ہمارے درمیان بیٹھا تھا اور ہم ہمد تن اس کی طرف متوجہ تھے۔ پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔“

انور خاں نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک کھردری چٹائی پر ماریا پہلو کے بل پڑی تھی۔ رات کے وقت اسحاق اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر ٹائیفلون کی رسی سے باندھ دیتا تھا۔ وہ اسے کسی طرح کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا اور اب ہم بھی سمجھ گئے تھے کہ ماریا رعایت کی سختی نہیں ہے۔ فیروز کی ٹانگ پر گولی کا زخم اس کا ثبوت تھا۔۔۔ انور خاں میرے پہلو میں چلتے ہوئے بولا۔ ”اس بندے کو یہ معلوم نہیں ہوتا چاہیے کہ ہم اسے پہلے سے جانتے ہیں۔“

”آپ بے فکر ہو۔“ میں نے کہا۔

ہم اس جگہ پر پہنچے جہاں باروندا کسی کچھوے کی طرح سمٹ سنا کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے منہ سے الکحل کے بجائے اٹھر رہے تھے۔

”اسے شراب کہاں سے ملی؟“ انور خاں نے پُر حیرت سرگوشی کی۔

”یہ وہ شراب ہے جو ماریا کے لیے آئی تھی۔“ میں نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا۔

لائسن کی روشنی میں انور خاں نے قریب سے بغور باروندا کا چہرہ دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ انور کا مطلب تھا کہ یہ وہی ہے۔

ہم یہ غور اس کے کئے ہوئے بازو اور ٹانگ کا جائزہ لیتے رہے۔ ٹانگ کو ران پر سے کاٹا گیا تھا۔ یہ مشکل چھ سات

Scanned and Uploaded By Nadeem

اور شاید وہ بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے نا، یہ وہ تیز بہاؤ والا پیار تھا جو کہیں پاؤں نہیں جسنے دیتا۔ میں بھی راج بھون میں ہی رہ رہا تھا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دیکھنے اور ملنے کے بہت سے مواقع تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا: 'ہمارا راز بہت جلدی کھل جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ بہت بُرا ہوگا۔ مگر اس نے ہنس کر نال دیا اور پھر وہی ہوا جس کا ذکر تھا۔ ایک دن اس کے پتا نے ہمیں دکھ لیا... اور پھر پتا نہیں کس طرح یہ بات اور بھی کئی لوگوں تک پہنچ گئی۔'

"اس کا مطلب ہے کہ وہ ہندو تھی اور جہاں تک میری جانکاری ہے انہی دو چار لوگوں کی فیملیاں راج بھون میں رہتی ہیں جو حکم کے قریبی مشیروں اور مصاحبوں میں شامل ہیں۔" تم مجھے شرلاک ہومز کا دیسی ایڈیشن لگ رہے ہو۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتیجے نکالتے ہو۔" اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے تھوڑا بہت بتا دو تا کہ مجھے نتیجے نکالنے کے لیے مغز ماری نہ کرنی پڑے۔" "بتاؤ رہا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے کہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتاؤ، وہ کون تھی؟" "اب وہ کسی اور کی ہے، اس کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"تم نے خود ہی کہا ہے کہ پھر یہ بات پھیل گئی تھی اور کئی لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کوئی ایسا راز نہیں رہا۔"

"تم ہوشیار واقع ہوئے ہو۔ ویکیوں کی طرح بحث کر لیتے ہو۔ لیکن تم یہاں اس منحوس اسٹیٹ میں کیسے آ پھنسے ہو۔ اور... مجھے لگتا ہے کہ تم انڈین بھی نہیں ہو... کیا تم انڈین ہو؟" "نہیں... پاکستانی... بس کچھ حادثات نے یہاں پہنچا دیا ہے۔"

"اوہ، ونڈرفل... پاکستانی۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

"نیپال اور پاکستان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہم دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے 'مالک' ہیں۔ ایورسٹ، کے ٹو، نانگا پربت، ملکہ پربت اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ ہمارے ہاں دنیا کے بہترین قدرتی مناظر اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ ہم نے بہت اچھے کھلاڑی پیدا کیے ہیں... اور پھر ایک اور بات... ہم دونوں ملکوں کو ایک بڑا زبردست ہمسایہ بھی ملا ہے۔ بہت محبت کرنے والا، بہت ہمدرد... اور امن پسند۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" "یہی تو بات ہے۔ پیار وہیں ہوتا ہے جہاں نہیں ہونا چاہیے۔"

"کون لڑکی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "یہ وہ سوال ہے جس کا جواب کوئی بھی سچا عاشق نہیں دیتا۔"

"حکم جی کے خانوادے سے تھی؟" "یہی سمجھ لو۔" "پھر کیا ہوا؟"

"وہی جو ہوتا آیا ہے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن سنبھال نہیں سکا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ تم ایک نیچر کی حیثیت سے اس اسٹیٹ میں آئے ہو، تمہیں اس کے لیے بہت معاوضہ دیا گیا ہے۔ عزت اور آسائش دی گئی ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ یہ لوگ جتنے مہربان ہیں، اتنے ہی سخت بھی ہیں۔ بہت ظالم بن جائیں گے۔ لیکن تمہیں پتا ہے نا، ہونی ہو کر رہتی ہے۔"

"میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے اگر تم بُرا نہ مناؤ تو پوچھوں؟"

"تم نے شراب پلا کر میری رات کو نگین کیا ہے... پوچھو۔" "کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جسے تم سکھشا دینے کے لیے یہاں اسٹیٹ میں آئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ جارج کی بہن ماری فرگوسن؟"

"تم فاول پلے کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہے نا، کوئی بھی سچا پیار کرنے والا اپنے محبوب کا نام زبان پر نہیں لاتا۔" "چلو ٹھیک ہے، میں نہیں پوچھتا۔ لیکن تمہارا پیار کس قسم کا تھا؟"

"یہ وہ پیار تھا جو آندھی کی طرح اٹھتا ہے اور طوفان کی طرح دماغ پر اور دل پر چھا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی طلب اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ یہ پیار کرنے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ کہیں پاؤں نہیں جسنے دیتا... کچھ سمجھنے میں نہیں آنے دیتا۔ ہم بھی راج بھون میں بس دو چار ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ لگتا تھا برسوں کے شناسا ہیں۔ چند گھنٹیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔"

"وہ بہت خوب صورت تھی؟" "مجھے اس کا پتا نہیں لیکن وہ میرے لیے دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی تھی اور میں اس کے لیے محبوب ترین شخص۔ اس کی ممکن ہو چکی تھی۔ اس کا ہونے والا شوہر اسے چاہتا تھا۔"

کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے رگ پھوں اور سوکھی سڑی جلد میں عجیب سی سختی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ "اگر میں نے تمہیں سب کچھ آج ہی بتا دیا تو تم کل کس تشریف میں شوق لاؤ گے۔"

"شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ کس شوق میں تشریف لاؤ گے؟"

"ہاں ہاں۔ یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی میں فقرے میں لفظ لٹے بول جاتا ہوں۔ تم خود ہی ٹھیک کر لیا کرو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ باقی بات کل ہوگی اور اگر تم 69" ہی کی ایک بوتل لا سکو تو کیا بات ہے۔"

"چلو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل تمہارے لیے وہی لاؤں گا جو کہا ہے لیکن اپنی بات ادھوری نہ چھوڑو۔ مجھے اچھن رہے گی۔"

"آہ ادھوری بات۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ "باتیں تو کبھی مکمل نہیں ہوتیں اور نہ کام مکمل ہوتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری خواہش پھر تیسری۔ انسان کو کہیں نہ کہیں رکنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور جہاں سے آگے نہ جاسکے وہاں خوشی سے رک جائے۔ باقی کی خواہشوں کو دل سے نکال دے۔"

میں نے کہا۔ "تم ایک چیمپین فاسٹر ہو لیکن تمہاری باتیں فلاسفروں جیسی ہیں۔ لگتا ہے کہیں گہری چوٹ کھائی ہے تم نے۔"

"تم مجھے کریدنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں اور... شراب کے بغیر تو بالکل بھی پسند نہیں۔" وہ مسکرایا تو اس کے لیے دانت نمایاں ہو گئے۔

اس کا مطمع نظر سمجھتے ہوئے میں نے بوتل کی باقی شراب بھی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے بوتل کو نندیوں کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے اس کی اکلونی ناگ پھر سے زنجیر میں باندھ دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا تاہم میں انور خاں کی تاراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

تھوڑی سی اور بی کروہ پوری ترنگ میں آ گیا۔ میرے پوچھے بغیر ہی بولا۔ "مجھے اسی جرم کی سزا ملی ہے جو بہت عام ہے۔ جو ہمیشہ سے بہت عام رہا ہے۔ جس کو کوئی روک سکا ہے نہ روک سکے گا۔ مجھے پیار ہو گیا تھا۔ ایک دم... بہت تیزی سے۔ بالکل طوفانی پیار..."

"کس سے؟" "جس سے نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

کی باتوں میں وزن ہے۔ وہ بولا۔ "آج میں تمہیں دو کام کی باتیں بتاتا ہوں۔ اگر تم ان کو یاد رکھو گے تو یہ عمر بھر تمہارے کام آئیں گی۔ بولو یاد رکھو گے؟"

"بالکل رکھوں گا۔" میں نے کہا۔ مجھے اس شخص سے اب واقعی عقیدت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ چند دن میں مرنے والا ہے اور میں نے ان آخری دنوں میں اسے ایک ویرانے میں بہترین شراب فراہم کر کے اس کو مسرور کیا تھا۔

وہ بولا۔ "انسان کے بنیادی خوف دو ہی ہوتے ہیں۔ ذہنی تکلیف اور جسمانی تکلیف۔ تم کسی خطرناک غنڈے سے دویدوڑتے کیوں نہیں ہو؟ تمہیں ڈر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مارے گا۔ تم پر کوئی ہتھیار استعمال کرے گا جس سے تمہیں تکلیف ہوگی۔ دوسرا خوف ذہنی تکلیف کا ہے۔ اگر وہ تمہیں مارے گا یا تم سے گالم گلوچ کرے گا یا تمہیں تھر تھر کانپنے پر مجبور کر دے گا تو لوگ یہ منظر دیکھیں گے اور تم شدید شرمساری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اگر ہم ان دو بنیادی خوفوں پر کنٹرول کر لیں تو ہم کسی بھی بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ بس ہم یہ طے کر لیں کہ ہم جسمانی تکلیف کو جھیلیں گے... اور اگر کہیں شرمندگی اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تو بھی جھیلیں گے۔"

"تمہاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اگر نہ لگیں گی تو یہ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔" وہ شان سے نیازی سے بولا۔ ذرا توقف کر کے اس نے گلاس میں بچی بچی شراب اپنے اندر اندر لی اور بولا۔ "اب میں تمہیں جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کا ایک خاص الخاص گرتا بتاؤں۔ اس گرت کو سمجھ لو گے تو دھیرے دھیرے جسمانی تکلیف تمہارے جسم سے دور ہو جائے گی۔ تمہیں درد نہیں ہوگا یا ہوگا تو بہت کم ہوگا۔ تم ایک نئے انسان بن جاؤ گے۔ ذرا سوچو اگر انسان کو درد نہ ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔"

ایک دم مجھے پھر وہ شستی والا منظر یاد آ گیا۔ اسحاق نے جیکی کو دیوانہ وار مارا تھا اور اس نے بس ایک دوبارہ کراہنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا واقعی... اسے بھی درد نہیں ہوتا؟ جیکی میں میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ جیکی نے جو دونوں باتیں کی تھیں، وہ میرے دل کو لگی تھیں... اور اب اس کی یہ تیسری بات بھی جیسے دل میں کھب گئی تھی۔

وہ ابھی تک لنگوٹ میں تھا۔ مجھے اس کا سارا جسم اٹھین

ایسا ہمسایہ ہو تو پھر جنت میں جانے کے لیے مرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ دنیا ہی بہشت بن جاتی ہے۔“ وہ حسبِ عادت طنزیہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اس موضوع پر بات کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے یاد دلایا کہ ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی تو اس کے سینے کی پسلیاں نمایاں تر ہو گئیں۔ لاشیں کی زرد روشنی میں اس کا سایہ سرنگ کی گھردری دیوار پر جھول رہا تھا، جیسے سائے نے جنگی سے بھی زیادہ پی رکھی ہو اور اسے بیٹھنا مشکل ہو رہا ہو۔ جنگی نے کہا۔ ”تم وعدہ کرو کہ کم از کم میرے مرنے تک یہ بات اپنے تک ہی رکھو گے۔“

میں نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی بھی یہ بات کسی تک نہیں پہنچاؤں گا۔“

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”وہ جارج کی بہن ماریا کی گہری سہیلی شکنتلا ہے۔ میری شاگرد تو ماریا تھی لیکن دھیرے دھیرے شکنتلا بھی مجھ سے سکھنا لینے لگی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے، وہ ہمیشہ ساڑی پہنتی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا۔ جوڈو کرانے سیکھنے کے لیے ساڑی سے اچھا لباس اور کوئی نہیں ہے۔ بس اس میں ایک خرابی ہے کہ ساڑی والی پلیئر کرانے کھیلنے ہوئے کسی کو کک نہیں مار سکتی، صرف فلائنگ کک مار سکتی ہے کیونکہ فلائنگ کک میں دونوں ٹانگیں اکٹھی ماری جاتی ہیں۔ میری بات سمجھ کر وہ بہت ہنسی۔ ہنسنے ہوئے اس کے دانت یمن کے موتی دکھائی دیتے تھے۔ اگلے روز وہ ماریا کی طرح ٹراؤزر پہن کر آئی۔ وہ ماریا کی طرح سنجیدہ نہیں تھی۔ بس شغل کے لیے آ جاتی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا ”لنک“ بنا کہ باقی ساری باتیں، سارے لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ بس ہم دونوں رہ گئے اور ہماری پیاسی نظریں جو ہر پل ایک دوسرے کو تلاش کرتی تھیں۔ شکنتلا کے پتا اشوک سہنی حکم جی کے خاص مشیر تھے۔ ایک دوسرے اہم مشیر رام گوپال کے ساتھ عرصے سے ان کی خاموش جنگ چل رہی تھی۔ اشوک سہنی اس جنگ میں اپنے حریف کو نیچلا دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں مل سکتا تھا کہ وہ شکنتلا کو حکم جی سے بیاہ کر اس کے سر بن جائیں۔ اشوک سہنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ شکنتلا اپنے اٹھڑپن اور خوب صورتی کی وجہ سے حکم جی کو پسند تھی۔ درحقیقت اشوک سہنی نے اپنے منصب اور رتبے کو بڑھانے کے لیے

ہی یہ فیصلہ کیا تھا اور یہ شکنتلا اپنے ہونے والے شوہر سے فریادیں بارہ برس چھوٹی تھی۔ اور اس سے پہلے بھی شوہر صاحب کی بیویاں اور رکھیلیں وغیرہ تھیں جن میں اس کی چیتھی اور منہ چڑھی بیوی رتا دیوی بھی شامل تھی۔“

بات کرتے کرتے جنگی کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا پورا ڈھانچا دھل کر رہ گیا۔ میں نے اسے پانی پلاتا چاہا لیکن اس نے شراب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دو گھونٹ لے کر قدرے شانت ہو گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا اور بولا۔ ”مجھے یہ ماننا چاہیے کہ اس معاملے میں زیادہ پیش قدمی میری طرف سے ہی ہو رہی تھی۔ شکنتلا پہلے تو بچنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پھر وہ بھی بے بس ہو گئی۔ یہ بڑی حیران کن کروش تھی۔ بے شک اس کی ”بے جوڑ شادی“ ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ حکم جی کو ناپسند نہیں کرتی تھی۔ اپنے مانتا پنا کی پسند کو وہ اپنی پسند سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک حکم جی ایک روحانی شخصیت بھی تھے جن کی عزت تکریم اور خوشی کا خیال رکھنا سب کا فرض تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ بے پناہ طاقت سے میری محبت کے مقناطیس کی طرف بھی پھینکتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر ہی ہوا تھا۔“

جنگی نے چند لمحے توقف کیا اور اپنی نشیمن آنکھوں سے ماضی میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”وہ چاندنی رات تھی۔ بڑی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ میں نے شکنتلا کو راج بھون کی چھت پر بلایا تھا۔ ہم سنگ مرمر کی جالیوں والی ایک برساتی میں ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے میں اس مہ جلیں پر جھکا ہوا تھا، اس کے لمبے بال سنگ مرمر کے چوڑے پردوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں کسی کی آمد کا امکان نہیں تھا لیکن اچانک ہم پر بجلی سی گر پڑی۔ ہم نے اشوک سہنی صاحب کو دیکھا۔ اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئے پھر ایک دم ٹھوے اور خاموشی سے نیچے چلے گئے۔ شکنتلا کی بری حالت تھی۔ وہ اپنی اوڑھنی کو درست کرتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس بات کا پتا ہمیں کئی دن بعد چلا کہ اشوک سہنی صاحب کو آگاہ کرنے والی شکنتلا کی انگریز سہیلی ماریا ہی تھی۔ اس نے یار مار کا کردار ادا کیا تھا۔“

”شکنتلا پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ہمارے ملنے کے راستے بند ہو گئے۔ ہم جو چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزار سکتے تھے، مابقی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارا ملنا ممکن نہیں اور اگر میں ایک نیچر

اور ٹریڈر کی حیثیت سے یہیں اسٹیٹ میں رہا تو میری جان کے ساتھ ساتھ شکنتلا کی زندگی کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا اور یہ مجھے ہرگز منظور نہیں تھا۔ میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جلد ہی کسی طرح شکنتلا کو بھی اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ وہ بہت روٹی تھی۔ ان دنوں اس کا دودھیا گلابی رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ میں اس سے آخری بار ملنا چاہتا تھا اور شاید وہ بھی آخری بار ملنا چاہتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک آخری ملاقات طے ہوئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ وہی کپڑے پہن کر آئے جن کپڑوں میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنی ایک کیمٹی کی بنیاد والدہ کی عیادت کے بہانے کوشلی چلی گئی۔ شاید تمہیں پتا ہی ہو کوشلی، زرگاں کی ایک نواحی آبادی ہے۔ یہاں سے جنگی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔“

”نہیں، میں اس بارے میں نہیں جانتا۔“

”شکنتلا وہاں پہنچی اور میں بھی حکم جی کے ”ناٹ“ واپس ”سے“ بچا کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یاد ہے، وہ پورے چاند کی رات تھی۔ چاند بھی نکل آتا، کبھی بدلیوں میں چھپ جاتا تھا۔ ہم ایک باغیچے میں ملے تھے۔ وہاں مولسری اور رات کی رانی کے پھول تھے۔ کچنار اور نیم کے گھنے پیڑوں میں ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔ وہ ٹوٹ کر روئی اور میری آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ اس نے کہا مجھے بھولنا نہیں۔ میں بھی جہاں ہوں گی، تمہیں یاد کروں گی۔ تمہارے لیے پرارتھنا کروں گی۔ صبح شام کے بدلتے رنگوں میں، نئے موسموں میں اور تہواروں میں تمہاری صورت میری نگاہوں کے سامنے رہے گی۔ میں نے کہا۔ میں دل میں ایک کاٹا لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ زخم ہمیشہ رستا رہے گا۔ مجھے بہت خون رلائے گا۔ بس یہ دعا کرنا کہ یہ ناسور بن کر مجھے زندہ درگور نہ کر دے۔“

”ہم نے وہ سب باتیں کیں جو جدا ہو جانے والے پریمی کسی آخری ملاقات میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہاں کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ جب شکنتلا آخری بار میرے گلے لگ کر چلی گئی اور میں بھی رخ موڑ کر دوسری طرف روانہ ہو گیا، مجھے لگا کہ وہ رک گئی ہے اور مڑ کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن شک اتنا شدید تھا کہ مجھے دیکھنا پڑا۔ ہاں وہ واقعی رک گئی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ کچنار، نیم اور مولسری کے پیڑوں کے درمیان وہ چاندنی میں نہائی ہوئی کھڑی تھی اور کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ کوئی اپسرایا پھر کوئی داستان شہزادی۔“

جس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پتھر اگئی تھی۔ اور وہی نہیں میں بھی پتھر اگیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور دوبارہ لپٹ گئے۔ وہ جیسے میرے جسم کا حصہ بن گئی، میرے اندر پوست ہو گئی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دل فگار لہجے میں کہا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا شاکن۔ وہ ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی۔ تو پھر مجھے یہاں سے لے چلو۔ کہیں بہت دور۔۔۔ جہاں کوئی میری خبر نہ پاسکے۔۔۔

”اور پھر وہ ہوا جو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا، جو ہمارے سامان گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم جو، ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے منہ موڑنے کے لیے آئے تھے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس باغیچے سے نکل گئے۔ اسی حالت میں جس حالت میں تھے۔ ہم گھنے جنگل میں گھس گئے۔ اندھا دھند بھاگتے رہے اور چلتے رہے۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اسی طرح دنیا کے دوسرے کنارے تک جاسکتے ہیں۔ میں جب شکنتلا سے ملنے کوشلی میں آیا تھا تو میں نے احتیاط کے طور پر ایک پٹل اپنے کپڑوں میں رکھ لیا تھا۔ اب اس خطرناک جنگل میں یہی پٹل ہمارے پاس واحد ہتھیار تھا۔ مگر عجیب بات تھی، کوئی خوف نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہ آسانی موت کو گلے لگا سکتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ پیار دیوانہ ہوتا ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ماضی میں جھانکتی ہوئی آنکھیں جیسے پیار کی دیوانگی کو دیکھنے لگیں۔ میلے چیلے لنگوٹ میں وہ تنک دھڑنگ بیٹھا تھا۔ اس کے سر اور واڑھی کے جھاڑ بھنکاڑ بال اسے کسی تارک الدنیا سادھو کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ اب وہ شراب کے لیے زیادہ بے تابی بھی نہیں دکھا رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ پورے سرور میں ہے۔ وہاں کی طرف سے ماریا کے کھانسنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ شاید سو رہی تھی۔ باروندا جنگی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی کہانی کا ایک اہم کردار ماریا اسی سرنگ میں اس کے ساتھ موجود ہے۔

”کیا تمہارا پیچھا نہیں کیا گیا؟“ میں نے لاشیں کی کو ذرا اونچی کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ ”نہیں کیا گیا اور اگر کیا بھی جاتا تو دو چار آدمی تو میرا پیچھا نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میرے پاس پٹل تھا اور اس کی کوئی تین درجن گولیاں تھیں۔ میں نے بہت سا مارشل آرٹ گھول کر پیا ہوا تھا اور میرے بدن میں بجلیاں کوندتی تھیں۔ میں دو چار بندوں کی ہڈیاں تو خالی ہاتھ بھی توڑ

میں نے کہا۔ ”وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔ ہم کو پکڑ لیا جائے گا۔ دونوں کو سزا ملنے سے بہتر ہے کہ کوئی ایک بچ جائے۔ میرا بچنا تو بہت مشکل ہے لیکن تم بچ سکتی ہو۔ میری خاطر شاکن... صرف میری خاطر... تم نے ان لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ تم اپنی مرضی کے ساتھ نہیں آتی ہو۔ میں تمہیں زبردستی لایا ہوں... پلیز شاکن... انکار نہ کرنا۔“

وہ سر تاپا احتجاج بن گئی۔ وہ دلہوز انداز میں کراہی۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتی... کبھی نہیں کر سکتی۔“

”میں نے اس کے خون آلود ہونٹوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ سختی سے ڈھانپ دیا۔ میں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ میں نے اسے اپنے سر کی قسم دی اور اسے لاچار کر دیا، ہاں میرے دوست اسے لاچار کر دیا۔“

جیل کی آنکھوں میں اب مسرت کے جگنو بچکے تھے، واقعے کی مناسبت سے اب اس کے چہرے سے گہرا اندوہ جھلک رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں پکڑ لیا گیا۔ مجھے کشتی پر ہی گرا لیا گیا۔ وہ درجنوں لوگ تھے۔ میں جانتا تھا کہ مزاحمت بے کار ہے۔ انہوں نے میرا پٹل چھین لیا۔ مجھے اس بُری طرح زد و کوب کیا کہ میری ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور ٹانگ منہ سے خون جاری ہو گیا۔ میں وہیں کشتی پر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔“

”ہوش آیا تو خود کو زمرگان کی بدنام جیل میں پایا۔ اس جیل کا انچارج جارج گورا جیسا سفاک شخص تھا۔ مجھے ایک زمین دوز کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا رابطہ فقط ایک شخص سے ہوتا تھا۔ یہ مجھے کھانا پہنچاتا تھا اور پھر خالی برتن لے جاتا تھا۔“

میرے جسمانی زخم مجھے دن رات تڑپاتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ جارج گورا اب نفس نفیس میری کوٹھڑی میں آیا۔ اس نے کہا۔ ”موت کی سزا تیرے جرم کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ تجھے مر مر کر جینا ہو گا۔“ جارج کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو آج کل مارا کا شوہر ہے... سرجن اسٹیل بریرے۔ وہ کہنے کو سرجن ہے لیکن فطرت میں بے رحم قصاب ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا میڈیکل باکس بھی تھا۔ مجھے ایک انجکشن دیا گیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میرا باپاں بازو اور دائیں ٹانگ جسم کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ واقعی یہ مر مر کر جینے جیسا تھا۔ میرا فن میری زندگی تھا اور مجھے اس فن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں اس کال کوٹھڑی میں چھ مہینے تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا

پہنچایا۔ خوراک کی خوشبو مختلف چرندوں کو ہمارے قریب لے آتی تھی اور ہم انہیں مایوس نہیں کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہم تادیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں تلاش کرنے والے اس جنگل میں ہر طرف پھیلے ہوں گے اور وہ بہت جلد اس دور افتادہ گوشے تک بھی پہنچ جائیں گے۔ شکنتلا بھی یہ جانتی تھی لیکن ہم ان باتوں کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ شکنتلا چاہتی تھی کہ اگر ایسا وقت آگیا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے گولی مار دوں۔ لیکن میں اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا، زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک پلان بنا رکھا تھا اور میں نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر بُرا وقت آگیا تو وہ میری ایک بات ضرور مانے گی۔

”اور پھر ایک رات وہ بُرا وقت آگیا تھا۔ ہم دونوں کشتی میں لیٹے تھے۔ تاریک آسمان پر تاروں کی بساط چھٹی ہوئی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیا اس کشتی کو چھوڑ کر جنگل میں راستہ بنانے کی کوشش کرنا ٹھیک رہے گا؟ اچانک کچھ آوازیں ہوا پر تیر کر ہم تک پہنچیں۔ یہ پانی پر چو پڑنے کی آوازیں تھیں، کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے۔ پھر میں نے دور نیم تاریکی میں تین کشتیوں کو دیکھا۔ یہ لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کشتیوں کی بناوٹ دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حکم جی کے لوگ ہیں اور ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آپہنچے ہیں۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھے، میرے ذہن میں جو پلان تھا میں اس پر عمل کر سکتا تھا۔ اب شاید تمہیں میری بات سن کر حیرانی ہو لیکن میں تمہیں جو بتا رہا ہوں سچ بتا رہا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ اپنی جھاڑ جھنکار ڈاڑھی کھاتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک دم شکنتلا پر پل پڑا۔ میں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیے، اس کے منہ پر زور دار لمبے مارے، اس کے جسم کو نوچ لیا۔ وہ گر پڑی۔ وہ حیرت اور صدمے سے لنگ گئی۔ بس وہ اتنا ہی کہہ پاری تھی جیسی... جیسی... میں نے اسے اوندھا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ چند دن پہلے جنگل میں بھاگنے کے دوران میں اس کے بازوؤں پر زخم آئے تھے، یہ زخم پھر رسنے لگے۔ میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔ ”شکنتلا! مجھے معاف کر دینا۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ مجھے انکار نہ کرنا اور تم نے وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ انکار نہیں کرو گی۔“

”اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں یادوں کے خوش رنگ جگنو چمک رہے تھے۔ وہ بولا۔ ”میں ان دنوں شراب نہیں پیتا تھا۔ ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا لیکن مجھے اتنا نشہ تھا جو اس واٹ 69 کی دس بوتلیں ایک ساتھ پی لینے سے بھی نہیں ہو سکتا... نہیں ہو سکتا۔ اور اس نشے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں خوشبو بھی، آنسو تھے اور ان آنسوؤں کی کمی سے خوشیوں کی کلیاں چمکتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جگہ قدرت نے روز ازل سے ہمارے لیے ریزہ کر رکھی تھی۔ ہماری محبت کے لیے... ہمارے ملن کے لیے۔ ہم زمان و مکاں... کے احساس سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ہجر کی بے رحم خیتوں نے طلب کی شدت کو انتہا پر پہنچایا تھا اور اب طلب کی اس انتہا نے سرشاری اور کیف کا ایک جہاں آباد کر دیا۔ ہم یوں ملے کہ پیار کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ہاں میرے دوست! کبھی زمین اس طرح دیوانہ وار آسمان سے نہ ملی ہوگی، کبھی بہاروں نے اس طرح ویران باغوں پر یلغار نہ کی ہوگی... اور نہ کبھی تابوتوز بادش نے اس طرح صحراؤں کو جل تھل کیا ہوگا۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ ان روز و شب کے بارے میں شاعری کروں... اگر میں ایسا کر سکتا تو وہ شاعری بے مثال ہوتی۔ وقت اسے مٹا سکتا اور نہ بھلا سکتا۔“

باروندا جیل کی گدلی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے جیسے ان روز و شب میں کھو گیا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک چمکین فائنر کم اور ایک شاعر زیادہ نظر آیا۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ میں چاہتا تھا کہ نشہ اترنے سے پہلے پہلے وہ اپنی کہانی ختم کر لے۔ اس نے گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ”ہم اس کشتی میں پورے سات روز رہے۔ شکنتلا کے شباب نے مجھے سیراب کر دیا اور میری انوکھی محبت کی شدت نے اسے ہر فکر بھلا دی... ہم نے کشتی کا کچھ سامان تو چرندوں پرندوں کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا تھا اور کچھ کشتی کے ایک گوشے میں سیٹ دیا تھا۔ ہم کشتی کے چھوٹے سے ڈیک و سونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور تیز بادش کے وقت بیسینٹ میں چلے جاتے تھے۔ وہاں نیچر کے سوا ہمیں دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا... اور کبھی کبھی لگتا تھا کہ نیچر بھی ہماری ہم مزاج ہو گئی ہے۔ ایک دن سرخ بالوں والا ایک بہت بڑا ریچھ ندی میں اتر آیا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ میں نے پستول نکال لیا لیکن وہ کچھ دیر تک ہمارا جائزہ لینے کے بعد واپس چلا گیا۔ ایک رات پانی میں تیرنے والا ایک سانپ ہمارے ساتھ کشتی پر موجود رہا لیکن اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں

سکتا تھا۔ ہم آدھی رات تک جنگل میں بھاگتے رہے اور پھر اس ندی پر پہنچ گئے جو ”کچے“ کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہاں گھاٹ پر بہت سی چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں۔ ایک نئی کٹور کشتی مجھے اچھی لگی۔ اس کے اوپر سامان تھا اور اس کا نیلا رنگ چمکیلا تھا۔ ملال اور مجھیرے اپنی جھوپڑیوں میں سو رہے تھے۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا، اس خاموشی میں بس کبھی کبھی لہریں کشتیوں سے نکراتی تھیں اور مدھم آواز پیدا ہوتی تھی۔ کشتی کے اندر بہت سے پھل اور کھانے پینے کی اشیاء لادی ہوئی تھیں۔ کشتی کا مالک ایک اشرف نامی نوجوان تھا۔ وہ علی الصباح یہ سامان لے کر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اسے اسٹیٹ ہی کی ایک جاگیر زہرہ آباد تک جانا تھا۔ ہم نے نوجوان سے معقول کرایہ طے کیا اور اسے کہا کہ وہ ہمیں بھی زہرہ آباد لے جائے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ابھی رات کے اندھیرے میں روانہ ہوگا۔ وہ مان گیا۔ ہم اس کے ساتھ ندی کے بہاؤ پر چل دیے۔ نوجوان سمجھ گیا تھا کہ ہم پریمی جوڑا ہیں اور کہیں پناہ کے لیے گھوم رہے ہیں۔ اس نے ہمیں آفر کی کہ اگر ہم کچھ دن کے لیے اس کی اس کشتی میں رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اسے معقول کرایہ دے دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر ہم ابھی اور اسی وقت اس سے یہ کشتی خرید لیں تو پھر؟ پہلے تو وہ نہیں مانا لیکن جب میں نے اسے کشتی کی قیمت سے قریب آڈھائی گنا زیادہ رقم آفر کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے کرنسی نوٹوں کو لائین کی روشنی میں ایک ایک کر کے بڑے دھیان سے دیکھا اور پھر ایک جگہ کشتی کے تالوں کی چابیاں ہمارے حوالے کر کے نیچے اتر گیا۔ اس کا سارا سامان بھی کشتی کے اندر ہی رہا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صبح کے طلحے اندھیرے میں نہیں تم ہو گیا۔

”اب یہ خوب صورت کشتی ہماری تھی۔ ہم ایک بانس نما چوک مدو سے اسے جس طرف چاہے لے جاسکتے تھے۔ اور ہم تاریک جنگل میں اسے بہت دور تک لے گئے۔ پھر ندی میں سے ایک اور شاخ پھوٹی۔ یہ شاخ ہمیں تیزی سے اپنے ساتھ بہاتی ہوئی ایک نامعلوم مقام پر لے گئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں ہمارے اور جنگلی حیات کے سوا اور کوئی نہیں... اور نہ ہی کوئی کبھی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں پانی پر ہزار ہا کنول تیرتے تھے۔ ان پھولوں کے درمیان آبی پرندوں کی مستیاں تھیں۔ جنگل سے موروں کی ”میں آؤں... میں آؤں“ سنائی دیتی تھی اور شاخوں پر رنگ برنگے طوطے چبکتے تھے۔ ہم نے کشتی کو ایک خاموش کنارے پر بٹھرا دیا۔“

ذرا توقف کر کے باروندا جیل نے دو گھونٹ لیے۔

رہا۔ مجھے ان گنت جسمانی و ذہنی اذیتیں جھیلنا پڑیں۔ یہاں تک کہ میں جاں بلب ہو گیا۔ مجھے رات کے وقت انتہائی تیز بخار ہونے لگا، اس کے علاوہ میرے بازو کا زخم بھی ٹھیک ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک رات سخت بے ہوشی کی حالت میں مجھے جیل کے شفا خانے میں پہنچایا گیا۔ میں اس شفا خانے میں قریباً ایک ماہ رہا۔ یہاں سیکورٹی کا وہ انتظام نہیں تھا جو جیل میں تھا۔ میرے پہرے پر صرف دو افراد ہوتے تھے۔ وہ دونوں ہندو تھے۔ وہ دیوالی کی رات تھی۔ زبردست آتش بازی کی وجہ سے کچھ ہوائیاں شفا خانے کے اندر آ گئیں اور شفا خانے کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ میرے دونوں پہرے دار تہوار کی وجہ سے اندھا دھند پے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی مدد ہوشی اور آتشزدگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک خطرناک کوشش کر کے شفا خانے سے نکل گیا۔“

اس نے ایک بار پھر توقف کر کے میری طرف دیکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”اگر تفصیل میں جاؤں گا تو یہ روداد طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ فرار کے بعد میں تین ماہ تک ایک مہربان پارسی عورت کے گھر میں چھپا رہا۔ وہ گھر میں شراب تیار کرنے کا کام کرتی تھی۔ وہیں رہتے شراب کی لت بھی لگی۔ وہیں پر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شکنتلا اب کس حال میں ہے۔ کیا تم جانتا چاہو گے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟“

”وہ حکم کی پتی نہیں بن سکی۔ لیکن پھر بھی حکم نے اسے چھوڑا نہیں۔ وہ حکم کی پسند تھی اور وہ اس کے ساتھ ”سونے“ کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔“

”میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔“

جیک کے چہرے پر عجیب طرز پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”حکم جیسے لوگ ارادے کے بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ وفاداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور یہ وفاداری ہوتی ہے اپنی حرص اور خواہش کے ساتھ۔ اپنے اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسے لوگ وہ ہر نیک کام کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد حکم، شکنتلا کو اپنی پتی کا درجہ تو نہیں دے سکتا تھا لیکن وہ اس کے پرکشش جسم سے یکسر محروم ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی خوب صورتی اور اس کی بے مثال زلفوں کا اسیر تھا۔ اس نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ شکنتلا کے ذریعے سب سے پتا اشوک سہی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو ”فیری“ بنا دے۔ فیری بننے کا مطلب سمجھتے ہو تم؟“

”نہیں، مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں۔“

”حکم اور اس کے حواریوں نے اپنے عوام کی دنیا اور عاقبت سنوارنے کے لیے بڑا اعلیٰ انتظام کیا ہوا ہے۔ شاید تم نے ساتویں کے جشن کے بارے میں سنا ہو؟ اس عالی شان جشن کے موقع پر راج بھون میں بڑے ”پاکیزہ“ قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ یہ انتظامات درحقیقت حکم اور اس کے درویش صفت دوستوں کی خوشی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ درویش صفت لوگ اسٹیٹ کی بہتری کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں، اپنا خون جلاتے ہیں۔ اگر یہ ساتویں کے جشن کے موقع پر آٹھ روزہ شراب وغیرہ پیتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ تفریح وغیرہ کر لیتے ہیں تو ایسا کیا برا کرتے ہیں؟ اور یہ سب کچھ بڑے شفاف طریقے سے ہوتا ہے بھی۔ پرانے زمانے سے یہ ریت چلی آرہی ہے۔ جشن کے موقع پر راجوڑے میں سے سات رنگوں کے مطابق سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ انہیں فیریاں یا اردو میں پریاں کہا جاتا ہے۔ یہ فیریاں پھر راج بھون کے اندر ہی رہتی ہیں۔ انہیں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ فنون کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں ظاہر ہے کہ ناچ گانے اور موسیقی وغیرہ کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کا تو پتا نہیں لیکن آج کل یہ فیریاں حکم کی رکھیلیں ہی سمجھی جاتی ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے یا اپنے قریبی دوستوں کے تصرف میں لاسکتا ہے۔ اب شکنتلا بھی ایک فیری کی حیثیت سے حکم کے حرم میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اس کی زندگی راج بھون کی اوچی دیواروں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے گم ہے۔“

اپنی اندرونی کمی کو کم کرنے کے لیے اس نے تھوڑی سی مزید ”سیال آگ“ اپنے معدے میں اتاری اور اپنا سر سرنگ کی کھر در دی دیوار سے نکا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”تم اس پھیرے کی کشتی تک کیسے پہنچے؟ کہیں یہ وہی کشتی تو نہیں...“

”ہاں، یہ وہی کشتی ہے۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”اسی کشتی میں، میں نے اپنی زندگی کے بہترین سات آٹھ روز گزارے تھے۔ یہ کشتی اب پرانی ہو چکی ہے لیکن اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر، ہر ہر راج پر میری محبت کی یادگاریں ہیں۔ اس کشتی کے اندر اب بھی میری شکنتلا کی ہنسی جذب ہے۔ اس کی حسین سرگوشیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے میں نے یہ کشتی ڈھونڈ لی ہے۔ میں اسی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا۔ ایسا نہ ہو سکا دوست تو میں اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی

راحت سے محروم ہو جاؤں گا۔ اور یہ محرومی مجھے مرکز بھی نہیں دے گی۔ اسی لیے تو کہتا ہوں، میری مدد کرو۔ مجھے واپس پہنچا دو۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز میں التجا کارنگ آ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے کبھی اس اسٹیٹ سے بھاگ جانے کی کوشش نہیں کی؟“

”مجھے لگتا ہے کہ تم یہاں کے جغرافیے اور حالات سے زیادہ واقف نہیں ہو۔ اس اسٹیٹ کو تین طرف سے ایک چوڑے پاٹ والی بہت تیز رفتار ندی نے گھیر رکھا ہے۔ اس ندی کے ساتھ ساتھ نگرانی کا سخت انتظام ہے۔ چوتھی طرف یہ جنگل ہے۔ اس طرف سے بھی اسٹیٹ کے بارڈر کو تقریباً ”سیل“ کر دیا گیا ہے۔ ویسے بھی میرے جسم کی حالت تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اس آدھے جسم کے ساتھ میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔ جب میں پارسی عورت ہوشن کے پاس تھا، میرے دل میں کئی بار آئی کہ ہوشن کی پناہ چھوڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔ ہوشن نے بڑا حوصلہ کر کے مجھے پناہ تو دے دی تھی لیکن وہ ڈرتی بھی رہتی تھی۔ اس کے ذریعے وہ ہم ہی تھا کہ حکم جی کے خاص قیدی اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے اور وہ جہاں بھی چلے جائیں، ان کو کھوج لیا جاتا ہے۔ شاید تم نے بھی یہ بات سنی ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں بھی ان خاص قیدیوں میں سے ایک ہوں اور مجھے بھی ایک جدید ”جادو“ کے ذریعے اس اسٹیٹ کے اندر جکڑ لیا گیا ہے۔

باروندا جیسی نے کہا۔ ”اے حکم کے روحانی کرشموں میں سے ایک کرشمہ کہا جاتا ہے لیکن اس کی اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں۔ کیا تم جادوؤں نے اور عملیات وغیرہ پر یقین رکھتے ہو؟“

”رکھتا بھی ہوں۔ اور نہیں بھی... اس معاملے میں بہت سے لوگوں کی طرح درمیان درمیان میں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”بہر حال، میں تمہیں اپنی محنت ہوشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ ہر وقت خوفزدہ رہتی تھی کہ کسی دن اس کے گھر کے دروازے پر حکم کے بے رحم ہیر کاروں کی دستک ہو جائے گی۔ وہ بے چاری بیمار رہنے لگی تھی۔ پھر ایک روز میں نے بڑی خاموشی سے اس کا گھر چھوڑ دیا۔ میرے پاس دو تین ہفتوں کی خوراک موجود تھی اور ایک دیسی ساخت کا پستول بھی تھا۔ میں کئی روز تک جنگل میں چھپا رہا۔ پھر میری

ملاقات چند پھیروں سے ہوئی۔ میں ان کے پاس رہنے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ میں نیپالی اور انگریزی کے سوا کچھ بول نہیں سکتا۔ وہ یہ زبان نہیں سمجھتے تھے۔ بس اشاروں سے گزارہ ہوتا تھا۔ میں بیمار رہتا تھا۔ بازو کا زخم مسلسل رستا رہتا تھا۔ شراب میری سخت ضرورت بن چکی تھی۔ بہر حال، مجھے زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ میں سو سال زندہ رہ کر بھی شاید وہ کچھ حاصل نہ کر پاتا جو میں نے اس ستائیس اٹھائیس سال کی زندگی میں حاصل کر لیا ہے۔ شکنتلا کے ساتھ گزارے ہوئے دن میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان دنوں کی خوب صورت یادوں کے سہارے میں جیتا رہا ہوں اور ان یادوں کے سہارے ہی اب مرنا بھی آسان لگ رہا ہے۔ ان پھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میرے دل میں یہ خواہش جاگتی تھی کہ میں اس نیلی کشتی کو ڈھونڈوں جس میں، میں نے شکنتلا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مقامی شخص نے بھی میری مدد کی۔ آخر میں کامیاب ہوا۔ مجھے وہ کشتی مل گئی۔ پھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میں کام بھی کیا کرتا تھا۔ میرے پاس کچھ رقم جمع تھی اور پستول بھی تھا۔ میں نے یہ سب کچھ کشتی کے موجودہ مالک ملاح سیوک رام کو دے دیا اور اس سے اجازت لے لی کہ میں جب تک زندہ ہوں، اس کشتی میں رہوں گا اور وہ مجھے کھانا اور شراب دیتا رہے گا۔ وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ گھائے کا سودا نہیں ہے۔ اس نے اقرار کر لیا۔ تو یہ ہے میری کہانی...“

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے جیلی کی سانس پھول گئی اور آواز پھر سے لڑکھڑانا شروع ہو گئی۔ دراصل اب اس کا نشہ ذرا دھیمپا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ نشے کے بغیر اس کی وہی حالت ہو جاتی تھی جو کسی نارمل شخص کی نشے میں دھت ہو کر ہو سکتی ہے۔ وہ کسی لاغر کچھوے کی طرح پیوند زمین ہو جاتا تھا اور اس کی آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔

اس کی کہانی متاثر کن تھی۔ مجھے اس کہانی نے شاید اس لیے بھی زیادہ متاثر کیا کہ میں خود بھی دل کا روگی بن چکا تھا۔ ثروت میری محبت تھی اور وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی... پچھلے دو ڈھائی سالوں میں پلوں کے نیچے سے نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ یہاں سلطانہ مجھے اپنی بیوی بتاتی تھی۔ وہ ایک دلیر لڑکی تھی۔ اس میں کچھ انوکھی باتیں موجود تھیں۔ جیسے یہ کہ وہ کبھی زیور نہیں پہنتی تھی۔ شاید وہ زیور کو عورت کے لیے غلامی و محکوم کی علامت سمجھتی تھی۔ وہ میری زندگی کی خاطر عارضی طور پر سر جارج گورا کے ہاتھوں بے بس تو ہو گئی تھی لیکن جہاں تک میں اسے سمجھا تھا، وہ ظلم سہہ کر بھولی جانے

مٹے گا، وہ کچھ کر کے رہے گی۔
چند منٹ تک میرے اور باروندا جی کے درمیان اس کی روداد کے بارے میں سوال جواب ہوئے۔ تب میں نے ایک بار پھر اسے سابقہ موضوع کی طرف لانا چاہا۔ میں نے اس کی جلد کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”جی! تم ایک مختلف شخص ہو۔ تمہارے جیسے چمپئن فائٹر کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“
”تم... کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”تمہارے اندر جسمانی تکلیف سہنے کی بے پناہ گنجائش ہے۔ اس بیمار حالت میں بھی تم برداشت کے معاملے میں بے مثال ہو۔ تم اس بارے میں مجھے بھی کچھ بتانے جارہے تھے لیکن پھر درمیان میں تمہاری یہ دلچسپ روداد آ گئی۔“
اس نے نفی میں انگلی ہلائی۔ ”میں مرنے والا ضرور ہوں لیکن میری یادداشت زیادہ کمزور نہیں ہوئی۔ میں اب بھی تمہیں بتا سکتا ہوں کہ الٹریٹھ ٹیلر کے چوتھے شوہر کا نام کیا تھا اور پرل ہاربر کی بندرگاہ پر کس تاریخ کو حملہ ہوا تھا۔“ اس نے پھر لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں بتانے کا وعدہ ضرور کیا تھا لیکن آج نہیں کل... کل تم میرے لیے شراب اور ہنٹر بیف کا ایک ”پیس“ لاؤ گے۔ وہ یہاں اس نیڈ بیگ کے قریب اطمینان سے بیٹھیں گے اور مارشل مارٹ کے بارے میں بات کریں گے۔“
میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز میری آنکھ دس گیارہ بجے کے قریب کھلی۔ سرنگ کے دہانے پر ایک بار پھر ہنگامہ برپا تھا۔ انور خاں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف دیانے کے باپ سے کسی اور شخص کے بولنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ یہ شخص علم کے اہل کاروں میں سے تھا اور انور خاں سے زوردار مکالمہ کر رہا تھا۔

اس مکالمے سے پتا چلا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ نے ماریا کے وارثوں کو اٹھارہ گھنٹے کی جو دوسری مہلت دی تھی، وہ بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ انور خاں چنگھاڑ رہا تھا۔ ”ہم سمجھ گئے ہیں۔ یہ سچی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں ہے۔ ہمارے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں چھوڑ رہے کہ اس حرامزادی کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیں اور یہ بس اب ہونے ہی والا ہے۔“

دوسری طرف سے بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”میں تمہیں پھر پیشکش کرتا ہوں۔ تم مسٹر اسٹیل اور گرو مودان کو اپنے پاس ضمانت کے طور پر رکھ لو۔ لیکن میم صاحبہ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم سارا معاملہ بات چیت کے ذریعے طے کر

”ہاں... ہم مسلمان ہیں... اور اسی لیے اس کی عزت بچی رہی ہے۔ ورنہ یہ بھی مختار راجپوت کی بیٹی کی طرح تاراج ہو چکی ہوتی۔ باقی رہی اس کے ٹکڑوں کی بات... تو انصاف تو یہی کہتا ہے۔ کان کے بدلے کان... آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اس کتے جارح نے اپنی جیل میں کتنے لوگوں کو اعضا کاٹ کاٹ کر بے کار کیا ہے؟ آج اس کی بہن کو تھوڑا سا بدلہ چکانا ہوگا۔“

ماریا کے شوہر سرجن اسٹیل کی لڑکھاتی آواز ابھری۔ ”دیکھو، تم لوگ اپنے لیے بدترین انجام کو CHOOSE کر رہا ہے۔ ہام تمہارا ڈیمانڈ مان رہا ہے۔ سلطانہ کے بھائی اور فادر کو چھوڑا جا رہا ہے۔ ہام نے آج تمہارا یہ ڈیمانڈ بھی مانا کہ جن 50 لوگوں کا لسٹ تم نے دیا، اس میں سے 25 لوگوں کو ریلیز کر دیا جائے گا لیکن باقی لوگوں میں سے کچھ تو ایسا ہے جو ہماری کسٹڈی میں ناپائیدار ہیں... اور دو چار ایسا ہے جن پر بہت سخت کیس ہے۔“

”کیس تو تم پر بھی بہت سخت ہے اسٹیل صاحب۔“ اسحاق پھر کردہازا۔ ”ایسے کیسوں کے بدلے تمہاری اپنی چٹی کو دس بار بھی پھانسی دی جاوے تو کم ہے۔ اور مجھے لگت رہا ہے کہ یہ زیادہ دیر زندہ رہنے والی ناپائیدار ہے۔ بس اب گھنٹوں کی ناپائیداری کی بات ہے۔“

”پانڈے! میری بات سنو۔“ گرو مودان نے اپنے کسی ساتھی کو پکارا۔

”آ رہا ہوں سر۔“ پانڈے نے جواب دیا۔ یہ بھاری آواز والا وہی تھا جو انور سے مکالمہ کر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ مجھے یہ نام میڈم صفورا نے بتایا تھا۔ ایک نہری میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ رنجیت پانڈے، غالباً حکم کا وہی اہل کار تھا جسے... دشمنوں کے لیے عزرائیل کہا جاتا تھا... اور وہ یہاں پہنچ چکا تھا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانیازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

اگست 2010

130

حاجہ سیدی ذالچیت

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں جو کچھ بھی چل رہا تھا مگر اس نے اپنے چہرے کی بٹاشت قائم رکھی ہوئی تھی۔ گفتگو کے آخر میں انور خاں نے ماریا کے لیے تین بوتل شراب کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ مطالبہ میرے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسی وقت شراب کی سربراہی بوتلیں اندر سرنگ میں بھجوا دیں۔

گفتگو ختم ہوئی تو میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ”یہ پانڈے وہی ہے جو انڈین سکیورٹی فورس میں افسر تھا اور اب یہاں حکم کے لیے کام کرتا ہے؟“

”وہی ہے حرامی...“ انور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس کے یہاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکم اور جارج وغیرہ دونوں راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں۔ بات چیت کا... اور کسی اچانک کارروائی کا بھی۔ پانڈے اور اس کے ساتھی ایسی اچانک کارروائی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ خاص طور سے یہ پانڈے کسی لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح خطرناک ہے۔ ہمیں اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔“

اسحاق نے کہا۔ ”میری تورائے ہے کہ دہشتیہوں میں سے دو چار ہم اس خبیث ماریا کی کمر سے بھی باندھ دیے جائیں اور پانڈے وغیرہ کو بھی بتا دیا جائے کہ ماریا کس حال میں ہے۔“

”چلو اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔“ انور خاں نے کہا پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”لیکن ماریا ہے کہاں؟“ اسحاق بولا۔ ”وہ ادھر بیٹھی اپنی روٹی پکارتی ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ یہاں ڈنل روٹی اور کیک پیسٹری ٹاپیں ملیں گی... روٹی ہی ملے گی اور یہ روٹی بھی اسے خود پکانا ہووے گی۔“

میں نے دیکھا کہ سرنگ کے خم پر جہاں عارضی باورچی خانہ بنایا گیا تھا، وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے جا کر دیکھا اور یقین ہو گیا کہ بھوک انسان سے سب کچھ کروا سکتی ہے۔ سفید فام ماریا کے پاؤں زنجیر میں بندھے ہوئے تھے لیکن ہاتھ آزاد تھے۔ چوہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور اوپر تو اڑکھا تھا۔ ماریا جس نے شاید کبھی تنکا پکڑ کر بھی دہرا نہیں کیا ہوگا، اپنے لیے روٹی پکارتی تھی۔ پچھلے دو تین دن میں اسے کافی مشق ہو گئی تھی۔ تو بے پروا پر ایک گول روٹی نظر آرہی تھی۔

اسحاق میرے پیچھے آکھڑا ہوا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میم جی کو کافی تجربہ ہو گیا ہے۔ اب ان پر کچھ اور ذمے داری ڈال دینی چاہیے۔“

میں نے پانڈے کی بس ایک ہی جھلک دیکھی اور وہ بھی عقب سے۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلا اور چھلانگ لگا کر ایک نشیب میں اوجھل ہو گیا۔ وہ خاصا تومند تھا۔ اس نے پیٹ اور چمک دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ غالباً گرومودان سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے نشیب میں اتر ا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل بھی وہیں موجود ہو...

اس تبادلہ خیال کا نتیجہ پانچ دس منٹ بعد سامنے آ گیا۔ پانڈے کی بھاری بھر کم کرخت آواز ایک بار پھر درختوں کے عقب سے ابھری۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ”انور خاں! ہم تاجیں چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کی حماقت کرو اور اس کے نتیجے میں سب کچھ برباد ہو جائے۔ گرومودان خون خرابے سے بچنے کے لیے ہر حد تک جانا چاہتے ہیں۔ تم نے پچاس لوگوں کی جوسٹ دی ہے، ان میں سے آدھے تو ہمارے پاس آگئے ہیں لیکن باقیوں کا کچھ پتا نہیں۔ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی مزید کوشش کرتے ہیں، تم بھی اپنے اندر کچھ پکچس پیدا کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہم کل دو پہر تک تم لوگوں کو کوئی حتمی جواب دے سکیں گے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ تم صرف وقت گزاری کر رہے ہو۔“ انور خاں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ”تمہاری فطرت دھوکا ہے پانڈے... اور تم اس کے خلاف نہیں چل سکتے ہو۔ مگر میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتا دوں۔ ہمیں تو مرنا ہی ہے لیکن یہ میم صاحب بھی زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ میرا تم سے اور اسٹیل... مودان وغیرہ سے وعدہ ہے۔“ انور کی آواز میں حد درجے کی تپش تھی۔

سرجن اسٹیل کی لڑکھائی آواز ابھری۔ ”ہام ماریا کا لائف بچانا چاہتا اور اس کے ساتھ تمہارا سب کا لائف بھی بچانا چاہتا۔ ہام ہو پ کرتا ہے کہ کچھ طے ہو جائے گا۔ ہام کی طرف سے پرامس ہے کہ کل دو پہر تک کسی طرح کا کوئی کارروائی نہیں ہوگا۔ تم لوگ بھی خود کو COOL رکھو۔“

انور خاں... سرجن اسٹیل اور پانڈے کے درمیان اس حوالے سے دو چار منٹ بات ہوئی پھر انور خاں کل دو پہر کا مزید وقت دینے کو تیار ہو گیا۔

یہ بڑی سخت قسم کی اعصابی جنگ تھی۔ ہر پہل جیسے سولی پر گزر رہا تھا۔ دونوں طرف سخت تناؤ موجود تھا۔ ایسی صورت حال میں کامیاب فریق وہی ہوتا ہے جو اعصاب کو ٹوٹنے سے بچائے رکھتا ہے اور اندازہ ہوتا تھا کہ انور خاں اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کے دل و دماغ

پورا ہو جائے۔“

پھنکارا۔ ”موت اتنی آسان نہیں ہے میم جی۔“ اسحاق نے اپنی بہن کو ایک ایک سانس کے لیے ترپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ کیا تم نے بھی ہائی ہوئی پیاسی چڑیا کو دیکھا ہے؟ وہ اسی طرح سانس لیوت گئی۔ اور وہ بھی بھی تو ایک چھوٹی سی چڑیا کی طرح... تمہارے بھائی کی شکرہ آنکھوں نے اسے شکار کے لیے چننا... اور پھر اس کے بے رحم بچوں نے اس کے جسم کو لہو کر ڈالا۔ وہ اس کے بچوں سے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے جیون کی ریکھا ہی پار کر گئی۔ ہاں، میں نے اسے مرتے دیکھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ جان دینا آسان نہیں۔“

اسحاق کے لہجے میں اتنی آگ تھی کہ چاروں طرف انگارے برستے محسوس ہوئے۔ ماریا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اسحاق پاؤں پختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ وہاں کھڑا رہا تو پیش کے دریا میں بہہ جائے گا اور وہ اس پیش کی وجہ سے پتہ جائے گی۔ انور خاں آگے بڑھا اور اس نے ماریا کو بے مشکل آدہ کیا کہ وہ اپنے پاؤں پر دو انگلیاں لے۔ وہ بڑے بڑے منہ بنا رہی تھی۔ میں اس کے قریب چوکیں کھڑا تھا۔ راکفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی اور میری انگلی ٹریگر کے آس پاس تھی۔ ماریا کے ہاتھ فی الحال کھلے ہوئے تھے اور یہ امر خارج از امکان نہیں تھا کہ وہ پیش کے عالم میں کسی پر جھپٹ پڑتی۔ پچھلے چند دن میں ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کی طرف سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سرنگ کے دور افتادہ کونے سے باروندا جی کی کاواویلا بیٹائی دے رہا تھا۔ وہ نشے کے بغیر تپ رہا تھا اور اس کی وہی گئی اور جھلاہٹ واپس آچکی تھی جس کا مشاہدہ ہم نے سنی میں کیا تھا۔

احمد نے آکر مجھ سے کہا۔ ”تاہش بھائی! تمہارا یار بہت بے چہن ہو رہا ہے۔ وہ کہوت ہے، میں مرنے والا ہوں۔ اگر میں پیاسا مر گیا تو تم سب جہنم میں جاؤ گے۔“ ”وہ جس طرح کا پانی مانگ رہا ہے، وہ دے کر بھی تو ہم جہنم میں ہی جائیں گے۔“ چوہان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انور خاں بولا۔ ”اس کی پیاس ذرا بڑھنے دو، پھر وہ اندر کی باتیں بتانے پر مجبور ہوگا۔“

میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ شام تک اس کی تپ ذرا بڑھ جائے تو پھر اسے ”مہیا“ کی جائے۔ اندر جی کی کاواویلا تھا

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی، یہ سارا دن بیٹھ کر نہیں گھورنے کے سوا اور تو کچھ کرتی نہیں۔ ہم چھ سات بندوں کے لیے اگر چودہ پندرہ روٹیاں اتار دیا کرے گی تو کون سی قیامت آجائے گی؟ اس کی اپنی روٹی بھی ہضم ہو جائے گی۔“

ماریا، اسحاق کی بات سمجھ گئی تھی لیکن سنی ان سنی کر گئی۔ اس کے چہرے کی سرخی سے ظاہر تھا کہ اس کا پارا چڑھ رہا ہے لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ ایک اسارٹ اور صحت مند جسم رکھتی تھی۔ کل باروندا جی کی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک وقت میں جوڈو کرائے بھی سیکھتی رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ جوڈو کرائے میں اسے مہارت تھی یا نہیں مگر اس کے ذیل ڈول اور تاثرات سے دکھائی دیتا تھا کہ وہ بوقت ضرورت سخت قسم کی جدوجہد کر سکتی ہے۔ بہر حال، ابھی تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہوا تھا اور وہ خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

ہمیں اپنے قریب دیکھ کر وہ جھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے روٹی اتار کر ایک طرف رکھی اور سانس گرم کرنے کے لیے تو اتارنا چاہا۔ جب وہ تو اتار رہی تھی، وہ ایک دم لڑھک گیا اور گھوم کر اس کے پاؤں پر آیا۔ وہ چلا اٹھی... اور پھر ”اوگا ڈ... اوگا ڈ“ کی گردان کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ تو نے اس کے سفید گلابی پاؤں کو آتشیں بوسہ دیا تھا اور انگلیوں سے اوپر کی ساری جگہ سرخ نظر آرہی تھی۔ ماریا کی آوازیں سن کر چوہان اور ہمیش بھی وہاں آ گئے۔

چوہان نے اس کا متاثرہ پاؤں دیکھ کر کہا۔ ”ماریا کے بیگ میں ایک دواؤں والا شاپر پڑا ہے، وہ لے کر آؤ۔“ ہمیش بیگ کی طرف بڑھا۔ ماریا ایک دم بھڑک کر انگریزی میں بولی۔ ”مجھے نہیں چاہیے دوا۔ مجھے نہیں چاہیے تمہاری ہمدردی۔ مجھے مر جانے دو۔ مجھے زہر کا کوئی انجکشن لگا دو تا کہ میری جان چھوٹ جائے۔“

اسحاق پھنکارا۔ ”تم ابھی سے گھبرا گئی ہو میم جی! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی پورا پورا حساب کتاب ہوتا ہے اور جو کچھ ہوا ہے یہ تو ”حساب“ کا عشرِ عشر بھی نہیں۔ بس ایک چھوٹی سی مثال سن لو۔ جس ملازم کو تم نے طوطوں کو خوراک نہ دینے کی پاداش میں بھوکا مار دیا تھا، یہ اس کی ایک گھنٹے کی بھوک پیاس کا بدلہ بھی نہیں ہے۔“

اس مرتبہ وہ گلابی اردو میں بولی۔ ”اسی لیے تو ہام تو م سے کہتا ہے کہ ہام کو مار ڈالو۔ تمہارا سارا ہی بدلہ ایک بار میں

اور باہر ان کتوں کی آوازیں تھیں جو پانڈے اور اسٹیل کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔

شام ہونے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر باروندا جی کی کے پاس تھا۔ آج وہ خلاف معمول دراز ہونے کے بجائے ٹیک لگا کر دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دیتا تھا۔ ”جی! میں نے کہا۔ اس نے میری آواز نہیں سنی اور بے حرکت بیٹھا رہا۔“

”جی! میں نے کہا۔ اس نے میری آواز نہیں سنی اور بے حرکت بیٹھا رہا۔“

یوگا ایک مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ عدم آبادی روانہ نہ ہو گیا ہو۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ وہ جیسے اپنے ارد گرد سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کے چہرے پر گہری جھلاہٹ ابھری۔ وہ نہایت سچ لہجے میں بولا۔ ”تم کہاں سے آ گئے ہو؟ کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے؟ دوغ ہو جاؤ... دوغ ہو جاؤ۔“

”تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ میں تاہش ہوں۔“

”تاہش ہو تو میں کیا کروں؟“ اس پر بدستور جھلاہٹ سوار تھی۔

”دیکھو، میں یہ کیا لایا ہوں۔“ میں نے دھسکی کی چم چم کرتی بوتل لائین کے رخ پر رکھ کر اسے دکھائی۔ اس کی جی ایک دم کم ہو گئی۔

اس نے آنکھیں موند کر دو تین گہری سانسیں لیں پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں بہت دور گیا ہوا تھا... وہ میرے بہت پاس تھی۔ ہم اس خاموش پانی کے کنارے پر تھے اور وہاں سیکڑوں کنول کھلے ہوئے تھے۔ تم نے... سارا ظلم توڑ دیا...“ شاید وہ مایوس لہجے میں کچھ اور بھی کہتا مگر پھر اس کی نظر بوتل پر پڑ گئی۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پیاس نمایاں ہونے لگی۔

”تم کس ظلم کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”محبت کے ظلم کی!“ اس نے رواں انگریزی میں

کہا۔ ”جب میں بہت تنہا ہوتا ہوں... دکھ کی آخری حدود کو چھو رہا ہوتا ہوں، وہ میرے پاس چلی آتی ہے۔ اسی لباس میں جس میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا... اور اسی لباس میں جس میں وہ سات آٹھ روز میرے ساتھ کشتی پر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور سرسبز جنگل میں پانی کے

ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیتی ہے۔ ہنسی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ پھر وہ اپنا وزن میری ہاتھوں پر ڈال کر لہرائی ہے۔ اس کے بال بہت لمبے ہیں... وہ کسی سیاہ آئیل کی طرح ہوا میں جھومتے ہیں اور جھلتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر کرمیں موتی بکھیرتی ہیں اور اس کی شرعی آنکھوں میں پھولوں اور تیلیوں کے سارے رنگ اتر آتے ہیں۔ وہاں فطرت کے سوا ہمیں کوئی نہیں دیکھتا اور فطرت بھی ہماری ہم مزاج ہو جاتی ہے۔ رات کی پھیلتی ہوئی چادر میں ہم اپنی کشتی کے اندر چلے جاتے ہیں اور اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ... محبت کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔“

”مجھے افسوس ہے دوست کہ میں نے تمہیں تمہارے تصور سے دور کر دیا۔“ میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں۔ اس کو تصور مت کہو۔ یہ تو حقیقت سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے جسم اور لباس کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتا ہوں... جیسے اب۔ میں اسے سونگھ سکتا ہوں۔ میں اس سونگھ رہا ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اپنی سانس اندر کی طرف کھینچی۔

شاید وہ اس بارے میں کچھ دیر مزید بات کرتا لیکن اب شراب کو اپنے سامنے دیکھ کر اس سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہی روز والا عمل پھر شروع ہوا۔ میں وہ سیال آتش، گلاس میں بھر بھر کر اسے دیتا رہا اور وہ یہ سچ بول اپنے گلے میں اتارتا رہا۔ آخر اس کا نشہ پختہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ اور نا توانی ختم ہونے لگی۔ مدقوق چہرے پر برسنے والی ازلی جھلاہٹ کی جگہ ایک طرح کے سکون نے لے لی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ایک بار پھر اپنی ہنسی کو یاد کرنے لگا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اب یہاں کی صورت حال کو بھی کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم حکم اور جارج کے باغیوں کی حیثیت سے یہاں اس سرنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

جلد ہی میں گفتگو کا رخ کل والے موضوع کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ حقیقت ہے کہ مارشل آرٹ کے حوالے سے اس نامور کھلاڑی کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ ”ماسٹر کھلاڑی“ عام لوگوں کی طرح جسمانی تکنیک اور داؤ پیچ کے بجائے ذہنی کیفیت اور دماغی توانائی پر زور دیتا نظر آتا تھا۔

وہ جیسا کھی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ نیڈ بیگ ہمارے سامنے تھا۔ وہ ایک بار پھر مجھے مختلف پس دینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے عملی مشق بھی کرا رہا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ مجھے

Scanned and Uploaded By Nadeem

سے ماضی کی برف پگھل رہی ہو اور یاروں کے جھرنے بہہ رہے ہوں۔

وہ گنگنا تارہا... پھر اس کی آواز دوبارہ مدھم ہو گئی اور وہ دھیرے دھیرے سو گیا۔

اگلی صبح ایک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ انور خاں کی دی ہوئی ڈیڈ لائن ختم ہونے سے پہلے ہی رنجیت پانڈے درختوں کے جھنڈ میں پہنچا اور اس نے یہ آواز بلند پکار کر انور خاں سے کہا کہ وہ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔

انور خاں نے کہا۔ ”بات چیت بہت ہو چکی ہے۔ اب ہمیں صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں مطالبات منظور ہیں یا نہیں؟“

”نہی بتانے کے لیے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں۔“ پانڈے کی پاٹ دار آواز آئی۔

”کون آیا ہے؟“ انور خاں نے پوچھا۔

”میں ہوں مراد شاہ... تل پانی سے۔“ ایک گونجتی ہوئی آواز ابھری۔

ایک دم میرے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ نام میں نے چرواہے نریندر سنگھ اور انور وغیرہ کی گفتگو میں سنا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ تل پانی میں مراد شاہ کی حیثیت چھوٹے سرکار کے مشیر خاص اور دست راست کی ہے اور اب یہی مراد شاہ یہاں بات چیت کے لیے موجود تھا۔

”م السلام علیکم شاہ صاحب! ہمیں امید نہیں تھی کہ ہم یہاں آپ کی آواز سنیں گے۔“ انور خاں نے بلند آواز میں کہا۔

”اور مجھے بھی امید نہیں تھی کہ مجھے یہاں آکر اس طرح تم سے بات کرنی پڑے گی۔“

”دیکھیں شاہ صاحب! یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی بھی راج بھون کے ستم سے محفوظ نہیں رہا۔ وہاں تل پانی میں سلطانہ نے آپ کے سامنے وہابی دی گئی کہ اگر اسے واپس زرگاں بھیجا گیا تو اس کی جان اور عزت کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اور دیکھ لیں شاہ صاحب... ویسا ہی ہوا ہے۔“

”یہ تو تمہارا بیان ہے انور خاں! اصل حقیقت تو تحقیق کے بعد ہی سامنے آئے گی... اگر واقعی کسی نے قانون توڑا ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے لیکن تم اور تمہارے ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تم ایک بے گناہ لڑکی کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہو۔ اس کو اذیت دے رہے ہو۔ یہ صورت حال کسی کے لیے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔ اس طریقے سے انصاف کرنے کی ریت چل پڑی تو پھر یاد رکھو کہ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہیں رہے

گی۔“ مراد شاہ کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

مجھے چرواہے نریندر کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ چھوٹے سرکار کو ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ انہوں نے واقعی سخت رویہ اپنایا ہے۔

انور خاں نے کہا۔ ”شاہ صاحب! ہم نے انصاف اور قانون کا دروازہ بہت کھٹکھٹایا، اب ہم اور برداشت نہیں کر سکتے۔ اب پانی سر سے گزر گیا ہے جی۔ اب اینٹ کا جواب پتھر سے اور پتھر کا گولی سے ملے گا۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔“

”اگر تمہارا یہ فیصلہ ہے تو پھر ہمارا فیصلہ بھی سن لو۔“ مراد شاہ کی غصیلی آواز ابھری۔ ”ہم کو اس معاملے میں حکم کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا پڑے گا اور اگر تم لوگوں اپنی ہٹ پر قائم رہے تو ہم نے جن لوگوں کو تل پانی میں پھنسا دی ہے، وہ بھی ہماری پناہ میں نہیں رہیں گے۔“

”تو آپ بھی ظلم کے آگے جھکنا شروع ہو گئے ہیں۔ میں اسے موقع پرستی کہوں یا کچھ اور؟“

”تم ہر حد توڑ رہے ہو انور خاں! تمہیں اس کے لیے بچھتنا پڑے گا۔“

”ہم تو یہ سمجھے تھے شاہ صاحب کہ آپ حق کا ساتھ دینے کے لیے آئے ہیں۔ آپ ہماری بات سنیں گے اور دوسروں کو بھی سمجھائیں گے۔“

”میں اب بھی تمہاری بات سننے کو تیار ہوں لیکن اگر آپ کے لیے تمہیں پہلے مسز اسٹیل کو چھوڑنا ہوگا۔“

”آپ پہلے ہماری پوری بات سن لیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ نے ہمیں قائل کر لیا تو میں خود اور اپنے سارے ساتھیوں کی طرف سے بھی عہد کرتا ہوں کہ ہم اس لڑکی کو چھوڑ دیں گے۔“

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی، پھر طے ہوا کہ مراد شاہ ہم سے بات کرنے کے لیے اور ماریا کو صحیح سلامت دیکھنے کے لیے سرنگ کے اندر آئے گا۔ رنجیت پانڈے، شاہ صاحب کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی بھیجنا چاہتا تھا لیکن انور خاں اور اسحاق نے سختی سے منع کر دیا۔

شاید مراد شاہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

سرنگ کے ایک علیحدہ گوشے میں انور خاں، فیروز، چوہان اور مراد شاہ کے درمیان بات چیت ہوئی۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ مراد شاہ نے کہا۔ ”میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ سب سے پہلے وہ کام کرو جو سب سے ضروری ہے۔ اس گواہ کو یہاں لاؤ جو ہارون کے قتل کے سلسلے میں گواہی دینا چاہتا ہے۔“

انور خاں نے فیروز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ یہ ہے۔ آپ کے سامنے بیٹھتا ہے۔“

مراد شاہ نے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں اور غور سے فیروز کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی سفید قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال لیا۔ یقیناً یہ ٹیپ ریکارڈر، بیٹری سیل سے چلتا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ اب ساری پلاننگ سمجھ میں آرہی تھی۔ یہاں آکر مراد شاہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک تو سرجن اسٹیل وغیرہ کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ ماریا کے اغوا کو قابل مذمت سمجھتے ہیں اور اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ فیروز کا وہ بیان بھی لیتا چاہ رہے تھے جو چھوٹے سرکار کے سامنے سلطانہ کو بے گناہ ثابت کر کے موہن کمار کو اپنے ہی دیرینہ ساتھی کا قاتل ثابت کر سکتا تھا۔

مراد شاہ نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور فیروز سے پوچھا۔ ”تم مقتول ہارون کو کیسے جانتے ہو؟“

”میں اس کو نہ جانتوں گا تو اور کس کو جانوں گا؟ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم اکٹھے جوان ہوئے، ہم نے اکٹھے ”حکم“ کی ملازمت کی۔ وہ گھڑ سوار محفطوں میں شامل تھا، میں راج بھون میں کام کرتا تھا لیکن ہم ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن ہارون کو اس کے اپنے ہی ساتھی ”حکم“ کے کہنے پر جان سے مار ڈالیں گے۔ انہوں نے صرف سلطانہ کو پھنسانے کے لیے اتنا بڑا اپرا دھ کیا۔ میں ہر جگہ اور ہر وقت اس حرامزادے موہن کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔“

”تم نے ہارون کو قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا؟“

”لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ تب تک میں حکم کا باغی نہیں بناتا تھا بلکہ حکم کے خاص ملازموں میں شامل تھا۔ جو لوگ ہارون کے قتل میں موہن کے ساتھ شامل تھے، میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں اور اس قتل کی ساری تفصیل جانی ہے۔“

زخمی فیروز اور مراد شاہ کے درمیان چار پانچ منٹ تک سوال جواب ہوئے اور فیروز کا مکمل بیان ریکارڈ ہو گیا۔

مراد شاہ کے چہرے پر اطمینان کی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ بولا۔ ”یہ بیان بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔“

انور خاں نے کہا۔ ”آپ ہمیں اس صورت حال کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ہم نے ان لوگوں کو آج دوپہر ایک بجے تک کا الٹی میٹم دیا ہے۔“

مراد شاہ نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ ”میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات بنتی ہے تو بنا لینی چاہیے۔ صورت حال ایسی ہے کہ کسی بھی وقت معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہے، ماریا عورت ذات ہے۔ اس کے پرغال بنائے جانے کی وجہ سے تل پانی میں بھی کچھ لوگ تشویش ظاہر کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکم جی اور جارج کی حمایت بڑھ بھی سکتی ہے۔“

”لیکن لوگوں کو سلطانہ والا معاملہ بھی تو نظر آتا چاہیے۔ اور اب تو فیروز کے بیان کے بعد بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سلطانہ کے معاملے میں سراسر ظلم ہوا ہے۔“

”وہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔“ مراد شاہ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے بھی ایک عورت کو ہی پرغال بنایا ہے اور یہ عورت... سلطانہ والے معاملے میں زردوش ہے۔“

”مگر وہ بہت سے دوسرے معاملوں میں زردوش نہیں ہے۔ برسرِ ناہیں ہے۔“ اسحاق بھڑک کر بولا۔ ”یہ ظالم عورت ہے اور اس کا بھائی اس سے بڑھ کر ظالم ہے۔ وہ میری بہن کا قاتل ہے اور اس طرح کے کئی ظلم اس گھرانے کے کھاتے میں ہیں۔ ہم اپنے کسی مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اگر یہ لوگ ناہیں مانیں گے تو پھر یہ سیم قتل ہووے گی اور بہت بڑے طریقے سے ہووے گی۔“

”لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟“ مراد شاہ نے قدرے برہم انداز میں کہا۔ ”تم سب لوگوں کو تو ماریا دیا جائے گا۔ اس کے بعد تم سے رشتہ ناما رکھنے والوں پر بھی بڑا سخت وقت آئے گا۔ بہت خون بہے گا۔“

انور خاں نے گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر وہی ہلکی سی آسودگی پھیل گئی جو ایک دم کشیدہ ماحول کو تبدیل کر دیتی تھی۔ وہ ہولے سے بولا۔ ”لیکن میرا خیال ہے شاہ صاحب... یہ لوگ ماریا کی موت کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لیں گے۔ انہیں مطالبات ماننے ہی پڑیں گے۔“

”اپنی جگہ تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔“ مراد شاہ

بولے۔ ”جارج اور اس کے بہنوئی اسٹیل اور ان کے ساتھیوں کو ماریا کی موت کی طور بھی قبول نہیں ہوگی لیکن زرگاں میں ہی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک ماریا اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی وہ پچاس بندے رکھتے ہیں جن کو تم رہا کرانا چاہتے ہو۔ یہ لوگ کوئی بھی ایسی چال چل سکتے ہیں جس سے سب کچھ ختم ہو جائے۔“

انور خاں کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ بہر حال، وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟“

”میں گرومودان وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔“ مرادشاہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”گرومودان اور دیگر گرو اندر خانے جارج گوراسے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور سے جب سے جگڑا میں آگ والا واقعہ ہوا ہے۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ زرگاں میں جگڑا کے بڑے پجاریوں اور جارج کے کارندوں میں چپقلش چلتی رہتی ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ انور خاں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرے نزدیک گرومودان اور رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی ایک خاص مطلب رکھتی ہے۔ جہاں تک گرومودان کو میں جانتا ہوں، وہ ایک بہت ہی گہرا بندہ ہے۔ اس کے اندر جھانکنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ وہ بندے کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتا ہے۔ رنجیت پانڈے سے بھی اس کی دوستی ہے اور رنجیت پانڈے تو دیسے بھی بکا و شخص ہے۔ جو اس کی مطلوبہ قیمت دے دے، وہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ گرومودان اور پانڈے یہاں کوئی اپنا کھیل کھیل سکتے ہیں؟“ فیروز نے پوچھا۔

”یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہاں اسٹیٹ کی سیاست میں سب کچھ چلتا رہا ہے اور اب بھی چل رہا ہے۔“

”لیکن... شاہ صاحب... ماریا کا شوہر اسٹیل یہاں خود موجود ہے۔ موہن کمار جیسے لوگ بھی ہیں۔ کیا وہ گرومودان کو کوئی چال چلنے دیں گے؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ضرور ہی کوئی چال کھیلی جائے گی، میں صرف ایک امکان بتا رہا ہوں۔ فرض کرو اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بھی رنجیت پانڈے تو یہاں موجود ہے نا... اور جہاں یہ غیبت موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی مار دھاڑ تو ضرور ہوتی ہے۔ اس بندے کے تو خیر میں ہی خون اور بارود شامل ہے۔ اس کی عیاری بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔“

مرادشاہ نے اپنی آواز مزید دھمکی کی اور بولا۔ ”میری یہ بات ذہن میں رکھ لو... جب تک پانڈے یہاں موجود ہے، تم کسی معاملے کو بھی آسان نہیں لے سکتے۔ تمہیں ہر سیکنڈ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا پڑیں گی۔ یہ کوئی نہ کوئی کارستانی ضرور کرے گا۔“

”تو کر لے کارستانی۔ اس کی جو کارستانی بھی ہوگی، وہ میم کے جیون کی قیمت پر ہووے گی۔“ اسحاق آتش بار لہجے میں بولا۔

دو چار منٹ تک مرادشاہ سے ہماری بات چیت مزید جاری رہی۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔ اس گفتگو کا اختتام اس امر پر ہوا کہ انور خاں نے اپنی دی ہوئی ڈیڈ لائن کل رات آٹھ بجے تک بڑھا دی۔

☆☆☆

مرادشاہ نے جو کچھ کہا تھا، اس نے ہمیں مزید چوکس کر دیا۔ رنجیت پانڈے کی عیاری اور سفاکی کی جو کہانیاں میں سن چکا تھا، اس کے بعد اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ عمران مجھے ہر بات پر یاد آتا تھا۔ پانڈے کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی بار بار یاد آتا۔ پانڈے جیسے خطرناک ترین لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا عمران کا شوق تھا۔ اگر عمران یہاں ہوتا تو شاید وہ پانڈے کا بہترین حریف ثابت ہوتا۔ وہ رات میں نے پھر بارود عراجی کے ساتھ گزاری۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرا روحانی استاد ہے۔ وہ مجھے مارشل آرٹ کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتا رہا تھا جو مجھے کسی کتاب میں نہیں مل سکتی تھیں، نہ کوئی شخص انہیں اپنے تجربے کا حصہ بنا سکتا تھا۔ خاص طور سے وہ مجھے جسمانی درد برداشت کرنے کے حوالے سے جو کچھ بتا رہا تھا، وہ نایاب تھا۔

یہ اس رات دو ڈھائی بجے کی بات ہے۔ جبکی سے ملاقات کے بعد میں دہانے کے قریب واپس آ گیا تھا اور ہمیش کے برابر لیٹ گیا تھا۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا، جب احانک مجھے ایک نامانوس بو محسوس ہوئی۔ یہ اسپرٹ... جیسی... کوئی تیز اثر ہو بھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں کھلبلی سی بچ لئی۔ ایک اندیشہ خوفناک انداز میں چنگھاڑتا ہوا میرے دماغ میں مہم آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ الفاظ ذہن میں گونجنے لگے جو آج صبح مرادشاہ نے یہاں سرنگ میں ہمارے سامنے کہے تھے۔ اس نے رنجیت پانڈے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پانڈے یہاں موجود ہو اور وہ بچلا

بیٹھا رہے۔ مرادشاہ نے وارننگ دی تھی کہ ہمیں اس کی طرف سے بہت زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔

میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور لائٹس کی آواز سنی کی۔ ہمیش بھی اٹھ بیٹھا تھا اور نتھن پھیلا کر بو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یہ کیسی بو ہے؟ کہیں کوئی ٹیس وغیرہ تو نہیں؟“ وہ پریشان لہجے میں بولا۔

”ماریا کہاں ہے؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

ماریا اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی اور اس کا سیفٹی ہیچ بٹا لیا۔ ذہن میں یہ خیال برق کی طرح گوندا تھا کہ کہیں سرنگ کے اندر کوئی ٹیس وغیرہ تو نہیں چھوڑی گئی۔ دہانے کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی پھر چوہان بھی رائفل بدست وہاں آن موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی۔

”یہ بو کیسی ہے؟“ اس نے بھی وہی سوال کیا۔

اسی دوران میں سرنگ کے ایک گوشے سے شوں شوں کی مدھم آواز آئی۔ اسحاق بھی جاگ گیا تھا۔ وہ اس تاریک گوشے کی طرف لپکا اور چند سیکنڈ بعد ماریا کو کھینچتا ہوا روشنی میں لے آیا۔ ”حرامزادی... الو کی بچی... تو خود چین سے رہو تو ہے نہ ہمیں رہنے دیو تو ہے۔“ اس نے اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔

ماریا کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں میں ایک ٹن اسپرے تھا۔ اسپرے کی اسی بوتل سے نکلنے والے کیمیکل کی بو نے ہم سب کو بڑی طرح چونکایا تھا۔ یہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی صورت حال تھی۔ یہ ایک چھڑ مار ٹائپ کا اسپرے تھا جو ماریا کے سامان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

”یہ کیا کر رہی تھی؟“ اسحاق نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”ہام یہاں تاہیں رہ سکتا۔ یہاں بہت زیادہ کیڑا ہے۔ ہر طرح کا INSECTS ہے۔ ہام کا ہاتھ پاؤں سوچ گیا۔“ وہ طیش میں بولی۔

”تم یہیں رہو گی جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ تم آسمان سے تاہیں اتریں۔ ہماری ہی طرح گوشت پوست سے بنی ہوئی ہو۔“ اسحاق پھنکارا۔

”ہام سے تاہیں رہا جاتا۔“ وہ کراہی۔

”تم سے رہا جاوے گا۔ جس طرح تم کورونی پکانا آ گئی ہے، مٹی کے پیالے میں پانی پینا آ گیا ہے اور کوئلے سے دانت صاف کرنا آ گئے ہیں، اسی طرح تم کورہتا بھی آ جاوے

گا۔“ اسحاق نے پھر مارا سپرے اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینک دیا۔

”ہام یہاں تاہیں رہے گا۔ چاہے تو مہم کو شوٹ کر دے۔“ وہ دھاڑی اور اس نے سرنگ کے عقبی حصے میں جانے کی کوشش کی۔

اسحاق اور احمد نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اسحاق نے اسے دو طمانچے مارے اور گھسیٹا ہوا واپس لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے گراری وار چاقو نکال کر کھول لیا تھا۔ وہ پھنکارا۔ ”اگر اپنے باپ کی ہے تو اب قدم اٹھا کر دکھا۔ سیدھا تیرے جگر میں یہ چاقو نہ ڈال دیا تو میرا نام اسحاق تاہیں۔“

اسحاق کے لہجے میں کچھ ایسی آتش تھی کہ ماریا کا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔

احمد بولا۔ ”بہتر تو یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں ڈھیل نہ چھوڑی جاوے۔ رات کے وقت پاؤں کس کر باندھ دیے جاویں تاکہ یہ چل نہ سکے۔“

”اب کوئی حرکت کرے گی تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ اسحاق نے کہا۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر چلا تا شروع کر دیا۔ وہ اچھل رہی تھی۔ کبھی دامن ہو رہی تھی، کبھی بائیں۔ اس کے پاؤں پر سے کوئی چھپکلی گزر گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ ڈانس کرنے والی کیفیت میں نظر آئی۔ پھر وہ جیسے اچھل کر ایک پتھر پر چڑھ گئی۔ اس پتھر کے ارد گرد تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے گی لیکن یہ پتھر چھوٹا سا تھا۔ اس پر بس کھڑا ہی ہوا جاسکتا تھا اور وہ کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں طیش آمیز بے بسی تھی۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ اسی طرح کھڑی رہو اور کھڑی کھڑی اکڑ جاؤ۔“ اسحاق نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا دہانے کی طرف چلا گیا۔

وہ کھڑی رہی اور غصے میں بڑبڑاتی رہی۔ وہ نہایت قیمتی چیز اور شرٹ میں تھی۔ یہ لباس اس کے سامان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اب یہ کیڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جارج گورا کی بہن نے ڈیڑھ دو ہزار ڈالر کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے بال جو اغوا کی رات ریشم کی طرح ملائم اور سلک کی طرح چمک رہے تھے، اب گھونسلے کی شکل اختیار کر چکے تھے اور اس گھونسلے کے نیچے اس کی صورت بھی اجڑی اجڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بالکل عام لڑکی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے عمران کی کہی ہوئی ایک بات یاد

Scanned and Uploaded By Nadeem

آگئی۔ ایک روز میڈم صفورا کی چھوٹی بہن میڈم نادیا کے ناز غرے دیکھ کر اس نے کہا تھا۔ اس لڑکی کی چمک دمک میں کچھتھر فیصد حصہ اس کی دولت اور حیثیت کا ہے۔ اگر یہی نادیا کسی کھوتی ریزمی پر بیٹھ کر جھکیوں میں سے نکلے تو اس کے مقابلے میں اس کی کھوتی زیادہ خوب صورت نظر آئے۔ اور یہ کوئی نادیا کی بات ہی نہیں ہے، اکثر امیر کبیر لڑکیاں خوب صورتی میں بس کھوتی کے آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا تھا۔۔۔ بھئی، یہ تو امیر کبیر لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ جھٹ بولا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ کھوتیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ گدھا برداری اس کا بڑا مان سکتی ہے لیکن میں سب امیر لڑکیوں کی بات تو نہیں کر رہا۔ بس ایکسٹرا مارن اور فیشن زدہ بیبیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

عمران کی کبھی ہوئی باتیں ایسے ہی میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ جب بھی یاد آتا تھا، اپنے ساتھ میرے لیے ندامت و پشیمانی کا ایک بہت بڑا ریل لاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کا قاتل ہوں اور ہزار ہا ملاتی نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔

صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دہانے سے کچھ فاصلے پر کتوں کا شور سنائی دیا۔ یہ وہی کتے تھے جو حکم جی کے اہل کاروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ان کی آوازیں اکثر ویشتر سنائی دیتی رہتی تھیں۔ لیکن آج یہ آوازیں دہانے کے عین سامنے قریباً ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے آ رہی تھیں۔ انور خاں، احمد اور میں اپنی اپنی پوزیشن پر بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے انور خاں کو چونکتے دیکھا۔ اس کی نگاہ دور جنت اور کیکر کے درختوں پر مرکوز تھی۔ ہم نے دیکھا، دیو بکس بوجھتے تیزی سے کسی چیز کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کا رخ دہانے کی طرف ہی تھا۔ وہ جس چیز کا پیچھا کر رہے تھے، وہ کوئی چھوٹا جانور تھا جو تیزی سے بینترے بدل رہا تھا۔ دفعتاً ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کتے سیدھے سرنگ کی طرف ہی آرہے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ ”اوہو۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“ انور خاں کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اس کی انگلی ٹریگر پر تھی لیکن وہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ گولی چلائے یا نہیں۔ اور جب انور خاں خود فیصلہ نہ کر سکا تو ہم کیسے کرتے؟ قریباً نصف درجن خوں خوار کتے سماعت شکن شور برپا کرتے سیدھے سرنگ میں گھس آئے۔ وہ جس چیز کا تعاقب کر رہے تھے، اس کی ہلکی سی جھلک ہم نے دیکھی۔ وہ جنگلی ہرن کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ سیدھا سرنگ کے اس

قدرتی جمبیر میں گھسا جہاں ہم نے بستر بچھا رکھے تھے۔ شکاری کتے اس پر جا پڑے، وہ بڑی طرح زخمی ہوا۔ ہمیں اس کا پھٹا ہوا پیٹ نظر آیا۔ اسی حالت میں وہ گھوما اور ہماری پوزیشنوں کی طرف آیا۔ اب ہمارے لیے بے حرکت رہنا مشکل تھا۔ میری اور انور خاں کی رائفلوں سے ایک ساتھ شے نکلے۔ دو کتے قلابازیاں کھا کر گرے۔ باقی کتوں نے نیچے سے جانور کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ ماریا چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ سرنگ میں ایک دم کھرا م ساج گیا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب دہانے کے عین سامنے فائرنگ شروع ہو گئی۔ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر حکم کے مسلح اہل کاروں نے ہلا بول دیا تھا۔

”گولی چلاؤ۔“ انور دہانے کی طرف رخ کر کے دھاڑا۔ میں نے دیکھا، دو افراد جھک کر بھاگتے ہوئے دہانے کے عین سامنے پہنچ گئے تھے۔ وہ جدید رائفلوں سے فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ میں نے احمد کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ ایک دوسری گولی چوہان کے کندھے میں لگی اور رائفل اس کی گرفت سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یہاں انور خاں کی مہارت اور اس کے اعتماد کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس دوسرا موقع نہیں ہے۔ اگر اس کا نشانہ خطا گیا تو حملہ آور بھاگتے ہوئے سرنگ میں گھس آئیں گے۔ اس نے اپنی اسٹائپرگن سے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ قریباً بیس میٹر کی دوری پر دونوں حملہ آوروں کے سروں میں گولیاں لگیں اور وہ اپنے ہلارے میں دور تک ٹڑھک گئے۔ یہ واقعی بڑے خطرناک لمحے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دونوں حملہ آوروں نے جدید بلسٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ اگر ان کے سروں میں گولی نہ لگتی تو وہ اندر آنے میں کامیاب ہو جاتے۔

دو افراد کے گر جانے سے پیچھے آنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ انہوں نے سیدھا دہانے کی طرف آنے کے بجائے دائیں بائیں پوزیشن لے لی۔ فیروز زخمی ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ مل کر فائرنگ کر رہا تھا۔ چند گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزریں تو اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کرنی چاہی۔ یہ فیصلہ غلط نکلا۔ دہانے کے عین سامنے سے وہ ”ہٹ“ ہو گیا۔ میں نے اسے سینے پر گولی کھا کر مردہ ہرن کے اوپر گرتے دیکھا۔ دو شکاری کتے تو سرنگ سے باہر نکل گئے تھے۔ دو تین سرنگ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے اور ان کی آوازوں سے ایک پُر ہول گونج پیدا ہو رہی تھی۔ اسحاق نے ماریا کو زمین پر گرا کر رائفل کی ٹال اس کی

پیشانی سے لگا دی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے اسے شوٹ کر سکتا تھا لیکن پھر یہ ہنگامہ جس طرح اچانک شروع ہوا تھا، اسی طرح آنا فانا ختم ہو گیا۔ فائرنگ ختم گئی۔ کتوں کی دور افتادہ آوازوں کے سوا کوئی آواز باقی نہ رہی۔

ہم اپنی پوزیشنوں پر پوری طرح چوکس تھے۔ ہم نے انگلیاں ٹریگر پر رکھی ہوئی تھیں اور دہانے کے سامنے ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کا نوٹس لے رہے تھے۔

اسحاق دھاڑا۔ ”یہ اس طرح ناہیں مانیں گے۔ اس حرامزادی کے کلڑے کر کے باہر بھیجنا شروع کرو۔ اور پہلا نکلا میں کرتا ہوں، ابھی کرتا ہوں۔“ اس نے اپنا خوفناک پھل کا گراری دار چاقو نکال لیا۔

انور خاں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن دو منٹ ٹھہر جاؤ۔

فائرنگ ختم گئی تھی پھر بھی خطرہ موجود تھا۔ میں اور ہمیش نیچے جھک کر دوڑتے ہوئے فیروز کے پاس پہنچے۔ گولی اس کی چھاتی پر بائیں طرف لگی تھی۔ وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ ہم نے اسے اٹھا کر فائرنگ کی ریچ سے ہٹایا اور ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ چوہان حالانکہ خود بھی زخمی تھا تاہم وہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ہم نے فیروز کو پانی پلایا جو اس کی باجھوں سے بہہ گیا۔

”کچھ ہو سکتا ہے؟“ میں نے لرزاں آواز میں چوہان سے پوچھا۔

اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر شدید کرب تھا۔

فیروز کی نگاہیں ہم پر جمی تھیں۔ یہ نگاہیں زندہ تھیں لیکن بتدریج بے جان ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ احمد کی طرف دیکھ کر بہت نحیف اور شکستہ آواز میں بولا۔ ”اگر۔۔۔ بھی۔۔۔ اکبر سے ملاقات ہو تو۔۔۔ اسے بتا دینا۔۔۔ میری ماں مسلمان تھی۔۔۔ میں مسلمان ماں کا بیٹا ہوں۔“

احمد نے اشک بہاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فیروز کی آنکھیں تارا ہو گئیں۔ ہم نے اس کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا۔

اسحاق قریباً تیس فٹ کے فاصلے سے فیروز کی موت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ چنگھاڑنے لگا اور ماریا کو زد و کوب کرنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسحاق کا ہاتھ کسی نے نہیں روکا۔ صدے نے سب کو

جکڑ رکھا تھا۔ اگر ذرا گہرائی سے دیکھا جاتا تو فیروز کی موت میں ماریا بھی جیسے دار تھی۔ چند دن پہلے اس نے فیروز پر گولی چلائی تھی جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ آج لڑائی کے دوران میں اسی زخمی ٹانگ کی وجہ سے فیروز تیزی سے حرکت نہیں کر پایا تھا۔ بہر حال، یہ بات تو اہل حقیقت تھی کہ آج اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے جو ناشتا اس نے کیا تھا، وہ آخری تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک اور تیز رفتار تھا کہ کوئی اس کا راستہ نہ روک سکا۔ اور شاید ڈاکٹر چوہان کے علاوہ کوئی اس کا راستہ روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ ماریا کے لیے اب کسی کے دل میں ہمدردی کی رفق موجود نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اسحاق نے بے رحمی سے اس کے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت جڑ سے کاٹ ڈالی تھی۔ اب ماریا چلا رہی تھی اور اس کے ہاتھ کا زخم تیزی سے خون اگل رہا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

اسحاق نے جتنی انداز میں کئی ہوئی انگلی ماریا کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور پھنکارا۔ ”۔۔۔ ہاں یہی انگلی تھی جس سے تو نے فیروز پر گولی چلائی تھی۔ یہی تھی نا؟ یہ انگلی ہے ہی کاٹے جانے کے قابل۔۔۔ یہی ہم جیسے غریبوں پر گولی چلاوت ہے۔ ہمیں اپنے اشاروں پر نچاوت ہے۔ ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ اب ایسی ساری انگلیوں کو کاٹ دیو یں گے۔“

چلا چلا کر ماریا کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اس پر غشی طاری ہو گئی۔ پتا نہیں کہ ایسا تکلیف کے سبب ہوا تھا یا کئی ہوئی انگلی دیکھنے کے بعد اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اسحاق نے کئی ہوئی خون آلود انگلی انور خاں کے سامنے پھینکی۔ ”انور بھائی! یہ پہلا چھوٹا سا نذرانہ بھیجو اس حرامزادی کے بچی کو۔۔۔ اور ساتھ ہی بتاؤ اس کو کہ یہ ایک چھوٹی سی جھلکی ہے اس قلم کی جو ابھی ان کو دیکھنی ہے۔“ اسحاق کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

میں نے انگلی کو دیکھا۔ جب یہ جسم کے ساتھ تھی تو خوب صورت لگتی ہوگی، اب علیحدہ ہو کر کریمہ النظر ہو گئی تھی۔ جڑ کی طرف سے اس کے ساتھ تھوڑی سی کھال ٹک رہی تھی۔ ناخن لمبا تھا اور اس پر گلابی پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد ایک لمبی پکڑا رہی تھی، شاید بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اسحاق نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ با اختیار اور طاقتور طبقے کی اسی انگلی نے اس کرۂ ارض پر زندگی کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ یہ انگلی ٹریگر دباتی ہے۔۔۔ پورے پورے

ملک... اور پورے پورے خطے خاک و خون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ حالت امن میں بھی یہ انگلی ایک خوفناک دھمکی کی صورت ٹریگر پر دھری رہتی ہے اور خلقِ خدا کی ناتوانی سے خراج وصول کرتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر چوہان کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ تاہم اطمینان کی بات یہ تھی کہ گولی کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ چوہان نے اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبایا ہوا تھا تاکہ خون کا زیادہ اخراج نہ ہو۔ احمد کو گولی کے بجائے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔ یہ چھرا اس کے بازو کے اندر ہی تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر صاف نظر آتے تھے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں دونوں زخموں کی مرہم پٹی کی گئی۔ اگر ان میں ماریا کو بھی شامل کر لیا جاتا تو زخموں کی تعداد تین تھی۔ فیروز کی چادر سے ڈھکی ہوئی لاش ہمارے سامنے تھی اور یہ لاش ہم سب کے ذہنوں میں چنگاریاں بکھیر رہی تھی۔ اب واقعی کچھ کر گزرنے کو دل چاہتا تھا۔

حکم کے جن دو گارڈز کو انور خاں نے دہانے کے عین سامنے اپنے باکمال نشانے سے ٹھنڈا کیا تھا، وہ وہیں ساکت پڑے تھے۔ انہیں انور نے قریباً بیس میٹر کی دوری سے نشانہ بنایا تھا لیکن وہ چونکہ برق رفتاری سے دہانے کی طرف آرہے تھے، اس لیے گولی کھانے کے بعد بھی وہ لڑھکے تھے اور دہانے سے مزید قریب ہو گئے تھے۔ ان کی عمریں پچیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ ان کے پاس چھوٹے سیرل والی جدید رائفلیں تھیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ دونوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی ہیں۔

اسحاق اور ہمیش نے دونوں مردہ کتوں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر سرنگ کے عقبی حصے میں پھینک دیا۔ یہ ہاؤنڈ نسل کے قد آور کتے تھے اور میں انہیں زرگاں میں دیکھ چکا تھا... ایسے ہی خون خوار کتوں نے مجھ پر جارج گورا کی کوٹھی میں حملہ کیا تھا۔ کتوں کے ساتھ ساتھ ہرن کے بچے کا کٹا پھنسا جسم بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، یہ سارا واقعہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اگر انور خاں اپنی دور مار رائفل سے بروقت دو ٹھیک نشانے نہ لگاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس سارے واقعے کے دوران میں عجیب الخلقت باروندا جیسی ہم سے قریباً سو میٹر دور سرنگ کے عقبی حصے میں موجود رہا تھا اور اس کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا... وہ اس دوران میں سو رہا تھا۔

انور خاں کے کہنے پر اسحاق نے فوری طور پر ایک پرچہ لکھا۔ اس پرچے کا مختصر مضمون کچھ اس طرح تھا۔ ”لگتا

ہے کہ یہ کبھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ پہلا ٹھٹھہ تم کو ارسال کر رہے ہیں۔ یہ تمہاری میم صاحبہ کی انگلی ہے۔ یہ سب سے چھوٹا ٹکڑا ہے جو تم وصول کر رہے ہو۔ اس کے بعد جو ٹکڑا بھی آئے گا، وہ اس سے بڑا ہوگا۔ تمہارے پاس ہمارے مطالبوں کی منظوری کے لیے فقط ایک گھنٹے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد میم صاحبہ کی باقی چار انگلیاں تمہارے پاس پہنچیں گی اور پھر پورا پنجہ پیش خدمت کیا جائے گا۔ تم لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ تم کسی رعایت کے حق دار نہیں ہو۔ اگر تم گولی کی زبان میں فیصلہ چاہتے ہو تو پھر ایسے ہی سہی۔ اب ہمارے مطالبوں میں ایک مطالبہ اور شامل کرلو۔ ہم اب نل پانی جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں راجواڑے سے نکلنے کے لیے محفوظ راستہ چاہیے اور تمہاری یہ میم تب تک ہمارے ساتھ رہے گی جب تک ہم راجواڑے سے نکل نہیں جاتے۔“

انور خاں نے ماریا کی انگلی ایک مومی کاغذ میں لپیٹی پھر اس کے ساتھ اسحاق کا لکھا ہوا پرچہ رکھا۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ ایک پتھر رکھنے کے بعد انہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر اوپر سے باریک ڈوری باندھ دی۔

انور خاں نے اپنی پوزیشن کے عقب سے پانڈے کو بلند آواز میں پکارا اور کہا۔ ”پانڈے! تیری منحوس صورت یہاں دیکھ کر ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ اب میم زندہ نہیں بچے گی۔ تیری بد معاشی کا تیرے انگریز دوستوں کو بڑا اچھا صلہ ملنے والا ہے۔ اپنی حماقت کا یہ پہلا انعام قبول کرو۔“ اس کے ساتھ ہی انور خاں نے پورے زور سے بازو دھما کر ڈوری میں بندھا ہوا پارسل درختوں کے جھنڈ کی طرف پھینک دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ جھنڈ کے عقب سے پانڈے کی گرج دار آواز ابھری۔

”دھول کر دیکھ لے۔ امید ہے، جو کچھ بھی ہے تجھے پسند آئے گا۔“ انور خاں نے کہا۔

کچھ دیر بعد درختوں کے عقب سے پانڈے کا ایک ساتھی برآمد ہوا۔ اس نے پہلے ہمیں اپنے خالی ہاتھ دکھائے اور پھر محتاط قدموں سے پارسل کی طرف بڑھا۔ پارسل اٹھا کر وہ واپس گھنے درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد تناؤ بھرا تھا۔ بہر حال، اب ہم مخالف فریق کو مزید رعایت دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ اسحاق بھی بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جو انٹی میٹم ہم نے دیا ہے، اس سے ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھنا چاہیے اور حقیقت یہی تھی کہ فیروز کی لاش اٹھانے کے بعد اب ہمارے دلوں میں رحم کی کوئی رمت باقی نہیں رہی تھی۔ چوہان اور احمد زخمی ہو

چکے تھے، اپنے ساتھی ماجد کی موت کا صدمہ ہم چند دن پہلے جھیل چکے تھے۔ اب اگر ہمارے ساتھ یہی سب کچھ ہونا تھا تو پھر جارج گورے کی اس گوری بہن کو بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ اب ہوش میں آچکی تھی اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی انگلی کے زخم سے خون کا اخراج روکنے کے لیے چوہان نے وہاں خاص طریقے سے پٹی باندھ دی تھی... پھر بھی خون کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ ماریا نے بھی شاید اب محسوس کر لیا تھا کہ اس کے بچنے کا امکان کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف منجمد ہو گیا تھا اور اس کی ساری تن فن ایک خوف آمیز مایوسی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

انٹی میٹم کا ایک گھنٹا مکمل ہونے میں آٹھ دس منٹ باقی تھے جب جھنڈ کے عقب سے پھر پانڈے کی آواز ابھری۔ وہ بیٹری سے چلنے والے میگافون کے ذریعے بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”انٹیل اور موہن کمار تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ ”اب بات چیت کا وقت گزر چکا ہے۔ ہمیں ہاں پانڈے میں جواب چاہیے۔“ انور خاں گرجا۔ ”اور ایک بات اچھی طرح دماغ میں بٹھا لو پانڈے! ہم یہاں مرنے کے لیے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاک کر دے تو اس کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا... ہم نے جو کہہ دیا ہے، وہ کہہ دیا ہے۔ اب ہم ایک سیکنڈ اور نہیں دیں گے۔ ٹھیک دس منٹ بعد اسٹیل کی پٹی کا دوسرا ٹکڑا اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد...“

اسحاق ایک تیز دھار تلوار نکال لایا تھا۔ اس نے صاف سیدھے لہجے میں ماریا فرگو سن کو بتا دیا کہ وہ اس کا ہاتھ لینا چاہتا ہے اور وہ خود کو اس کے لیے تیار کر لے۔

”تو مہام کو ایک ہی دفعہ ماریا کیوں نا ہیں دیتے؟ ہام کو گولی مار دو۔“ وہ کر بناک انداز میں چلائی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ موت اتنی آسانی سے ناہیں آوت ہے۔ ایک ایک سانس کے لیے تڑپنا پڑت ہے۔ جس طرح ملل کے گئے کپڑے کو کانٹے دار جھاڑیوں پر ڈال کر کھینچا جائے تو وہ تار تار ہو ت ہے... اسی طرح نکلتی ہے جان۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہوا ہے اپنی آنکھوں سے...“ وہ بیجانی لہجے میں بولتا چلا گیا۔

”آچھا... ہام کو دہانے پر لے جاؤ... ہام ایک آخری بار... اپنے سہینڈ سے بات کرنا مانگتا...“ وہ روتے ہوئے بولی۔ اس نے اسحاق کی انگارہ آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگلے دو تین منٹ میں اس کا ہاتھ کلائی پر

سے الگ ہونے والا ہے۔

اسحاق نے سوالیہ نظروں سے انور خاں کی طرف دیکھا۔ انور خاں نے سر کے اشارے سے اسحاق کو مشورہ دیا کہ وہ ماریا کی بات مان لے۔

چند منٹ بعد ماریا ایک بار پھر دہانے پر تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں پاؤں میں بھی زنجیر تھی۔ اس زنجیر میں بس اتنی گنجائش تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتی تھی۔ اس کے عین عقب میں اسحاق موجود تھا۔ اس کی ٹریل ٹو رائفل کی ٹال ماریا کی کمر سے بس ڈیزھ دو فٹ کی دوری پر تھی۔

دہانے پر پہنچ کر ماریا نے دل ڈکار لہجے میں پکار بلند کی۔ وہ اب انگریزی میں بول رہی تھی۔ اس نے اسٹیل کو مخاطب کر کے کہا۔ ”یہ لوگ میرا ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔ اب تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو گئے ہو کہ میں لکڑوں میں یہاں سے باہر نکلوں؟“

”ایسا ہرگز نہیں ہے ماریا... لیکن جو کچھ ہمارے بس میں نہیں، وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ جو بندے یہ مانگ رہے ہیں، ان میں سے کچھ ہمارے پاس موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ ان بندوں کی جگہ کوئی تاوان وغیرہ لینا چاہیں تو ہم تیار ہیں... لیکن وہ بندے کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ ہماری طرف سے چوہان نے گرج کر انگریزی میں کہا۔ ”یہ سب تمہاری سیاست ہے لیکن یہ سیاست تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ رو مودان وغیرہ کا تو کچھ نہیں جائے گا لیکن تم اپنی بیوی کو بچا نہیں سکو گے۔“

ماریا ایک بار پھر چلائی۔ ”اسٹیل! ان لوگوں کا ایک ساتھی مر گیا ہے۔ یہ اب کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تو بھائی جارج کو یہاں بلا لو۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو شاید اب تک کوئی حل نکل آتا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے ماریا کی آواز شدت جذبات سے بیٹھ گئی۔ وہ دل دوز انداز میں روتے گئی۔

اسحاق اور ہمیش اسے کھینچتے ہوئے سرنگ میں واپس لے آئے۔ اس کے رونے کی آواز آخر تک سنائی دیتی رہی۔ اس واقعے کے فقط پانچ چھ منٹ بعد حالات نے ایک حیران کن پلٹا کھایا۔ اسحاق، ماریا کا ہاتھ کانٹے کے لیے بالکل تیار ہو چکا تھا اور ہم میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے بظاہر اس سفاک عمل سے روکنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ فیروز کی بے گور و کفن لاش ہمارے سامنے تھی اور اس کی دید نے ہمارے

سینوں میں انگارے بھر رکھے تھے۔ یہ کھلی جنگ تھی اور جنگ میں سب کچھ روا ہوتا ہے اور مارا یا تو ویسے بھی فیروز کی موت میں حصے دار تھی۔

اچانک میگافون پر سرجن اسٹیل کی آواز ابھری۔ ”انور خاں! تو تم کہاں ہے؟“

انور اطمینان سے بولا۔ ”میں اپنی جگہ پر موجود ہوں اور اپنے فیصلے پر بھی قائم ہوں۔“

”ٹھیک ہے انور خاں... ہام تمہارے مطالبوں کو مان رہے ہیں۔ تو اب کسی طرح کا کارروائی نہیں کرے گا۔“ اسٹیل کی آواز میں خلست خوردگی اور پسائی نمایاں تھی۔

”اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ بھی کوئی چال نہیں ہے؟“ اسحاق کی آواز میں دہاڑ تھی۔ ”تم پھر کسی حیلے سے اپنے شکاری کتے ہماری طرف روانہ کر سکتے ہو... یا وہ تمہارا پالتو پاٹھڑے کوئی اور حرکت کر سکتے ہیں۔“

”اب ایسا کچھ نہیں ہوگا... تو تم لوگوں کی تسلی کے لیے ہام اپنے گارڈز کو سو میٹر پیچھے لے جا رہے ہیں۔ ہام ہو پ کرنا کہ تو تم کی طرف سے بھی کوئی ایسا ویسا مومنٹ نہیں ہوگا۔“ اگلے ایک گھنٹے میں واقعی اس امر کے واضح ثبوت نظر آئے کہ مخالف فریق نے ہمت ہار دی ہے اور اب وہ ماریا فرگوں کی بخیریت رہائی چاہتے ہیں۔ درحقیقت ہم اس ساری کارروائی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر چکے تھے اور مشکل ترین مرحلہ وہی تھا جب پاٹھڑے نے شکاری کتوں والی خوفناک چال چلی تھی۔ یقیناً ہرن کے بچے کو پلاننگ کے تحت دہانے کے سامنے چھوڑا گیا تھا۔ کتے ہرن کے پیچھے لپکے تھے۔ یہ بات سامنے کی تھی کہ ہرن جان بچانے کے لیے بھاگے گا تو سرنگ کے دہانے کی طرف آئے گا۔ اگر وہ وہاں بائیں ہونے کی کوشش کرتا تو بھی ”حکم“ کے اہل کار اسے ڈرا کر اس کا رخ دہانے کی طرف کر سکتے تھے۔ بہر حال جو ہوا، وہ منصوبہ ساز کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔

پاٹھڑے اور اس کے مسلح ساتھیوں نے دہانے کے ارد گرد سے اپنی پوزیشنیں ہٹائی تھیں۔ باقی لوگ بھی کافی فاصلے پر چلے گئے تھے۔ ان کے گھوڑے اور کتے وغیرہ بھی اب دہانے کے قریب دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ دہانے کی طرف سے غافل ہو گئے ہوں۔ انہوں نے ہماری حرکات و سکنات پر مکمل نظر رکھی ہوئی تھی۔ کم از کم دو ٹیلی اسکوپس کے چمکتے ہوئے شیشے مجھے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ماریا کا درد سے بڑا حال تھا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں کا نسا چیتے کو بھی باقاعدہ ایک تکلیف کا نام دیا جاتا ہے اور اس کاٹنے کو نکالنے کے لیے آپریشن تھیر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں اس کی پوری انگلی جڑ سے کاٹ دی گئی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر چوہان نے اسے ایک پین کلر انجکشن دیا اور انفیکشن سے بچانے والا ایک کپسول بھی کھلایا۔ وہ پھر بھی مسلسل ہائے دائے کرتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب ہمیں اپنا دوست چرواہا زیندر سنگھ دہانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے سر کا صاف کھول رکھا تھا تا کہ ہم اسے دور ہی سے اچھی طرح پہچان لیں۔ دہانے کے عین سامنے آکر وہ زور سے بولا۔ ”آپ لوگوں کے لیے میرے پاس ایک چٹھی ہے، کیا میں آگے آکر دے سکتا ہوں؟“

اس نے یہ الفاظ مقامی زبان میں ادا کیے تھے۔ انور خاں نے اس سے کہا۔ ”اگر تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے تو آ جاؤ۔ اگر ہتھیار ہے تو اسے وہیں رکھ دو۔“

انور خاں نے بھی یہ الفاظ اسی علاقائی زبان میں کہے تھے۔ یہ زبان میری اور چوہان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے اپنی چھوٹی سی کلباڑی کر سے نکال کر وہیں ایک درخت کی جڑ میں رکھ دی اور آگے بڑھ آیا۔ وہ ہم سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے مخالف فریق کی طرف سے ہماری جانب روانہ کیا گیا ہے۔

اس نے ایک چٹھی نکال کر انور خاں کے ہاتھ میں تھا دی۔ یہ سرجن اسٹیل کی طرف سے تھی اور انگلش میں لکھی گئی تھی۔ چوہان نے چٹھی پڑھی۔ اس کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔ ”... ہم تمہارے مطالبات کو من و عن تسلیم کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اب تمہاری طرف سے ماریا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تمہارے مطلوبہ لوگوں کو لانے کے لیے آدمی زرگاں روانہ کیے جا چکے ہیں۔ وہ کل شام تک واپس آ جائیں گے۔ سلطانہ کا والد اور بھائی بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اگر تم لوگ انہیں یہاں بلوانا چاہتے ہو تو بتا دو۔ لیکن اگر براہ راست تل پانی پہنچانا چاہتے ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارا کوئی بندہ خود تل پانی جا کر اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر تم لوگ اسٹیٹ سے نکلتا چاہتے ہو تو بھی ہم تمہیں محفوظ راستہ دینے کے لیے تیار ہیں۔“

اب ہمارے درمیان معاملات طے ہیں۔ اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ تم ماریا کی صحت اور آرام کا پورا خیال رکھو گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہماری طرف سے ایک ڈاکٹر جاتا ہے اور اس کاٹنے کو نکالنے کے لیے آپریشن تھیر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں اس کی پوری انگلی جڑ سے کاٹ دی گئی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر چوہان نے اسے ایک پین کلر انجکشن دیا اور انفیکشن سے بچانے والا ایک کپسول بھی کھلایا۔ وہ پھر بھی مسلسل ہائے دائے کرتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب ہمیں اپنا دوست چرواہا زیندر سنگھ دہانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے سر کا صاف کھول رکھا تھا تا کہ ہم اسے دور ہی سے اچھی طرح پہچان لیں۔ دہانے کے عین سامنے آکر وہ زور سے بولا۔ ”آپ لوگوں کے لیے میرے پاس ایک چٹھی ہے، کیا میں آگے آکر دے سکتا ہوں؟“

آکر ماریا کی مرہم پٹی کر دے۔ اگر تم لوگوں کو خوراک یا کوئی اور ضروری چیز درکار ہے تو ہمیں بتاؤ، ہم مہیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

.... حالات میں بہتری کا خواہاں اسٹیل بر رہے۔“

یہ خط خوش آئند تھا۔ سب کے چہرے چمک گئے۔ درحقیقت اب اس سارے معاملے کو سات آٹھ روز گزر چکے تھے۔ مسلسل تناؤ نے بھی کے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ ایسے حالات میں اتنا زیادہ وقت گزارنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص کہے کہ وہ تھکا نہیں اور اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تو وہ غلط کہے گا۔ ولیری سے موت کا سامنا کرنا اور بات ہے۔ مسلسل موت اور زندگی کے درمیان معلق رہنا اور بات ہے۔

انور نے زیندر سے پوچھا کہ چٹھی بھیجنے والوں سے اس کا رابطہ کیسے ہوا؟

اس نے بتایا کہ اس کے پاس ہمارے لیے ایک اور پیغام بھی ہے اور یہ مرادشاہ وغیرہ کی طرف سے ہے۔ وہ اس امید پر دہانے کے آس پاس موجود تھا کہ شاید اسے کوئی ایسا موقع مل جائے کہ وہ یہ پیغام ہم تک پہنچا سکے۔ یہ امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی... لیکن پھر واگرو کی طرف سے کرپا ہو گئی اور جو کام ناممکن نظر آتا تھا، ممکن ہو گیا۔ اسے درختوں میں بکریاں چراتے دیکھ کر خود صاحب لوگوں نے اپنے پاس بلایا اور یہ چٹھی دے کر ہماری طرف روانہ کر دیا۔

زیندر سنگھ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ پاٹھڑے وغیرہ زیندر کو اندر بھیج کر شاید یہ بھی جاننا چاہ رہے تھے کہ اندر کا نقشہ کیا ہے اور دہانے کے آس پاس کتنے لوگ موجود ہیں۔

انور خاں نے زیندر سے پوچھا کہ مرادشاہ کا پیغام کیا ہے؟ زیندر کے تاثرات بدل گئے۔ محسوس ہوا کہ اس کے پاس ہمیں بتانے کے لیے کچھ خاص باتیں ہیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں جلدی جلدی انور خاں کو مقامی زبان میں جو کچھ بتایا، اس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

... ماریا کے اغوانے پوری اسٹیٹ میں کھلبلی مچا دی ہے۔ ہر طرف بس اسی بارے میں بات ہو رہی ہے۔ زرگاں میں اونچے طبقے کے لوگوں میں سخت خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے جو انگریز یہاں موجود ہیں، وہ سخت خوف زدہ ہیں۔ ان کی عورتیں گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ گھروں پر بھی سخت پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔ عام لوگ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جارج گور صاحب کی بہن اغوا ہو سکتی ہے تو اور کون محفوظ ہے۔

زیندر سنگھ نے بتایا کہ اس کے علاوہ زرگاں میں ایک

اور طرح کی چپقلش بھی پیدا ہو گئی ہے۔ وہاں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار ہے، وہ اندر خانے دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ کا تو خیال ہے کہ ماریا کی جان بچانے کے لیے انور خاں اور اس کے ساتھیوں کے سارے مطالبے مان لیے جائیں اور کسی طرح کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔ لیکن کچھ لوگ اسے بہت بڑی شکست سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح باغی ذہن رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بڑھیں گے۔ ویسے بھی چالیس پچاس خطرناک ترین لوگوں کو یوں چھوڑ دینا بہت نقصان کا کام ہوگا اور بعد میں اس کے نتائج بہت بُرے نکلیں گے۔

”حکم کا اپنا رویہ کیا ہے؟“ انور نے زیندر سے پوچھا۔

زیندر نے مقامی زبان میں کہا۔ ”مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ حکم جی خود بھی بندوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔“

پھر وہ انکشاف کرنے والے لہجے میں بولا۔ ”مرادشاہ نے مجھے آپ لوگوں کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ حالات اتنے اچھے نہیں جتنے نظر آرہے ہیں بلکہ بہت زیادہ خراب ہیں۔ ظاہری طور پر شاید یہ لوگ کچھ نرمی دکھا رہے ہوں مگر اندرون خانہ ایک زبردست حملے کا پورا پروگرام بن چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس حملے میں ماریا کے ساتھ ساتھ آپ سب لوگوں کو بھی ختم کر دیا جائے۔ اس حملے کی تیاری کے لیے رنجیت پاٹھڑے اور اس کے تین درجن ساتھی یہاں موجود ہیں۔ انہیں تیاری کے لیے کچھ وقت چاہیے، اسی لیے وہ نرمی دکھا رہے ہیں اور یہ چٹھیاں وغیرہ بھیج رہے ہیں۔“

میں نے دیکھا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ کے چہروں پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ واقعی یہ ایک تشویشناک اطلاع تھی۔

چوہان نے زیندر سنگھ سے پوچھا۔ ”مرادشاہ صاحب اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟“

جواب میں زیندر سنگھ بولا۔ ”شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کے بندوں نے زرگاں میں خفیہ طور پر جو جانکاریاں اکٹھی کی ہیں، ان سے پتا چلا ہے کہ پچاس بندوں کی لسٹ میں سے قریباً چالیس پینتالیس بندے ایسے ہیں جنہیں ”حکم جی“ کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس بارے میں آپ لوگوں کو جو کچھ بھی بتایا جا رہا ہے وہ صرف اور صرف وقت گزارنے کے لیے ہے۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ لوگوں کے جو زیادہ سے زیادہ مطالبے مانے جاسکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ سلطانہ لی لی کے والد اور بیمار بھائی کو چھوڑ دیا جائے۔ اور آپ لوگوں کو تل پانی جانے یا پھر اسٹیٹ سے نکلنے کے لیے راستہ دے دیا جائے۔ شاہ صاحب نے آپ لوگوں کو مشورہ

دیا ہے کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی کوئل پانی بھجوا دیں اور خود اسٹیٹ سے نکلنے کا راستہ لے لیں۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں نے اور کچھ نہیں دینا۔ چاہے اس کے لیے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔“

انور خاں نے زیندر سنگھ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ہم اس بارے میں مشورہ کرتے ہیں اور کوئی فیصلہ لیتے ہیں۔“

”اور اس چٹھی کا جواب؟“ زیندر نے پوچھا۔

”اس کا جواب بھی ہم کچھ دیر بعد دیں گے۔“

زیندر نے مقامی زبان میں انور خاں سے گفتگو جاری رکھی اور کہا۔ ”انہوں نے ڈاکٹر کے بارے میں خاص طور سے پوچھا ہے کہ کیا وہ میم جی کے لیے کوئی ڈاکٹر بھیج دیں؟“

اسحاق چمک کر بولا۔ ”کوئی ضرورت نہیں۔ ان کو بتاؤ کہ ڈاکٹر ہمارے پاس موجود ہے۔۔۔ بلکہ ہم سب ڈاکٹر ہیں اور اس کا بہت اچھا علاج کر سکتے ہیں۔“

زیندر سنگھ ہم سے اجازت لے کر واپس چلا گیا۔

یہ ایک بدلی ہوئی صورت حال تھی۔ ہمیں اندر کی رپورٹ ملی تھی اور یہ خاصی تشویشناک تھی۔ زرگاں کی محلاتی سازشوں کی وجہ سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک گروہ ماریا کی زندگی کی پروا کیے بغیر ہم جوئی کر سکتا تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ آدھ پون گھنٹے تک بحث ہوئی۔ اسحاق اور احمد وغیرہ تو اس پر تیار نہیں تھے کہ اپنے دوستوں کی رہائی کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائیں مگر ڈاکٹر چوہان اور انور خاں کا خیال تھا کہ بدلی ہوئی صورت حال میں حکمت عملی سے کام لینا پڑے گا۔ انور خاں موت سے ڈرنے والا شخص نہیں تھا لیکن وہ مستقبل قریب کے حالات کو بھی ذہن میں رکھ رہا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اگر یہ معاملہ خون خرابے پر ختم ہوتا اور ماریا بھی ماری جاتی تو پھر زرگاں کے مسلمان رہائشیوں پر قیامت ٹوٹ پڑنا تھی۔ حکم جی وغیرہ اس واقعے کو بہانہ بنا کر بہت ظلم کر سکتے تھے۔

آخر میں انور خاں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”یارو! ہم اس وقت جنگ جیسی حالت میں ہیں اور جنگ میں کبھی وقت کے مطابق تھوڑا سا پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شکست ہو گئی۔ میری رائے میں مراد شاہ صاحب نے جو اندر کی رپورٹ ہم تک پہنچائی ہے، وہ بڑی اہم اور قیمتی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

”لیکن اگر ہم اپنے دوسرے مطالبوں سے پیچھے نہیں گے تو وہ لوگن اور بھی شیر ہو جاویں گے۔“ اسحاق نے کہا۔

”میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہو گا۔“ چوہان نے

پرسوج لہجے میں کہا۔ ”سچ میں مسئلہ تو ان پچاس بندوں کا ہے جسے جن کو ہم چھڑانا چاہتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ نہیں ہو گا تو پھر حکم جی ”ایکشن والا خطرہ“ کسی صورت مول نہیں لے گا۔ اس پر جارج گور اوغیرہ کی طرف سے بھی زبردست دباؤ پڑ جائے گا کہ اس معاملے کو خون خرابے کے بغیر حل کیا جائے۔“

”ہاں، یہ بات تو سمجھ میں آوتی ہے۔“ احمد نے کہا۔

”اگر ہم اپنے اس مطالبے سے پیچھے ہٹ جاوتے ہیں۔۔۔ اور پھر بھی حکم اور پانڈے وغیرہ کھون کھرا بے کا سوچتے ہیں تو جارج اور اس کے سیکڑوں ساٹھی ایک دم قیامت برپا کر دیں گے۔“

اس موضوع پر پانچ دس منٹ مزید بات ہوئی۔ آخر ایک حتمی فیصلہ کر لیا گیا۔۔۔ طے ہوا کہ اسٹیل وغیرہ کو ان کی چٹھی کا جواب دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ سب سے پہلے سلطانہ کے والد اور بھائی کوئل پانی پہنچائیں، اس کے بعد ہم بھی اپنی مانگوں پر نظر ثانی کریں گے۔ ان کو شروع میں یہ عندیہ دیا جائے کہ اگر پچاس کے پچاس لوگ رہائیں کیے جا سکتے تو ان میں سے جتنے لوگ جارج کی جیل میں موجود ہیں، ان کو چھوڑ دیا جائے اور یہاں پہنچایا جائے۔ اس فیصلے پر اسحاق سمیت سب نے اتفاق کیا۔ تاہم اسحاق کی رائے تھی کہ اسٹیل اور اس کے ساتھیوں نے کل شام تک سارے مطالبے ماننے کا جو وعدہ کیا ہے، اس کے پورا ہونے کا انتظار کر لیا جائے۔

کچھ بحث و تھقیص کے بعد اسحاق کی یہ بات مان لی گئی۔ حالانکہ اس وعدے کے پورا ہونے کے امکانات کم ہی تھے۔ فیروز کو نہلائے بغیر ایک چادر میں لپیٹا گیا۔ انور خاں نے باقاعدہ اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر سرنگ کے اندر ہی اسے ایک نیم پتھر ملی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ سب کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ دونوں کتوں کی لاشوں کو سرنگ کے عقبی حصے میں پہلے سے موجود ایک گڑھے میں پھینک کر منی ڈال دی گئی۔ پانڈے کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر لے گئے۔

رات کو دہانے پر اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد میں پھر باروندا جیل کے پاس پہنچا اور وہاں اس کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے گزارے۔ شراب پینے کے بعد اس کی توانائیاں خود کر آتی تھیں اور وہ کافی حد تک صحت مند دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرا بے حد مشکور بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی دل جمعی سے مجھے مارشل آرٹ کے داؤچ سے آگاہ کر رہا تھا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس کے اندر جیسے یہ شدید خواہش پیدا ہو گئی

تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ بتائے اور میں اس کے بتائے ہوئے کو ”فالو“ بھی کروں۔ اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ میرے اندر ایک آگ دیکھ رہا ہے اور اگر یہ آگ جلتی رہی تو میں کافی کچھ حاصل کر لوں گا۔ اور وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔۔۔ میں خود محسوس کرتا تھا کہ میرے اندر کچھ روشن ہو چکا ہے اور اس روشنی کی ابتدا اسی رات ہوئی تھی جس رات سلطانہ نے میرے لیے بہت کچھ کھودیا تھا۔

مجھے سکھانے کے دوران میں جبکی چھوٹے چھوٹے وقفے بھی لیتا تھا۔ ان وقفوں میں وہ دھسکی کے ٹھونٹ لیتا، کھانا کھاتا اور ہنر بیف چبانے کی کوشش کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پرانی یادیں بھی تازہ کرتے لگتا۔

جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس رات جنگل میں خوب بارش بھی ہوئی۔ بجلی چمکتی رہی، بادل گر جتے رہے۔ بجلی ہوئی نباتات کی خوشبو ہوا کے ساتھ سرنگ میں چکراتی رہی۔ اس ماحول نے جبکی کا نشہ دو آتشہ کر دیا۔ وہ اپنا من پسند نیپالی گیت گنگنانے لگا۔

۔۔۔ ہم نے اگلے روز شام تک سرجن اسٹیل اور پانڈے وغیرہ کا وعدہ ایفا ہونے کا انتظار کیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق ان لوگوں نے ایک بار پھر عذر لنگ کا سہارا لیا۔ پانڈے نے میگا فون کے ذریعے ہمیں بتایا کہ بارش کی وجہ سے رات کو کافی راستے بند ہو گئے ہیں۔ جنگل میں سات آٹھ میل کا علاقہ ایسا ہے جہاں سفر ممکن نہیں رہا۔ لہذا جیل سے یہاں پہنچنے والوں کی آمد میں ایک دو روز کی تاخیر ہو سکتی ہے۔ بات کی تہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کی طرف سے جو اطلاعات ہم تک پہنچی تھیں، وہ بالکل درست ثابت ہو رہی تھیں۔ ہم سے وعدے کیے جا رہے تھے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کیا جا رہا تھا۔

اسحاق اور احمد بہت برہم تھے۔ وہ ذہنی طور پر مرنے مارنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ خاص طور سے اسحاق تو یہی چاہتا تھا کہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا جائے۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

بہر حال، طے شدہ پروگرام کے مطابق اسحاق کو بھی ہماری بات ماننا پڑی۔ چوہان نے انگریزی میں خط لکھا۔۔۔ اور اس میں اسٹیل وغیرہ کو یہ عندیہ دیا گیا کہ اگر وہ لوگ فوری طور پر سلطانہ کے والد اور بھائی کو گونگے ہاشم سمیت تل پانی پہنچا دیں۔ تو ہم باقی کے مطالبات میں کچھ ٹپک پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ خط ایک بار پھر میں ہی لے کر گیا۔ میں نے پچھلے چند

دنوں میں انٹرن سیکورٹی فورسز کے سابقہ افسر رنجیت پانڈے کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس مرتبہ بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ رنجیت پانڈے کی جگہ ایک سانولا سا سفر بہ اندام شخص خط لینے کے لیے آگے آیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ تھیں اور وہ حکم کے سپاہیوں کی مخصوص وردی میں تھا۔ میں نے تل پانی میں چھوٹے سرکار یعنی اجیت رائے کے محافظ بھی دیکھے تھے۔ ان کی وردیاں سبز رنگ کی تھیں۔ جنگل میں یہ وردیاں جیسے سبز گرد و پیش کا حصہ ہی بن جاتی تھیں۔ حکم کے سپاہیوں کی وردیوں میں سبز اور خاکی رنگ تھا۔

خط دینے کے بعد میں واپس آ گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹے پھر انتظار اور تناؤ کے تھے۔ دونوں طرف خاموشی تھی لیکن یہ ایسی خاموشی تھی جسے کسی بھی لمحے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس خاموشی کی دھند میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی موجود تھا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب پانڈے نے ہی ہمیں میگا فون کے ذریعے اطلاع دی کہ ہمارا مطالبہ پورا کر دیا گیا ہے۔ سلطانہ کے والد، بھائی اور ملازم ہاشو بخیریت تل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اگر ہم اس کی تصدیق کرنا چاہیں تو ہم میں سے کوئی ایک شخص تل پانی جا کر واپس آ سکتا ہے۔

انور خاں تصدیق کیے بغیر کیسے مان سکتا تھا؟ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اطلاع دینے والا پانڈے تھا۔

مشورے کے بعد طے ہوا کہ ہم میں سے احمد سرنگ سے باہر جائے گا اور تصدیق کر کے ہمیں اطلاع دے گا۔ تل پانی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ احمد ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بہ آسانی واپس آ سکتا تھا۔ میرے دل میں آئی کہ میں بھی رضا کارانہ طور پر احمد کے ساتھ چلا جاؤں۔ اس طرح میں تل پانی میں سلطانہ سے مل سکتا تھا اور اس بچے سے بھی جسے میرا خون کہا جا رہا تھا۔ میں سلطانہ کو تسلی بخشی بھی دے سکتا تھا مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں جس منزل کا راہی نہیں تھا، اس منزل کی طرف جانے سے کیا حاصل تھا؟ مجھے سلطانہ کی طرف نہیں کسی اور کی طرف جانا تھا۔ وہ جو ایک روز، بغیر کچھ بتائے، بغیر کچھ کیے، خاموشی سے منہ موڑ کر چلی گئی تھی۔۔۔ سمندر پار جا گئی تھی۔۔۔ ان گلی کوچوں کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ گئی تھی۔۔۔ جہاں ایک چپے پر ہماری یادوں کے گلشن کھلے ہوئے تھے۔ ہاں، میری منزل وہی تھی۔ اس کے سوا کوئی ہمت خواہ میری زندگی میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر سلطانہ آئی تھی تو وہ میرے ہوش و

Scanned and Uploaded By Nadeem

حواس میں نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹا ہوا وقت میرے ذہن کی سلیٹ پر سے بالکل صاف ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی قربانیوں کے بارے میں سنا تھا۔ ان جانکار یوں کی وجہ سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی تو موجود تھی لیکن کسی بھی درجے کی محبت نہیں تھی۔

احمد، انور خاں کی ضروری ہدایات کے ساتھ سرنگ سے روانہ ہو گیا۔ اس کے لیے پانڈے نے گھوڑا فراہم کیا اور ایک محافظ بھی ساتھ بھیجا۔ احمد کی واپسی دو گھنٹے سے پہلے ہی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ مثبت خبر لایا ہے۔ اس نے آکر بتایا۔

”سب ٹھیک ہے انور بھائی! میں سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی سے مل کر آیا ہوں۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ سلطانہ بی بی کے بیمار بھائی کو چار پائی اور گھوڑا گاڑی پر سفر کرا کے مل پانی پہنچایا گیا ہے۔“

”مل پانی میں کیا حالات ہیں؟“ چوہان نے پوچھا۔

”سلطانہ بی بی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجرموں کو ہر صورت سزا ملنی چاہیے۔ اگر حکم اور اس کے لوگوں تاہیں دیتے تو پھر اس سزا کی ذمہ داری چھوٹے سرکار کو لینی چاہیے۔“

انور خاں نے احمد سے سرنگ کے ارد گرد کے حالات دریافت کیے۔

احمد اپنے زخمی بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”باہر ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ لوگ موجود ہیں۔ میرے کھیاں میں تو ان کی تعداد ڈھائی تین سو سے کم نہیں ہووے گی۔ وہ دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دور بینیں لے کر درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ان کے گھوڑے گھاس پر منہ مارتے نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کا اسلحہ ہے۔ ٹیلوں کے ساتھ ساتھ ان کی چھو لدا ریاں ہیں اور خچر وغیرہ بندھے ہوئے ہیں۔“

”ظاہر ہے کہ میم صاحبہ کا معاملہ ہے۔ اگر ساری فوج بھی یہاں بھیج دی جاتی تو حیرانی کی بات نہیں تھی۔“ چوہان نے کہا۔

انور خاں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”چلو، پہلا مرحلہ تو طے ہوا۔“

”اب کیا کرنا ہے؟“ احمد نے پوچھا۔

”اب ان کو دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مزید یہاں نہیں رک سکتے۔ وہ ہمارے مطلوبہ بندے یہاں پہنچا دیں۔ اگر سارے نہیں آسکتے تو اتنے پہنچا دیں جتنے کا

انہوں نے اقرار کیا ہے۔ یعنی پچیس افراد!۔“

”لیکن وہ اتنے بھی نہیں پہنچائیں گے۔“ بھکشو ہمیش نے کہا۔

”نہیں پہنچائیں گے لیکن کچھ نہ کچھ تو بتائیں گے نا۔ فی الوقت وہ جو بھی دیں، ہمیں مان لینا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟“ آخری الفاظ کہتے ہوئے انور خاں نے چوہان کی طرف دیکھا۔

چوہان نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

اس بار خط لکھنے کے بجائے چوہان اور انور خاں نے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری طرف سے سرجن اسٹیل اور گرومودان آئے۔ درختوں کے جھنڈ میں قریباً آدھ گھنٹا بات چیت ہوئی۔ ہماری توقع اور اندیشے کے عین مطابق وہ لوگ فوری طور پر صرف سات بندے دینے کے لیے آمادہ ہوئے۔ یہ زیادہ اہم بندے نہیں تھے۔ یہاں بھاگتے چور کی لنگوٹی والا محاورہ صادق آ رہا تھا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ معاملہ طے ہو گیا۔ چوہان اور احمد واپس آ گئے۔

چوہان نے بتایا۔ ”کل دو پہر تک سات بندے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ماریا سمیت یہاں سے نکل سکیں گے اور مل پانی کی طرف روانہ ہوں گے۔“

”ماریا آخر تک ہمارے ساتھ رہے گی؟“ ہمیش نے پوچھا۔

”نہیں... اسٹیٹ کی حدود سے دو میل پیچھے ماشی پور کے قریب ہمیں ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے بدلے سرجن اسٹیل یا گرومودان میں سے کوئی ایک ہماری تحویل میں آ جائے گا۔ وہ تب تک ہمارے ساتھ رہے گا، جب تک ہم کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے۔“

”یہ دھوکا ہے۔ کوئی چال ہے۔“ اسحاق نے چیخ کر کہا۔ ”میں آپ سب کو بتا دیتا ہوں، ہم تب تک ہی بچے ہوئے ہیں جب تک یہ چھو کری ہمارے ساتھ ہے۔ جس وقت یہ ہمارے ہاتھ سے نکلی، ہم مارے جاویں گے۔ میں کسی صورت ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ تب ہی رہا ہووے گی جب ہم یہاں سے نکلیں گے۔“ اسحاق کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

انور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”دیکھو، ہم ماریا کے بدلے جو کچھ لے رہے ہیں، وہ بھی کچھ کم خاص نہیں ہے۔ سرجن اسٹیل یا پھر گرومودان۔ ماریا کی طرح ان دونوں کے جیون کا رسک لینا بھی ان لوگوں کے لیے آسان نہیں ہو گا۔ اور پھر تب تک ہم ویسے بھی اسٹیٹ سے تقریباً نکل چکے ہوں گے۔“

اسحاق بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا۔ بہر حال، انور خاں اور چوہان اسے سمجھانے میں لگے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اسے بمشکل راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆

سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ اب ہمیں کل دو پہر تک زرگاں سے رہا ہونے والے سات بندوں کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں سے نکلنے کی تیاری بھی کرنا تھی۔

احمد مل پانی سے ہو کر آیا تھا۔ میں اس سے سلطانہ اور بالو وغیرہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ احمد خود بھی بھانپ گیا کہ میں اس سے سلطانہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کھانے کے بعد ہم ایک الگ جگہ جا بیٹھے۔ احمد نے بتایا۔ ”وہ ابھی تک سخت صدمے میں ہے۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں۔ نہ ہی بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ بس گم صدمہ ٹھہری ہوئی ہے یا پھر رونا شروع کر دیوت ہے۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر ایک ڈاکٹر اس کا علاج کر رہا ہے۔ میں اس سے ملا ہوں۔ وہ بتا رہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بہتر ہو جاوے گی۔“

”تم خود بھی اس سے ملے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، میں گیا تھا۔ وہ عبدالغنی کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ میاں بیوی اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر رونے لگ گئی۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ تمہاری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بہت تاکید کی کہ میں تمہارا بہت کھیاں رکھوں... اس کے دل میں تمہارے لیے وہی پریشانی ہے جو ایک بہت پیار کرنے والی بیوی کے دل میں ہو سکتی ہے۔“

”اس نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟“

”ناہیں، تب بھائی امیر اکھیاں ہے کہ وہ اپنا سارا دکھ درد اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے۔ جیسے ساگر اوپر سے شانت ہووے ہے، پر اندر طوفان پلے ہے۔ سلطانہ بی بی کے اندر بھی بہت کچھ چل رہا ہے۔ اب بتانا ہیں، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔“

”تم نے اسے بتایا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں؟“

”ناہیں، میں یہ بتاتا تو وہ زیادہ غمگین ہو جاتی۔ وہ اوپر سے کچھ بھی کہے لیکن کوئی بھی بیوی اس طرح اپنے شوہر کو ہمیشہ کے لیے کھونا نہیں چاہتی۔ اور سلطانہ تو ایسی شوہر پرست بیوی ہے جس نے...“

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے ذہن میں آیا

تھا کہ وہ یہ باتیں پہلے بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے۔ میں نے احمد سے مشورہ مانگتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے... ایسا کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ جلد سے جلد نارمل ہو جائے؟ اس بات کو سمجھ لے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں؟“

اس سے پہلے کہ احمد جواب میں کچھ کہتا، اسحاق نے اشارے سے ہمیں اپنی طرف بلایا۔ وہ ہمیں کوئی خاص چیز دکھانا چاہ رہا تھا۔

ہم اٹھ کر اس کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دہانے سے کچھ فاصلے پر اس جگہ لے آیا جہاں ہم سوتے تھے۔ ”یہ دیکھو۔“ اسحاق نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ماریا جو پچھلے تقریباً اٹھارہ گھنٹے سے پتھر پر چڑھی بیٹھی تھی تاکہ کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے... اب تھک ہار کر زمین پر لیٹ گئی تھی اور سو رہی تھی۔

اسحاق زہریلے لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”حرامزادی کہوت تھی مجھے بیڈ چاہیے، گدا چاہیے۔ اب دیکھو، پتھروں پر سو رہی ہے۔“

”سیانے ٹھیک ہی کہوت ہیں کہ وقت سب کچھ سکھا دیوت ہے۔“ احمد نے تائیدی کی۔

”ایک دو ہفتے اور ہمارے ساتھ رہی تو اسے کانٹوں پر بھی سونا آ جاوے گا۔“ اسحاق نے کہا۔

واقعی یہ دیکھنے والا نظارہ تھا۔ خوشبودار کمروں میں محضر دانیال لگا کر آرام دہ بستروں کا لطف لینے والی، سخت ناموار زمین پر پڑی تھی۔ اس کا قیمتی لباس سرنگ کی مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔ اپنے لباس کی طرح وہ خود بھی بے ترتیب تھی۔ ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں تھا۔ میں نے دہانے کی طرف سے آنے والی مدہم روشنی میں دیکھا، اس کی گوری چٹی پنڈلی پر ایک چھوٹا لال بیک ریگ رہا تھا۔ یہی زندگی اور زندگی کی بوا بے تھی۔

اگلے روز سہ پہر ڈھائی تین بجے کے قریب وہ ساتوں افراد زرگاں سے آ گئے جن کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ ان کی عمریں بیس اور ستائیس اٹھائیس سال کے درمیان تھیں۔ داڑھیاں بڑھی ہوئیں، سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں تھے۔ ان کی شکلوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بامشقت قید گزار کر آرہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے جسم اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ انور خاں، احمد اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو بھی چمک گئے۔

ایک پارسی کے سوا یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ ان

Scanned and Uploaded By Nadeem

میں سے صرف ایک شخص قتل کا مجرم تھا، باقی سب جرم بے گناہی کا شکار تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے حکم یا جارج کی کسی زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ کسی سرکاری اہل کار کے دست ستم کو روکنے کی کوشش کی تھی یا ایسا ہی کوئی اور گناہ کیا تھا۔ انور خاں نے مجھ سے اور چوہان سے ان سب کا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک ججام تھا، دوسرا ایک ماہر قفل گر تھا۔ یہ سب افراد اپنی اس آزادی کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے تھے اور قدرت کی نیرنگی پر حیران تھے۔

سب سے پہلے انہیں کھانا کھلایا گیا۔ ہمارے پاس بس گزارے لائق خوراک تھی۔ زیادہ تر خشک راشن یعنی چنے، بھٹے، ہنتر بیف اور بسکٹ وغیرہ ہی تھے۔ قیدیوں نے یہ چیزیں نذیروں کی طرح کھائیں۔ اندازہ ہوا کہ اپنی طویل قید کے دوران میں وہ معقول خوراک سے یکسر محروم رہے ہیں۔

ان میں سے جو شخص ججام تھا، وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زرگاں میں وہ میرے بال تراشتا رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا حمام اسی محلے میں ہے جہاں مختار راجپوت اور ان کی بیٹی سلطانی رہتے ہیں۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اکثر سلطانی خود مجھے اپنے ساتھ لے کر آتی تھی اور جب تک میرے بال تراشے جاتے تھے، وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔ میں چونکہ پوری طرح صحت مند اور چوکس نہیں تھا، وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ عبدالرحیم نامی یہ ججام اس بات پر ششدر بھی تھا کہ میں اسے کیوں پہچان نہیں پا رہا ہوں۔ چوہان اسے ایک طرف لے گیا، غالباً صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

ان قیدیوں سے ہمیں اپنے ارد گرد کے حالات کے بارے میں بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ہم رات تک تیاری میں لگے رہے۔ خشک راشن تھیلوں میں رکھا گیا۔ فالٹو ایمینیشن کو پولیٹھین میں لپیٹ کر کینوس کے دو بڑے بیگوں میں اس طرح سنبھالا گیا کہ وہ بارش وغیرہ سے محفوظ رہے۔ رائفلوں کو صاف کر کے بالکل تیار کر لیا گیا۔ مکمل ترتیب بنا کی گئی کہ ہمیں کس فارمیشن میں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہنگامی صورت حال سے کس طرح نمٹنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انور خاں میں یقیناً قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل وقت سے پہلے ہی طے کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اس خشک و تاریک سرنگ میں یہ ہماری آخری رات ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرح کی سسنی بھی رگ و پے میں جاگی ہوئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد حالات ہمارے لیے ایک دم خطرناک ہو جائیں گے۔ آنے

والے ایک دو روز میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ماضی قریب میں ایسے حالات مجھے اعصاب زدہ کر دیا کرتے تھے۔ میں خطرے کی آمد سے پہلے ہی اس کے بارے میں اتنا سوچتا تھا کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا تھا مگر اب صورت حال مختلف تھی۔ حالات کی سنگینی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ میں خود کو اس پرجوش گروپ کا حصہ محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح میں بھی لڑنے مرنے کے لیے تیار تھا۔ میرا جوش یوں اور بھی بڑھ گیا تھا کہ ہم جو کچھ کرنے جا رہے تھے، وہ میری خواہش کے عین مطابق تھا۔ میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں کسی طرح اس ”جادوگری“ سے نکل جاؤں۔ بے شک اس راجوڑے نے ایک جادوگری ہی کی طرح مجھے کئی برس سے اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ اب میرے لیے ایک سبب پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایک ایسی جماعت کا حصہ بن گیا تھا جو یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس جماعت کے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسری طرف ہمیں روکنے والوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔

یہ بات اب ہر خشک و شبیہ سے بالاتر ہو چکی تھی کہ میرے جسم میں ایک الیکٹرانک چپ موجود ہے جو مجھے اس راجوڑے کی حدوں میں پابند رکھے ہوئے ہے۔ یہ چپ اب بھی میرے جسم میں موجود تھی۔ میرے صیادوں کو اب بھی فوراً معلوم ہو سکتا تھا کہ میں اس اسٹیٹ میں کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں۔ لیکن اب میں جس جماعت کا حصہ تھا، وہ اسے روک نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ روکتے تو پھر زبردست خون خرابے کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔

جو بات چیت ہوئی تھی، اس میں چوہان نے پانڈے وغیرہ سے تین خیر بھی طلب کیے تھے۔ ہمیں دو خیر اور ایک گھوڑا دیا گیا۔ یہ تینوں جانور رات آٹھ بجے ہی سرنگ میں پہنچ گئے۔ ہمیں ان کو سامان برداری کے لیے استعمال کرنا تھا۔ حسب معمول رات کے پہلے حصے میں جن افراد کی ڈیوٹی تھی۔ ان میں، میں بھی شامل تھا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں نے دس پندرہ منٹ تک چٹائی پر لیٹ کر کمر سیدھی کی اور پھر شراب کی نصف بوتل لے کر باروندا جیسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کے لیے ایک چٹائی بچا دی گئی تھی اور لائین رکھ دی گئی تھی۔ وہ تنہائی میں خوش رہتا تھا اور ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ علیحدہ رہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ نیند سے بیدار ہوتے ہی اس میں شراب کی طلب بیدار ہو جاتی تھی اور

یہ طلب شام تک بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شام کے بعد یہ طلب عروج پر پہنچ جاتی تھی اور وہ واویلا شروع کر دیتا تھا۔ ہمیں جینمی ہونے کی بشارتیں سناتا۔ خود کو کوستا اور ان حالات کو بھی جو اسے پیا سمارنے پر تلے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم باروندا کو اس کی طلب کے مطابق شراب فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے تو اس سرنگ کے اندر ہی ایک چھوٹی سی فیکٹری لگائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں باروندا جیسی کے ٹھکانے پر پہنچا تو چونک گیا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا اور نہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے نیڈ بیگ کی طرف دیکھا، وہ بھی اکیلا ہی جھول رہا تھا۔ لائین کی ٹواؤ پچی کر کے میں دائیں بائیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ شاید وہ کسی حاجت کے لیے کسی کوئے کھدرے کی طرف ریگ گیا ہے۔ اگلے دو چار منٹ کے اندر میری پیشانی پر پسینا آگیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ کھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر سے باندھ دی جاتی تھی اور صبح کے وقت ہی بس ایک دو گھنٹے کے لیے کھولی جاتی تھی۔ یا پھر کسی وقت رات کو جب وہ مجھے فائننگ آرٹ کے داؤ پیچ سکھاتا تھا، میں کچھ دیر کے لیے اس کی ٹانگ کھول دیتا تھا۔ رات آٹھ نو بجے میں خود ہی اسے کھانا دینے کے لیے یہاں آیا تھا، تب بھی اس کی ٹانگ بندھی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی بندھی ہوئی ٹانگ کے ساتھ ریگ کر کہیں جاتا تو زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اسے دو چار آوازیں دیں پھر اسے سرنگ کی ذیلی شاخوں میں ڈھونڈنا شروع کیا۔

میری آوازیں سن کر ہمیش اور احمد بھی ٹارچ کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

”کیا ہوا تابش؟“ احمد نے پوچھا۔
”جیسی نظر نہیں آ رہا۔“ میں نے سر اسیم لہجے میں کہا۔
وہ دونوں بھی میرے ساتھ تلاش میں شریک ہو گئے۔ ہم نے زمینی شہادت ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی۔ ایک دو جگہ نیچے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ یہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ بیساکھی نما لکڑی کا نشان بھی موجود تھا۔ تو کیا باروندا جیسی کسی طرح اپنی زنجیر کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ اپنے اکلوتے ہاتھ سے وہ کس طرح ایسا کر پایا تھا؟ جلد ہی دیگر ساتھیوں تک بھی یہ خبر پھیل گئی کہ جیسی غائب ہے۔

سب دہانے کے قریب اکٹھے ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ ”یہ تو سوچا نہیں جاسکتا کہ وہ باہر نکل گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ دہانے کی طرف سے ہی نکل سکتا تھا۔“

”مطلب ہے کہ وہ سرنگ کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔“ اسحاق نے کہا۔
”ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔“ انور خاں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔
”وہ کیا؟“ چوہان نے پوچھا۔
”سرنگ سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ... جو اب تک ہماری نظر سے اوجھل رہا ہو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے انور بھائی۔“ اسحاق الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”تم جانت ہی ہو، یہاں پہنچنے کے دوسرے ہی روز ہم نے چپا چپا دیکھ لیا تھا۔“
”لیکن ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر جگہ پہنچے تھے اور سو فیصد تسلیم کر لی تھی۔“

کسی نے انور کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔ ہاں ایک طرح کی سسنی سب نے محسوس کی۔ اگر واقعی سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ موجود تھا تو پھر اس راستے سے سرنگ میں داخل بھی ہوا جاسکتا تھا اور یہاں ہمارے دشمنوں میں پانڈے جیسا نہایت عیار اور گھاگ شخص بھی موجود تھا۔

انور خاں، چوہان اور اسحاق تو اپنی پوزیشنوں پر موجود رہے اور باقی ایک بار پھر جیسی کو ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ میں اپنی جگہ کچھ ندامت بھی محسوس کر رہا تھا۔ جیسی سے زیادہ تر میرا ہی رابطہ رہتا تھا۔ اس کی بندش کو چیک کرنا بھی میری ہی ذمہ داری تھی۔ اسحاق اور انور خاں وغیرہ کا خیال تو شروع میں یہ تھا کہ مجھے اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لیکن بعد میں جب انہیں جیسی کی مکمل کہانی معلوم ہوئی تھی، وہ بھی اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگے تھے۔

رات آخری پہر تک سرنگ کی بھول بھلیوں میں اس کی تلاش جاری رہی پھر ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری روانگی کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ انور خاں کا خیال تھا کہ ہم اجالا ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں۔ جانوروں پر سامان رات کو ہی باندھ لیا گیا تھا۔ باقی تیاری بھی مکمل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہم جیسی کی مزید تلاش جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

☆☆☆

چھ بجے کے لگ بھگ ہم سرنگ سے نکل آئے۔ مطلع صاف تھا۔ گرد و پیش اس میں نہائے ہوئے تھے۔ سرنگ چھوڑتے ہوئے میں نے الوداعی نظروں سے اس کے اندر جھانکا۔ یہاں گزارے ہوئے دن بڑے سسنی خیز تھے۔ تناؤ سے پُر اعصاب ٹمکن۔ یہاں کئی ایک انوکھے واقعات ہوئے تھے

جن میں شکاری کتوں کا اچانک سرنگ میں گھس آنا اور پھر اندھا و ہند فارنگ کا شروع ہو جانا بھی شامل تھا۔ ہم اپنے قریبی ساتھی فیروز کی قبر بھی اسی سرنگ کی ویران تاریکی میں چھوڑے جا رہے تھے... اور پھر سب سے بڑھ کر باروندا جیسی تھا۔ وہ ایک معنی کی طرح ہمارے سامنے آیا تھا اور ایک معنی کی طرح اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کا یوں اچانک اوجھل ہو جانا میرے دل و دماغ کو تھوڑا سا ہلکا کر رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس اب یہاں رہنے کا وقت نہیں تھا۔ ورنہ جیسی کو ہم کسی صورت چھوڑ کر نہ جاتے۔ انور خاں کے نزدیک اب بھی تو بے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ جیسی سرنگ کی بھول بھلیوں میں ہی موجود ہوگا۔ جونہی وہ اپنے ارد گرد کے حالات بہتر دیکھے گا، یہاں سے نکل جائے گا۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل چکا ہے لیکن اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو کیا وہ اس خطرناک جنگل کو پار کر کے واپس اس ندی تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ نہتا تھا، معذور تھا اور نشے کے بغیر اتنا کمزور تھا کہ کسی بھی وقت، کسی حادثے کا شکار ہو سکتا تھا...

میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ عمران مجھ سے جدا ہوا تھا تو کیا وہ شخص بھی جدا ہو گیا تھا جس میں عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی؟

ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں اس قافلے کا حصہ بن گیا جو اس سرنگ سے نکل کر گھنے درختوں میں داخل ہو رہا تھا۔ اس مختصر قافلے میں موجود افراد ایک خاص ترتیب سے باہر نکلے تھے اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق یہ ترتیب ہر صورت میں برقرار رکھی جانی تھی۔

سب سے آگے وہ گھوڑا تھا جس پر خوراک کا سامان لدا تھا۔ اس کے عقب میں چوہان، ہمیش اور احمد تھے۔ ان کے پیچھے ماریا بھی جس کے عین عقب میں اسحاق تھا۔ ماریا کے دائیں بائیں بھی دو افراد موجود تھے۔ اس کے پیچھے وہ باقی پانچواں افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں تھے جنہیں زرگاں سے رہا کرایا گیا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار تو نہیں تھا تاہم انور خاں نے ان میں سے چار بندوں کو تلواریں سے مسلح کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے عقب میں انور خاں اور میں تھے۔ ہم دونوں نے دو سامان بردار خجروں کی رسیاں بھی تھام رکھی تھیں۔ ان خجروں پر چٹائیاں، برتن اور اضافی ایمنیشن وغیرہ بار کیا گیا تھا۔ ہر بندے کو اپنی ڈیوٹی معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہنگامی صورت حال میں انہیں

کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ ترتیب سے ظاہر ہے، ماریا اس مختصر قافلے کے عین درمیان میں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر باندھے جانے چاہیے تھے مگر انگلی کٹنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی تھا اس لیے انور نے تھوڑی سی رعایت کی تھی اور ہاتھ سامنے کی طرف بندھوائے تھے۔ اسحاق نے ایک بڑے سائز کی چادر اس کے جسم کے گرد لپیٹ دی تھی۔ وہ اس چادر کے اندر ڈلگاتی ہوئی سی چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کئی اور جھلاہٹ کے آثار صاف محسوس کیے جاسکتے تھے۔

ہم روانہ ہوئے تو حسب پروگرام اسٹیل، پائڈے اور ان کے دیگر ساتھی ہمارے پیچھے چل دیے۔ اپنی ”کمینٹ“ کے مطابق انہوں نے ہم سے کافی فاصلہ رکھا تھا۔ یہ ایک محفوظ فاصلہ تھا۔ یہ لوگ ہمارے پیچھے اور دائیں بائیں موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر گھڑسوار تھے۔ ان کی سبز اور براؤن وردیوں کی جھلک ہمیں چاروں طرف دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی سو سے کم نہیں تھی۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ بھی موجود تھا۔ یہ لوگ چاہتے تو سینکڑوں میں ہمیں بھون کر رکھ سکتے تھے۔ لیکن ہمارے پاس ماریا ایک اہم مہرے کے طور پر موجود تھی۔ وہ اس اسٹیٹ میں ایک اہم ترین شخصیت تھی اور اس کی زندگی کے لیے رسک لینا آسان نہیں تھا۔

”ہمیں کتنا فاصلہ طے کرنا ہوگا؟“ میں نے اپنے پہلو میں چلتے انور خاں سے پوچھا۔

”میلوں میں تو ٹھیک سے نہیں بتا سکوں گا لیکن اندازہ ہے کہ یہ دو دن کا سفر ہوگا۔ ہم پرسوں دو پہر تک اسٹیٹ کی حد سے نکل جائیں گے۔“

”اسٹیٹ کی حد سے نکلنے کے بعد ہماری پناہ گاہ کہاں ہوگی؟“

”اسٹیٹ سے باہر جو مقامی لوگ آباد ہیں، وہ حکم وغیرہ کے سخت خلاف ہیں۔ یہ زیادہ تر جاٹ اور راجپوت برادریاں ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو نیپالی علاقے سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ حکم اور چھوٹے سرکار کے گارڈز کے ساتھ اکثر ان کی جھڑپیں چلتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ہمیں فوراً پناہ دے دیں گے۔“

”کیا ہم انہیں مطمئن کر سکیں گے کہ ہم واقعی حکم کے باغی ہیں اور ہمیں پناہ دی جانی چاہیے؟“

”یہ سب کچھ ڈاکٹر چوہان کرے گا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ہے۔ شاید تمہیں چوہان کی روداد کا پورا پتا نہیں ہے۔“

”پورا کیا، مجھے تھوڑا پتا بھی نہیں ہے۔ اس نے صرف اتنا بتا رکھا ہے کہ وہ الہ آباد میں رہتا ہے۔ وہاں حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اسے بھاگ کر اسٹیٹ میں آنا پڑا اور یہاں پناہ لینا پڑی۔“

انور بولا۔ ”حقیقت میں چوہان ایک دیہاتی کاشت کار کا بیٹا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر محنت مزدوری تک ہی محدود رہتے ہیں مگر چوہان قابل نکلا۔ نہ صرف یہ گاؤں سے شہر گیا بلکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ الہ آباد میں اس کا کلینک تھا اور مریضوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ انہی مریضوں میں چوالیس پینتالیس سال کی ایک ہندو عورت بیہما بھی تھی۔ یہ بیوہ تھی اور کافی پر اپنی کی مالک تھی۔ اس کے بیٹے نا فرمان تھے اور اس کوشش میں تھے کہ ماں سے پر اپنی اپنے نام کروالیں۔ بیہما اپنے علاج کے دوران میں چوہان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی۔ یہاں تک کہ اس نے بیٹوں اور بہوؤں کے خوف سے اپنی پر اپنی کے کاغذات چوہان کے پاس رکھوا دیے۔ یہ صورت حال بیہما کے بیٹوں کو کسی طور قبول نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر چوہان کی جان کے دشمن ہوئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بیہما کی ایک بہو نے اپنی ساس پر بدچلنی کا الزام لگا دیا۔ اور کہا کہ اس کی ساس اپنا دھرم بدل کر نو جوان ڈاکٹر سے بیاہ رہ چالے گی۔ بیہما کے بیٹوں نے چوہان کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اس معاملے میں پولیس کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ چوہان کے خاندان برادری والے بھی پھر گئے۔ خدشہ پیدا ہو گیا کہ لڑائی ہو جائے گی۔ چوہان نے سمجھ داری دکھائی اور لوگوں کو خون خرابے سے بچانے کے لیے چپ چاپ اسٹیٹ میں آ گیا۔ اب یہ قریباً ڈھائی برس سے یہیں پر ہے۔“

چوہان کے بارے میں جاننے کی خواہش کافی دیر سے میرے دل میں تھی۔ آج انور خاں کے ذریعے یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ میں نے اس روداد کے حوالے سے انور خاں سے کئی سوالات پوچھے۔ جو کچھ انور کو معلوم تھا، اس نے بتایا۔ ساتھ ساتھ ہمارا سفر بھی جاری رہا۔ میں نے انور سے پوچھا۔ ”اب چوہان اسٹیٹ سے باہر جا رہا ہے اور اپنے لوگوں میں واپس پہنچ رہا ہے۔ کیا اب اس کے لیے خطرہ نہیں ہوگا؟“

”اسٹیٹ سے باہر حالات کافی بدل گئے ہیں۔“ انور خاں نے جواب دیا۔ ”بیہما کے لاپچی بیٹے ایک دوسرے سے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ ایک قتل ہو گیا ہے اور دوسرا جیل میں سڑ رہا ہے۔ ایک بہو اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے... اور یہ وہی ہے جس نے اپنی ساس پر الزام لگایا تھا۔ سارا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ بیہما نے اپنی زیادہ تر پر اپنی سچ دی ہے اور گورکھ

پور چلی گئی ہے۔“ ہم بظاہر تو باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے مگر اطراف پر ہماری گہری نظر تھی۔ ایک عجیب سی سنسنی بھی رگ و پے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اور انور خاں سب سے پیچھے تھے۔ اگر خدا نخواستہ کسی طرح کی کوئی کارروائی ہوتی تو سب سے پہلے ہم ہی نشانہ بنتے۔ عقب سے قافلے کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ہم پر ہی تھی۔

دو پہر ایک بجے کے قریب ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہمارے رکتے ہی ساتھ چلنے والے حکم کے دو ڈھائی سواہل کار بھی رک گئے۔ ہم نے کھانا وغیرہ کھایا۔ چوہان نے اپنی اور احمد کی مرہم پٹی کی۔ ہمیش کے ٹوٹے ہوئے بازو کی دیکھ بھال بھی چوہان باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہم میں سے زیادہ تر زخمی تھے۔ اگر ڈاکٹر چوہان ساتھ نہ ہوتا تو ہماری حالت کافی اتر ہوتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو ڈاکٹر چوہان اس قافلے کا اہم ترین بندہ تھا۔

ہمارا سفر گھنے جنگل کا تھا۔ کہیں کہیں راستہ زیادہ دشوار ہو جاتا تھا۔ ایسے میں تلوار بردار افراد آگے چلے جاتے تھے اور کہیں کہیں سے شاخوں کو کاٹ کر راستہ بناتے تھے۔ ایسے تلواریں ایک سرلائے کے ساتھ شاخوں سے ٹکراتیں۔ ایسے ہی سرلائے ہمارے ارد گرد بھی سنائی دیتے۔ یہ پائڈے اور اس کے ساتھی ہوتے تھے جو ہماری ہی طرح راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے۔ جنگل میں شیشم، کیکر، جنتر اور کھنار کے درختوں کی بھرمار تھی اور جنگلی جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایک دو جگہ ایسے نشان بھی نظر آئے جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تیندوے کے ہیں۔ ان نشانوں کی وجہ سے قافلے میں سنسنی کی لہر محسوس کی گئی۔

چلتے چلتے ایک جگہ ماریا کو اچانک ٹھوکر لگی۔ اس کی بائیں جانب چلنے والے شخص نے بے ساختہ اسے تھاما اور گرنے سے بچایا۔ یہ وہی پارسی تھا جو سات افراد کے ہمراہ جارج کی جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔ حالانکہ اس نے ماریا کی مدد کی تھی مگر ماریا نے اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ شاید اسے کوفت ہوئی تھی کہ ایک بچ کا لے لے اے چھو اے۔

”ہام سے دور رہو۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”معافی چاہت ہوں میم جی۔“ پارسی گڑبڑا کر رہ گیا۔

”اب اس کو ہاتھ مت لگانا۔ چاہے گر کر اس کے تھوڑے کا بھرتا بن جاوے۔“ اسحاق نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

ماریا اس رسی کی طرح تھی جو جل جاتی ہے لیکن اس کے بل نہیں جاتے۔ پچھلے چند دن میں وہ بہت خوار ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس کی اکثر فوں برقرار تھیں۔ اس کی نظروں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ غالباً نسلی تعصب بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارا سفر جاری رہا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ درختوں کی گھنی شاخوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آتی تھیں۔ کسی وقت ہلکی سی تمازت بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک جگہ عجیب سا واقعہ ہوا۔ ہمیں اپنے ارد گرد مختلف جنگلی جانوروں کی موجودگی کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کم کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ بس کسی وقت ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ ارد گرد کے درختوں پر بندر اور ان کے بچے بھی اچھلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی باریک آوازیں جنگل میں دور تک گونجتی تھیں۔ ایک بڑے چھتا درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے دفعتاً ایک جسم بندر مار یا پر آن گرا۔ بالکل جیسے بجلی سی چمک جاتی ہے۔ بس اتنا ہی دکھائی دیا کہ اس نے مار یا کے ہاتھوں سے کوئی شے چھینی ہے۔ پھر وہ جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس شاخوں پر چلا گیا۔ مار یا چلاتی ہوئی بائیں طرف ایک شخص پر گری۔ دونوں لڑھک کر ایک بارشی گڑھے میں چلے گئے۔ دو تین رائفلیں بندر کی طرف سیدھی ہوئیں مگر وہ زبردستی لگا کر شاخوں میں اوجھل ہو گیا۔ مار یا بدحواسی میں جس شخص سے کمرائی یہ وہی پاری تھا جسے اس نے سہ پہر کے وقت برا بھلا کہا تھا۔ اب پاری اوپر اور وہ اس کے نیچے تھی۔ پاری ٹپ کر اٹھا لیکن کچھ کی وجہ سے پھر پھسل کر میم صاحبہ کے اوپر جا گرا۔ اسحاق اور احمد نے اسے کھینچ کر اٹھایا، پھر مار یا کو گڑھے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ پاری ریان اور مار یا دونوں کچھ میں لت پت تھے۔

قافلہ رک گیا تھا۔ قافلے کے ساتھ ہی وہ دو ڈھائی سو افراد بھی رک گئے جن کی کمان پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے پاس تھی۔ پانڈے کے ایک ساتھی نے آگے آکر استفسار کیا کہ کیا ہوا ہے۔ انور خاں نے اسے واقعے سے آگاہ کیا۔ مار یا کے چہرے اور لباس سے کچھ وغیرہ صاف کیا گیا۔ وہ اپنے گھر میں ہوتی تو شاید اس طرح سڑے ہوئے کچھڑ میں اتھر جانے کے بعد کئی گھنٹے واش روم کے اندر ہی گزارتی لیکن یہاں اسے بس ایک بالٹی پانی ہی میسر آ سکا۔ پاری ریان کو اتنا بھی نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد جب قافلہ پھر روانہ ہوا تو ہم نے اس شریر بندر کو دوبارہ دیکھا۔ وہ ایک شاہ بلوط کی بلند شاخوں پر

بیٹھا بسکٹ کھا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ٹیکہ کا ہتھیار تھا۔ وہ مار یا سے یہی چھین کر لے گیا تھا۔ مار یا اب کچھ شرمندہ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے بھی احساس تھا کہ جس شخص کے صرف ہاتھ لگانے پر وہ برہم ہو گئی تھی، اس کے ساتھ اسے باقاعدہ بغل گیر ہونا پڑا تھا۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے میم جی اب کچھ شرمنا رہی ہے۔“
انور خاں گہری سانس لے کر بولا۔ ”ان گوری چڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ شرمندہ ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے یا غیرت شیرت جاتی ہے۔“
ہم مدھم آواز میں باتیں کرتے چلتے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے بھی انور خاں عقابی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی حیثیت نیم کے اس کپتان کی سی تھی جو ہمہ وقت فیلڈ پر گہری نظر رکھتا ہے اور ہر نقل و حرکت کو نوٹ کرتا ہے۔

رات کو درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ پر ڈیرا ڈالا گیا۔ درختوں کی شاخوں سے لالٹینیں لٹکا دی گئیں۔ دو عارضی چولہے بنائے گئے۔ راستے میں شکار کیے گئے گوشت کو بھونا گیا۔ نہایت سکین صورت حال کے باوجود اس قیام نے لطف دیا۔ جنگلی جانوروں اور کیرے کوزروں کی مداخلت سے محفوظ رہنے کے لیے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے اٹاؤ روشن کر دیے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لینا تو سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ایک دم مجھے یاروندا جی کی پھر یاد آ گیا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ بھی اتنی جلدی کھو جائے گا۔ اس خطرناک جنگل میں وہ اکیلا کس طرح ”سروائیو“ کرے گا؟ یہ سوال ایک تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست تھا۔

چند دنوں کے ساتھ میں جنگل نے مجھے بہت کچھ دیا تھا اور اس میں سب سے اہم، درد کے حوالے سے وہ فلسفہ تھا جس نے میرے دل کی گہرائی کو چھوا تھا۔ وہ درد کے ساتھ انوکھے طریقے سے نمٹتا جانتا تھا اور اس نے یہ جانکاری بڑی تفصیلی انداز میں مجھ تک پہنچائی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس معاملے میں بھی عمران نے ہی میری مدد کی ہے۔ اگر مجھے جنگل میں اپنے پچھڑے یار کی جھلک نظر نہ آتی تو میں اسے کشتی سے اٹھا کر کہاں لاتا۔ اور اگر وہ نہ آتا تو پھر... اس کی باتیں بھی وہیں کشتی میں اس کے ساتھ رہ جاتیں...

مجھے لگا کہ مجھ سے پچھڑنے کے باوجود عمران قدم قدم پر میری مدد کر رہا ہے۔ کبھی کسی ڈھنگ سے، کبھی کسی روپ میں... وہ ہمہ وقت میرے ساتھ تھا۔ اس کی معنی خیز باتیں، اس کی جاں بخش مسکراہٹ، اس کی جادوئی ہنسی... سب کچھ میرے ساتھ تھا۔ اور پھر اس کی آواز، اس کا وہ انقلاب آفریں جملہ جس نے میری ناتوانیوں و نامرادیوں کی راکھ میں سے ایک نئے انسان کو وجود دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمہ داری خود پر لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔“ اور پھر اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا تھا۔ ”جو ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور مرنا ہے تو ڈرنا کیا۔“

وہ رات خیریت سے گزری۔ ہم نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے باری باری پہرا دیا اور آرام بھی کیا۔ اگلی صبح اجالا ہونے کے ساتھ ہی ہم پھر روانہ ہو گئے۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی ہمارے ارد گرد موجود دو ڈھائی سو افراد بھی حرکت میں آ گئے۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ گرد مودان ان لوگوں میں موجود نہیں تاہم پانڈے، اسٹیل اور موہن کمار وغیرہ ساتھ ہی ہیں۔ جارج کی جیل سے رہا ہونے والے قیدیوں میں حجام عبدالرحیم بھی تھا۔ آج وہ میرے اور انور خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں زرگاں کی اس بدنام جیل کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ”میں حکم کے ایک سپاہی کو استر مارنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ میرے استرے سے وہ بری طرح گھائل ہوا تھا۔ وہ میرے پاس ایک مسلمان بوڑھے کو لایا تھا۔ اس بوڑھے پر حکم کا کوئی افسر ناراض تھا۔ سپاہی نے مجھ سے کہا کہ میں بوڑھے کی داڑھی اور سر کے بال موٹہ دوں۔ میں نے انکار کیا۔ وہ سخت غصے میں آ گیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کی گردن پر استر مارا اور بھاگ گیا۔ دو دن بعد مجھے مل پانی کے راستے میں پکڑ لیا گیا۔“

”کب سے جیل میں ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”تین سال سے اوپر ہو گئے تھے جی۔ مگر ایسے گت ہے کہ تین صدیاں بیت گئی ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ پھانسی ہی دے دیتے۔ وہاں جیل میں بڑی کڑی مشقت لی جاوت ہے۔ بات بے بات ذلیل کیا جاوت ہے۔ جارج صاحب کے ہر کارے مار مار کر ادھیڑ دیوت ہیں... یہ ہر کارے قیدی عورتوں پر بھی ہر طرح کا ظلم ڈھاوت ہیں۔ وہاں کوئی کسی کی فریاد سننے والا نہیں۔“ عبدالرحیم نے اپنی قمیص اٹھا کر پشت دکھائی۔ یہاں ہنٹر کی مار کے انمٹ نشان موجود تھے۔ جس

طرح گھوڑوں کی پیٹھ کو داغا جاتا ہے اسی طرح عبدالرحیم کی پیٹھ کو بھی داغا گیا تھا... یہ عبدالرحیم کا نمبر تھا... R88۔
عبدالرحیم، جارج کی جیل کے لرزہ خیز واقعات سناتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ اس جیل کے قیدیوں کی زندگی و موت کلی طور پر جارج اور اس کے اہل کاروں کے ہاتھ میں تھی۔ اگر زرگاں میں کہیں قانون کا تھوڑا بہت گزر رہا ہے... تو اس جیل میں نہیں۔

سہ پہر تک جس رہا لیکن پھر ایک دم بادل گھر کر آ گئے۔ شمالی افق پر ایک کالی سیاہ گھٹا نظر آئی۔ آسمان سے ظاہر تھا کہ زبردست بارش شروع ہونے والی ہے۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانی چوکی نظر آ رہی تھی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں ہمیں جنگل میں کئی جگہ ملی تھیں۔ یہ دو تین کمروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ان کی دیواریں موٹی اور کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ان چوکیوں کی چھتیں لکڑی کی تھیں۔ وزنی شہتیر اور بالے وغیرہ کی۔ شہر میں اتنی مہنگی چھتیں ڈالنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ جنگل تھا، یہاں لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو دیواریں بھی اسی قیمتی لکڑی کی بنا سکتے تھے۔ ان چوکیوں میں بے اکثر کی چھتیں گر چکی تھیں اور اندر خود رو گھاس اگی ہوئی تھی، تاہم دو چار چوکیاں سلامت بھی نظر آتی تھیں۔

انور خاں نے بتایا تھا کہ دس پندرہ سال پہلے تک بھائیل اسٹیٹ کی حد ان چوکیوں تک ہی تھی لیکن بعد میں اسٹیٹ کی حد بڑھالی گئی اور نئے بارڈر پر نئی چوکیاں بنائی گئیں۔ یہ پرانی چوکیاں بے کار ہو گئیں یا ان کو گودام وغیرہ کی شکل دے دی گئی۔

ہمیں کچھ فاصلے پر ایسی ہی ایک بوسیدہ چوکی نظر آ رہی تھی۔ انور خاں رک گیا۔ اس نے ساتھیوں کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”ابھی پڑاؤ کا وقت تو نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ موسم خراب ہونے والا ہے۔ اگر ہمیں کھلے میں بارش نے گھیر لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ پانڈے اور اس کے ہر کاروں کے پاس تو چھولداریاں وغیرہ ہیں، ہم کیا کریں گے؟“

چوہان نے بھی افق پر پھیلتی ہوئی تاریکی کو دیکھا اور بولا۔ ”اس چوکی کو اندر سے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ رات گزارنے کے قابل ہے تو یہاں رک جاتے ہیں۔“
دیگر ساتھیوں نے بھی تائید کی۔ ہم نے چوکی کا اندر سے جائزہ لیا، چھتیں سلامت تھیں۔ جھاڑ جھنکار موجود تھا لیکن اسے معمولی کوشش سے صاف کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے رکنے کا

... ہمارا یہ فیصلہ درست ہی ثابت ہوا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر بارش شروع ہو گئی۔ سہ پہر چار بجے کا وقت تھا لیکن اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکنے لگی اور بادل دھاڑنے لگے۔ ہمارے ساتھ اسٹیکل... پاٹھرے اور ان کے ساتھیوں کو بھی رکنا پڑا تھا۔ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے انہوں نے بڑی تیزی سے چھو لدا ریاں اور خیمے وغیرہ لگائے تھے۔

جنگل کی بارش کا آہنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ گرد و پیش ایک تاریک دھند لکے میں چھپ جاتے ہیں اور آواز سے لگتا ہے کہ کہیں ایک بہت بڑا آبشار گر رہا ہے۔ چوکی کی چھت کہیں کہیں سے ٹپک رہی تھی، وہاں برتن رکھ دیے گئے تھے۔ حتیٰ زمین کیلی نہ ہو۔ کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دی گئیں۔ حتیٰ ایک دم ہی بڑھ گئی تھی۔ چوکی کے اندر سے ہی کاٹھ کباڑ جمع کر کے آگ روشن کر لی گئی۔ جانوروں کو چھت مہیا نہیں کی جا سکتی تھی لہذا ان پر سے سامان اتار لیا گیا۔ پاٹھرے اور اس کے دو ڈھائی سو اہل کاروں نے چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

چوہان نے دونوں فخروں اور گھوڑے پر سے سامان اتر وایا۔ اس کی آواز آئی۔ ”انور خاں! صرف دو لالٹینیں ہیں۔ باقی دو لگتا ہے کہ راستے میں کہیں گر گئی ہیں۔“

”چلو جو ہیں انہیں تو روشن کراؤ۔“ انور خاں نے کہا۔

”ان میں سے بھی ایک میں بس تھوڑا سا تیل ہے۔ ایک دو گھنٹے ہی جلے گی۔“

”تاریخ وغیرہ سے کام چلا لیں گے۔“ انور نے تسلی دی۔

ماریا تھک کر چور ہو گئی تھی... اور سونا چاہتی تھی۔ چوہان نے اس کے زخمی ہاتھ کی پٹی بدلی اور ایک چھوٹے کمرے میں اس کے لیے چٹائی بچھا دی۔ حسب معمول اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر تالا لگا دیا گیا۔ مزید احتیاط کے طور پر کمرے کو بھی باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ چوکی میں داخل ہونے کا واحد راستہ سامنے کی طرف سے تھا۔ برآمدے میں چوکر ستونوں کی اوٹ میں دو راقفل برداروں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ ستونوں کے اندر باقاعدہ سوراخ تھے جن میں راقفل کو ”پوزیشن“ کیا جا سکتا تھا اور اگر دنگاہ بھی رکھی جا سکتی تھی۔ ایک مورچا انور نے اور دوسرا اسحاق نے سنبھال لیا۔ اپنے سفر کے اس آخری مرحلے میں ہم کسی طرح کی کوتاہی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بارش مسلسل جاری تھی۔ چوکی کے سامنے ایک چھوٹی

سی آبی گزرگاہ بن گئی تھی جس میں تیز رفتار پانی بہہ رہا تھا۔ میرے اندر کی کیفیت پھر عجیب ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جینگی ہو، نیڈ بیگ ہو اور رات کا وہ آخری پہر ہو۔ میں جینگی کی ہدایت کے مطابق نیڈ بیگ پر ننگے ہاتھوں سے حملہ کروں اور اس وقت تک ٹکے برساتا رہوں جب تک میرے ہاتھوں کی کھال چھل نہ جائے اور خون میری کہنیوں تک نہ پہنچنے لگے۔ پتا نہیں کیوں اب دھیرے دھیرے جسمانی چوٹیں مجھے تکلیف کے ساتھ ساتھ مزہ بھی دینے لگی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد تھکاوٹ نے اثر دکھایا اور جلد ہی سب سو گئے۔ صرف وہ جاگتے رہے جنہیں شروع رات میں ڈیوٹی دینی تھی۔ یعنی انور خاں اور اسحاق۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک لالٹین بجھ چکی تھی۔ صرف ایک لالٹین کی مدد میں روشنی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں نے کسی کو اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ ”کون؟“ میں نے پوچھا۔

پاری ریان کی مدد آواز آئی۔ ”میں ہوں۔ پیشاب کرنے جاؤ ہوں۔“

میں نے پھر سر تکیے سے نکا دیا... اور سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلنے کی وجہ، پاؤں میں اٹھنے والی تھکن تھی۔ شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹا تھا۔ میں نے اٹھ کر پاؤں کو جھاڑا اور پھر لیٹ گیا۔ تب مجھے دوبارہ ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔

”کون؟“ میں نے پھر استفسار کیا۔

یہ پاری ریان ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گرم چادر لینے گیا تھا۔

بارش کے ساتھ اب تیز ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ بانی کی بو جھاڑیں کھڑکیوں کے چوٹی تختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ موسم نے ایک دم کروٹ لے لی ہے اور ٹھنڈ شروع ہو گئی ہے۔ میں نے قریب لیٹے ڈاکٹر چوہان سے وقت پوچھا اور پھر سو گیا۔ ابھی ہماری ڈیوٹی شروع ہونے میں قریب دو گھنٹے باقی تھے۔

پتا نہیں کہ اس بار میں کتنی دیر سویا رہا۔ یکا یک مجھے لگا کہ چھت ایک دھماکے سے مجھ پر آن گری ہے اور ہر طرف قیامت برپا ہو گئی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چھت تو اپنی جگہ موجود تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ میں نے چوہان، احمد، اور ہمیش کو چلاتے ہوئے سنا۔ وہ بدحواسی میں برآمدے کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں راقفل تھیں۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ ایک سیکنڈ کے لیے تاریک جنگل روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔

برستی بارش میں میری نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی، وہ ماریا تھی۔ وہ اندھا دھند چھو لدا ریاں کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف شرٹ اور انڈر ویئر تھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ میں نے یہ سارا منظر ایک سلاخ دار کٹر کی میں سے دیکھا۔

ایک سیکنڈ بعد سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا مگر تب تک میں اپنی انگلی راقفل کے ٹریگر تک پہنچا چکا تھا۔ میں نے ماریا کے رخ پر کیے بعد دیگرے چار فائر کیے۔ ان میں سے کم از کم ایک گولی ضرور ماریا کو لگی۔ چالیس پچاس فٹ کی دوری سے مجھے اس کے چلانے کی آواز آئی۔ چوکی کے دروازے کی طرف بھی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ سارا جنگل دھماکوں اور للکاروں سے گونج رہا تھا۔ احمد پکار رہا تھا۔ ”انور بھائی! میں چھت پر جا رہا ہوں۔“

انور خاں نے اسحاق کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ”اسحاق! کھڑکی کے پاس۔“

اسی دوران میں بجلی نے چمک کر پھر نشیب و فراز کو روشن کیا۔ مجھے ماریا کی فقط ایک جھلک نظر آئی۔ اسے کسی نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ تناور درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ میں نے راقفل کو کھڑکی میں رکھ کر پھر دو تین فائر کیے۔ ایک برسٹ سلاخ دار کھڑکی کے بالکل پاس دیوار سے ٹکرایا۔ چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ مجھے ایک دم نیچے جھٹکنا پڑا۔

صورت حال بڑی نازک ہو گئی تھی۔ وہ کام ہو گیا تھا جسے بدترین کہا جا سکتا تھا۔ ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کیسے نکلی تھی؟ کس وجہ سے نکلی تھی؟ یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ فی الحال تو ہم مسخ افراد کے گھرے میں تھے اور اگلے چند منٹ میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں جھک کر چلتا ہوا دوسری کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں انور خاں کی ہدایت کے مطابق اسحاق موجود تھا اور مسلسل فائر کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح مورچا بند ہو کر کسی لڑائی میں حصہ لے رہا تھا... ٹریگر پر انگلی کو حرکت دینا، راقفل کے جھٹکے کو برداشت کرنا، مخالف سمت سے آنے والی گولی کے خطرے کو محسوس کرنا... یہ سب کچھ میرے لیے نیا تھا۔

قریباً سات آٹھ منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ پھر ایک دم یہ سلسلہ ٹھہر گیا۔ غالباً ہمارے مخالفین کوئی حکمت عملی سوچ رہے تھے۔ وہ ہمیں مارنے یا زندہ پکڑنے کی بہترین پوزیشن میں تھے اور... غالباً... انہیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔

شاید وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کس طرح کم سے کم جانی نقصان کرا کے ہمیں بے بس کر سکتے ہیں۔ اس صورت حال میں ہمیں بس ایک معمولی سا فائدہ حاصل تھا اور وہ یہ کہ ہمارے مخالفین کھلی جگہ پر تھے جبکہ ہم اس چوکی میں مورچا بند تھے لیکن یہ مورچا بندی ایک طرح سے نقصان دہ بھی تھی۔ یہ عمارت ہمارے لیے چوہے دان بن سکتی تھی۔ اگر یہ دو ڈھائی سو افراد ہم تیرہ چودہ بندوں کو مارنے پر ہی قتل جاتے تو پھر وہ اس چوکی کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتے تھے۔

”یہ ہوا کیسے؟“ میں نے لرزتی آواز میں اسحاق سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ... اس حرامی کتے کی وجہ سے۔“ اسحاق نے کہا اور بڑی تاریک کاروشن دائرہ سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینکا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ کھڑکی سے تیس چالیس فٹ کی دوری پر ایک لاش اونڈھی پڑی نظر آئی۔ یقیناً یہ پاری ریان کی لاش تھی۔ میں نے اسے اس کے کپڑوں سے پہچانا۔

”یہ کیا ہوا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”یہ اس حرامزادی کے ساتھ ہی بھاگ رہا تھا۔ انور بھائی نے اسے گولی ماری ہے۔“

”لیکن... لیکن وہ تو دوسری طرف بھاگی ہے...؟“

”ہاں، یہ اس طرف آیا تھا... وہ چھو لدا ریاں کی طرف گئی تھی۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا یار... وہ تو تالے میں تھی۔ اس کے پاؤں میں بھی زنجیر تھی...؟“

”تالے کھولنے والا یہ کتا بھی تو ہمارے ساتھ ہی تھا۔“ اسحاق نے نفرت سے کہا اور تاریخ کی روشنی ایک بار پھر ریان کی لاش کی طرف پھینکی۔

میرا جسم سنسن کر رہ گیا۔ جب یہ ساتوں قیدی جارج کی جیل سے رہا ہو کر سرنگ میں آئے تھے تو انور خاں نے ان سب کا تعارف کرایا تھا۔ پاری ریان کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک ماہر قتل ساز ہے۔ اب صورت حال کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ سانحہ اس پاری ریان کی وجہ سے ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات میں نے دوبار اس کی مشکوک نقل و حرکت بھی دیکھی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ریان نے ایسا کیا کیوں؟

میں نے یہی بات اسحاق سے پوچھی تو وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ ”ابھی ٹھیک سے تو پتا نہیں... لیکن لگت ہے کہ اس کو روٹی گوشت کی خماری چڑھی ہے۔“

”روٹی گوشت کی خمار؟“

”ہاں، تین سال سے کجرجیل میں پڑا ہوا تھا۔ اب پیٹ بھر کر کھانا ملا۔ عورت دیکھی تو حرامی کے اندر کا جنگلی سور جاگ پڑا۔“

میں شپٹا کر رہ گیا۔ اب بات پوری طرح میری سمجھ میں آرہی تھی۔ اگلے دو چار منٹ میں سب کچھ کھل گیا کہ کیا ہوا ہے۔

اسحاق کے کہنے پر میں اس چھوٹے کمرے کی طرف گیا جہاں ماریا کو حفاظت کی غرض سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، کمرے کے دروازے کا آہنی قفل کھلا ہوا تھا۔ اندر وہ زنجیر بھی کھلی پڑی تھی جو رات کے وقت ماریا کے پاؤں میں ڈالی جاتی تھی۔ زنجیر کے چھوٹے لاک کو بھی ایک آہنی تار کے ذریعے کھولا گیا تھا۔ چٹائی پر ماریا کی نیلی جینز پڑی تھی اور بالائی جسم کا زیر جامہ پڑا تھا۔ کمرے کا یہ نقشہ وہ ساری کہانی سنار ہا تھا جو یہاں گہری تاریکی میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اسی دوران میں انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے موقع کا جائزہ لیا اور یقیناً اسے بھی وہ سب کچھ سمجھ میں آ گیا جو مجھے آیا تھا۔ اس نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کو کھٹو کر ماریا اور ریان کو غائبانہ صلواتیں سنائیں۔ میں نے انور خاں کو بتایا کہ رات پہلے پہر کس طرح ریان پیشاب کرنے اور چادر لینے کے بہانے حرکت کرتا نظر آیا تھا۔

انور خاں بولا۔ ”خبیث نے سب کچھ پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل شام جو دو لائٹنیں گم ہوئی تھیں، وہ بھی اسی نے نہیں گرائی ہوں گی۔ یا آس پاس کہیں چھپا دی ہوں گی۔“

یقیناً یہاں جو کچھ ہوا تھا، ماریا اور ریان کی باہمی انڈر اسٹینڈنگ سے ہوا تھا۔ انور خاں نے پرسوں جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کہا تھا۔۔۔ ان گوری چڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے۔۔۔

تو کیا یہاں بھی اسی انتہا درجے کی ”بے شرمی“ نے کام دکھایا تھا؟ آزادی حاصل کرنے کے لیے ماریا نے اپنا آپ اس شخص کے حوالے کر دیا تھا جس کے ساتھ چھو جانا بھی اسے کل تک گوارا نہیں تھا۔ یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔ پارسی ریان نے یہاں سے نکلنے میں ماریا فرگوں کی مدد کی تھی، تاہم اس

مدد کی بھرپور قیمت بھی وصول کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے اس وقت تک ماریا کے پاؤں ہی نہ کھولے ہوں جب تک اپنا مطلب پورا نہ کر لیا ہو۔ وہ ماسٹر قفل ساز قفل شکن تھا اور اس نے جو دو ”آخری قفل“ کھولے تھے، انہوں نے اس پر مسرت کا دروا کیا تھا اور موت کا بھی۔

انور خاں کے ایک کان سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی پوری سائڈ نیلی ہو رہی تھی۔ ”یہ کیا ہوا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جس وقت ماریا یہاں سے بھاگی، اس کے ہاتھ میں پختہ اینٹ تھی۔ اسحاق سو گیا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا لیکن میری ساری توجہ بھی باہر کی طرف تھی۔ یہ گمان ہی نہیں تھا کہ اندر سے بھی کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔“ انور نے کان کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

یہی وقت تھا جب اوپر تلے دو فار ہوئے اور پھر ایک برسٹ چلا۔ قریبی سیزھیوں سے کوئی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور عین انور خاں کے قدموں میں گرا۔ یہ احمد تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے چھت پر پوزیشن سنبھالی تھی۔ اس کا کندھا خون سے سرخ نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس پر پانچ دن پہلے دو طرفہ فائرنگ میں اسے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔

میں نے احمد کو سنبھالا، انور خاں دوڑتا ہوا اپنی پوزیشن پر واپس پہنچ گیا اور جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ایک بار پھر اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونج رہے تھے، ہر طرف شعلوں کا رقص تھا۔ میں، چوہان اور اسحاق بھی پوری توانائی سے اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ مخالف فریق کا پلاز ا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری ایک گولی کے جواب میں درجنوں گولیاں آرہی تھیں۔

انور خاں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ورنہ مارے جائیں گے۔“

”لیکن انہوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔“ چوہان کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گھیرا توڑ کر نکلنا ہوگا۔ ورنہ کچھ نہیں ہو سکے گا۔“ انور خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”ہاں، تخت یا تختہ۔۔۔ اگر کچھ ناہیں کریں گے تو بے موت مارے جا دیں گے۔“ اسحاق نے اپنی رائفل سے ایک طویل برسٹ چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دھیان سے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اسحاق کے قدموں میں ایک بندے کی لاش پڑی تھی۔ یہ ان ساتوں

افراد میں سے ایک تھا جو جیل سے رہا ہوئے تھے۔ یقیناً اسے دو طرفہ فائرنگ میں گولی لگی تھی۔ یہ واقعی نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماریا کو اپنے ہاتھ سے کھونے کے بعد ہم ایک دم موت کے منہ میں آ گئے تھے۔ یہاں رہتے تو موت بھی، باہر نکلے تو بھی موت بھی۔ بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔

تو کیا آخری وقت آ گیا ہے؟ میں نے بے حد درد سے سوچا۔ اس بارشی رات، میں اس گھنے جنگل کے کسی نامعلوم جھے میں۔۔۔ ان تباہ توڑ برستی گولیوں کے درمیان میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے؟ کیا کبھی میرے پیاروں کو معلوم ہو سکے گا کہ میں کہاں اور کس حالت میں موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا؟ کیا کبھی کوئی میرے آخری لمحوں کے بارے میں جان سکے گا؟ چند لمحوں کے لیے۔۔۔ صرف چند لمحوں کے لیے میرے اندر مایوسی اور ناتوانی ابھری لیکن پھر فوراً ہی عمران کا تصور اندھیرے سے برآمد ہوا اور مسکراتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی شبیہ ان لمحوں میں بالکل واضح اور روشن تھی۔ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی دلکش ہڈیاں، اس کی ٹھوڑی کا گڑھا، اس کے چمکتے ہوئے ہموار دانت۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مخمور لہجے میں بولا۔ ”آنکھیں بزر کر کے کود جاؤ جگر۔۔۔ زیادہ سے زیادہ موت ہی ملے گی نا۔ اور موت تو ہماری محبوبہ ہے۔ وہ ہمارے آگے آگے بھاگتی ہے۔ ہم نے اس کے پیچھے بھاگنا سیکھ لیا ہے۔“

میرے رگ و پے میں نئی توانائی سی بھر گئی۔ میں نے وہ سارے لمحے یاد کیے جن میں، میں نے دل کی گہرائی سے خودکشی کا سوچا تھا۔۔۔ یہاں جو کچھ بھی ہونے والا تھا، خودکشی سے تو بہتر ہی تھا۔

انور خاں اپنے ساتھیوں کو آخری ہدایات دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف آمیز دلیری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہا ہے، اس میں زندگی کے امکانات بہت کم ہیں۔ لیکن اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسحاق نے ایک جھٹکے سے دتی بموں والا وہ تھیلا اکھول دیا جو اب تک ہمارے سامان کا حصہ رہا تھا۔ انور خاں نے دودھتی بم اپنی واسٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیے، ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دیگر ساتھیوں نے بھی ایک ایک، دو دو بم لیے لیے۔ یہ عام دتی بموں کی طرح گول بم نہیں تھے، ان کی شکل لمبوتری تھی۔ یہ پرانی طرز کے لیکن بڑے طاقتور بم تھے۔ ان کی شکل ”آکس کریم کون“ سے ملتی جلتی تھی۔ انور خاں نے بتایا تھا کہ انہیں ”اسٹک بم“ کہا جاتا ہے۔۔۔ چند روز پہلے انور خاں مجھے

یہ بم استعمال کرنے کا طریقہ تفصیل سے بتا چکا تھا۔ لیکن اس حوالے سے میری عملی مشق صفر تھی۔ بہر طور ایک دتی بم میں نے بھی لے لیا۔

انور خاں نے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے تم سب کے سامنے ہے۔ ہم بری طرح گھر چکے ہیں، جتنی دیر کریں گے اتنا ہی مزید پھنستے جائیں گے۔ ہم خود کو بچانے کی آخری کوشش کرتے ہیں۔ ہم چوکی کے عقبی دروازے کو ایک دم کھول کر نکلیں گے۔ میں سب سے آگے رہوں گا۔ ہم پوری رفتار سے دوڑیں گے اور گھنے درختوں میں روپوش ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے پاس بوگیر کتے نہیں ہیں۔“

اسحاق بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دو بجے سے پھنچ جاویں۔ کوئی ایسی جگہ ٹھہراؤ، جہاں ہم اکٹھے ہو سکیں۔“

”میرے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں۔“ انور نے فوراً جواب دیا۔ ”جو ساتھیوں سے علیحدہ ہو جائے، وہ اپنے طور پر جان بچانے کی کوشش کرے۔“

ابھی انور خاں کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ گولیوں کی ایک بار آئی اور فرش پر رکھے ہوئے کھانے پینے کے برتن بھنے ہوئے چنوں کی طرح اچھل اچھل کر چاروں طرف بکھر گئے۔۔۔ ہمارا گھوڑا اندھا دھند بھاگتا ہوا برآمدے میں گھسا۔ پورے زور سے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر گر کر تڑپنے لگا۔ اسے گولی لگ چکی تھی۔

”لگت ہے کہ وہ لوگمن قریب آرہے ہیں۔“ ہمیش نے کہا۔

انور خاں نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر اسنا پیر گن سے دو فار کیے اور بولا۔ ”اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ ہم سب جھک کر دوڑتے ہوئے چوکی کے عقبی حصے میں پہنچے۔ یہاں ایک چھپر سا تھا جسے گولیوں کی بوچھاڑ سے آگ لگ گئی تھی۔ بارش کے سبب یہ آگ زیادہ پھیل نہیں پائی تھی۔ ہم عقبی دروازے کے ساتھ لگ گئے۔ انور خاں سب سے آگے تھا۔ موت کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کا سینہ تانا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں اسحاق تھا۔ پھر چوہان، پھر زخمی احمد پھر میں اور آخر میں ہمیش۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے فقط چار ہمارے ساتھ آ سکے تھے۔ وہ چاروں ہماری قطار کے دائیں جانب تھے۔ یہ سائڈ قدرے محفوظ تھی۔ عبدالرحیم بھی ان چاروں میں شامل تھا۔

”بس دوڑنا ہے۔ رکنے کا مطلب موت کے سوا اور

Scanned and Uploaded by papeer and paper

کچھ نہیں۔“ انور نے آخری ہدایت دی اور دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا۔
خولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ خصوصاً سامنے والے حصے کی طرف فائرنگ کا زیادہ زور تھا۔ ہم نے الوداعی نظروں سے ایک دو بجے کو دیکھا۔ انور خاں نے اپنے ہاتھ والے دتی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر نکالی اور ٹانگ مار کر دروازہ کھول دیا۔
”بھاگو۔“ انور خاں کی آخری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ہم اندھا دھند نکلے۔ بارش کی بو چھاڑیں اور درختوں کی شاخیں ہمارے چہروں سے ٹکرائیں۔ ہم نے اپنی رانگلوں کے منہ کھول دیے اور جھک کر بھاگتے چلے گئے۔ سب سے پہلے انور خاں کے پھینکے ہوئے دتی بم کا دھماکا ہی سنائی دیا تھا۔ چکا چوندا پیدا کرنے والے اس زوردار دھماکے نے ہر طرف غنسنی کی لہر دوڑادی۔ پھر کئی اور دھماکے ہوئے۔ ہم ان دھماکوں کا نتیجہ دیکھنے کے لیے رکے نہیں، بس شاخوں سے ٹکراتے دوڑتے چلے گئے۔ احمد میرے آگے دوڑ رہا تھا۔ بائیں جانب سے ایک برسٹ آیا۔ جو اسے چھلنی کر گیا۔ وہ اچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا اور ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے مڑ کر دیکھا بھی جا سکتا۔ اس برستی موت کا دوسرا شکار ہمیشہ تھا۔ وہ میرے عین پیچھے تھا۔ مجھے تو یہی لگا کہ اس نے میری طرف آنے والی موت اپنے جسم پر روکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب گولی جسم سے ٹکرائی ہے اور گوشت میں گھس رہی ہے تو اس سے ایک خاص آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس رات پہلی بار میں نے اپنے عین عقب میں یہ آواز سنی۔ یہ ہمیشہ کے جسم سے پھٹا ہوا سیسہ ٹکرانے کی آواز تھی۔ ایک کراہ کے ساتھ وہ اوندھے منہ گرا۔ غالباً گرنے سے پہلے وہ اپنے دتی بم کی سیفی پن ہٹا چکا تھا۔ اس کے گرنے کے تین چار سیکنڈ بعد ہی عین اس جگہ پر سماعت ممکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے سے پیدا ہونے والا ایئر پریشر مجھے اپنے پورے جسم پر محسوس ہوا تھا۔ میری خوش بختی کہ بم کا کوئی ٹکڑا مجھے نہیں لگا اور میں بالکل محفوظ رہا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزریں۔ ایک جگہ میں اوندھے منہ گرا۔ ایک جگہ بری طرح ایک درخت سے ٹکرایا۔ لیکن رکنا نہیں، بھاگتا چلا گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے ٹریل ٹور انفل پر جمار کھے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ہی میں نے رائفل سے دوسرا میگنیزین انیج کر لیا اور اطراف میں فائر کرتا رہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس دتی بم

بھی تھا لیکن بھاگ دوڑ میں وہ دتی بم نہیں لگ گیا تھا۔ کہاں گرا تھا، یہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔
بھاگتے ہوئے مجھے اپنے سامنے صرف چوہان نظر آ رہا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ چوہان اور انور خاں کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا۔
فائرنگ کا زور اب ہماری بائیں جانب قریباً دو سو میٹر کی دوری پر تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہم موت کی زد سے اگر نکلے نہیں۔ تو کم از کم دور ضرور چلے گئے ہیں۔
”گھانٹی کے ساتھ ساتھ بھاگو۔“ انور خاں نے پکار کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا۔
اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس کی یہ واقفیت ہمیں ایک یقینی موت کے چنگل سے نکال سکتی ہے۔
”تم ٹھیک ہوتا بش!“ چوہان نے بھاگتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں۔“ میں نے بھی ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
”اور ہمیشہ؟“
میں چپ رہا۔ چوہان سمجھ گیا کہ میرا جواب کیا ہے۔
پھر مجھے عبدالرحیم اور اس کا ایک ساتھی نظر آیا۔ وہ دونوں دائیں طرف تھے اور ہمارے متوازی ہی بھاگ رہے تھے۔
ہم قریباً بیس منٹ تک انور خاں کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ہماری ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں لیکن زندہ رہنے کی فطری خواہش ہمیں بھگائے چلی جا رہی تھی۔ یہ گھنا جھگڑا، تاریکی تھی اور ہلکی بارش بھی۔ اس لیے ہماری یہ میراتھن دوڑ عجیب طرح کی تھی۔ درختوں سے ٹکرانا، پھسل کر گرنا اور گر کر اٹھنا۔ یہ سب کچھ ہماری دوڑ میں شامل تھا۔ ایک بڑی ٹارچ ہمارے پاس موجود تھی لیکن ہم اسے روشن نہیں کر سکتے تھے۔
قریباً بیس منٹ بعد ہم نے ایک آبی گزرگاہ کو پار کیا۔ پانی ہمارے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ ہم نے اپنی گولیوں والی بیلٹس گردنوں سے لپیٹ لیں اور رائفلیں سروں سے بلند کر لیں۔
آبی گزرگاہ کو پار کرتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ اسحاق بھی زخمی حالت میں ہمارے ساتھ ہے۔ چوکی سے نکلے وقت ہم کل دس افراد تھے۔ لیکن اب صرف چھ نظر آ رہے تھے۔ چار مزید ساتھی گھیرا توڑنے کی کوشش میں قلمہ اجل بن گئے تھے۔ ان میں سے احمد۔ ہمیشہ اور عبدالرحیم کے ایک ساتھی کی موت تو یقینی تھی۔ عبدالرحیم کا ایک ساتھی بری طرح گھائل ہو کر گرا تھا

اور شاید اسی حالت میں پکڑا گیا تھا۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک کی لاش تو ہم نے خود چوکی میں دیکھی تھی، دوسرے کے بارے میں بھی غالب امکان یہی تھا کہ وہ چوکی میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کا شکار ہوا۔
آبی گزرگاہ کو پار کرنے کے بعد ہم نے قدرے ”ریلیف“ محسوس کیا۔ ہم اس قدر رہا پ گئے تھے کہ چند منٹ کے لیے سستانا ضروری ہو گیا تھا۔ ہم ایک جگہ، گیلی زمین پر درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ”ہمیشہ کا کیا بنا؟“ اسحاق نے پوچھا۔
”اسے گولی لگ گئی تھی۔“ میں نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔
عبدالرحیم روتے ہوئے بولا۔ ”آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اور ہم لوگوں نے آپ کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ سب کچھ اس بد بخت ریان کی وجہ سے ہوا۔ کاش! ہم اسے اپنے ہاتھ سے مار دیتے۔“
انور اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ ”جو ہو چکا اس کا ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب اپنا سارا دھیان یہاں سے نکلنے کی طرف لگاؤ۔ ہم خطرے سے باہر نہیں۔ وہ لوگ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔“
ہم ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور گرتے پڑتے آگے بڑھنے لگے۔ اپنے پیچھے جانے والے ساتھیوں کا غم تازہ تازہ تھا اور دل میں ٹیسس ابھار رہا تھا۔ جیسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ صرف بیس تیس منٹ پہلے ہمارے ساتھ چوکی سے نکلنے والے لوگ اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ کل رات تک ہم چوکی میں ماریا کے علاوہ کل تیرہ افراد تھے۔ اب صرف چھ بچے تھے۔
ہم صبح سات آٹھ بجے تک مسلسل چلتے رہے۔ آخر تھک کر چور ہو گئے۔ یوں لگا کہ اب چند قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں ہے۔ خاص طور سے زخمی چوہان سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی رائفل انور خاں نے اور گولیوں والا تھیلا میں نے اٹھا رکھا تھا۔ نہایت گھنے اور لمبے سرکنڈوں کے درمیان یہ عارضی طور پر چھپنے کے لیے ایک مناسب جگہ تھی۔ حشرات الارض بشمول سانپوں وغیرہ کا ڈر تو تھا مگر جو حالات ہمارا تعاقب کر رہے تھے، وہ ان سے زیادہ خطرناک تھے۔
یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ ایک طرف ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا جس پر کالی جھب ہوئی تھی۔ جوں جوں دھوپ تیز ہوتی گئی، اس جوہڑ سے اٹھنے والی بوباس بڑھتی

گئی۔ جونکیں... کیچوے... کیڑے مکوڑے بہت کچھ پودوں میں رنگ رہا تھا اور ہمارے جسموں پر بھی۔ دوپہر تک ہمیں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جمل دیئے ہیں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ارد گرد دور تک کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔
اسحاق نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”یوں لگتا ہے کہ وہ لوگوں پانی کی دوجی طرف رہ گئے ہیں... ناہیں تو اب تلک کوئی پھل ضرور نظر آتی۔“
چوہان بولا۔ ”شاید انور بھائی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ان لوگوں کے پاس بویو گیر کتے نہیں ہیں اور یہ بات ہمارے حق میں جانی ہے۔“
”پھر بھی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا... اگلے ایک دو گھنٹے میں ہی کچھ اندازہ ہو سکے گا۔“ انور خاں نے کہا۔
وقت گزرتا رہا اور شام تک ہم خود کو کافی مطمئن محسوس کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی یہ اطمینان ایک بار پھر تشویش میں ڈھل گیا۔ ہمیں کچھ فاصلے سے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس فائر سے ہم ازم اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ ہمارے آس پاس کوئی موجود ہے۔ ”وہ لوگوں اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے ناہیں۔“ اسحاق نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور اپنی رائفل کے ساتھ نیا میگنیزین انیج کرنے میں مصروف ہو گیا۔
چوہان نے بھی اپنی رائفل انور خاں سے لے لی اور ٹیلی اسکوپ گلے میں لٹکالی۔ چند گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک بار پھر تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے تاریکی میں بدل گئے اور سرکنڈوں میں لاتعداد جھینگروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مجھے دیر سے پیشاب کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے بعد میں جوہڑ کے کنارے کی طرف گیا۔ اچانک مدھم آوازیوں نے میرے قدم پکڑ لیے۔ یہ اسحاق کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ڈاکٹر چوہان تھا۔ اسحاق کہہ رہا تھا۔ ”... یہ بات ناہیں کہ اس کے ساتھ ہمدردی ناہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھی ہے... لیکن اس کا ساتھ ہمارے لیے مصیبت کھڑی کرے گا... اور بہت بڑی مصیبت کھڑی کرے گا...“ آخری الفاظ کہتے کہتے اسحاق کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔
”آہستہ بولو۔“ چوہان نے اسے تنبیہ کی۔
اسحاق نے اپنی آواز تھوڑی سی مدھم کر لی لیکن لہجہ ویسا ہی تشویشناک رہا۔ ”چوہان بھائی! میں تم سے اس بحث میں ناہیں پڑنا کہ تابش پر کوئی جادو ٹونے کا معاملہ ہے یا اس کے

شریر (جسم) میں کوئی جزوہ وغیرہ لگایا گیا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، ہمارے لیے ہے خطرناک۔ یہ جہاں بھی جائے گا، وہ لوگوں اس کا پیچھا کریں گے۔ اور اس کے ساتھ... ہم بھی..." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تو کیا تم دشواس سے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں ہوگا تو ہم بچ جائیں گے؟" چوہان کی سرگوشی ابھری۔ "چلو ناہیں نہیں گے... لیکن کچھ ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع تو ملے گا نا۔"

میں بغیر آواز پیدا کیے آگے بڑھ گیا اور جو ہڑکی طرف چلا گیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔

بے شک اسحاق جذباتی اور شعلہ مزاج تھا... لیکن جو بات وہ کئی دن سے مسلسل کہہ رہا تھا، وہ ٹھیک تھی... اور یقیناً بات اسحاق کے علاوہ اور کئی ساتھیوں کے دل میں موجود تھی۔ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں تھا۔ ایک نادیدہ بندش نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بندش کسی جادوؤں کی شکل میں ہے لیکن اب یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ اسٹیٹ کے کچھ اہم قیدیوں کی طرح میرے جسم میں بھی کوئی ایسی چیز رکھی گئی ہے جو میری WHERE ABOUTS کے بارے میں میرے ذہنوں کو آگاہ رکھتی ہے۔

اسحاق کی یہ بات بالکل درست تھی کہ یہاں سے راز کو فرار اختیار کرنے کے معاملے میں، میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ میری موجودگی میرے ساتھیوں کے لیے ہر راستہ بند کر سکتی تھی۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے بڑی تیزی سے سوچا۔

اب میرے دل سے اس بات کی گواہی آنا شروع ہو گئی تھی کہ شاید میں اس منحوس جنگل کے حصار سے کبھی نکل نہیں سکوں گا... اور اگر... مجھے یہیں پر مرنے کا تھا تو پھر میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کے لیے خطرہ کیوں بنوں؟

کیوں نا میں اپنا اخلاقی فرض ادا کروں۔ اپنے ساتھیوں کو کسی امتحان میں ڈالے بغیر خاموشی سے اکیلا ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اکیلا مر جائے یا باجماعت!...

میں مردار کی بو والے کائی زدہ جو ہڑ کے کنارے کھڑا تھا۔ میری رائفل، ایک چھوٹی نارنج، گولیوں والا بیگ اور ایک شکاری چاقو میرے پاس موجود تھے۔ اس کے علاوہ اور کیا چیز مجھے درکار تھی... اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں۔

میں نے چند لمحوں تک سوچا، پھر وہیں سے گہری تاریکی

میں آگے بڑھ گیا۔ مجھے کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ بس ایک یہی سوچ تھی کہ میں یہاں سے آگے بڑھ جاؤں۔ اپنے ساتھیوں اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کر لوں۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موت ملی تو اسے گلے سے لگا لوں گا... زندگی ملی تو اس سے بھی نمٹ لوں گا۔ عمران نے یہی تو سکھایا تھا مجھے۔

میں گہری تاریکی اور جھاڑ جھکاڑ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور قریباً ایک گھنٹے میں دو تین کلو میٹر آگے نکل گیا۔ قدرتی طور پر میرا رخ اس آواز کی مخالف سمت میں تھا جو کچھ دیر پہلے ہمارے کانوں میں پڑی تھی۔ میرا مطلب فائر کی آواز سے ہے۔

چلتے چلتے میں سوچ رہا تھا کہ میری اچانک گمشدگی کے حوالے سے میرے ساتھیوں کا رد عمل کیا رہا ہوگا؟ انہوں نے مجھے ارد گرد تلاش کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ محتاط انداز میں آوازیں بھی دی ہوں۔ وہ نارچیں روشن کرنے کا رسک تو نہیں لے سکتے تھے، تاریکی میں ہی مجھے اور میرے قدموں کے نشان ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے ذہن میں یہ شدید خدشہ پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں میں کسی جنگلی جانور کا نشانہ تو نہیں بن گیا... یا پھر ایسا تو نہیں کہ حکم کے اہل کار گھات لگا کر جو ہڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے ہوں۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں آگے بڑھتا رہا۔ ایک دو جگہ گھنی جھاڑیوں میں کسی جنگلی جانور کی موجودگی کا متحرک احساس بھی ہوا لیکن ایسا کوئی خطرہ عملی طور پر میرے سامنے نہیں آیا۔ میں چل رہا تھا لیکن جتنی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اسٹیٹ کی بیرونی حد کی طرف بڑھ رہا ہوں یا پھر بیرونی حد کے متوازی ہی چلتا جا رہا ہوں۔

رات کا آخری پہر تھا جب میں بے حد تھک گیا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن خطرات سے بھرے ہوئے اس سیاہ جنگل میں آرام کیسے کرتا؟ سب سے پہلے یہی بات ذہن میں آئی کہ اگر میں کچھ دیر کرنا چاہتا ہوں تو مجھے زمین کے بجائے کسی درخت پر ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے جب میں سلطانہ والی چوٹ کھا کر جارج کی رہائش گاہ سے بھاگا تھا تو دو روز جنگل میں بھٹکتا رہا تھا۔ تب بھی میں نے ایک شب ایک بلند درخت پر کائی تھی۔ آج کی شب میں نے پھر یہی کلیہ آزمایا۔ نارچ کی روشنی میں ایک ایسا درخت منتخب کر لیا جس پر چڑھا جاسکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش اور چند تازہ خراشوں کے بعد میں درخت کے ایک مضبوط

دوٹانے پر نشست جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ارد گرد کی شاخوں کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کچھ شکاری جانور درختوں پر بھی چڑھ جاتے ہیں جن میں خطرناک جنگلی بے، تیندوے اور چیتے وغیرہ شامل ہیں۔

ان خطرات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا۔ آکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ قرب و جوار روشن ہو چکے تھے۔ سبزے پر سے شبنم آہستہ آہستہ اوجھل ہو رہی تھی۔ میری انتڑیوں میں بھوک کی وجہ سے کھرام مچا ہوا تھا لیکن اس کھرام کے مداوے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایک قریبی درخت پر خوبانی کے سائز کا ایک سبزی پائل پھل نظر آ رہا تھا مگر مجھے انور خاں کی بتائی ہوئی باتیں یاد تھیں۔ اس نے کہا تھا... جنگل شناس... ہو۔ دوسری صورت میں بندہ بھوک مٹانے کی کوشش میں خود بھی مٹ سکتا ہے۔ بہت سے پھل اور بیج وغیرہ زہریلے ہوتے ہیں اور ان کی ظاہری شکل یا ذائقے وغیرہ سے ان کے زہریلے ہونے کا بالکل پتا نہیں چلتا۔

میں درخت سے اتر اور ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی میں تیس قدم ہی چلا تھا کہ بڑی طرح چونک گیا۔ میں تیندوے کے پاؤں کے نشانات اب بڑی اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ اب پھر مجھے وہی نشان نظر آئے۔ گیلی زمین پر یہ بالکل واضح تھے۔ ان نشانات کو بغور دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ پرانے نہیں۔ غالباً رات کے وقت تیندو امیر سے آس پاس موجود تھا۔ ٹرپل ٹورائل پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میں مزید احتیاط سے چلنے لگا۔ میں ارد گرد کے درختوں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خطرناک جانور ”آسان درختوں“ پر چڑھ سکتا ہے اور پھر درخت کے اوپر سے ہی بے آواز، اپنے شکار پر چھلانگ لگا دیتا ہے... اچانک مجھے اپنی رگوں میں لہو رکتا ہوا محسوس ہوا... وہ میرے سامنے تھا۔ فقط پندرہ بیس فٹ کی دوری پر۔ زردی مائل جھاڑیوں میں چھپا ہوا وہ جھاڑیوں کا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر میں غفلت میں آٹھ دس قدم مزید اٹھالیتا تو سیدھا اس کی زد میں آ جاتا۔ اس کی قاتل آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ شاخوں کی اوٹ میں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی دم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دراز قد جوان جانور تھا۔ اس کے جسم پر چیتے کی طرح داغ تھے۔ اس کا وزن اس کے پچھلے پاؤں پر تھا اور اس کی یہ کیفیت اشارہ دے رہی تھی کہ اگر میں نے دو قدم بھی

اور بڑھائے تو وہ مجھ پر جست لگا سکتا ہے۔ میں پتھر کی طرح ساکت کھڑا ہو گیا۔ میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے سے پوسٹ تھا اور میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسہ نہیں تھا لیکن میرے گولی نہ چلانے کی وجہ، اپنے نشانے پر ”میرا عدم اعتماد“ ہی نہیں تھا... اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ گولی کی آواز میری نشان دہی کر سکتی تھی اور اگر دشمن آس پاس موجود تھا تو اس کے لیے بہت آسانی فراہم ہو سکتی تھی۔

قریباً نصف منٹ تک میں اور درندہ آمنے سامنے کھڑے رہے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ ایک دوسرے کے عمل اور رد عمل کو دیکھتے ہوئے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ میں اس جانور کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں کسی درندے کو اس طرح کھلی جگہ پر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس فٹ کے بے رکاوٹ فاصلے کے سوا اور کچھ نہیں تھا... یہ ایک ناقابل بیان احساس تھا۔

وہ میں چالیس سینڈمیں چالیس گھنٹوں کی طرح لگے۔ پھر اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ موڑا۔ مجھے اور میری ”ٹرپل ٹو“ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ بے پروائی سے چلتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ جیسے میرا اور اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو... کوئی واسطہ کوئی بھی اچھا یا بُرا نہ تھا۔ اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر خطرناک ہے... درست ہی کہتے ہیں۔ درندے اس وقت تک نقصان نہیں پہنچاتے جب تک وہ بھوکے نہ ہوں یا پھر جب تک ان کی زندگی میں جارحانہ مداخلت نہ کی جائے... لیکن حضرت انسان جب شر پر اترتا ہے تو کل وقتی اور سر تا پا مہلک ہو جاتا ہے۔ اپنی ہلاکت آفرینی کو مکملی شکل دینے کے لیے وہ ہزار بابائے ڈھونڈ لیتا ہے۔

میں کچھ دیر وہیں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے تیندوے سے اپنی روبرو ملاقات کا اثر اپنے دل و دماغ پر محسوس کرتا رہا... تب ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ تیندوے کے پاؤں کے نشانات بدستور میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر اب یہ کچھ مدھم محسوس ہو رہے تھے۔ کئی جگہ یہ نشان چھوٹے بڑے دیگر جانوروں کے نقوش پا میں گنڈ ہو جاتے تھے... ایک جگہ میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے دیکھا اور پھر مجھے پاؤں کے بل

بیٹھنا پڑا۔ بیٹھے بیٹھے ہی میں نے اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی اور رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ مجھے کچی زمین پر انسانی پاؤں کے نشان دکھائی دیے تھے۔ یہ ننگا پاؤں تھا اور کئی جگہ اس کا نقش بہت واضح تھا۔ یہ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے لیے حد درجہ حیران ہونے کی وجہ کچھ اور تھی۔ یہ صرف ایک پاؤں کا نشان تھا۔ دوسرا پاؤں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دوسرے پاؤں کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آتا تھا۔ جگہ جگہ نظر آنے والا یہ چھوٹا سا سوراخ کسی بیساکھی نما کڑی کا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس جگہ اس قسم کی زمینی شہادت دیکھوں گا۔ میری نگاہوں میں بارہندہ جیلی کا دق زدہ چہرہ گھوم گیا۔ میں نے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ یہاں سے گزرا تھا... یقیناً گزرا تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔

میں تیزی سے ان نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ تیندوے اور دیگر جانوروں سے وابستہ خیالات ایک دم میرے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ میں ان نشانات کو ٹریس کرتا ہوا بے تابی سے آگے بڑھتا رہا۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد مجھے گھنے درختوں میں چھپی ہوئی ایک چار دیواری کے آثار نظر آ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کھنڈر تھا۔ اس پر نباتات اور خود رو بیلوں کی پورش تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ گھاس پات کا ہی حصہ ہے۔ یہ دراصل وہی ہی بے آباد چوکیوں میں سے ایک تھی جو اس دیرانے میں کہیں کہیں دکھائی پڑتی تھیں لیکن یہ چوکی تقریباً مسامر ہو چکی تھی۔ بس ایک کمر اور برآمدے کا ایک حصہ موجود تھے۔ تاہم ان کی چوٹی چھتیں بھی گری ہوئی تھیں۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ بارہندا جیلی اس کھنڈر میں ہی موجود ہے۔ یہ دوسرا سوال تھا کہ وہ زندہ حالت میں ہے یا مردہ... اور اکیلا ہے یا اس کے ساتھ بھی کوئی موجود ہے؟ میں پاؤں اور بیساکھی کے نشان دیکھتا ہوا احتیاط سے آگے بڑھا۔ نشان کھنڈر کی تاریکی میں داخل ہو رہے تھے۔ میں کچھ دیر تک ایک دیوار کے ساتھ لگ کر سن گن لیتا رہا پھر میں نے محتاط انداز میں آواز دی۔ ”جیک... جیک!“

جواب نہ آیا۔ میں نے دوسرے مزید پکارا پھر ٹارچ روشن کر کے اندر چلا گیا۔ کمرے کی چھت نے گر کر جھونپڑی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس جھونپڑی میں کثرت سے جھاڑ

جھنکار اُگا ہوا تھا۔ اس جھونپڑی کے سامنے ہی ایک چھوٹے چیتل کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔ غالباً چند گھنٹے پہلے یہ چیتل کسی تیندوے یا بھینڑیے وغیرہ کا شکار ہوا ہو گا۔ اس کے جسم پر بہت کم گوشت باقی بچا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے ٹارچ کی روشنی کو حرکت دی۔ بارہندا جیلی مجھے سامنے ہی بے حرکت پڑا نظر آ گیا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن پھر میری نگاہ اس کے سینے کے مدھم زرد دم پر پڑی۔ وہ زندہ تھا۔ تب مجھے ایک شے نظر آئی۔ یہ شراب کی بوتلیں تھیں۔ مٹی میں لتھڑی ہوئی۔ یہ پانچ عدد بوتلیں جلی کے قریب ہی پڑی تھیں۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی شراب لگتی تھی۔ ان بوتلیوں میں سے دو خالی ہو چکی تھیں۔ ایک میں سے تھوڑی سی پی گئی تھی، باقی دو بھری ہوئی تھیں۔ بوتلوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصہ مٹی میں دبلی رہی ہیں۔ انہیں جیلی نے کھود کر نکالا تھا۔ اس کے سر ہانے کی طرف کچی زمین میں ایک دوڑھائی فٹ گہرا گڑھا موجود تھا۔ جیلی نشے کی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھجکے اٹھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے اگلے ہاتھ پر خون جم کر سوکھ گیا تھا تاہم مجھے لگا کہ یہ جلی کا اپنا خون نہیں ہے۔ اس کے اپنے جسم میں خون نمایاں کہاں۔ اگر کوئی تھوڑی بہت چیز رگوں میں حرکت کرتی بھی ہوگی تو وہ شراب ہی ہوگی... یہ شاید چیتل ہی کا خون تھا۔

میں نے کچھ دیر تک ارد گرد کا جائزہ لیا پھر جھنپڑ جھنپڑ کر جلی کو جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور مجھے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ تب شاید اس نے مجھے پہچان لیا مگر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ اس نے کسمسا کر انگڑائی لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں پھر بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے ساتھ ہی بولا۔ ”میں سمجھا تھا کہ میں جب مکرانوں گا تو خود کو جنت میں پاؤں گا لیکن... تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ دوزخ ہی ہے... اور سناؤ... تمہارے ساتھ اور کون کون ہے یہاں؟“

”خوش قسمتی سے آپ مرے نہیں، ابھی زندہ ہو۔“ اس نے پھر ایک محمور انگڑائی لی۔ ”تمہارے خوش قسمتی کہتے ہو۔ تم سے بڑا بھانڈا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کچی کچی کھانے سے میرے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہے ورنہ میں تمہاری اس بات پر خوب ہنستا... بلکہ میں ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا۔“

”کچی کچی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تو اور کیا۔ یہاں میری مٹی بیٹھی ہے جو پکا کر کھاتی۔ بھوک کی وجہ سے میری آنتیں بریک ڈانس کر رہی

Scanned and Uploaded By Nadeem

اسرارِ سبیل

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

ٹورنٹو سے لنڈی کوئل تک

جاسوسی ڈائجسٹ سائنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے
ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد
ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: شمر عباس

(فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III سائنس ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مخصوص طہریہ انداز میں بولا۔ ”تم لوگوں کے چنگل سے
رہائی تو ماریا کے لیے بہت بڑی بات تھی، اس طرح کی
یورپین لڑکیاں تو کبھی بھی ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی
خوشی خوشی کسی کے بستر پر لپٹ جاتی ہیں۔ ان کا جسم ان کے
لیے ایک فائدہ بخش پراپرٹی کی طرح ہوتا ہے جسے یہ کسی بھی
وقت ریٹ پر دے سکتی ہیں۔ خیر، چھوڑو اس بات کو... اس
کے بعد کیا ہوا؟“

میں نے جبکی کو اس خونی ہنگامے کی پوری تفصیل بتائی
جو چوکی کے آس پاس برپا ہوا تھا اور جس میں پاری ریان
کے علاوہ ماریا کو بھی گولی لگی تھی۔

ماریا کو گولی لگنے کا سن کر جبکی کی آنکھوں میں ہلکی سی
چمک آگئی۔ وہ بولا۔ ”زندہ ہے یا مر گئی؟“
میں نے کہا۔ ”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال،
زخمی ضرور ہوئی ہے۔“

”چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہوتا تو بہتر ہے۔ اگر وہ
صاف بخا جاتی تو یہ میرے لیے ایک بُری خبر ہوتی...
اور اپنی زندگی کے ان آخری دنوں میں، میں بُری خبریں
سننا نہیں چاہتا۔“

”اس ماریا کے لیے آپ کے دل میں بہت رنج ہے؟“
”ہاں، اس نے صرف مجھے دکھ دیا ہوتا تو کوئی بات
نہیں تھی۔ اس نے شکستہ کو دکھ دیا۔ اس کی گہری سبیلی ہو کر بھی
اس نے دغا بازی کی اور ہماری ملاقاتوں کے بارے میں
شکستہ کے پتا کو بتایا۔ پتا نہیں کہ تم نے اچھا کیا ہے یا بُرا کہ
مجھے سرنگ میں ماریا کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا...
ورنہ اس کے لیے میری ”بے پایاں محبت“ نے جوش ضرور
مارنا تھا۔ میں اس کی جتنی بھی عزت افزائی کر سکتا ضرور کرنی
تھی۔ اگر اس عزت افزائی سے اس کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ
جاتیں تو مجھے دلی راحت ہوتی... بہر حال جو ہوا ٹھیک ہوا۔
خدا سے دعا ہے کہ وہ اسے زندگی دے اور مصیبت والی زندگی
دے۔ اسے کچھ تو دوسروں کے درد کا احساس ہو۔“

جبکی اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا رہا اور اپنا نشہ
بھال رکھنے کے لیے شراب کے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں اس کھنڈر میں سے
اس نے یہ سیال آگ کیسے ڈھونڈ نکالی ہے؟

وہ بولا۔ ”شراب جہاں بھی ہوتی ہے، مجھے بلا لیتی
ہے۔ کسی مستانی محبوبہ کی طرح مجھے دیکھ کر آنکھ مارتی ہے، سبھی
بجاتی ہے... اور جب لڑکی خود سبھی مارے تو پھر عاشق کا تو
فرض بن جاتا ہے کہ وہ اس کو گود میں بھرنے کے لیے سر دھڑکی

دھڑنگ تھا۔ ایک تہ در تہ لنگوٹ کے سوا اس کے جسم پر اور کچھ
نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنے جسم کی گہری خراشیں دکھائیں۔
یہ خراشیں اس کے کانوں، اس کے سینے اور کمر پر خاصی گہری
تھیں اور سیاہ نشان سے بن چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی
بہت سخت شے کے ساتھ بہت زیادہ رگڑ کھا کر گزرا ہے۔ ”یہ
سب کیا ہے؟“ میں نے اس کی نہایت سخت جلد پر انگلی
پھیرتے ہوئے کہا۔

”وہاں اس سرنگ میں آگے جا کر نکلنے کا ایک راستہ
موجود تھا لیکن وہ اتنا تنگ تھا کہ مجھ جیسے پہلوان کو بھی بہت
زور لگا کر اس میں سے گزرنہ پڑا۔ بس اس وقت مجھے یہ کلیہ یاد
رہا کہ جہاں سے بندے کا سر گزر سکتا ہے، وہاں سے پورا جسم
بھی گزر سکتا ہے۔“

وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ حیران کن تھا لیکن یقین کرنے
کے سوا چارہ نہیں تھا کیونکہ بارونڈا جیسی میرے سامنے موجود
تھا... اور وہ جس قسم کے ڈھیٹ جسم کا مالک تھا، وہ اس طرح
کی مہم جوئی کر بھی سکتا تھا۔

”تم نے زنجیر کیسے کھولی؟“
”جیسے ہمیشہ سے کھولی جاتی ہے۔ زنجیر کھولنے،
توڑنے اور پھیلانے کے لیے ہمیشہ سے حوصلے کی ضرورت
رہی ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

”جبکی! آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح نکل جاؤ
گے تو مجھ پر الزام آئے گا... اسے میری غفلت سمجھا جائے گا۔“
وہ ہنسا۔ ”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بلکہ کسی کا بھی
کوئی قصور نہیں۔ میں سرنگ کی جس دراڑ میں سے نکلا ہوں،
وہاں سے کوئی اور نکل کے دکھا دے تو میں مانوں۔ خیر، چھوڑو
ان باتوں کو۔ تم یہاں کیسے نازل ہوئے ہو؟ مجھے تو اپنی
آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا۔“

”مجھے بھی نہیں ہو رہا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں
آپ کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھ سکوں گا۔“

میں نے بارونڈا جیسی کو مختصر اور سارے واقعات بتا
دیے جو اس کے جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ میں نے
اسے ماریا فرگوسن کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا
کہ ہم نے اپنے تحفظ کے لیے اسے ریغمال بنا رکھا تھا۔ سرنگ
سے نکلنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ بھی میں
نے جبکی کے گوش گزار کر دیا۔ جب میں روداد کے اس حصے
پر پہنچا جہاں چالباز ماریا پاری ریان کو اپنا جسم ریشوت کے
طور پر پیش کر کے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئی تھی... جبکی
کے چہرے پر عجب زہرناک تاثرات پھیل گئے۔ وہ اپنے

تھیں... اس لیے، چاہا جیسا کہ ویسے ہی کھالی۔“

”کس کی پکڑ تھی؟“

”حکم جی کی۔“ وہ مسکرایا۔ ”وہ دیکھو، وہ سامنے پڑا
ہے۔“ جبکی نے کئے پھٹے چیتل کی طرف اشارہ کیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ جبکی کے ہاتھ پر خشک خون
کیوں لگا تھا۔ وہ چیتل کے سینے میں سے کبھی نکال لایا تھا اور
اسے شراب کے آتشیں گھونٹوں کے ساتھ گھلے سے نیچے اتارا
تھا۔ سچ ہے کہ بھوک انسان سے سب کچھ کراتی ہے...
”اس چیتل کو مارا کس نے؟“

”چیتل نہیں یار... حکم جی... اور حکم جی کو عوام کے سوا
اور کون مارے گا؟ یہ عوام ہی ہیں جو بھوک سے بے بس ہو کر
تیندوے کا روپ دھار لیتے ہیں اور حکم جی جیسے زور آور لوگ
ان کے لیے چیتل اور ہرن بن جاتے ہیں۔ کل رات یہاں
بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک عوام نے ایک حکم جی پر حملہ کیا۔
بڑی محبت سے اس پر چھپنا مارا اور بڑی عقیدت سے اس کا
پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ حکم جی ڈری ڈری آوازیں نکالتا رہا، اس
کی دم پھڑکتی رہی اور وہ عوام کے نیچے سے نکلنے کے لیے زور
لگاتا رہا۔ لیکن عوام کی جتنی میں اتنی گرم جوشی تھی کہ وہ نکل نہیں
سکا۔ ہاں دوست! ہر حکم جی ایک دن چیتل ضرور بنتا ہے... اور
ہر مظلوم ایک دن تیندوے کا روپ ضرور دھارتا ہے۔“

میں نے گہری سانس لے کر نارچ بھجا دی۔ صورت
حال واضح تھی۔ رات کسی وقت تیندوے نے چیتل مارا تھا
اور اس کھنڈر کے سامنے بیٹھ کر اس کا گوشت کھایا تھا۔ اس
کے جانے کے بعد بھوکا جبکی کھٹکتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور اس
نے بھی اس شکار میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے
کچھ کبلی نکالی تھی اور اس کا نرم گوشت چنایا تھا۔ یقیناً یہ وہی
تیندو تھا جو اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے
میرا اس سے سامنا بھی ہوا تھا۔ وہ تازہ شکار کی وجہ سے
بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ تھا لہذا اس نے مجھ سے بھی کوئی
خاص تعرض نہیں کیا تھا۔

”یہ سب کیا ہے جبکی! آپ مجھے بتاؤ کہ آپ کس طرح
یہاں پہنچے؟ کیا وہاں سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی
تھا؟“

”بالکل تھا... لیکن وہاں سے شاید میں ہی نکل سکتا
تھا... کوئی اور نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

جبکی نے نارچ میرے ہاتھ سے لے کر روشن کی اور
اس کا رخ اپنے جسم کی طرف کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نک

نومبر 2010ء
گرم دودھ اور سرشموں
کا احتیاج
شمارے کی ایک جھلک

لب دم توبہ

معاشرے کے حقیقی رنگوں اور رنگین و سنگین تجربات
پر مشتمل ایک فکر انگیز داستان۔ آخری صفحات
کی زینت محی الدین نواب کے قلم سے۔

بخت گزیدہ

ابتدائی صفحات کے رنگ۔ سازشوں، قتل و غارت
گری کے فتنوں کے درمیان گھری زندگی کا احوال

کچھ یادیں، کچھ باتیں

محترم معراج رسول کا ایک یادگار انٹرویو

حضرت زکریا علیہ السلام

آپ کی زندگی کے عبرت اثر حقائق
جنہیں بے موسم پھل عنایت کر کے اللہ تعالیٰ
نے اپنی شانِ کبریائی کا جلوہ دکھایا۔

دودھاری

انسانی فطرت کی بھرپور عکاسی تحریر۔ جو کبھی
دودھاری اور کبھی کند ثابت ہوتی ہے۔
مرزا امجد بیگ کا دلچسپ انداز۔

واپسی

تجربہ تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات پر مشتمل پل پل رنگ بدلتی
طویل داستان۔ محی الدین نواب کے قلم کا جادو

انٹرویو، محفل شعرو سخن، آپ کے خط

ش صغیر ادیب، تنویر ریاض،

مختار آزاد، سلیم انور، کاشف زبیر،

اور مریم کے خان کی دلکش تحریریں۔

موجود ہے تو اس نے کہاں رکھی ہوئی ہے۔ میں نے تو اسے
اب تک اس میلے کیلے لنگوٹ میں ہی دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل
گیا۔ جسکی نے اپنے دور لنگوٹ کی گرہ کھولی اور اس کی ایک
بالائی تہ میں بڑی احتیاط سے لپیٹی گئی کارڈ سائز کی تصویر نکال
لی۔ اسے پہلے پونٹھین میں پھر ایک رومال میں لپیٹا گیا تھا۔
جسکی نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے رومال کی گرہ کھولی پھر
پونٹھین کو ہٹایا۔ وہ تصویر کو یوں برآمد کر رہا تھا جیسے کسی عبادت
گاہ میں ہو اور کسی مقدس شے کو منظر عام پر لا رہا ہو۔

یہ ایک نہیں تین تصویریں تھیں۔ مسلسل جسکی کے پاس
رہنے سے ان پر تھوڑی بہت سلوٹیں بھی آچکی تھیں۔ جسکی نے
پہلی تصویر مجھے دکھائی۔ یہ راج بھون کے کسی عالی شان ہال
کمرے میں اتاری گئی تھی۔ اس میں سات لڑکیاں نظر آرہی
تھیں۔ ان ساتوں نے مختلف رنگ کے لباس پہن رکھے
تھے۔ یہ سارے لباس گھاگرے چولی پر مشتمل تھے۔ لڑکیوں
کے کندھوں پر خوب صورت آرائشی پُر لگے ہوئے تھے۔ یہ پُر
بھی لباس کے رنگ کے ہی تھے۔ ایک لڑکی پر میری نظر جم کر
رہ گئی۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ
یہی شکنتلا ہے۔ میں نے اس سے پہلے جسکی سے سنا تھا کہ شکنتلا
جب ساتویں کے جشن کی پری بنی تو اس کو سبز رنگ ملا تھا۔ وہ
واقعی حسین و جمیل تھی۔ اس کی صورت میں موجود ایک خاص
قسم کی دلکشی، نگاہ کو کشش کرتی تھی۔

”بیچانا کہ وہ کون ہے؟“ جسکی نے معنوم لہجے میں مجھ
سے پوچھا۔

میں نے سبز لباس والی پر انگلی رکھی۔
جسکی کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم پہچان لو
گے۔ ستاروں میں سے چاند کو پہچانا کون سا مشکل ہوتا
ہے۔“

میں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ ساتوں لڑکیاں ایک کرسی
کے پیچھے قطار میں کھڑی تھیں۔ زرنگار کرسی پر کوئی شخص ممکن
تھا۔ اس نے چوڑی دارپا جائے کے ساتھ نہایت قیمتی شیر وانی
پہن رکھی تھی۔ گلے میں موتیوں کی مالاں تھیں مگر اس کا چہرہ
نظر نہیں آتا تھا۔ چہرے پر کسی نے سیاہ روشنائی والے قلم سے
اتنی لکیریں لگائی تھیں کہ چہرہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

”کیا کرسی پر حکم جی بیٹھا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں، تم اسے حکم جی بھی کہہ سکتے ہو لیکن یہ زیادہ دیر
حکم جی نہیں رہے گا۔ بہت جلد جیسک بن جائے گا۔“ وہ معنی

میری کشتی پر لے جاؤ۔ ہم وہاں سے بہت دور گئیں ہیں۔
زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دن کا سفر ہمیں واپس وہاں پہنچانے سے
گا۔ تمہارے پاس رائفیل ہے۔ دو ٹائٹیں ہیں۔ تم صحت مند
ہو۔۔۔ مجھے میری منزل تک پہنچا سکتے ہو۔“

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی یاسیت نے میرے دل پر
گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کا گرم ہاتھ تھامتے ہوئے
کہا۔ ”مجھے لگتا ہے جسکی۔۔۔ آپ اپنی یادوں میں گم ہو کر رہ گئے
ہو۔ آپ آگے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ راستہ یہاں ختم
نہیں ہوا۔ ابھی آگے بہت کچھ ہے۔“

”میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ میرے لیے سب کچھ
وہیں ختم ہو گیا تھا جب اس رات کشتی پر میرا ہاتھ شکنتلا کے
ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ حکم کے محافظوں نے ہمیں ایک دوسرے
سے علیحدہ کیا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے جدا ہونا میرے
لیے کیسا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تم نے تو اسے دیکھا ہی نہیں
ہے۔ وہ بے مثال ہے دوست۔۔۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، اس
کی مسکراہٹ میں کھونے کے بعد دوبارہ ابھر نہ سکتا۔ اس کی
زلفوں میں الجھنے کے بعد پھر رہائی نہ پاسکتا۔ کاش! میں شاعر
ہوتا، میں کھل کر بتا سکتا کہ وہ کیا تھی اور۔۔۔“

وہ بات کرتے کرتے ایک دم رک گیا جیسے کوئی نیا
خیال اس کے ذہن سے نکرایا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس
خیال کو مجھ پر ظاہر کرے یا نہیں۔

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
وہ توقف سے بولا۔ ”کہنا تو نہیں، کچھ دکھانا چاہ رہا
ہوں تمہیں۔۔۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ تم یہ غلط نہ ہو۔۔۔ وہ اس پر
ناراض نہ ہو جائے۔ جب وہ ناراض ہو جاتی ہے تو کئی کئی
دن تک میرے تصور میں نہیں آتی۔ مجھے تڑپاتی ہے اور خود بھی
تڑپتی رہتی ہے۔“

”کیا آپ مجھے اس کی کوئی چیز دکھانا چاہ رہے ہو؟“
”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ پھر ذرا سوچ
کر بولا۔ ”لیکن تم وعدہ کرو کہ اس کو پاک صاف نظروں سے
دیکھو گے۔ اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی ایسا ویسا
خیال نہیں لاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا۔۔۔
اور میں خود کو بہت گناہ گار محسوس کروں گا۔“

”کیا آپ مجھے اس کی کوئی تصویر دکھانا چاہ رہے
ہو؟“ میں نے رُشوقی لہجے میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں
سر ہلایا۔ اس کی ٹھوڑا آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ویسا ہی ہوگا جیسا وہ چاہتا
ہے۔ ساتھ ساتھ میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ یہ تصویر اگر واقعی

بازی لگا دے۔“
”آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہاں شراب موجود ہے؟“
”شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس کھنڈر میں گھتے
ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کہیں شراب موجود ہے۔
یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تمہاری کھوپڑی میں نہیں آئیں
گی۔ اس کے لیے ریاضت کی ضرورت ہے۔ میرے پاس
زیادہ وقت نہیں ورنہ میں اس حوالے سے بھی تمہیں کئی گرتا
جاتا۔“
”میں ایسے گرتے سیکھنے کے لیے پیشگی معذرت چاہتا
ہوں۔۔۔“

”دیکھو کچھ اور نہ کہنا میری دوسری محبوبہ (شراب)
کے بارے میں۔ ورنہ یہ تو بہن محبت ہو جائے گی اور یہ تو بہن
عدالت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اپنی
شاگردی سے عاقی بھی کر سکتا ہوں۔۔۔“

وہ گول مول باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے میں
نے اندازہ لگایا کہ یہ بولتیں شاید کسی جرائم پیشہ شخص یا اشخاص
نے یہاں دہائی تھیں لیکن ان بولتوں میں سے کچھ شراب رستی
تھی۔ اس کی بدبوداری، مٹی میں جذب ہوتی رہتی تھی اور
اسی مخصوص بدبو یا ہلکی سی باس نے جسکی کو اس شراب کا سراغ
دیا تھا۔

شام ہونے کے بعد میری بھوک انتہا کو پہنچ گئی۔ شاید
اس وقت مجھے بھی کوئی کبھی قسم کی چیز ملتی تو میں بھی اسے کچا
چبانے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کل رات کی تیز بارش کی
وجہ سے ہوا میں خشکی کچھ بڑھ گئی تھی۔ پیٹ خالی ہو تو سردی
زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا لیکن یہ بدقوق جسم
والا جسکی تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اسے سردی گرمی کی مطلق
پروا نہیں تھی۔ لیکن کچھ بھی تھا، شراب نے اس بے مثال
بندے کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ اس کا ایک ثبوت شام
کے فوراً بعد اس وقت ملا جب جسکی کو شدید کھانسی شروع ہوئی
اور اس کھانسی کے دوران میں ہی اس کے منہ سے خون رسنے
لگا۔ اس نے کئی بار خون تھوکا اور اسے ڈھانپنے کے لیے اس پر
منی ڈالی۔ وہ ایک دم گم سم نظر آنے لگا۔

وہ آزرده لہجے میں بولا۔ ”میں نے کہا ہے نا کہ اب
میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ تم میری مدد
کر سکو۔“

”دل چھوڑ مت کرو۔۔۔ آپ ٹھیک ہو جاؤ گے۔۔۔ اور مدد
کی بات آپ کس حوالے سے کر رہے ہو؟“
”میری آخری خواہش پوری کر دو۔ مجھے کسی طرح

خیز انداز میں بولا۔ ”حکم جی“ کو دیکھنے کی آرزو میرے دل میں تھی لیکن یہ آرزو اس کی تصویر دیکھنے کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ جیسی نے دوسری تصویر دکھائی۔ اس میں سبز لباس والی شکلتا بچوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی اور اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے چرن چھو رہی ہے۔ یقیناً یہ حکم جی کے پاؤں ہی تھے لیکن یہاں بھی اس کے پاؤں اور پنڈلیوں پر بے تحاشا سیاہ لکیریں لگا دی گئی تھیں اور پاؤں نظر نہیں آتے تھے۔ شکلتا کی زلفیں واقعی بہت دراز تھیں۔ اس کی بھاری چوٹی، جیسے قالین پر کھنڈی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے جسم کی ساری غیر معمولی رعنائی اور کشش اس پوز میں نظر آرہی تھی۔ یقیناً وہ ایک دل آویز جسم کی مالک تھی۔ اس تصویر میں ایک دیوار پر بدھا کے اس نا در روزگار مجھے کی پینٹنگ بھی نظر آرہی تھی جو مقامی لوگوں کے نزدیک ناقابل شکست تھا اور جسے چوری کرنے کی پاداش میں، میں اور میرے صفورا وغیرہ اس راجوڑے میں موجود تھے۔

تیسری تصویر کلاسیکل رقص کی تھی۔ یہ بھی گروپ فوٹو تھا۔ اس میں ساتوں ”پریاں“ پاؤں میں کھنکرو باندھے رقص کر رہی تھیں۔ ان کے پس منظر میں پتلیوں والے سازندے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی شکلتا نمایاں تھی۔ اس کا سرایا ایک تصویر تھا اور اس تصویر نے جیسی کے ساتھ ایک کستی میں گنوں کے پھولوں سے بھری ہوئی جھیل کے اندر سات روز گزارے تھے۔ اگر باروندا جیسی اس حوالے سے خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا تو شاید ٹھیک ہی سمجھتا تھا۔

”یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں؟“ میں نے جیسی سے پوچھا۔ وہ کچھ دیر کھانتے رہنے کے بعد بولا۔ ”بس، یہ میری خوش قسمتیوں میں سے ایک خوش قسمتی ہے۔ میں ان دنوں جیل سے بھاگ آیا تھا اور اپنی مسند ہوشن کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہوشن سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح مجھے ساتویں کے جشن کی کچھ تصویریں لا دے۔ ساتویں کے جشن کی تصویریں اتاری جاتی ہیں اور یہ جشن کے میلے میں فروخت بھی ہوتی ہیں۔ لیکن میلا چونکہ ختم ہو چکا تھا، اس لیے جشن کے پچھکارڈز کا ملنا بڑا مشکل تھا۔ پھر بھی ہوشن نے کسی طرح جشن کے آٹھ دس پچھکارڈز حاصل کر لیے۔ ان میں سے ان تین کارڈز میں شکلتا نظر آرہی تھی۔ اور یہ تین کارڈز میرے لیے ایک بہت بڑے سرمائے کی طرح تھے۔“

”تصویروں پر یہ لکیریں... آپ نے لگائی ہیں؟“

”ہاں... حکم جی کے چہرے پر خوب صورتی اور نیکی کی

جگہ سی اتنی ہے کہ برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ پھر کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ”دیکھو، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں تم سے التجا کر رہا تھا کہ تم مجھے کسی طرح میری کستی تک پہنچا دو۔ تم مجھے استاد کہتے ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اپنے استاد پر تمہارا یہ ایک بہت عظیم احسان ہو گا۔“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، مجھے ایک نامانوس آہٹ سنائی دی۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرا کہ یہ کسی ”پمپ ایکشن رائفل“ کے کاک ہونے کی آواز ہے۔ میں نے تارچ فوراً بچھا دی اور رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ لگتا تھا کہ جیسی نے بھی یہ آواز سنی ہے اور وہ تھوڑا سا چونکا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ تاہم میرے لیے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ دھڑکن کی اس تیزی میں خوف کا عنصر شامل نہیں ہے۔ میں جھک کر چلتا ہوا محتاط قدموں سے دروازے کی طرف آیا۔ چیتل کے ڈھانچے کے قریب پہنچ کر میں نے آنکھیں سکیڑیں اور ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔

یہاں دشمن موجود تھا... اور وہ ایک نہیں تھا۔ نہ ہی دو تین یا چار کی تعداد میں تھا۔ وہ درجنوں میں تھا۔ شاید ہر جھاڑی کے پیچھے... ہر درخت کی اوٹ میں۔ میری جھٹی جس نے گواہی دی کہ نہایت خاموشی... نہایت ہوشیاری سے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں رنجیت پانڈے کا نام گونجا۔

تو کیا وہ وقت پہنچ گیا تھا جس کا انتظار تھا؟

کیا آج یہاں مجھے اپنا حوصلہ آزمانا تھا؟ آگے بڑھنا تھا، لڑنا تھا... اور مرنے کا تھا؟

مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ صرف چند سیکنڈ میں ہی میں ذہنی طور پر ہر طرح کی صورت حال کے لیے تقریباً تیار ہو گیا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا... وہاں عمران کھڑا تھا۔ یہ اس کا تصور تھا لیکن حقیقت کی طرح واضح اور روشن لگا۔ اس نے میرے کندھے سے کندھا ملایا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جادو کی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا... جگر! جوڑنا ہے تو مرنے کا ہے... اور جو مرنے ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ کاش! وہ جیتی جاتی حالت میں میرے ساتھ ہوتا... بہر حال... اس کا تصور بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جاں بازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

(اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں)

دیگر سے کئی نار چھیں روشن ہو گئیں۔ ان نار چوں کی روشنی سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی کہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے اس کھنڈر چوکی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے اور ان کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ ایک ساتھ درجنوں نار چھیں روشن ہونے کی وجہ سے کھنڈر کی اطراف روشن ہو گئی تھیں۔ کوئی اس کھنڈر میں سے نکلنے کی کوشش کرتا تو فوراً نظر میں آ جاتا۔

شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ انسان حالات سے سبق سیکھتا ہے، اس سے پہلے ہونے والے معرکے میں ماریا کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ہی اپنی پناہ گاہ سے بھاگ نکلے تھے۔ پانڈے جیسا شخص یہ غلطی دوسری بار نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کھنڈر کے قرب و جوار کو سختی و المقدور روشن کر دیا تھا۔

میکافون پر پانڈے کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ ”ہم تمہیں دس منٹ کا وقت دیوت ہیں۔ اگر تم لوگ اس سے کے اندر باہر نہیں نکلتے تو ہم فائر کھول دیویں گے۔ یاد رکھو، تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔“ اس بار پانڈے کے لہجے میں مخصوص تشویش موجود تھی۔ یہ تشویش اس کے اندر کی بے پناہ سفاکی کو ظاہر کرتی تھی۔

میں بے آواز کھسکتا ہوا پیچھے آیا۔ جبکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی واحد ٹانگ سامنے کی طرف پھیرا رکھی تھی۔ بول اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس میں سے مزید کافی ساری شراب اپنے اندر اٹھیل چکا تھا۔ صورت حال اس کی سمجھ میں بھی بہت اچھی طرح آچلی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ حکم اور جارج کے لوگوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اب بچنے کا کوئی امکان نہیں۔

میں نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ ”جبکی! میں آپ کے لیے مصیبتوں کی وجہ بنا ہوں۔ میں آپ کا کھوج لگاتا ہوں اس کھنڈر میں نہ آتا تو شاید آپ بچ جاتے۔“

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ شاید بڑی چیز ہے۔ اس لفظ کو اپنی باتوں میں آنے ہی نہیں دینا چاہیے۔ اگر اس لفظ کا ہی سہارا لینا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ شاید تم میری وجہ سے بھٹے ہو۔ شاید تم اس کھنڈر میں نہ آتے تو بچ بچا کر کسی طرف نکل جاتے اور شاید میں جارج کی بہن کو مارشل آرٹ سکھانے اس اسٹیٹ میں نہ آتا تو اب تک بھلا چکا ہوتا۔ اور شاید میں اور شکستہ ایک دوسرے کی نظر کا شکار نہ ہوتے اور جارج کی بہن ہماری خبری نہ کرتی تو میں

ایک ایک فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی... سیٹیاں بجاتی ہوئی چوکی کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ میں نے اپنی رائفل سے چند جوابی فائر کیے۔ میرا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا، نہ ہی مجھے ایسی شوٹنگ کے داؤ پیچ آتے تھے... میرے لیے اطمینان اور راحت کی بس ایک بات تھی۔ اس طرح درجنوں دشمنوں میں گھر کر اور موت کو اپنے روبرو دیکھ کر بھی میرے جسم اور دل و دماغ پر لرزہ طاری نہیں ہوا تھا۔ آج میں اس شخص سے بہت... بہت زیادہ مختلف تھا جس نے اپنے گھر کے سامنے چلڈرن پارک میں سینٹھ سراج کے غنڈوں سے مار کھائی تھی اور پھر اپنے ہر جاننے والے سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ آج میں اپنے اندر مرنے کا حوصلہ پار ہا تھا اور یہ حوصلہ بھی پار ہا تھا کہ مرنے سے پہلے اپنے دس بیس دشمنوں کو موت کا مزہ چکھا دوں۔

ایک بار پھر فائرنگ ہوئی۔ تڑتڑکی زبردست آوازوں کے ساتھ چند برسات بھی چلے۔ گولیاں کھنڈر کی دیواروں سے ٹکرائیں اور ہر طرف چنگاریاں پھرن لگیں۔ کسی درخت پر گھونسے میں دبکا ہوا کوئی پرندہ گولی کھا کر ”دھپ“ سے میرے سامنے تاریکی میں گرا اور پھر پھڑا کر ساکت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میکافون پر ایک جانی پیکانی آواز ابھری۔ اس آواز کو سن کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ہمیں گھیرنے والوں میں رنجیت پانڈے بھی شامل ہے۔ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں پکار کر کہا۔ ”تم لوگ بچنے کے لیے چلے جاؤ، چانس نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ باہر آ کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں دس منٹ دیوت ہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہووے گی اور قانون کے مطابق سلوک ہووے گا۔“

میں خاموش رہا۔ قریباً ایک منٹ بعد میکافون پر پانڈے کی آواز دوبارہ ابھری۔ ”تم جواب کیوں نہیں دیوت ہو؟ اگر تم جواب نہیں دو گے تو ہم سمجھیں گے کہ تمہیں یہ آفر منظور نہیں ہے۔ ہم حملہ کرنے پر مجبور ہو جاویں گے۔“ پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چوکی کی اندرونی صورت حال سے باخبر نہیں ہے، صرف انداز سے کام لے رہا ہے۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اندر زیادہ تعداد میں افراد موجود ہیں۔ اگر میں خود اس سے مکالمہ کرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ میں سے کوئی یہاں نہیں ہے۔ اس صورت حال میں پانڈے اور اس کے درجنوں ساتھیوں کا حوصلہ مزید بڑھ جاتا۔

میری خاموشی طویل ہوئی تو درختوں میں کے بعد

کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیا تھا کہ اسے پاس ہاتھ باندھ کا کوئی ٹاور کس تھا جسے میں فوراً ہر صورت میں ختم کر دیتا تھا۔ میری خاموشی نے اسے کچھ اور معلوم لوگ بھی اس جیسے کے پیچھے تھے۔ مجید مضمونی شخص کی ہلاکت پر... شک کی بنا پر میں فوراً اسے ختم کر دیتا تھا۔ اس نے اپنی خوش اسلوبی سے کیا کہ میں اس کی کراچی۔ ہم میں میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن آزمائشیں تھیں۔ عمران کی توجہ اپنی گری فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پر ان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سر دھری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی درونک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درجنوں تماشا گاہیوں میں سے کسی کو شک نہ ہو سکا۔ میری بے وقوفی، کم ہمتی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ میں میڈم کے ہر کارے ہمارے پیچھے لگ گئے اس خوفناک عقاب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک ٹیک ہارے کے تارک میں اوٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ میرے نکل خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح نور بھائی عاقل کو موقع سے بھاگ دیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پکڑا گیا۔ سفاک سینے سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندھنا موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں اس کے جسم خاکی تک پہنچنے کے لیے چلتا ہوا سیر حیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک کھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ راستے میں ہاتھ نام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیر خوار بچہ سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت انگیز واقعات ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پڑا ہوں۔ ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آ رہا ہوں۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالغنی صاحب کے پاس لے گئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزین ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور مل پانی۔ زرگاں میں حکم کی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم کی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی مل پانی میں آئی تھی۔ یہاں حکم کی کا چھوٹا بھائی کاربھارت تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کا بھائی تھا۔ میری غلط بیانی کی وجہ سے چھوٹے سرکار نے اہل کار سلطانہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سرکی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں بچپن سے دوسری کی باتیں بالکل بھول چکا ہوں۔ مجھے چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں مجھے اور سلطانہ کو حکم کی کے لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی مگر حیرت انگیز طور پر پکڑا گیا۔ زرگاں میں مجھے پکڑا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صغور سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پکڑا دیا گیا۔ اس نے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ سے اسٹیٹ میں کام لیا جانے لگا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے مجھے وہاں سے بچنے دیا اور خود وہیں رک گئی۔ پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ نے مجھے ہمت بخشی اور میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو گارڈز کو زخمی کیا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں سڑک سے بے پروا ہوا پھر کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ سڑک گھڑ سوار میرے عقاب میں تھے اور میں جنگل میں بھٹکا۔ پانچ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن صبح اچانک میرا عقاب کرنے والے آئے۔ یہ چار افراد تھے۔ میں نے اچانک فائرنگ کر دی۔ دو افراد اتر ہو گئے جبکہ دوسرے کے گھات اتر گئے۔ میں انہی افراد کے ایک گھوڑے پر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مگر مجھے پھر اپنے عقاب میں کچھ لوگ نظر آئے۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج کو رے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ اس کی حالت خراب تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے اپنا رستہ بدل دیا۔ اس کے بجائے حکم کی کے اہلکاروں سے مذاہیر ہو گئی۔ وہاں فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک ساتھی اور حکم کی کے اہلکار مارے گئے۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی کنبلی کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب و غریب آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا، اس کی حالت خراب تھی۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ پتا لگایا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے نہیں بھی نہیں کر لیا جاتا ہے۔ ماریا کے اغوا کی خبر ہم نے حکم کی کے اہلکاروں تک پہنچا دی۔ غار کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور ہم ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ اوپر باروندا نامی عجیب القہق شخص نے مجھ پر کچھ باتیں عیاں کیں۔ وہ جوڑو کرائے کا نامور چمپئن تھا اور یہاں ماریا اور حکم کی کے گارڈز کو تربیت دینے آیا تھا مگر ایک ہندو لڑکی کے عشق نے اسے حکم کی کے عقاب کا شکار بنا دیا اور وہ اپنی ٹانگ اور ایک ہاتھ گنوا بیٹھا۔ باروندا نے مجھے جوڑو کرائے کے حوالے سے اہم باتیں بھی سکھائیں۔ دوسرے دن سرنگ کے دہانے پر ہنگامہ بڑھا تھا۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی اور انور خاں اور حکم کی کے اہلکاروں میں بات چیت کے دوران میں مجھے ایک نام سنائی دیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا، انڈین انٹیلیجنس فورسز کا سابقہ افسر جس نے مجھے کی چوری پر ہمیں پاکستان سے پکڑ کر یہاں انڈیا میں قیدی بنا لیا تھا۔ اوپر باروندا جب بھی مجھے جوڑو کرائے کے حوالے سے اہم باتیں سکھاتا تھا۔ انور خاں کے رنجیت پانڈے وغیرہ سے مذاکرات ہو رہے تھے تاہم وہ لوگ وقت گزاری کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے دھوکے سے غار پر بلا بول دیا تاہم انہیں ناکامی ہوئی لیکن ہمارا ایک ساتھی فیروز اس حملے میں مارا گیا۔ اس کے رشتوں کے طور پر اسحاق نے ماریا کی ایک انگلی کاٹ کر پانڈے کو بھیج دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جبکہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران میں ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غدار کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہمیں گھیر لیا گیا اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور ہمیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گھنے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ وہاں چوہان اور اسحاق میں بحث چلی کہ میری وجہ سے دشمن ان تک پہنچ جائیں گے۔ یہ سن کر میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن میں دوبارہ چل پڑا۔ چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر عیسائی کے نشانات ملے اور میں اسے کھوجتا ہوا باروندا جب تک جا پہنچا۔ اس کا اس طرح ملنا میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ یہ ایک کھنڈر تھا چوکی تھی۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ کچھ آہٹ ہوئی۔ یہ رائفل کے کاک ہونے کی آواز تھی۔ یہاں دشمن درختوں کی تعداد میں موجود تھا۔ ہمیں گھیر لیا گیا تھا۔ میں اپنی طور پر ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ پھر میرے تصور نے مجھے اپنے ساتھ عمران کو کھینچا۔ اس کا تصور بھی میرے لیے کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

اس طرح تو بہت کچھ سوچا جاسکتا ہے دوست... لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم میرے لیے مصیبتوں کی وجہ بنے ہو؟ کیا اس سے پہلے بھی تم نے میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کی ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”... میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا جی... آپ کو آپ کی کشتی سے نکال کر اس جنگل میں لانے کا ذمہ دار کوئی اور نہیں صرف میں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں جس کی وجہ سے آپ یہاں موجود ہو۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

”میرے ساتھی تو آپ کو اس کشتی میں چھوڑ کر آگئے تھے لیکن میں آپ کو وہاں نہ چھوڑ سکا... اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو آپ بے ہوش تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ اسی طرح دم نہ توڑ جاؤ... لیکن زیادہ اہم وجہ دوسری تھی۔ مجھے آپ کی شکل و صورت میں اپنے بہت پیارے دوست کی تھوڑی سی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ وہی دوست ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ اس کا نام عمران تھا۔ اس نے مجھے نئی زندگی دی اور تھوڑے ہی وقت میں مجھے اتنا عزیز ہو گیا کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور اگر بیان کروں گا تو شاید حق ادا نہ کر پاؤں گا۔“

میں نے اس بارے میں اسے تھوڑی سی تفصیل مزید بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔

”جو بھی ہوا اسے اب دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں... اور نہ ہی اسے دہرانے کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ بہر حال، میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر تم لوگ مجھے وہاں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے تو یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوتا۔“

”میں اس کے لیے شرمندہ ہوں جی!۔“

”چلو... تم نے سچ تو بولا... اور مجھے اس کی خوشی ہے۔ نیپالی میں ایک کہادت ہے کہ سچ بولنے والے کی زندگی کا آخری مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔“

میں نے دیکھا کھنڈر سے باہر ٹارچوں کے روشن دائرے اب پہلے سے بڑھ گئے تھے۔ موت کا گھبراہٹ کا گھبراہٹ میں نے کہا۔ ”جیک! ابھی میگافون پر ان لوگوں نے جو اعلان کیا ہے، آپ نے سنا ہے؟“

وہ نرمی انداز میں مسکرایا۔ ”شاید تم بھول رہے ہو کہ میں اردو اور ہندی نہیں سمجھتا۔“

”اوہ سوری۔“ میں نے کہا۔ ”یہ حکم اور جارج کا سب سے خطرناک ہرکارہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ ہمیں پکڑ کر رہا تھا کہ اگر ہم ہتھیار ڈال کر باہر آجائیں تو ہمیں شوٹ نہیں کیا جائے گا اور ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔“

جیک نے بوتل میں سے دو بڑے گھونٹ لیے اور ایک

بار پھر نرمی انداز میں مسکرایا۔ ”اس پانڈے کو میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ کسی بہت نیک ماں کا بچہ ہے۔ وہ خدا کی بندی ایسے تین چار پانڈے اور پیدا کر دیتی تو پورا انڈیا شاید اس دنیا میں ہی سوگ بن جاتا۔ وہ میگافون پر جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیں بالکل شوٹ نہیں کریں گے اور ہمارے ساتھ سلوک بھی قانون کے عین مطابق ہوگا... لیکن یہاں کا قانون کیا ہے؟ یہ شاید تم نہیں جانتے۔“

”کیا قانون ہے؟“

”یہ تو طے ہے کہ میری اور تمہاری کم سے کم سزا موت ہوگی اور موت یہاں بڑے بڑے طریقے سے دی جاتی ہے۔ تمہیں پھانسی چڑھنے... اور سولی چڑھنے کا فرق معلوم ہے؟“

میں خاموش رہا۔

وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”پھانسی میں گلے میں رستا ڈال کر لٹکایا جاتا ہے اور سولی میں مجرم کو لٹکڑی کے کراس پر کیل ٹھونک کر ٹانگ دیا جاتا ہے... یوں کر کے۔“

اس نے اپنا اکلوتا بازو پھیلا کر کراس کی شکل بنانے کی ادھوری کوشش کی۔ پھر شراب کا ایک طویل گھونٹ بھر کر بولا۔ ”میں نے جارج کی جیل میں لوگوں کو سولی چڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بھی وہیں پر سولی چڑھایا جائے گا۔ وہ مرنے کے لیے بہت بڑی جگہ ہے اور وہ طریقہ بھی بہت بُرا ہے۔“

اس نے ذرا توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”پرانے طریقے کے مطابق جلا د پہلے مجرم کے جسم کے جوڑ توڑتا ہے۔ یہاں سے... یہاں سے... اور یہاں سے...“ اس نے اپنے منحنی، گھٹنے، کوٹھے اور کہنی وغیرہ کے جوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”پھر اس بد نصیب کی آنکھیں نکالی جاتی ہیں اور بعض اوقات کان بھی کاٹ لیے جاتے ہیں۔ تب اسے لٹڑی کے کراس پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کندھوں میں چھ لمبی میخیں گاڑی جاتی ہیں... اور اسے کھلی جگہ پر آخری سانس لینے کے لیے لٹکا دیا جاتا ہے۔“

جیک جو کچھ کہہ رہا تھا، اس قسم کی بات میں نے دوران سفر حجام عبدالرحیم سے بھی سنی تھی۔ اس نے جارج کی جیل کا احوال سناتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں مجرموں کو بہت بُرے طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ دوسرے قیدیوں کے لیے عبرت کا سامان مہیا کرنے کے لیے ایسی تمام سفاکانہ سزائیں سرعام دی جاتی ہیں۔

”تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟“ میں نے باروندا جیک

سے پوچھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”میری رائے تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں۔ میں اپنی کشتی میں مرنے چاہتا ہوں لیکن لگتا ہے کہ اب حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دیں گے... اور جب موت کشتی میں نہیں آتی تو پھر کہیں بھی آجائے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تو آپ گرفتاری دینا نہیں چاہتے؟“

”ہرگز نہیں، اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو کر لو لیکن اس سے پہلے اپنی یہ رائے مجھے دے دینا... تاکہ میں ان حرامیوں میں سے دو چار کو شوٹ کر کے خود کو گولی مار سکوں۔“

”میرے خیال میں، میں بھی لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کروں گا۔“ میں نے پورے یقین سے کہا۔

اسی دوران میں میگافون پر منحوس آواز پھر سنائی دینے لگی۔ اس مرتبہ آواز میں جھلٹا ہٹ نمایاں تھی۔ پانڈے نے کہا۔ ”دس منٹ پورے ہو چکے ہیں۔ ہم تمہیں آخری بار باہر آنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔“

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”پانڈے! تم سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میرا ارادہ تھا کہ پانڈے کے سامنے آتے ہی دو چار گولیاں اس کے سینے میں ٹھونک دوں پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے، ہو جائے۔

”تم کون ہو؟“ پانڈے نے پوچھا۔

”تم مجھے مہروز کے نام سے جانتے ہو۔ میں مختار راجپوت کا داماد ہوں۔“

چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ میری سمت حرکت کر آیا۔ پانڈے کی آواز گونجی۔ ”تم اپنی رائفل پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ پھر تم سے بات ہو سکتی ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ پانڈے جیسا گھاگ شخص اتنی آسانی سے خود پر حملے کا موقع نہیں دے گا۔ عین ممکن تھا کہ میرے سامنے آتے ہی مجھے شوٹ کر دیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی کھنڈر پر ہلا بول دیا جاتا۔

میں نے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جو کر سکتا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آواز کے رخ پر کوئی چلائی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فارے کیے اور اس کے ساتھ ہی یہ امید کی کہ ایک آدھ گولی رنجیت پانڈے کو لگ گئی ہوگی۔

میری فارنگ کے ساتھ ہی جیسے کسی طوفان کا بند ٹوٹ گیا۔ گولیاں مینہ کی طرح کھنڈر کے درود یوار پر برسنے لگیں۔ میں ایک محفوظ آڑ میں تھا، جم کر جوابی فارنگ کرنے لگا۔ ج

کہتے ہیں کہ لڑائی کا انتظار لڑائی سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ ایک بار جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو پھر وہ اتنی خوفناک اور تکلیف دہ نہیں رہتی۔ میں نے اپنی فارنگ کے جواب میں ایک کرب ناک آواز سنی۔ یہ میرے مد مقابلوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی، جسے گولی لگی تھی۔ اس آواز نے میرے اندر چنگاریاں سی بھر دیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اس طرح کی مزید آوازیں سنوں۔

اگلے تین چار منٹ میں، میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ میرے حریفوں نے جتنی بار پیش قدمی کرنی چاہی، میں نے انہیں روک دیا۔ میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ اس کے باوجود دو تین افراد میری فارنگ سے ”ہٹ“ ہوئے۔ اس دوران میں، میں نے تیزی سے پوزیشنیں بدلیں، رائفل کے میگزین تبدیل کیے اور جیک سے گفتگو بھی جاری رکھی۔ وہ میرے لیے میگزین بھر رہا تھا۔ میگزین کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر وہ اس میں اپنے اکلوتے ہاتھ سے گولیاں ٹھونس سکتا تھا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا اور اس کا اندازہ اس کی باتوں سے ہو رہا تھا۔ فارنگ کے ساعت شکن شور میں وہ بکا کر بولا۔ ”شاباش... لڑتے ہوئے مرنے سے ڈرتے ہوئے نہیں مرنے۔“

”آپ بے فکر رہو۔ آخری گولی تک لڑوں گا۔“ میں نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں... نہیں۔ آخری گولی تک نہیں۔“ جیک کی آواز ابھری۔

”کیا مطلب؟“

”آخری دو گولیاں بچا کر رکھنی ہیں۔ ایک میرے لیے... اور ایک، چاہو تو اپنے لیے۔“

بکا بیک ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ مجھے جیسے کسی مست ہاتھی نے ٹکڑے ماری تھی۔ میں اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ ٹرپل ٹوراٹل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میرا سر بڑے زور سے پتھر کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ آنکھوں میں نیلے پیلے تارے ناچ گئے۔ میرے ذہن نے بکا کر کہا، مجھے دہشتی بم سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اضطرابی عمل کے تحت میں نے اپنے جسم کو ٹوٹ کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ صرف ایک پران میں سے خون رس رہا تھا۔ بارود کی تیز بو نتھنوں میں گھسی۔

”جیک! آپ ٹھیک ہو؟“ میں نے پکار کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بُری طرح کھانسنے لگا۔ لگتا تھا کہ اس کی سانس رک رہی ہے۔

میں نے گہرے اندھیرے میں رائفل کے لیے دیوانہ وار ہاتھ چلائے۔ وہ مجھے چیتل کی لاش سے پانچ چھ فٹ کی

دوری پر ملی۔ میں نے پیچھے کی طرف کھٹک آیا۔ گولیاں سنسنائی ہوئی دیواروں اور درختوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ گولیاں میرا کچھ بگاڑی نہیں سکتیں شاید کسی بھی شخص کی موت ان گولیوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔ ان گولیوں کا خوف دل و دماغ سے بالکل نکل گیا تھا۔ ہاں... اس کی جگہ دتی بم کے خوف نے لے لی تھی۔ مجھے پتا تھا، دتی بم ہوا میں قوس بناتا ہوا آئے گا اور کھنڈر کے اندر تک نقصان پہنچائے گا۔ میں اپنی رائفل کے ساتھ کچھ اور پیچھے ہٹ آیا اور تب مجھے دوسرا شدید ذہنی دھچکا لگا۔ میری رائفل تو رائفل استعمال کے قابل نہیں رہی تھی اور ایسا دتی بم کے زوردار دھماکے کے بعد ہوا تھا۔ دھماکے کے بعد رائفل کی لمبی میزھی ہو گئی تھی اور اپنی جگہ سے ایک ”بلی“ بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔

”فائر کیوں نہیں کر رہے ہو؟“ جسکی نے چلا کر پوچھا اور ایک بھرا ہوا میگزین میری طرف اچھالا۔

میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں سمجھ گیا تھا کہ اب یہ سارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ میں نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے اوپر سے چھانکا۔ نارجوں کی چند ایک روشنیاں کھنڈر کے عین سامنے پہنچ گئی تھیں۔ وہ لوگ گھبراہٹ کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ پانڈے کے کچھ کمانڈوز نے بلڈ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی ہیں۔ یہ خطرناک کمانڈوز کسی بھی ”چارج“ کر کے اندر گھس سکتے تھے۔

کچھ دیر پہلے جسکی نے مجھ سے کہا تھا کہ دو گولیاں بچا کر رکھنا۔ گولیاں تو بہت سی بچی ہوئی تھیں لیکن انہیں چلانے والا ہتھیار بیکار ہو چکا تھا۔

تو پھر اب کیا کرنا ہوگا؟ میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔

میرا دھیان اپنے شکاری چاقو کی طرف چلا گیا۔ تو کیا اس چاقو کو مضبوطی سے پکڑ کر دیوانہ دار اس کھنڈر سے نکلوں اور رائفل برداروں پر چارچوں۔ کسی کو مار تو شاید نہ سکوں لیکن اپنے مرنے کا حق تو ادا کر دوں؟ پھر ذہن جسکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا کیا بنے گا؟ کیا وہ زندہ پانڈے کے ہتھے چڑھ جائے گا؟ کیا اسے اس انجام سے بچانے کے لیے میں اسے اپنے اس چاقو سے قتل کر سکتا ہوں؟

بے شک... بے شک میں بہت تہذیب چکا تھا لیکن ابھی اتنا تہذیب بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک ایسے شخص کو جان سے مار سکوں جس کی میں دل سے عزت کرنے لگا تھا... اور جان سے مارنے کا کام مجھے کرنا بھی چاقو سے تھا۔

مجھے اپنی ہمت ٹوٹی ہوئی محسوس ہوئی۔ جسکی بھی بھانپ

چکا تھا کہ میرے فائرنگ نہ کرنے کا سبب کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟ وہ لوگ... وہ لوگ اندر گھسنے والے ہیں۔“

جسکی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اب بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کی سفاک آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے رائفل پھینک کر چاقو نکال لیا اور آخری لمحات کے لیے تیار ہو گیا۔ میری رائفل سے رستا ہوا خون میرے پاؤں تک پہنچ رہا تھا اور اس کی نمی مجھے اپنی جوتی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ ایک فائرنگ دھیمی ہوئی اور پھر ختم ہو گئی۔ مجھے کچھ دور افتادہ آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ شیشم، سفیدے اور بلوط کے دیو قامت گھنے درختوں میں چند افراد چلا چلا کر باتیں کر رہے ہیں۔

تب ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔

کھنڈر سے باہر ہر طرف شعلے رقص کرنے لگے۔ درو دیوار کی کرجیاں اڑنے لگیں اور شاخیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔

پر یہ انکشاف ہوا کہ اب فائرنگ کا آہنگ اور ہے۔ اب فائرنگ کا سارا زور ہماری دائیں جانب تھا۔ اور یوں لگا رہا تھا کہ دائیں جانب سے جوانی فائرنگ بھی ہو رہی ہے۔ چاروں طرف ایک دم کھرا م سناج گیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ جسکی کی آواز سنائی دی۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”لگتا ہے کہ کچھ اور لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔“

دھماکوں کے بے پناہ شور میں جسکی کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ اس کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔

میرے دل میں ایک دم نقارہ سا بجا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ہمارے سامنے یہاں موقع پر پہنچ گئے ہوں؟ مگر پھر فوج

میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ ہمارے سامنے باقی ہی کچھ

بچے تھے۔ انور خاں، چوہان، اسحاق اور جیل سے رہائی۔

والے دو بندے... یعنی کل پانچ افراد! مگر یہاں جس طرح

کی فائرنگ ہو رہی تھی، لگتا تھا کہ یہ ایک دو ڈھائی سو افراد

پوری طاقت کے ساتھ ایک دو سبے سے بھڑ گئے ہیں۔

طرف لکارے گونج رہے تھے اور ہتھیاروں کی کھٹکھٹ سنائی

دیتی تھی۔ زخمیوں کی پکار، گھوڑوں کی ہنہات، گولیوں کے

سرلائے اور دتی بموں کے دھماکے... میدان جنگ کا سا منظر

تھا۔ دتی بم کے ایک سماعت شکن دھماکے کے سامنے آن کر۔

اڑتا ہوا سا ہمارے جھوپڑے نما کمرے کے سامنے آن کر۔

میں نے تارچ کی روشنی چینی اور ششدر رہ گیا۔ یہ

فحش سبز وردی میں تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے پر

صاف اڑ گیا تھا اور گردن پر سے ٹھکی بھر گوشت غائب تھا۔ غالباً وہ یہاں گرنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

جسکی نے بھی سبز وردی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ پکار کر

بولا۔ ”یہ تو مل پانی کے لوگ ہیں۔“

”اور کافی تعداد میں ہیں۔“ میں نے اس کے فقرے

میں اضافہ کیا۔

میرے لیے سب سے خوش آمد چیز وہ رائفل تھی جو

سبز وردی والے کے ساتھ ہی چیتل کی لاش کے پاس گری

تھی۔ میں نے رائفل پکڑی اور سر کتا ہوا پیچھے آ گیا۔ یہ رائفل

میرے لیے بالکل اجنبی تھی لیکن تیار حالت میں تھی۔ میں نے

فریگر دہایا تو زبردست ترزاہٹ سے ایک برسٹ، لکڑی کی

بوسیدہ چھت میں جا لگا اور بہت سی منی ہمارے اوپر گری۔

میرے رگ دپے میں اعتماد اور جوش کی نئی لہر دوڑ گئی۔

میں نے رائفل پر گرفت مضبوط کر دی اور ایک دیوار کی اوٹ

لے کر چوکس بیٹھ گیا۔

دو تین پکارتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں

پڑیں۔ ان میں سے ایک منحوس آواز پانڈے کی بھی تھی۔ وہ

سخت طیش کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا

تھا۔ غالباً میری فائرنگ اسے شدید نقصان پہنچانے سے قاصر

رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں دو تین مختصر وقفوں کے سوا

زبردست فائرنگ جاری رہی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے

پستول سے لے کر برسٹ مارنے والی بڑی رائفلوں تک ہر

طرح کا ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ چوٹ برابر کی

ہے بلکہ مل پانی سے آنے والوں کو کچھ برتری حاصل ہے۔ مگر

ایک جگہ ایسی بھی جہاں سے پانڈے کے دو تین ساتھی بڑی

موثر فائرنگ کر رہے تھے اور مخالف فریق میں سے کسی کو آگے

پڑھنے نہیں دے رہے تھے۔ یہ جگہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر

تھی اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہاں تین افراد جی تھری

کن کے ساتھ موجود تھے۔

جسکی کا خیال بھی یہی تھا کہ جب تک پانڈے کے

بندے ٹیلے والی جگہ پر موجود ہیں، ان کا پلا بھاری رہے گا۔

پتا نہیں کیوں میرے دل میں آئی کہ میں یہاں اس کھنڈر کی

پناہ گاہ کو چھوڑ کر نکلوں اور بھاگتا ہوا اس ٹیلے پر پہنچ جاؤں۔

اندھا دھند گولیاں برساؤں اور اپنے سامنے آنے والے ہر

ذی روح کو چھلنی کر دوں۔ پھر مل پانی والوں کو میری لاش ٹیلے

کی بلندی پر سے ملے۔ میرے جسم پر گولیوں کے ان گنت زخم

ہوں۔ وہ لوگ میری لاش کو مل پانی لے جائیں... اور...

میرے کردار پر لگے ہوئے بزدلی و کم ہمتی کے سارے داغ

میرے لہو سے دھل جائیں۔

سوچنے اور عمل کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں بھی سوچ

رہا تھا لیکن عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے اندر انقلاب ضرور آیا

تھا مگر ابھی یہ انقلاب اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ میں ایسا

بڑا قدم اٹھا سکتا۔

اچانک فائرنگ دھیمی پڑ گئی اور یوں لگا کہ فائرنگ کا

آہنگ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ درختوں میں حرکت کرتی ہوئی

روشنیاں تیزی سے بائیں طرف ہٹنے لگیں۔ جسکی نے پکار کر

کہا۔

”میرا خیال ہے کہ پانڈے کے لوگ بھاگ رہے

ہیں۔“

کچھ دیر بعد مجھے بھی لگا کہ جسکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں

نے دو گھوڑوں کو برق رفتاری کے ساتھ اپنے سامنے سے

گزر رہے دیکھا۔ ان پر سبز اور خاکی وردیوں کی جھلک نظر

آئی۔ دائیں طرف سے ہونے والی فائرنگ ایک دم زور پکڑ

گئی تھی۔ جو فائرنگ بائیں جانب سے ہو رہی تھی، وہ کم

ہونے کے ساتھ ساتھ دور بھی چلی گئی تھی۔

یہاں ایک کھنڈر کے بالکل سامنے سے ایک گرجتی ہوئی

آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”تابش... تابش... تم کہاں

ہو؟“

میری رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ سر سے پاؤں تک

جوش کی ایک لہر چلی اور پھیل گئی۔ یہ ہمارے یار غار... شیر دل

انور خاں کی آواز تھی۔

میں نے پکارا۔ ”میں یہاں ہوں انور بھائی۔“ اس

کے ساتھ ہی میں نے تارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔

انور خاں اور اسحاق عقابوں کی طرح جھپٹتے ہوئے

اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ سبز وردیوں والے چار پانچ

افراد بھی تھے۔ انور خاں کا چہرہ جوش سے تھما رہا تھا۔ وہ سرتاپا

ایک جنگجو پٹھان نظر آتا تھا۔ ہم بغل گیر ہو گئے۔ وہ میرا ہاتھ

چوم کر بولا۔ ”یار! ایک دم کہاں چلے گئے تھے تم؟ بڑا پریشان

کیا تم نے۔“

اسحاق بھی مجھ سے بغل گیر ہوا۔

یہ تفصیلی بات کا وقت نہیں تھا۔ اکاؤنٹ فائر بھی تک

ہو رہے تھے۔

دو مسلح افراد جسکی کے پاس رک گئے۔ ہم کھنڈر سے

باہر نکل آئے۔ مجھے سامنے ہی درختوں کے نیچے پانچ چھ افراد

کی لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے زیادہ تر زرگاں کے تھے۔

ایک بارشی گڑھے میں ایک گھوڑا بھی مردہ پڑا تھا۔ ٹیلے کے

ارد گرد بھی جانی نقصان ہوا تھا... دو تین لاشیں میں نے اپنی

ہمیشہ کے لیے

ایک جگہ دعوت
تھی۔ بہت سے مہمان
جمع تھے۔ ان مہمانوں
میں مارک ٹومین اور

ایک نوجوان مصنف بھی شامل تھے۔ جب
سارے مہمان کھانا کھا چکے تو وہ گھر کی آرائش و
زیبائش دیکھنے میں محو ہو گئے۔ نوجوان مصنف
کی نظر کتابوں کی ایک خوب صورت الماری پر
پڑی۔ وہ کتابیں دیکھنے لگا، اس کو چند کتابیں
بہت پسند آئیں۔ اس نے میزبان سے کہا۔
”جناب والا! کیا یہ چند کتابیں آپ کچھ دنوں
کے لیے عاریتاً دے سکتے ہیں؟“

میزبان نے صاف انکار کر دیا۔
”نہیں... ہرگز نہیں۔“
نوجوان مصنف کو بڑی تکلیف پہنچی۔
مارک ٹومین نے اس کی یہ حالت جو دیکھی تو
کہا۔ ”دوست! تمہیں میزبان کے انکار سے
آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ لوگ کتابیں
عاریتاً لے جاتے ہیں اور پھر واپس نہیں کرتے،
ذرا خیال تو کرو یہ ساری کتابیں ایسی ہی تو ہیں
جنہیں ہمارے میزبان نے وقتاً فوقتاً عاریتاً
حاصل کیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس الماری
میں جگہ پا گئیں۔“

نائلہ علی کی کراچی سے کاوش

بھی تمہارے لیے پریشان تھے۔ ہم کل رات تمہیں ڈھونڈتے
رہے۔ پھر ہمیں خبر ملی کہ پاٹلے اور اس کے ساتھ ستر سائھی
پرانی چوکی پر موجود ہیں۔ انہوں نے چوکی کے گرد گھیراؤ لایا ہوا
ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پاٹلے نے جس شخص کو
گھیر رکھا ہے، وہ تم ہی ہو۔ جسکی کے بارے میں مجھے کچھ
اندازہ نہیں تھا۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ یہاں پہنچ گئے اور
پھر جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھا ہی ہے۔“

”بہت وقت پہنچے تم لوگ۔ میں تقریباً بے بس ہو چکا
تھا۔ تم نے میری رائفل دیکھی ہی ہے، اس کا بیرل ہی بیکار ہو
گیا تھا۔“

”شاید ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر لگتی لیکن یہاں پہلے سے
فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس فائرنگ نے ہمیں راستہ دکھایا۔“
”سلطانہ کیسے زخمی ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

میں دکھاتا نہیں چاہ رہی تھی۔ چوہان نے نو عمر لڑکے کے ساتھ
مل کر اسے بہ مشکل میرے قدموں سے علیحدہ کیا۔ وہ پہلو کے
بل ایک طرف جا پڑی۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں پوشیدہ
تھا۔

انور خاں مجھے دلاسا دیتے ہوئے ایک طرف لے
گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میری
سمجھ میں نہیں آ رہا یہ سب کیا ہے؟“
انور خاں نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔
اس نے کہا۔ ”تاہی! ہمارے بعد تل پانی اور زرگاں میں
حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ اس حرام زادہ
ماریا کے ہمارے ہاتھ سے نکلنے کے بعد حکم اور جارج ایک دم
شیر ہو گئے ہیں۔ وہ بڑے جوش میں ہیں اور جوش میں ہندے
سے بے وقوفیاں بھی ہوتی ہیں۔ حکم جی نے کل دوپہر پورے
میں ہندوں کو زرگاں کی جیل سے نکال کر سر عام سولی چڑھا دیا
ہے۔ ان پر بغاوت اور غداری کے الزام لگائے گئے ہیں۔ یہ
سب کے سب مسلمان تھے اور ان لوگوں میں شامل تھے
جنہوں نے پچھلے بدھ کی مہج جارج کی رہائش گاہ پر حملہ کیا اور
وہاں سے سلطانہ اور اس کے بچے کو نکالا۔“

”یہ تو واقعی ظلم ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔
”اس ظلم نے پوری اسٹیٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔“
چھوٹے سرکار اور مراد شاہ نے اب تک بہت خل سے کام لیا
ہے۔ لیکن اب حالات کو سنبھالنا ان کے بس میں بھی نہیں
رہا۔ کل سہ پہر حکم جی کے کچھ سپاہی تل پانی کی ایک قریبی بستی
میں گھس گئے۔ وہ وہاں اپنے دو مزدور قیدیوں کو پکڑنا چاہتے
تھے۔ ان میں سے ایک مراد شاہ کا ہم زلف بھی ہے۔ اس
واقفے کے بعد حکم جی اور چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں
جھڑپ ہو گئی۔ یہ پہلی براہ راست جھڑپ تھی اور یہ دیکھتے ہی
دیکھتے زوردار لڑائی میں بدل گئی۔ وہاں دونوں طرف کے کم
از کم چالیس ہندے مارے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو
زبردست جھڑپیں اور ہوئی ہیں جن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے
والی جھڑپ بھی شامل ہے۔“

یہ اطلاعات سنسنی خیز تھیں۔ میں نے انور خاں سے
پوچھا۔ ”یہ سلطانہ آپ کو کہاں ملی؟“

”مراد شاہ کے حکم پر کچھ لوگ تل پانی سے ہمیں تلاش
کرنے کے لیے نکلے تھے۔ سلطانہ بھی اصرار کر کے ان میں
شامل ہو گئی۔ ساتھ میں جو نو عمر لڑکا ہے، وہ اس کا بھتیجا طلال
ہے۔ ان لوگوں سے ہماری ملاقات وہیں جو ہڑ کے کنارے
پر ہوئی جہاں سے تم پرسوں رات رفو چکر ہوئے تھے۔ سلطانہ
کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ تم ہمارے ساتھ موجود نہیں ہو۔ ہم

جلدی ہی ہم باروندا جیل کے پاس چوکی کے کھنڈر میں
واپس آ گئے۔ یہاں اب بہت سے افراد جمع ہو چکے تھے۔ وہ
سب تل پانی کے سپاہی تھے۔ ان کے چہروں پر فالتو رنگ
تھا۔ وہ جیل میں بہت دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ جسکی نئے میں
اوٹ پٹانگ بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے چوہان سے سرگوشی
میں پوچھا۔ ”یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ تل پانی کے سپاہی تو اس
معاملے میں غیر جانب دار تھے۔ وہ اس لڑائی میں کیسے
آ گئے؟“

”بس آ گئے... بلکہ کود پڑے... اور علی الاعلان کود
پڑے۔“ چوہان کی آواز میں چھپا ہوا جوش نمایاں ہو گیا۔
”میں سمجھا نہیں۔“

اس نے میرا کندھا دیا۔ گرفت میں جذباتی کیفیت
تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”تل پانی والے میدان میں آ گئے
ہیں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔
پچھلے چوبیس گھنٹے میں تین جگہ زبردست ٹاکرا ہوا ہے۔“
اس دوران میں انور خاں نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔
”تاہی! آؤ تمہیں اپنے اس ساتھی سے ملوؤں جس کی وجہ
سے ہم حکم کے کتوں کو یہاں سے بھگانے میں کامیاب
ہوئے۔“

”کون ہے یہ؟“ میں نے پوچھا۔
”وہی جو اپنی جان سخت خطرے میں ڈال کر میرے
چڑھا۔ اس نے جی تھری چلائے والے دو سپاہیوں پر تلواریں
دار کیے اور ان کا قتلہ پاک کیا۔“

انور خاں اور چوہان مجھے لے کر مجھے درختوں میں
گھسے۔ یہاں ابھی تک دھواں اور بارود کی بو تھی۔ ایکہ بند
خٹک جھاڑیوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یقیناً ایسا کسی دہشت گرد
کے دھماکے کی وجہ سے ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے قریب ہی زمین
پر دو تین زخمی پڑے ہوئے تھے۔ انور خاں نے مجھے، چادر
میں لپیٹے ہوئے ایک زخمی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔
ایک نوجوان لڑکا اس زخمی کے پاؤں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ مجھے
لگا کہ یہ زخمی کوئی عورت ہے۔ اچانک وہ عورت حرکت میں
آئی۔ اور میرے قدموں میں گر پڑی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی
تھی۔ اس کی آواز نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ وہ
کوئی اور نہیں سلطانہ تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانا
چاہا لیکن وہ میرے پاؤں سے لپٹی رہی۔
”مجھے معاف کر دو مہر و ج... مجھے معاف کر دو۔“ وہ
بس یہی کہتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنا منہ سر لپیٹ لیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اپنی شکل

آنکھوں سے دیکھیں۔ سبز وردیوں والے افراد زخموں کو اٹھا
رہے تھے اور یہاں وہاں بکھرے ہتھیار اور پکڑیاں وغیرہ
اکٹھی کر رہے تھے۔ ایک شخص جھکا اور اس نے خود روگھاس
میں سے، دھات کی بنی ہوئی کوئی چیز اٹھائی۔ انور خاں نے
تاریج کی روشنی میں دیکھا۔ یہ ایک اپنی راڈ تھا۔ اس پر افقی
رخ پر تین چار چھوٹے راڈ لگے ہوئے تھے۔ عقب میں ایک
گول جالی سی تھی۔ دیکھنے میں یہ بی بی ایشیا جیسا تھا۔ اندازہ
ہوتا تھا کہ بھاگنے والے دیگر کئی چیزوں کی طرح یہ آلہ بھی
چھوڑ گئے ہیں۔

اسی دوران میں کسی نے عقب سے مجھے دیو بچ لیا۔ یہ
زبردست دوستانہ گرفت تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ ڈاکٹر
چوہان تھا۔ تاریج کی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں نمی
دکھائی دی۔ اس کا زخمی کندھا پیٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ فائرنگ
تھم چکی تھی لیکن ایک گرم ماؤزرا بھی تک چوہان کے ہاتھ میں
تھا۔

”یہ سب کیا ہے چوہان؟ اتنے سارے لوگ تمہارے
ساتھ؟ ہم تو صرف چھ ہندے باقی بچے تھے؟“ میں نے
پوچھا۔

”دو بولا۔“ تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہم چھ نہیں، صرف پانچ
بچے تھے۔ تم تو جو ہڑ کے کنارے پیشاب کرنے کے یہاں
نکل گئے تھے اور جس وجہ سے نکلے تھے، وہ میں اچھی طرح
جانتا ہوں۔ بہر حال... یہ جو کچھ ہوا ہے، تم اسے اللہ کی مدد
کہہ سکتے ہو۔ حالات ایک دم بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم
ابھی تمہیں تفصیل بتاتے ہیں۔“ چوہان نے کہا۔ اس کی آواز
میں ایک جوشیلی لہر تھی۔

انور خاں اور دیگر افراد ٹیبلے پر چڑھ گئے۔ میں بھی ان
کے ساتھ گیا۔ یہاں اب تل پانی کے سرخ سپاہیوں نے
پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ ٹیبلے پر دو خاور درختوں کی اوٹ
میں گولیوں کے بے شمار خول پڑے تھے اور ایک بڑی گن
تھی۔ انور خاں نے بتایا کہ یہ جی تھری ہے۔ یہاں اس منظر
میں موجود سب سے اہم چیز دو انسانی لاشیں تھیں۔ یہ دونوں
پاٹلے کے ساتھی تھے۔ ان کی سبز اور خاکی وردیاں لہو رنگ
تھیں۔ تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ ان کے جسم پر
گولیاں نہیں لگیں بلکہ کسی تیز دھار آلے سے وار کیے گئے
ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جی تھری گن چلانے والے ان
دو افراد کی ہلاکت کے بعد ہی لڑائی ختم ہو سکی ہے۔ انور خاں
نے یہ شان دار گن اور اس کا سارا فالتو ایونیشن اپنے قبضے
میں لے لیا۔ دونوں افراد کی خونچکاں لاشیں وہاں سے اٹھوا
دی گئیں۔

”جیسے ایک بہادر سپاہی ہوتا ہے۔“ انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بڑی انوکھی لڑکی ہے تابش! اور اس کا انوکھا پن پچھلے دو تین سالوں میں بہت دفعہ ثابت ہوا ہے۔ تم تو بہت سی باتیں بھول چکے ہو لیکن حقیقت تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔“

”سلطانہ نے لڑائی میں حصہ لیا ہے؟“
”حصہ ہی نہیں لیا، لڑائی جیتی نہیں ہے۔“ وہ بہت جذباتی انداز میں بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ”یقیناً تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ جی تھری اور اس کو چلانے والوں کو سلطانہ نے ہی ٹھنڈا کیا ہے۔ لڑائی کے دوران میں پتا نہیں وہ کس وقت پیچھے سے آئی اور اپنے پیچھے طلال راجپوت کے ساتھ ٹیلے پر چڑھ گئی۔ دونوں کے پاس خاندانی تلواریں تھیں۔ انہوں نے جی تھری چلانے والوں کو چیر کر رکھ دیا۔ پھر ہمیں آوازیں دیں کہ ہم ٹیلے پر آجائیں۔“
”میں سنائے میں تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔“ وہ زیادہ زخمی تو نہیں؟“

”نہیں، پاؤں اور ٹانگ پر ایک دو زخم آئے ہیں۔ چوہان اسے سنبھال لے گا۔“

”اور بچہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ وہیں تل پانی میں... چاچا عبدالغنی کے پاس۔ سنا ہے کہ وہ اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی۔ وہ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اب ایک اور عورت اسے دودھ پلا رہی ہے۔“

”میں کچھ نہیں بولا۔ انور خاں بھی خاموش رہا۔ کوئی زخمی بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ پس منظر میں گھوڑوں کی مضطرب ہنہناہٹ سنائی دیتی تھی۔ تل پانی کے باوردی سپاہی پوری طرح چوکس تھے۔ ان میں سے بیشتر کی رائفلیں ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھیں۔“

انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اے تمہاری بہت زیادہ ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ جو زخم اسے لگے ہیں اسے صرف تم ہی بھر سکتے ہو۔“
”میں کیا کروں؟“

”میں اس بارے میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ سلطانہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنے شوہر کو زبانی کلامی نہیں، واقعی مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ تم اگر ٹھان لو کہ تم نے اسے نازل کرنا ہے تو یہ ناممکن نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، سیٹی کی مدھم

سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بار بار ابھر رہی تھی۔ پھر یہ آواز قریب آتی چلی گئی۔ ایک باوردی شخص نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی پر ہلکے پیلے رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں اعلیٰ عہدہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہی انشینا نما شے تھی جو ٹیلے کے پاس جھاڑیوں سے ملی تھی۔ سیٹی یا پیپ کی آواز اسی میں سے آرہی تھی۔ اس باوردی شخص نے انور خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بھائی! اس میں سے یہ آواز آرہی ہے۔ شاید اس کا کوئی کھنکا دب گیا ہے۔“

آواز کے ساتھ ساتھ انشینا پر ایک ننھا سا بلب بھی اسپارک کر رہا تھا۔ اسی دوران میں چوہان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انشینے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چوہان نے باوردی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اے! انشینے کو لے کر ٹیلے کی طرف جاؤ۔“

اسے نامی وہ شخص انشینے کے ساتھ ٹیلے کی طرف بڑھا۔ جب وہ پچاس ساٹھ قدم چلا گیا تو چوہان نے پکار کر پوچھا۔ ”سیٹی کی آواز کم ہوئی؟“
”ہاں... بلکت ہے کہ ذرا کم ہو گئی ہے۔“ اسے نے بھی پکار کر کہا۔

”اب اور آگے جاؤ۔“
اے پھر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد چوہان نے پھر بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ اس بار بھی اسے کا جواب اثبات میں تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہاں... کچھ اور کم ہوئی ہے۔“
چوہان نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”کچھ سمجھ میں آیا؟“

میرے دماغ میں بھڑکی سی جھوٹ گئی۔ ایک دم میری ذہن اصل صورت حال کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو یہی وہ ریسپر تھا جس کے ذریعے میرا کھوج لگایا جاتا تھا... اور یہی ریسپر بانڈے اور اس کے ساتھیوں کو مقناطیس کی طرح یہاں اس کھنڈر چوکی تک پہنچ لایا تھا۔

ارد گرد اور لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر اس بارے میں تبصرہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اور چوہان ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

میرا بھوک سے بڑا حال تھا۔ دیکھا جاتا تو پچھلے تقریباً 48 گھنٹے سے میرے منہ میں اتاج کا ایک دانہ تک نہیں گیا تھا... انور خاں نے میری صورت سے ہی میری کیفیت کا اندازہ لگالیا۔ اس نے فوری طور پر میرے لیے خشک گوشت اور پانی کا انتظام کیا۔ نمکین گوشت کے چند ٹکڑے کھا کر اور

ٹھنڈا پانی پی کر میرے جسم میں جیسے جان آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ بھوک اور ذائقے کا آپس میں کتنا گہرا اور حیرت انگیز تعلق ہے۔ بھوک نہ ہو تو قانیو اسٹار ہوٹل کا بونے بھی بیکار اور بھوک ہو تو روٹی کے سوکھے ٹکڑے بھی ہفت رنگ دسترخوان کی طرح۔

اجالا ہونے سے پہلے ہی ہم تل پانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جنکی بھی ایک گھوڑے پر سوار ہمارے ساتھ تھا۔ پاٹڑے کے ساتھیوں میں سے تین افراد زخمی حالت میں ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی مشکلیں کس کے انہیں اوندھے منہ گھوڑوں پر لا دیا گیا تھا۔ اس خوں ریز لڑائی میں پاٹڑے اور اسٹیل وغیرہ کے چودہ ساتھی ہلاک ہوئے تھے۔ اے اور انور خاں کے ساتھیوں میں سے آٹھ نو بندوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو بعد ازاں پھنڈروں کے ذریعے وہاں سے ہٹایا جاتا تھا۔ نو دس بجے کے قریب ہم تل پانی میں داخل ہو گئے۔ پہلی بار میں چند ہفتے پہلے سلطانہ اور رسم کے ساتھ اس خوب صورت بستی میں داخل ہوا تھا۔ اس بار بھی سلطانہ میرے ساتھ تھی لیکن کسی اجنبی کی طرح۔ راستے میں بھی وہ بالکل الگ تھلگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور منہ سر پینے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔ وہ بس اپنے پیچھے طلال سے تھوڑی بہت بات کرتی تھی۔ اس کے مزاج میں عجیب سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔

نئی جیل کے کنارے تل پانی کی بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ نیم پختہ راستوں پر گھوڑا گاڑیاں حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ گھاکرے چولی والی عورتیں اور رنگ برنگی پگڑیوں والے مرد روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ سرسبز دھوانوں پر بکریوں اور گائے بھینسوں کے ریوڑ چر رہے تھے۔ جمیل پر تیرتی کشتیوں کے پس منظر میں مڑشکوہ عمارتوں کے کلس سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ گھنے جنگلوں کے پتوں سے یہ واقعی ایک دلکش بستی تھی۔

تل پانی میں مجھے دو نئی چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو ہر چہرے پر ایک جوش سا تھا۔ دوسرے میں نے کئی نوجوانوں کے کندھوں پر رائفلیں دیکھیں۔ مجھے لگا ایسا موجودہ صورت حال کی وجہ سے ہے۔ ہم بستی کے بارونق علاقے میں داخل ہوئے تو جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔ کچھ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں بھی لوگ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور نعرے لگائے۔ ایک چوک میں کچھ جو شیلے نوجوانوں نے اے جے کو گھیر لیا اور اس کے ساتھ انور خاں کو بھی۔ پھر ان دونوں کو کندھوں پر اٹھالیا گیا۔ صورت حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج رات کھنڈر کے

سائے والی جھڑپ اور جیت کی خبر عام لوگوں تک پہنچ چکی ہے۔

ہمیں سیدھا دیوان میں لے جایا گیا۔ دیوان کے صدر دروازے پر ہم نے جھومتے ہوئے ہانگی دیکھے۔ دیوان، وہی وسیع و عریض عمارت تھی جس کے اندرونی حصے میں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ وغیرہ کی رہائش گاہیں تھیں۔ اسی عمارت کے ایک حصے میں، میں نے چھوٹے سرکار کی عدالتی کارروائی بھی دیکھی تھی۔ چوہان مجھے لے کر تین چار کمروں کی ایک خوب صورت رہائش گاہ میں آگیا۔

”سلطانہ کہاں ہے؟“ میں نے چوہان سے پوچھا۔
”ہمیں پر ہے۔ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔

”لیکن مجھے تو پتا چلتا تھا کہ وہ چاچا عبدالغنی کے گھر میں ہے؟“

”حالات خراب ہو گئے ہیں۔ عبدالغنی کے گھر میں اسے خطرہ ہو سکتا تھا۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر اسے یہاں لایا گیا ہے۔“
”اور بچہ؟“

اس سے پہلے کہ چوہان جواب میں کچھ کہتا، بچے نے خود ہی جواب دے دیا۔ اس کے رونے کی آواز آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک ملازمہ بچے کو گلے سے لگائے اس کی پیٹھ ٹھپکتی ہوئی برآمدے میں سے گزری۔

”یہی مسلمان عورت ہے جو تمہارے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ میرے خیال میں صفیہ نام ہے اس کا۔ اس کا اپنا بچہ بھی یہیں پر ہے۔“

اسی دوران میں عقبی کمرے سے سلطانہ کے کراہنے کی آواز آئی۔ چوہان مدھم آواز میں بولا۔ ”سلطانہ کو معمولی پر لانے کے لیے تمہارے پاس یہ بہترین موقع ہے۔ وہ زخمی ہے۔ اسے تیمارداری کی ضرورت ہے۔ تمہاری ہمدردی اس کے لیے مرہم کا کام دے گی۔ تمہاری خاطر اس نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں تابش! اب وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ سمجھو کہ نیم مردہ ہو گئی ہے۔ تم اسے سہارا دو گے تو پھر سے جی اٹھے گی۔“

چوہان نے اپنے بیک میں سے چند دوائیں نکال کر مجھے دے دیں۔

باروندا جنکی کو بھی دیوان کے اندر ہی ایک دوسری جگہ رکھا گیا تھا۔ چوہان نے مجھے اس کے بارے میں تسلی دی کہ وہ بالکل خیریت سے اور محفوظ جگہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اسے وافر مقدار میں شراب بھی مہیا کر دی گئی ہے۔ چوکی کے کھنڈر

میں جنگی کے ساتھ اپنی ڈرامائی ملاقات کی تفصیل میں انور خاں اور چوہان کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔

اس گھر میں میرے، سلطانہ اور بالو کے علاوہ تین افراد اور موجود تھے۔ ایک تو وہی صفیہ نامی عورت جو بالو کو دودھ پلا رہی تھی۔ دوسرا گونا ملازم ہاشم اور تیسرا سلطانہ کا جواں سال بھتیجا طلال۔ طلال کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم کھلے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے وہ دو چار سال بڑا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ اجلا اور آنکھوں میں دلیرانہ چمک تھی۔ وہ سلطانہ کو بڑی محبت سے چچی جی کہتا تھا۔ میں نے اسے بس دو چار دفعہ ہی بولتے سنا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں خاموشی سے سلطانہ کے کمرے میں چلا گیا۔ میرے پاس چوہان کا دیا ہوا مرہم اور پیٹی وغیرہ تھی۔ وہ ایک آرام دہ بستر پر مائل اوڑھے لیٹی تھی۔ فرش پر کپاس کی پھول دار چٹائی بچھی تھی اور اس کے پھول لائین کی زرد روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے سر ہانے دودھ کا گلاس ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ جاگ رہی تھی۔ اس کا زخمی پاؤں جس پر پیٹی بندھی تھی، کمبل سے باہر تھا۔ میں نے پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے زخمی پاؤں کو چھوا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف، گریز، شرمندگی، بہت کچھ یکجا ہو گیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ”مہر و ج... یہ... کیا کر رہے ہو؟“

”تمہارے پاؤں پر دوا لگانے لگا ہوں۔“

”خدا کے لیے تائیں... ایسا مت کرو... مجھے گناہ گار نہ کرو۔“ اس نے اپنا پاؤں سمیٹ کر کمبل میں کر لیا۔

”اس میں گناہ والی کیا بات ہے؟“

”تائیں... تم میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگاؤ۔ اس سے مجھے گناہ لگے گا۔“

”کیوں؟ کیا اس لیے کہ میں تمہارا شوہر ہوں؟“

اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔“

”تو اگر میں تمہارا شوہر ہوں تو تم مجھ سے دور کیوں ہو... میری بات کیوں نہیں مان رہیں؟“

”میں نے تمہیں کہا ہے نا، میں تمہارے قابل تائیں۔ میری ناپاکی تمہیں بھی ناپاک کر دے گی۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں مہر و ج! میرے بچے کو لے کر مجھ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ میں تائیں چاہتی کہ میری چھایا بھی تم دونوں پر پڑے۔“

”دیکھو سلطانہ! جو کچھ ہوا، وہ بڑا تھا لیکن جو کچھ تم اب کر رہی ہو یہ بہت ہی بُرا ہے۔ ایک طرف تم مجھے اپنا شوہر کہتی

ہو، دوسری طرف تمہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ میں دوا لگانے کے لیے ہی تمہارے جسم کو ہاتھ لگاؤں۔ تم اس معصوم بچے کو بھی بھوکا مار رہی ہو جس کی خوراک اللہ نے تمہارے جسم کے اندر رکھی ہے۔ تم دنیا میں کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کے ساتھ اس طرح کا ظلم ہوا ہے۔ بے شک وہ تکلیف دہ حادثہ تھا لیکن ایسے حادثوں کے بعد بھی لوگ سنبھلتے ہیں۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہیں اور نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں اب تک قصور وار نہیں سمجھا لیکن اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلو گی تو میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

اس نے سر جھکا لیا اور سسکیاں لے کر روتی رہی۔ کتنا فرق تھا اس سلطانہ میں اور اس سلطانہ میں جو کل رات کھنڈر کے سامنے اچانک اپنی خاندانی تلوار سونت کر نکلی تھی اور سینے پر چڑھ گئی تھی۔ اس نے وہ کیا تھا جو کوئی دوسرا نہیں کر سکا تھا۔ وہ واقعی انوکھی تھی۔

میں نے ذرا حکم سے کہا۔ ”اپنا پاؤں باہر نکالو۔“ وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ”میں نے کہا ہے، پاؤں باہر نکالو۔“ میں نے دوبارہ کہا۔

اس مرتبہ اس نے پاؤں سرکا کر کمبل سے باہر نکال دیا۔ میں نے اس کی وہ پٹی کھولی جو علی الصباح جنگل میں باندھی گئی تھی۔ اس کے پاؤں پر اوپر کی طرف زخم آیا تھا۔ غائبانہ دستی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا یہاں۔ میں نے چوہان کی ہدایت کے مطابق زخم کو روئی سے صاف کر کے مرہم لگایا اور تازہ پیٹی باندھ دی۔ اس کی پیشانی اور رخساروں پر بھی نیل موجود تھے۔ دوسرا زخم اس کی کہنی پر تھا۔ میں نے یہاں بھی دوا لگائی اور پیٹی باندھی۔ اس دوران میں وہ مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ میں نے کچھ عرصے پہلے جب اسے پہلی بار ایک نیم تاریک کھوہ میں دیکھا تھا تو وہ مجھے ایک نہایت مضبوط اور باہمت لڑکی نظر آتی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ شاید اس لڑکی کی آنکھ میں بھی آنسو نہیں آیا ہوگا اور شاید اس نے بھی آہ بھی نہ بھری ہوگی... اور آنے والے دنوں میں وہ واقعی ایسی ہی نکلی تھی۔ میں نے اسے کئی مشکلوں کا سامنا مردانہ وار کرتے دیکھا تھا لیکن یہ جو آخری آفت اس پر ٹوٹی تھی، اس نے اسے واقعی تو زچھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے حصے میں آنے والے تمام آنسو انہی دو چار دنوں میں بہا دینا چاہتی ہے۔ کچھ احساسات پر انسان کا بس نہیں ہوتا، شاید سلطانہ بھی ایسے ہی احساسات کی زد میں تھی۔

میں اس کے قریب بیٹھا رہا اور اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ میں نے اس سے تسلی بخشی کی باتیں کیں۔ میں نے اس حوالے سے اس پر اپنی احسان مندی ظاہر کی کہ وہ کل رات میرے

لیے بہت نیک شگون ثابت ہوئی ہے... اور حقیقت بھی یہی تھی کہ کل رات کھنڈر کے سامنے ہونے والی خونی لڑائی میں سلطانہ کا انوکھا کردار پوری طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ اگر اپنے بھتیجے طلال کے ہمراہ دیوانہ وار ٹیلے پر نہ پہنچتی اور جی تھری چلانے والوں پر ٹوٹ نہ پڑتی تو شاید... صورت حال کیا سے کیا ہو جاتی... اور شاید میں بھی اس وقت یہاں اس آرام دہ کمرے میں زندہ سلامت موجود نہ ہوتا۔

وہ سب کچھ سنتی رہی لیکن یوں لگ رہا تھا کہ بس اس کے کان سن رہے ہیں۔ اس کا باقی سارا جسم میرے الفاظ کی نرمی، شیرینی اور محبت سے لا تعلق ہے۔ وہ بس میری فرماں برداری کر رہی تھی کہ میرے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں چھ سات ماہ کے بالو نے رونا شروع کر دیا۔ اس کا رونا بلند ہوتا گیا۔ اس کی آواز میں اتنا درد تھا کہ ترس آنے لگا۔ جواں سال عورت صفیہ اسے شاید دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی... وہ چند سیکنڈ کے لیے چپ ہوتا تھا پھر آہ و پکار شروع کر دیتا تھا۔

”یہ آواز سن کر تمہارا دل نہیں کانپتا سلطانہ؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے اچ تو تمہاری منت کرتی ہوں کہ اسے مجھ سے کہیں دور لے جاؤ۔ جن بچوں کی مائیں ان کے جنم کے وقت اچ مر جاتی ہیں، وہ بھی تو جلد رہتے ہیں اور پل جاتے ہیں۔ یہ تو پھر چھ سات ماہ کا ہے۔“

”تم اتنی پتھر کیوں ہو گئی ہو سلطانہ! میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔“

”میں کیا کروں مہر و ج! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے اپنے جسم سے گھن آتی ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں مہر و ج کہ اپنے بچے کو اپنی گود میں لے کر پیار کروں۔“

”تم ہو... تم ہو اس قابل۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”اور تمہیں ایسا کرنا پڑے گا... اگر نہیں کرو گی تو اس کا مطلب ہے کہ تم میری بیوی نہیں ہو اور نہ میں تمہارا شوہر ہوں۔“

میرے لب و لہجے نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔ اس نے پہلی بار سراٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے عقب میں سرخ انگارہ تھیں۔

میں تیزی سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں جا کر بالو کو لے آیا۔ اس کا رونا تو بند ہو چکا تھا لیکن ننھا سا سینہ مسلسل ہچکیوں سے دھل رہا تھا۔

میں نے اسے زبردستی سلطانہ کی گود میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لیے تو لگا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے گی لیکن پھر

اس نے پتا نہیں کس طرح ضبط کیا۔ میری نافرمانی کے خوف سے اس نے اسے بانہوں میں لے لیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا سارا وجود لرز رہا ہے۔ اس کے اناروں جیسے رخسار زرد ہو چکے تھے۔ ہونٹ سفید تھے اور جسم کی لرزش کچھ اس طرح تھی جیسے اسے تپ لرزہ ہو گیا ہو۔

بالو اس کی گود میں آتے ہی پرسکون ہو گیا تھا۔ وہ اپنی گول گول پیاری آنکھوں سے اسے دیکھتا ہوا گیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے بال اپنی منگی میں جکڑ لیے۔ جیسے کہہ رہا ہو... ”مجھ سے دور کیوں ہو گئی ہو؟ میں تمہیں کہیں نہیں جاسنے دوں گا۔“

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بالو کو دودھ پلائے لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کر سکے گی یا نہیں۔ میں اس پر ایک دم زیادہ دباؤ بھی ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اور بچے کو ایک ساتھ چھوڑ کر میں باہر آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو بالو ایک بار پھر زور و شور سے رورہا تھا۔ اس وقت اس کے رونے میں ایک طرح کا درد بھی لہریں لے رہا تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر اٹھ کر سلطانہ کے کمرے کی طرف گیا۔ بالو اور غلطانہ دونوں بستر پر موجود نہیں تھے۔ جواں سال ملازمہ صفیہ کمرے کے وسط میں پریشان کھڑی تھی۔

بالو کے رونے کی آواز غسل خانے کی طرف سے آرہی تھی۔ میں غسل خانے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا لیکن کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سلطانہ بالو کو نیم گرم پانی سے نہلا رہی تھی۔ وہ بالکل عریاں تھا اور اس کا سارا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سلطانہ ایک پتھر سے جیسے جھانواں بھی کہا جاتا ہے بالو کے نازک جسم کو گرہن رقی تھی۔ وہ درد سے لمبلا رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ میں گر جا۔

وہ چونک کر مجھ دیکھنے لگی۔ میں نے بالو کو اس کے صابن لگے ہاتھوں سے چھین لیا۔ وہ بیٹھ گئی اور دیوار سے سرکا کر پھر رونے لگی۔

اس نے بالو کو اتنے زور سے رگڑا تھا کہ کئی جگہ خراشیں آ گئی تھیں۔ ”تم اپنے ہوش میں تو ہو... یہ کیا کیا ہے تم نے؟“

”مہر و ج! تم نے بہت گلط کیا۔ اس کو میری گود میں ڈال دیا۔ تم کیوں اسے بھی میری طرح کلج کر دینا چاہتے ہو؟“

میں نے سلطانہ کو چند جھڑکیاں دیں اور بالو کو تو لیے میں لپیٹ کر کمرے میں لے آیا۔ سلطانہ نے غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ملازمہ صفیہ نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر

Scanned and Uploaded By Nadeem

اس نے نہیں کھولا۔ پہلے تو مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھے مگر پھر پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی نہ رہی ہے۔

ملازمتی صغیر نے بچے کو اپنا دودھ پلایا اور میں نے اسے تھک تھک کر سلا دیا۔ میری نگاہ بار بار اس کے معصوم چہرے پر ٹپکتی جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا کہ کیا یہ واقعی میرا بچہ ہے... میرا خون؟

گہنی بات یہ ہے کہ میں اس سے کوئی خاص لگاؤ محسوس نہیں کرتا تھا۔ جس طرح معصوم بچے نگاہوں کو پیارے لگتے ہیں، یہ بھی مجھے پیارا لگتا تھا۔ بس... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

سلطانہ کا غسل طویل ہوتا جا رہا تھا۔ شاید وہ خود بھی کھرج کھرج کر نہ رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ صغیر کے آوازیں دینے پر ہی باہر نکلی۔ اس نے اپنا منہ سرواڑی میں لپیٹ رکھا تھا۔ کیلے بال کمر پر جمول رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھے بغیر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر کمر پر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ جب وہ کمر پر اوڑھ رہی تھی، میں نے اس کے دونوں ہاتھ دیکھے۔ اس نے اپنے بدن کے ساتھ بھی بالوں والی تختی روا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ اور بازو جھانوائے کی رگڑوں سے سرخ ہو رہے تھے۔ یقیناً یہی صورت حال اس کے پورے جسم کی رہی ہوگی۔ میرے ذہن میں پھر چنگاریاں ہی بھرنے لگیں۔ جارج گورا کی محسوس صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ پتا نہیں اس رات اس خبیث نے سلطانہ کے جسم اور روح پر کتنے زخم لگائے تھے۔ یقیناً یہ اس رات کی تلخ یادیں ہی تھیں جنہوں نے اسے نیم دیوانہ کیا ہوا تھا۔

وہ لیٹ گئی تو میں نے بالوں کو پھر اس کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس مرتبہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ بس کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے دونوں ماں بیٹے پر کمر لپیٹ کر اچھی طرح ڈال دیا۔ سلطانہ کے پاؤں کی پٹی بھیگ کر اتر چکی تھی۔ میں نے سلطانہ کے منع کرنے کے باوجود تازہ پٹی باندھی اور کہنی کی پٹی بھی بدل دی۔

اب صبح ہونے والی تھی۔ میں بستر پر چٹ لینا رہا اور سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے روتے میں تھوڑی سی نرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اس بات کی توقع کی جاسکتی تھی کہ اگلے دو چار دن میں وہ خود کو مزید سنبھال لے۔ تاہم ڈاکٹر چوہان نے کہا تھا کہ سلطانہ کو مکمل طور پر نارمل کرنے کے لیے مجھے بہت تعاون کرنا ہوگا۔

ہماری میزبانی میں یہاں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جارہی تھی۔ بہترین رہائش اور کھانا مہیا کیا جا رہا تھا۔ شام کو میری

ملاقات اپنے سابقہ میزبان چاہا عبدالغنی سے بھی ہوئی۔ ان سے اسٹیٹ کے ہنگامہ خیز حالات کے بارے میں کچھ مزید معلومات ملیں۔ کئی جگہ قتل پانی اور زرگاں کے سپاہیوں میں جھڑپیں ہوئی تھیں اور اب کسی بڑی لڑائی کی توقع کی جارہی تھی۔ عبدالغنی نے یہ بھی بتایا کہ زرگاں میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے لوگوں کو موقع ملتا ہے، وہ زرگاں کو اور حکم جی کو چھوڑ کر قتل پانی کی طرف آ جاتے ہیں۔

عبدالغنی صاحب سلطانہ کے بارے میں بھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”وہ ایک خوددار اور غیر خاندان سے ہے۔ جارج گورا اس کی اتنا اور پندار کا دشمن تھا۔ آخر کار وہ اس کو رسوا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس واقعے (واقعے) نے سلطانہ کے دل پر ایک بہت گہرا گھاؤ لگایا ہے۔ مجھے تاہیں لگتا کہ یہ گھاؤ کبھی بھرنے لگے گا۔“

میں سلطانہ کے والد اور بھائی سے ملنا چاہتا تھا۔ ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح اس کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ان دونوں سے تو فوری طور پر ملاقات نہیں ہو سکی تاہم رات کے کھانے کے فوراً بعد جام عبدالرحیم ملنے کے لیے آگیا۔ یار یا کے بدلے کل سات افراد کو جارج کی جیل سے رہائی ملی تھی۔ ان سات میں سے صرف دو افراد جان بچا کر قتل پانی پہنچے میں کامیاب ہو سکے تھے اور عبدالرحیم ان دو خوش قسمتوں میں سے ایک تھا۔

چوہان نے عبدالرحیم کو وہ سب بتا دیا تھا جو میری یادداشت کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں، میں پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں فراموش کر چکا تھا۔ عبدالرحیم کو اس کے باوجود یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار پوچھتا تھا... کیا میں یہ بات بھی بھولا ہوا ہوں؟ کیا مجھے یہ واقعہ بھی یاد نہیں ہے؟ وہ مجھے میرے پرانے نام ”مہروز“ سے ہی مخاطب کرتا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ ”مہروز بھائی! وہ دن مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سلطانہ بی بی بہت خوش نظر آتی تھی۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگی رہت تھی۔ اسے ڈر بہت تھا کہ تم کہیں کم نہ ہو جاؤ۔ یا پھر جارج گورا صاحب کے کارندوں میں سے کوئی تم کو نقصان نہ پہنچا دے۔ تم بولتے بھی تو بہت کم تھے۔ ہر وقت بس کھوئے کھوئے رہت تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر بات، سنی ان سنی کر دیتے ہو۔ ایک دن سلطانہ بڑی گھبرائی ہوئی میری دکان میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ رحیم بھائی! آپ نے مہروز کو تو ناہیں دیکھا؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ اور بھی گھبرا گئی۔ بالکل جیسے تم کوئی چھوٹے سے بچے ہو اور

اس سے اپنی انگلی چھڑا کر بھاگ گئے ہو۔ وہ اس روز دیوانوں کی طرح تم کو ڈھونڈتی رہی۔ میں، طلال، ہاشم اور عمار صاحب بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ آخر تم دوپہر کے وقت ایک باغ سے ملے۔ تمہاری جھولی میں گیندے اور موٹیے کے بہت سارے پھول تھے۔ تم نے یہ پھول سلطانہ کو دے دیے اور محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سلطانہ تمہیں دیکھ کر رونے لگتی تھی۔ بعد میں پتا ہے اس نے کیا کیا تھا؟“

”کیا کیا تھا؟“

”اس نے ان سارے پھولوں کو دھاگے میں پرویا تھا۔ اس کے گھر سے، گیندے اور ہار وغیرہ بنائے تھے اور بڑے چاؤ سے یہ زیور پہنا تھا۔ اس نے بھی کوئی زیور ناہیں پہنا۔ وہ پہلا زیور تھا جو اس نے تمہاری وجہ سے پہنا۔ اور بعد میں بھی وہ کبھی کبھی گیندے اور موٹیے کا زیور پہنتی رہی۔“

مجھے یاد آیا کہ جب میں سلطانہ سے پہلی بار نیم تارکے کھوہ میں ملا تھا، تب بھی مجھے اس کے بالوں کے جوڑے میں موٹیے اور گیندے کے پھول نظر آئے تھے۔

عبدالرحیم جذباتی انداز میں اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ ”مجھ تو یہ ہے کہ وہ تمہیں پوجنے کی حد تک پیار کرنے لگتے تھے۔ اس کو تمہارے علاوہ جیسے کوئی کام ہی ناہیں تھا۔ تمہارے آرام کا خیال رکھنا، تمہیں وقت پر دوا دینا، ہلکے تمہیں نہلانا دھلانا تک اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جو کچھ تمہیں پسند ہو تو تھا وہ خود بھی تمہیں بند کر کے اسے پسند کرنے لگتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد عورت کا پریم دو خانوں میں بٹ جاتا ہے۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ کم از کم سلطانہ بی بی کے معاملے میں تو ایسا ناہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا اور اب بھی لگتا ہے کہ اس کا جینا مرنا صرف اور صرف تمہارے لیے ہے۔“

عبدالرحیم باتیں کر رہا تھا مگر میں ابھی تک گیندے اور موٹیے کے پھولوں میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے کچھ بہت پرانی باتیں یاد آرہی تھیں۔ لاہور یا دارہا تھا، باغ جناح یا دارہا تھا اور شروت یاد آرہی تھی۔ گیندے اور موٹیے کے پھول تو شروت کو بھی پسند تھے۔ وہ ان کی مشترکہ خوشبو سے مدہوش ہو جایا کرتی تھی۔ یہ دونوں پھول اس پر علیحدہ علیحدہ تو کچھ خاص اثر نہیں کرتے تھے لیکن ان کی ”اشترائی“ باس اس کے دل کی گہرائی میں اتر جاتی تھی۔ میں اس کے لیے جب بھی پھول لیتا تھا، وہ یہی دونوں ہوتے تھے۔ تو کیا میں دو ڈھائی سال کے عالم بے خبری میں بھی کچھ ایسے کام کرتا رہا ہوں جن کا تعلق شروت اور اس کی محبت سے تھا؟

رات بھگ رہی تھی۔ عبدالرحیم واپس اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ قتل پانی کی گلیوں میں گاہے بگاہے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آتی تھیں اور کچھ ایسے نعرے گونجتے تھے جن پر جنگی لکڑیوں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ اسٹیٹ کی موجودہ کشیدہ صورت حال کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ میں جیسی سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ بے شک یہاں پہنچتے ہی اسے وافر مقدار میں شراب مل گئی تھی اور اس حوالے سے وہ میرا محتاج نہیں رہا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں کے درمیان ایک تعلق ساید ہوا گیا تھا۔

میں نے جانے سے پہلے سلطانہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ حسب معمول منہ سر لپیٹ لیٹی ہوئی تھی، تاہم یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ بالوں اس کے پہلو میں تھا۔ میں باروندا جیسی کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا محل وقوع مجھے ڈاکٹر چوہان نے بتا دیا تھا۔ وہ دیوان خانے کے اندر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ایک باغیچے کی روش پر سے گزرا۔ یہاں چاندنی رات میں فواروں کا پانی چمک رہا تھا اور مصنوعی جھرنوں کی قنقل تھی۔ پھولوں کے تختوں کے آس پاس پتھریلی کرسیوں پر خوش لباس مردوزن بیٹھے تھے۔ تاہم ہر چہرے پر سنجیدگی نظر آتی تھی۔ ایک دم میں چونکا۔ مجھے موٹیے کی سحر کن مہک محسوس ہوئی۔ میں نے ایک کیاری میں سے کچھ پھول توڑ لیے۔ ایک باوردی ملازم نے ادب سے پوچھا۔ ”میں جناب کی کچھ خدمت کر سکتا ہوں؟“

”یہاں کہیں گیندے کے پھول بھی ہوں گے؟“

”یہاں تو ناہیں سرکار۔ ساتھ والی بڑی باغیچہ میں ہوں گے۔ میں ابھی لا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ دو منٹ بعد وہ ایک گول طشت میں تازہ پھول لے آیا۔ میں نے اس طشت میں موٹیے کے پھول بھی رکھے اور واپس جا کر خاموشی سے انہیں سلطانہ کے سرہانے رکھ دیا۔ وہ بے حرکت لیٹی رہی۔ تاہم چند سیکنڈ بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ ایک لکھنے کے لیے اس کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی لیکن پھر فوراً ہی معدوم ہوئی۔ تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ گڑبگڑائی اور اخلاقی انداز میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور بالوں کی لٹیں چہرے پر جمول رہی تھیں۔

”نہیں... نہیں... تم لیٹی رہو۔ میں ویسے ہی آگیا تھا۔“

میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ مجھے چلنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو رہی تھی۔ رات کے زخم میں غالباً ٹھنڈی وجہ سے درد

Scanned and Uploaded By Nadeem

ہور ہاتھ۔

قریباً دس منٹ بعد میں باروندا جیکی کے روبرو اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جیکی بدستور اپنے تئیں لنگوٹ میں تھا۔ حالانکہ میزبانوں نے اس کے پاس ہی ایک صاف ستھرا لباس بھی رکھ دیا تھا۔ رات کا جوشان دار کھانا اسے پہنچایا گیا تھا، وہ بھی تقریباً جوں کا توں ایک طرف رکھا تھا۔ اس میں سے غالباً دو چار کباب لیے گئے تھے۔ جیکی شراب کی بوتلوں کے درمیان یوں بیٹھا تھا جیسے راجا اندر حسین و جمیل عورتوں کے درمیان بیٹھتا ہوگا۔

مجھے دیکھ کر ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”تو آخر تم آگئے؟“ وہ شستہ انگریزی میں گویا ہوا۔

”مجھے تو کل ہی آجانا چاہیے تھا مگر پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کو کہاں ٹھہرایا گیا ہے۔“

”یہ لوگ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں چڑیا گھر میں بند کوئی جانور ہوں۔“ چھوٹے سرکار کے افسروں نے سوال پوچھ پوچھ کر میرا دماغ پلپلا کر دیا ہے۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ تم نے کتنے دن جارج کی بہن کو سکھادی تھی؟ تمہیں کیسے غائب کیا گیا؟ تم کیسے رہا ہوئے وغیرہ وغیرہ۔“ بات کرتے کرتے وہ بڑی طرح کھانسنے لگا۔

”میں نے پوچھا۔“ کوئی دوا وغیرہ بھی دی گئی ہے آپ کو یا نہیں؟“

وہ بولا۔ ”دوا کیا یہاں تو محالوں کی پوری ٹیم آئی تھی۔ وہ میرا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے پھر سے بھلا چنگا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید انہیں پتا نہیں کہ مرعہ الموت کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوا مجھے تھوڑا بہت افادہ دے سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔“ اس نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نے کہا۔“ یہ دوا انہیں زہر ہے اور اسی نے آپ جناب کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ اور دوسری بات میری سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ آپ ہر وقت مرنے کی بات کیوں کرتے ہو؟ آپ زندگی کی بات کیوں نہیں کرتے؟ آپ اپنے اندر جینے کی خواہش پیدا کر لو گے تو پھر حالات بھی بدلنا شروع ہو جائیں گے۔ حالات بدل سکتے ہیں۔“

اس نے ایک بار پھر سنی ان سنی کر دی جیسے میری بات اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہ ہو۔ اس نے آنکھیں سیال کا ایک طویل گھونٹ لیا اور اپنے اچھے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ تب میری نظر پہلی بار ایک نیڈ بیک پر پڑی۔ یہ نیڈ بیک اس آرام دہ کمرے کے ایک گوشے میں جھول رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں حیران رہ گیا۔

”نیڈ بیک کو تم نیڈ بیک ہی کہو گے۔ پیراشوٹ یا نیکی کا پٹر تو نہیں کہو گے۔“

”لیکن یہ یہاں کیسے آیا؟“

”میں نے منگوایا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تم آج نہیں توکل ضرور آؤ گے اور ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔“

میں تعجب سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا معما تھا۔

یوں لگتا تھا کہ جس طرح میرے اندر یہ طلب پیدا ہو چکی ہے کہ میں جیکی سے زیادہ سے زیادہ سیکھوں، اس میں بھی یہ خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تھوڑے سے وقت میں مجھے بہت کچھ سکھا دے۔

میں نے کہا۔ ”کیا آپ میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”بالکل۔۔۔ ادھورے کام سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کام میں نے اور تم نے شروع کیا ہے، وہ پورا ہو۔“

”میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کا شاگرد کہلوں۔ کیا آپ ایسا سمجھتے ہو؟“

”جکی بات یہ ہے کہ میں بھی ایسا نہیں سمجھتا۔ لیکن تمہارے اندر ایک تڑپ ضرور ہے اور اسی تڑپ نے مجھے آمادہ کیا ہے۔ تمہاری یہ تڑپ آنے والے دنوں میں تمہارے بہت کام آ سکتی ہے۔ اس کو اپنے اندر مرنے نہ دینا۔“

”آپ کس تڑپ کی بات کر رہے ہو؟ میری سب سے بڑی تڑپ تو یہی ہے کہ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“

”میں اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن اس تڑپ کے پیچھے بھی تو کوئی وجہ ہے۔ وہی بڑی جو تمہارے قریب آتے آتے تم سے بہت دور چلی گئی ہے۔ جس کو تم کھو چکے ہو لیکن بھولے نہیں ہو۔ شاید کبھی بھول بھی نہیں سکو گے۔“

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ ثروت اپنی تمام تر محبوبیت کے ساتھ میرے تصور میں آ گئی۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے لیکن۔۔۔ ڈھائی برس بیت چکے ہیں کہ اس کا کچھ پتا نہیں۔ اپنے آخری خط میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں جرمنی میں ایک یوسف نامی لڑکے سے اس کی محبت ہو چکی ہے۔ عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے۔ اب تک تو شاید۔۔۔“

میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک گولا سا میرے گلے میں اٹک گیا۔ ثروت کے لیے اس طرح کی بات سوچنا بھی میرے لیے مشکل تھا۔

”میں تمہارے احساس کو سمجھتا ہوں۔ ان مرحلوں سے میں بھی گزرا ہوں۔ میری اور تمہاری کہانی میں فرق یہ ہے کہ۔۔۔ تمہاری کہانی میں، کنول جھیل میں گزرے ہوئے وہ سات دن نہیں ہیں۔ ہاں۔۔۔ وہ سات دن جن پر سات زندگیوں کی قربان کی جاسکتی ہیں۔“

”لیکن میں نے۔۔۔“

”اچھا، یہ باتیں چھوڑو۔“ اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ”اس وقت میں بہت سرور میں ہوں پھر یہ سرور غنودگی میں بدلنے لگے گا۔“

وہ میرا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے لے کر نیڈ بیک کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں آٹے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ریت سے بھرا ہوا تھیلا ہمارے درمیان تھا۔ بلب کی روشنی میں شفاف دیوار پر اس سارے منظر کا سایہ بن رہا تھا۔ اس ”دیوان“ نامی پوری عمارت میں جزیرہ کی برقی روشنی موجود تھی۔

”درد کیا ہے؟“ جیکی نے سرور آواز میں کہا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے۔ یہاں۔۔۔“ اس نے انگلی سے اپنے سر کو ٹھونکا۔

پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے الفاظ کو دہراؤ۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔“ درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے۔“

وہ آنکھیں بند کیے بولا۔ ”درد کے ساتھ اندیشے اور وابستہ شامل کر لیے جائیں تو درد بڑھ جاتا ہے۔ خالص درد کی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی اور اگر خالص درد کی گہرائی میں ڈوب کر اس کی اصلیت محسوس کی جائے تو یہ اور بھی کم ہونے لگتا ہے۔“

”جی۔۔۔ میں نے کہا۔“

”صرف ”جی“ نہیں۔ ان الفاظ کو دہراؤ۔ میری طرح۔ آنکھیں بند کر لو۔“ اس نے حکم دیا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے الفاظ دہرائے۔ وہ جب اس انداز میں سکھاتا تھا تو عجیب موڈ میں آ جاتا تھا۔ وہ ایک ماسٹر فائزر سے زیادہ ایک سائیکسٹرسٹ دکھائی دیتے لگتا تھا۔ اس روز باروندا جیکی نے مجھے نیڈ بیک کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سخت مشق کرائی۔ اتنی مشق جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی کھال چھل گئی۔ خون رسنے لگا اور قطرے سنگ مرمر کے فرش پر گرنے لگے۔ میں ذرا است

سگریٹ کا دھواں

تین سو اجزا کا مجموعہ

سگریٹ دیکھنے میں چھوٹی نازک اور دلکش ہوتی ہے مگر جب سائنس دانوں نے اس کی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس کے دھوئیں میں تین سو اجزا شامل ہیں۔ یہ اجزا مختلف گیسوں اور رقیق مادوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو پیپروں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتے ہیں۔ یہ تیس چھوٹے چھوٹے قطرات سے مل کر بنتی ہیں جو انج کے چالیس لاکھ دس حصے کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ قطرات پیپروں کی دیواروں کی جھلی اور گلے کی نالیوں پر جم جاتے ہیں اور ان کے لیے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ تمباکو میں بعض نشہ آور گیسیں بھی ہوتی ہیں، یہی سگریٹ نوشی کو عادت بنانے کا باعث ہوتی ہیں۔

کراچی سے امتیاز احمد کی گل پاشیاں

پڑتا تو وہ مجھے جھڑکتا اور بیساکھی سے میرے سر یا پیٹ پر ضرب لگاتا۔ وہ جنونی موڈ میں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا جنون برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ جنون جیسے میرے جنون سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ یہ ایک تند و تیز لہر کی طرح مجھے اپنے ساتھ بہائے لیے چلا جا رہا تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تکلیف میرے لیے مزہ بنتی جا رہی تھی۔۔۔ نشہ بنتی جا رہی تھی۔ میں جیکی کی ہدایات پر عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ بالکل بے جان ہو کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

اگلی صبح سلطانہ کے بھائی اور والد سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ صبح سویرے سلطانہ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میں جاگا تو وہ جانے کے لیے تیار تھے لیکن جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ہماری ملاقات میرے کمرے میں ہوئی۔ سلطانہ کے والد مختار راجپوت کی عمر پچپن ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ کسی وقت وہ خاصے صحت مند رہے ہوں گے لیکن اب جیسے زندگی کے بوجھ نے انہیں نڈھال سا کر رکھا تھا۔ سلطانہ کا بھائی کافی کمزور تھا۔ جو اس سالی میں ہی اس کے ہاتھ میں بیساکھی آ گئی تھی۔ کمر کی تکلیف کے سبب وہ بہ مشکل چلتا پھرتا تھا۔

سلطانہ کے والد نے میرے سر پر پیار دیا۔ پھر دونوں نے مجھ سے معاقلہ کیا اور اسی گرم جوشی سے ملے جس سے کسی قریبی عزیز کو ملا جاتا ہے۔۔۔ جبکہ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں

انہیں پہلے بار دیکھ رہا ہوں۔

مختار صاحب نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ”مہر و ج! مجھے پورا یقین (یقین) ہے۔ اگر کوئی سلطانہ کو پھر سے سلطانہ بنا سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ وہ تمہاری بڑی سے بڑی بات مان سکتی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ کچھ مان بھی رہی ہے۔ اب وہ پہلے سے کچھ اچھی نظر آ رہی ہے۔ خدا کے بعد اب تم اچھا سہارا ہو مہر و ج!“

”میں اپنی کوشش کر رہا ہوں۔“

”لیکن... لیکن تم الگ کمرے میں کیوں سو رہے ہو؟ تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اسے تمہاری جرورت ہے مہر و ج... بہت زیادہ جرورت ہے۔“

میں اب اس بات کا کیا جواب دیتا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں اس کا شوہر ہونے کے باوجود شوہر نہیں ہوں۔ میں نے اسے اپنے ہوش و حواس میں قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ کوئی ازدواجی تعلق رکھا ہے۔ وہ جو کچھ تھا، ایک عالم بے خبری کا دورانیہ تھا۔

دونوں باپ بیٹا بہت دھمی تھے۔ میں اس موقع پر کوئی ایسی ویسی بات کر کے انہیں مزید دھمی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بڑے نیل نے میرے ہاتھوں کی چھل ہوئی کھال دیکھی اور بے تکلفی سے بولا۔ ”مہر و ج بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں، گر گیا تھا۔“ میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”آپ... آپ بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں مہر و ج بھائی! چا چا جی بتا رہے تھے کہ آپ پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں بھول چکے ہیں۔ یقیناً نہیں آتا۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟“

مجھے ایسی باتوں سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ میرے چہرے پر الجھن دیکھ کر ہی شاید مختار صاحب نے جلدی سے مداخلت کی اور بولے۔ ”کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائیں گا۔ بس تم سے ایک ہی درخواست کرنی ہے... بلکہ ہاتھ جوڑ کر کرنی ہے۔“ انہوں نے واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”تم سلطانہ کا خیال رکھنا۔ اسے تمہاری بہت سخت جرورت ہے۔“

جب میں اس طرح سوچتا تھا تو ایک دم ثروت ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہتی تھی۔ ”بس تابی! اتنی ہی طاقت تھی میرے پیار میں؟ یہی تھا ہمارا اثوت بندھن؟ یہی تھا تمہارا ختم نہ ہونے والا انتظار؟“

میں ایک دورا ہے پر تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ میں جسمانی طور پر سلطانہ کے قریب جائے بغیر بھی تو اسے سہارا دے سکتا تھا۔ جسمانی قربت تو میاں بیوی کی محبت کا آخری درجہ ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو کئی مدارج ہوتے ہیں۔ محبت سے بات چیت کرنا، اٹھٹھ کھانا پینا، دکھ سکھ بانٹنا۔ اس شام میں پھر سلطانہ کے لیے باغیچے سے گیندے اور مویے کے تازہ پھول لے کر آیا۔ میں نے ایک باوردی باغبان سے کہا اور اس نے وہیں پر مجھے ایک گجر ایٹا دیا۔ میں سلطانہ کے پاس واپس آ رہا تھا جب میری ملاقات اسحاق اور عبدالرحیم سے ہو گئی۔ اسحاق ہمیشہ کی طرح بہت سنجیدہ بلکہ مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے اشتعال کی وجہ ماریا فرگوسن ہی تھی۔ اس نے غم زدہ لہجے میں مجھے بتایا۔ ”وہ حرام زادی بیچ گئی ہے۔ تمہاری چلائی ہوئی گولی سے اس کی پنڈلی پر معمولی زخم آ گیا تھا۔ ابھی زرگاں سے آنے والے ایک بندے نے بتایا ہے کہ جارج گورانے ماریا کے باڈی گارڈ کو گولی سے اڑا دیا ہے۔ یہ باڈی گارڈ اس گھر میں موجود تھا جہاں سے ہم نے ماریا کو اٹھایا تھا۔“

”زرگاں کی عام صورت حال کیا ہے؟“ میں نے اسحاق سے پوچھا۔

”حکم اور جارج گورا غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتا چلا ہی ہووے گا کہ حکم نے بیس بے گناہ لوگوں کو سرعام سولی پر چڑھایا ہے۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے جارج کی وہ خصیعت بہن خود بھی موقع پر موجود تھی۔ جارج نے سب لوگوں کے سامنے اپنی بہن سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی ایک انگلی کے بدلے جب تک وہ انگلی کاٹنے والوں کے سر نہ ہیں کاٹنے گا، چھین سے نہ نہیں بیٹھے گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا کوئی بڑی لڑائی ہوگی؟“

”ضرور ہوگی۔“ اسحاق نے یقین سے کہا۔ ”دونوں بھائی اب کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ زرگاں میں عام لوگوں کو بھی اسلحہ دے کر لڑنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ چھوٹے سرکار نے آج دوپہر کو اعلان کیا ہے کہ اگر ہم پر حملہ ہو تو پوری طاقت سے جواب دیوں گے۔ مراد شاہ صاحب نے بھی کہا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے

گناہ دی ہے، ان کی حفاظت جان پر کھیل کر بھی کی جاوے گی۔“

گھر سوار سپاہیوں کا ایک بڑا دستہ دیوان خانے کے سامنے سے گزرا۔ ان کے علم بیرونی دیوار کے اوپر سے دکھائی دیے۔

میں نے اسحاق سے کہا کہ وہ ذرا جا کر باروندا جیل کی خبر لے لے۔ میں ابھی کچھ دیر میں اس کے پاس آؤں گا۔ عبدالرحیم نے کہا۔ ”وہ سہ پہر کے وقت بہت شور مچاوت تھا۔ اسے پھر اپنی سستی میں واپس جانے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ بلند آواز میں چلا رہا تھا۔ پھر چلاتے چلاتے ہی سو گیا۔“

”میں نے تو ایک اور بات سنی ہے۔“ اسحاق نے قدرے مدد آواز میں کہا۔

”کیا؟“

”زرگاں سے بھاگ کر یہاں آنے والے لوگوں میں راج بھون کی کچھ کنیزیں بھی شامل ہیں اور ان میں اشوک سانی کی بیٹی بھی ہے۔“

”کون اشوک سانی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی شکنتلا کا پتا... مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں پہنچنے والی عورتوں میں شکنتلا بھی ہے۔“

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ شکنتلا کے بارے میں، میں نے جیکی سے اتنا کچھ سنا تھا کہ اسے دیکھے بغیر بھی میں اسے جاننے پہچاننے لگا تھا۔

”کیا... تم یقین سے... کہہ سکتے ہو کہ ان میں شکنتلا بھی ہے؟“

”پورے یقین سے تو نا ہیں... لیکن سنا ہی ہے۔“

میں نے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ ”ایک کام کرو اسحاق... پتا کرو کہ واقعی ایسا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ یہاں آ گئی ہے؟“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”کچھ بھی نہ ہو لیکن میں جانتا چاہتا ہوں۔“

اسحاق نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا۔

جیل کی ساری کہانی اور اس کی ساری ذہنی کیفیت مجھے معلوم تھی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اب شکنتلا سے اس کی ملاقات دوبارہ ہوگی... لیکن اگر وہ واقعی یہاں آ گئی تھی تو پھر ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ باروندا جیل کے لیے انتہائی سنسنی خیز واقعہ ہوتا۔ شکنتلا اور جیکی کے بارے میں سوچتا ہوا ہی میں واپس اپنی آرام دہ قیام گاہ میں پہنچ گیا۔

سلطانہ پھر غسل خانے میں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ روزانہ نہا رہی تھی اور اس کا غسل طویل تر ہوتا تھا۔

آج بھی اس نے باہر آنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور بازو پتھر کی رگڑ سے سرخ نظر آ رہے تھے۔

بالو رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے گود میں تو نہیں اٹھایا تاہم اتنی مہربانی کی کہ اسے دیکھنے لگی۔

”دودھ پلایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے مزید تفصیل نہیں پوچھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ میری معلومات کے مطابق اس نے دودھ نہیں پلایا تھا۔ وہ ابھی صفیہ کا دودھ ہی پی رہا تھا۔

میں ابھی اس صورت حال کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔

”ہاتھ آگے کرو سلطانہ۔“ میں نے کہا۔

وہ ہاتھ کو بس تھوڑی سی حرکت دے کر رہ گئی۔

میں نے اس کا بھیگ ہوا سرخ ہاتھ پکڑا اور گجرا اس کی کھانکی میں باندھ دیا۔ اس کا جسم پھر لرزنا شروع ہو گیا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی تھی یہ۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر پر لا دیا گیا ہو... اور اس بوجھ کے ساتھ اسے اونچے نیچے راستے پر چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ اس کی ”سوچ کی کمر“ کانپ رہی ہو، ٹل کھا رہی ہو۔

”کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے سے اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو گرے مگر ان آنسوؤں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی بھوری چٹان کی سی سختی اور خاموشی تھی۔ اس سختی اور خاموشی کے پیچھے کیا پوشیدہ تھا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے باتیں کرتا رہا۔

بالو بھی اٹھ گیا اور اس کی گود میں بیٹھ کر ہنسنے لگا۔ سلطانہ کا چہرہ زرد ہونے لگا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں اسے دھکیل کر پیچھے نہ ہٹا دے۔ میں نے بالو کو اپنی گود میں لے لیا۔

سامنے ایک منقش پلیٹ میں پھل رکھے تھے۔ چھری بھی پڑی تھی۔ میں نے سلطانہ سے کہا۔ ”ایک سیب کاٹو۔“

وہ شدید تذبذب میں نظر آئی لیکن جب میں نے دوبارہ کہا تو وہ لرزنا ہاتھوں سے سیب چھیلنے لگی۔ ایک دم تیز دھار چھری اس کی انگلی میں لگ گئی۔ خون بہنے لگا۔ میں نے اس کی انگلی کو اپنے انگوٹھے سے دبا دیا۔ خون کا اخراج ذرا کم ہوا تو میں نے پٹی باندھ دی۔

”مہر و ج! مجھ کو معاف کرنا۔“ وہ روہانی آواز میں بولی۔

”کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

109

نام

ایک نوجوان نے جھکتے ہوئے اپنی محبوبہ کے باپ کو ٹیلی فون کیا۔

”کیا میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کر سکتا ہوں؟“

باپ نے جواب دیا: ”ضرور، ضرور۔ نام کیا ہے تمہارا؟“

ناصر علی کی جرات مندی ضلع صوابی سے

آواز میں کہا۔ ”ہمیں مراد شاہ اور ڈاکٹر چوہان سے تمہارے بارے میں کافی جانکاری مل چکی ہے۔ تمہاری روداد کافی اونٹنی ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ مختار راجپوت کی بیٹی نے زرگاں میں تمہارا جیون بچانے کے لیے وہ اونٹنی استعمال کی تھی جو تمہارے سوگد باقی پتانے اس کے پر یواد کو بخش تھی۔ یہ ایک بڑا بلیدان ہے۔ اس لڑکی نے دوسرا بلیدان کچھ ہی دن پہلے دیا ہے۔ اسے جارج کے ستم کا شکار ہونا پڑا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس صورت حال کے لیے ہم بھی ذمے دار ہیں۔ ہمارا دوش یہ ہے کہ ہم نے اس لڑکی کی فریاد کے باوجود اسے اور تمہیں زرگاں واپس بھیج دیا۔ ہم اس کے لیے شرمندہ ہیں۔“

میں چونک کر چھوٹے سرکار کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہاں واقعی شرمساری نظر آرہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ اس دور میں کوئی چھوٹا موٹا افسر یا زمیندار وغیرہ بھی اپنی انا کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اپنا قصور تسلیم کرنا تو دور کی بات ہے۔ چھوٹے سرکار ایک وسیع اسٹیٹ کا مختار کل تھا اور وہ مجھ جیسے ادنیٰ شخص کے سامنے شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے خلوص دل سے کہا۔ ”چھوٹے سرکار! یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو دوشی کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت آپ نے وہی کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت تو موہن کار وغیرہ نے آپ کے سامنے ثابت کر دیا تھا کہ سلطانہ ہی ہارون کی قاتلہ ہے۔“

”پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سے جلد بازی ہوئی۔ اس کے لیے ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہم بھگوان سے پرارتنا کرتے ہیں کہ وہ تمہاری جتنی کو صحت دیوے اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں سہل ہو جاوے۔ ہم نے یہاں اے کو ہدایت

”ماضی کے بارے میں سوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مستقبل کے بارے میں سوچو۔ میں اتنی بُری حالت میں بھی، تم پر محنت کر رہا ہوں۔ اس محنت کا چالیس پچاس فیصد تو تم میں ظاہر ہونا چاہیے۔ اگر نہیں ہوگا تو میری روح بے چین رہے گی۔“

میں ابھی جبکی کوشش کرتا تھا کہ بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس بات کا انتظار کرنا تھا کہ اسحاق، شکنتلا کے بارے میں اصل صورت حال معلوم کر لے۔

اس رات جبکی پھر نئے کی حالت میں اپنا پسندیدہ نیپالی نغہ گاتا رہا۔ اسے آج کافی تیز بخار بھی تھا۔ بخار کی مدد سے، شراب کے نشے سے مل کر دوا آتھ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے لنگوٹ کی تہوں میں سے، کاغذ میں لپیٹی ہوئی شکنتلا کی تصویریں نکال لیں۔ انہیں ان گنت بوسے دیے اور پھر انہیں دوبارہ لنگوٹ کی تہوں میں محفوظ کر کے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو ڈاکٹر چوہان آیا۔ اس نے بتایا کہ چھوٹے سرکار مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دیوان کے مہمان خانے میں طلب کیا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں اس محل نیا عمارت کے وسیع احاطے سے گزرا۔ یہاں مجھے شان دار ہاتھی ”بادل“ بھی نظر آیا۔ یہی بادل نامی ہاتھی تھا جس نے ایک مسلمان مزدور کو زخمی کیا تھا اور جس کی یاداش میں ہاتھی کا مالک یعنی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی آج کل باقاعدہ عمر قید کاٹ رہا تھا۔ میں عمارت کے عالی شان مہمان خانے میں پہنچا۔ ایک بلند و بالا محرابی دروازے سے گزر کر اور محلی قالینوں پر پاؤں دھرتا ہوا میں ایک خوب صورت ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں وکٹوریہ طرز کی ایک شان دار کرسی پر چھوٹے سرکار راجپوت رائے موجود تھا۔ وہ حسب سابق بند گیلے کے کوٹ اور سفید چٹون میں تھا۔ سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی اور گلے میں بیش قیمت مالامالیں۔ اس کی بارعب شخصیت نے جیسے اس سارے کمرے کو چکا چوند سے بھر دیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چند اور کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو کرسیوں پر انور خاں اور کپتان اے بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونا کسی مہاراجا کے دربار میں داخل ہونے کی طرح سنسنی خیز تھا۔ ایک طرف شیشے کی اٹالین تپائی پر چند جدید راغفلیں اور ان کے لوازمات رکھے تھے۔ شاید میرے یہاں آنے سے پہلے اس اسلے پر ڈسکشن ہو رہی تھی۔

میں نے ادب سے سلام کیا۔ چھوٹے سرکار نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں قدرے جھکتا ہوا بیٹھ گیا۔ وہی کلمات غی ادائیگی کے بعد چھوٹے سرکار نے اپنی بارعب

تو میں کسی بھی وقت... کہیں سے بھی عالم بالا کی طرف رخصت ہو سکتا ہوں... یوں کر کے۔“ اس نے اپنے ہاتھ سے ہوائی جہاز کی طرح اڑنے کا اشارہ دیا۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مارشل آرٹ کے آسمان کا تاندو ستارہ تھا... اب آہستہ آہستہ مجھے اس کے بارے میں اور بھی کئی باتیں یاد آرہی تھیں۔ تین چار سال پہلے اس نے بانگ کاٹنگ میں بنی ہوئی کسی فلم میں کام بھی کیا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ عتقرب ہالی وڈ کی کسی بڑی فلم میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ غالباً کسی انگلش آرٹیکل میں، میں نے اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ فائٹ کے وقت جبکی کا جسم ہی نہیں، اس کی اسپرٹ بھی مقابلے میں حصہ لیتی ہے۔ وہ اپنے مد مقابل کو مسماز کر دیتا ہے۔ اس کے ایک معروف برطانوی حریف نے اعتراف کیا تھا کہ وہ جب بھی جیسی سے مقابلہ کرتا ہے، اسے اپنی توانائی میں غیر معمولی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر ایک جاپانی فائٹر نے لکھا تھا... حریف کو چوٹ لگا کر بھی اگر آپ اسے ورد میں مبتلا نہیں کر پاتے تو آپ کا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے اور جبکی کے ساتھ لڑتے ہوئے یہی حوصلہ شکنی اعصاب کو جکڑ لیتی ہے۔ وہ چوٹ کو حیران کن صلاحیت سے جھیل لیتا ہے اور اگر اس نے اپنی یہ صلاحیت مزید پروان چڑھائی تو بہت جلد... کوئی اس کے سامنے ٹک نہیں سکے گا...

یہ... اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں کہی جا رہی تھیں لیکن پھر اچانک یہ ابھرتا ہوا ستارہ مارشل آرٹ کے افق سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس تیز رفتار دور میں کسی کو تا دیر کہاں یاد رکھا جاتا ہے۔ یقیناً جبکی کے بارے میں بھی چند ماہ تک مختلف خبریں گردش کرتی رہی ہوں گی۔ ایسی دو چار اڑتی اڑتی خبریں ہم نے بھی سنی تھیں۔ کسی نے کہا کہ جبکی کو اس کے مخالفوں نے ہنگری کے کسی ٹائٹ کلب میں قتل کر ڈالا ہے۔ ایک دفعہ یہ سنا کہ وہ شوبز اور فائٹنگ آرٹ سے بالکل کنارہ کش ہو کر بدھ مت کا پیروکار بن گیا ہے اور کسی اسٹوپا میں رہتا ہے... وغیرہ... وغیرہ...

آج... ماضی کا وہ معروف کردار یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دیوان خانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے ساتھ طوفانی عشق کی ایک حیران کن داستان تھی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں وقت کی مہیب لہریں اس سے یوں ٹکراتی ہوئی گزری تھیں کہ وہ جسمانی اور روحانی طور پر تہہ بالا ہو کر ناقابل شناخت ہو گیا تھا۔

”کس سوچ میں کھو گئے ہو؟“ جبکی نے مجھے چونکایا۔

”آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

رات کو میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک پھر باروندا جیکی کے پاس رہا۔ ہم نے مارشل آرٹ پر بہت سی باتیں کیں اور عملی مشق بھی کی۔ میرے کل کے زخموں کی وجہ سے جبکی نے آج مجھ پر زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ اگر ایک دن بہت سخت مشق ہو جاتی تھی تو اگلے روز ہاتھ تھوڑا سا ہلکا رکھتا تھا۔ آج وہ اپنی کشتی کے بارے میں واقعی بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے، آج کشتی بہت یاد آرہی ہے؟“

”ہاں، جب کسی چیز کے دوبارہ ملنے کی امید کم ہونے لگتی ہے تو پھر اس کی یاد زیادہ سنہور ہونے لگتی ہے۔“

”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو جبکی؟“

”زرگاں اور تل پانی میں ٹھن گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب میں پھر زرگاں کی طرف جا سکوں گا اور کشتی تک پہنچ سکوں گا۔“

”کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ اس کشتی سے بڑھ کر آپ کو کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔“

”ہاں، کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کشتی والی بھی نہیں؟“ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس کے ہڈیوں بھرے چہرے پر کرب اور اداسی کے گہرے سائے پھیل گئے۔ وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔ ”اس کی بات کیوں کرتے ہو؟ اس کی چاہت تو ہر پیمانے اور موازنے سے جدا چیز ہے۔ وہ تو ایک ایسی ہستی ہے جس نے مجھے تھوڑے سے وقت میں ہزار ہا برس کی پُر بہار زندگی کی راحتیں دیں اور جواب مجھے مرنے کا حوصلہ بھی بخش رہی ہے۔ اس کی بات مت کرو۔“

”آپ اسے ایک بار دوبارہ دیکھنے کی چاہت تو رکھتے ہوں گے؟“

”آج تم بے معنی سوال کر رہے ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہوا سے پوچھے کہ کیا تم چلنے کی چاہت رکھتی ہو۔ پانی سے پوچھے تم بہنے کی چاہت رکھتے ہو اور سرما کی طویل رات، گھونسلے میں گزارنے والے پرندے سے پوچھے... کیا تمہیں صبح کا انتظار ہے؟“

”ہاں، کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ واقعی شاعری کر سکتے ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی یادوں کو کچھ یادگار نغموں میں ڈھال دو۔“

”یہ ایک اور بے معنی بات۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تو کشتی پر واپس پہنچنے کی آس بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب

وے دی ہے کہ تمہارے سمیت مختار راجپوت کی فیملی کی سکیورٹی کا پورا انتظام کیا جاوے۔ ہم نے مختار کے بیٹے کے علاج کے لیے بھی خاص ہدایات دی ہیں۔

”بہت شکریہ، چھوٹے سرکار۔“ میں نے کہا۔

اجیت رائے کچھ دیر تک بغور میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ہلاکی و ذہانت و چمک تھی۔ اس کے حیکمے خدو خال والے چہرے پر ناک کا اونچا بانسہ بے حد نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولا۔ ”مجھے انور خاں اور چوہان نے بتایا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں تم بہت زیادہ بدل گئے ہو۔ تم نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالا ہے اور رائفل اٹھانا سیکھ لیا ہے۔“ میں جواب میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ سنسار کمزور کو دباتا چلا جاوت ہے۔ یہاں تک کہ زمین کے ساتھ زمین کر دیوت ہے۔ سرائی کر جینا ہی جینا ہے اور اس کے لیے بلیڈ ان دینے پڑتے ہیں۔“

انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مودب لہجے میں کہا۔ ”چھوٹے سرکار! تابش کے لیے جارج گورا کی قید کا پلٹ ثابت ہوئی ہے۔ یہ بڑی دلیری کے ساتھ جارج کے گھر سے نکلا ہے۔ کئی لوگوں کو اب بھی یقین نہیں کہ یہ کسی کی مدد کے بغیر جارج کا کڑا سپر توڑ کڑا تھا۔ بعد میں یہ ان تین لڑکوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے جارج کو قتل کرنے کا عہد کیا تھا۔ یہ بھی بڑی جرأت والی کارروائی تھی۔ ان چار لڑکوں میں سے صرف دو زندہ بچے ہیں۔ بے شک یہ لڑکے ناکام ہوئے سرکار! مگر یہ جارج کی خود سربہن کو سخت حفاظت کے باوجود اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔“

چھوٹے سرکار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”پتا چلا ہے کہ تم ایک ایسے نیپالی کو اپنے ساتھ لائے ہو جس کا ایک بازو اور پاؤں کٹا ہوا ہے۔ اور یہ وہی ہے جو کچھ برس پہلے زرگاں میں جارج کی بہن کا ٹیچر بن کر آیا تھا؟“

”جی سرکار! یہ وہی ہے... باروندا جی... زرگاں میں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ تین ماہ اسٹیٹ میں رہ کر واپس چلا گیا تھا لیکن وہ جارج گورا کی جیس بے جا میں تھا۔ پھر وہاں سے فرار ہوا اور گارڈز سے بچ کر چھوٹی ٹنڈی کے کنارے ایک جنگل میں چھپا رہا۔“

”وہاں اس نے بہت سارے ایک فٹ بوٹ میں گزارا ہے سرکار! تابش وغیرہ نے اس فٹ بوٹ میں ہی اسے دیکھا تھا۔“ انور خاں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹے سرکار نے زرنگار کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی شفاف ٹھوڑی کھجائی اور بولا۔ ”کیا واقعی... یہ شخص

اشوک ساہنی کی بیٹی کے عشق میں گرفتار تھا؟“

”بے شک چھوٹے سرکار! ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ وہ اب بھی گرفتار ہے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔ وہ بہت بیمار ہے۔ کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے لیکن اسے اپنی موت کا بھی کوئی غم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے عشق نے اس کے لیے مرنا بھی آسان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ...“

ایک دم مجھے شکنتلا والی بات یاد آئی اور میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر مذہب میں رہنے کے بعد میں نے مودب لہجے میں کہا۔ ”چھوٹے سرکار! اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ”پوچھو۔“

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بولنے کا پڑھا لکھا انداز اسے متاثر کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ”سرکار! مجھے پتا چلا ہے کہ زرگاں کے راج بھون سے کچھ لوگ بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ ان میں ساہنی صاحب کی بیٹی شکنتلا بھی ہے؟“

چھوٹے سرکار نے کہا۔ ”ہاں، کسی نے مجھے یہ بات بتائی تو تھی۔ بعد میں ہم نے اس لڑکی کو پیش کرنے کا حکم دیا لیکن وہ ملی نہیں۔ اس کے ساتھ راج بھون سے آنے والی تین چار اور عورتیں بھی تھیں۔ دراصل زرگاں سے آنے والے لوگن جانت ہیں کہ تل پانی میں زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ اس لیے وہ یہاں آکر ادھر ادھر روپوش ہو جانا بہتر سمجھتے ہیں۔“

باروندا اسے نے چھوٹے سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب! اگر آپ حکم دیویں تو میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں؟“

”ہاں ضرور کرو... بلکہ ہم تو چاہت ہیں کہ اگر وہ مل جاوے تو اسے خاص حفاظت میں رکھا جاوے۔ وہ راج بھون کی فیریز (پریوں) میں سے ہے... اور بھائی صاحب (حکم جی) کے جاسوس اس کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کریں گے۔“

ہماری بات چیت کے دوران میں ہی فوجی افراد اور انتظامی عہدے داروں کا ایک وفد چھوٹے سرکار سے ملنے پہنچ گیا۔ میں اور انور خاں چھوٹے سرکار سے رخصت ہو کر واپس آ گئے۔

☆☆☆

آٹھ دس روز مزید گزر گئے۔ حالات میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ دونوں طرف جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری

تھا۔ میری اور باروندا جی کی ملاقات روز ہو رہی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مجھ پر فائننگ آرٹ کے نئے عقدے کھل رہے تھے۔ حقیقت ہے کہ میں خود کو ایک بدلا ہوا شخص محسوس کر رہا تھا... میں اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بھی شاید نہ کر سکوں۔

سلطانہ کی کیفیت میں بھی معمولی تبدیلی آئی تھی۔ تاہم وہ اب بھی بالکل الگ تھلگ اور گم سم رہتی تھی۔ کوئی اس سے اظہار ہمدردی کی کوشش کرتا تو وہ غصے سے پھٹ پڑتی لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ بہت نرم اور اطاعت گزاری والا ہوتا تھا۔ وہ الگ کمرے میں ہی سو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس نے ابھی بالو کو اپنا دودھ پلانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

ایک رات میں اسے دیکھتے اس کے کمرے میں گیا تو وہ ریشمی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی چند تلیں اس کے چہرے پر تھیں۔ بالو اس کے پہلو میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر ایک صحت مند توانا کشش تھی۔ جیسے کوئی خود رو پودا یا جنگلی پھول۔ اور وہ میری بیوی تھی۔ میں قریباً پڑھ سال تک اس کے فریب رہا تھا اور ہماری قربت کی نشانی یہ بچہ تھا۔

مجھے سلطانہ کے ریشمی تکیے کے نیچے ایک ابھار سا محسوس ہوا۔ میں نے آگے جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ ایک چھوٹی تلواری کا دستہ تھا۔ یہی وہ تلواری تھی جس سے سلطانہ نے چند دن پہلے مردانہ دار کام لیا تھا۔ اس نے ٹیلے پر ”جی تھری“ چلانے والوں کے پپے پھاڑ ڈالے تھے اور یہ تلواری وہ اب بھی تکیے کے نیچے رکھ کر سوئی ہوئی تھی۔

میں نے بہت آہستگی کے ساتھ یہ چھوٹی تلواری اس کے تکیے کے نیچے سے نکال لی... میری احتیاط کے باوجود وہ جاگ گئی۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر رکھ لی۔

”یہ تلواری نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سب... بس یونہی۔“ وہ ہٹکائی۔

”نہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے... شاید صرف ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نگاہوں میں وہ ناقابل فراموش منظر گھوم گیا جب جارج گورا نے میرے گلے میں ذلت کا ہار پہنایا تھا اور سلطانہ نے میری بے مثال بے

بسی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔ پھر سلطانہ نے نگاہ جھکائی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سلطانہ! میں جانتا ہوں کہ میرے اوپر تمہارے کچھ قرض ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں اتارنا آسان نہیں ہے... لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اس رات کے بعد میں بتدریج تبدیل ہوا ہوں۔ میرے اندر بہت کچھ بدلا ہے سلطانہ... جس طرح جارج کا نام تمہارے ذہن میں گڑا ہوا ہے، میرے ذہن میں بھی گڑا ہے۔“

وہ دل دوز انداز میں سر جھکا کر رہ گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ سوئے ہوئے بالو کا ہاتھ چومنا اور تلوار سمیت باہر آ گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ریشمی پردے والے جھروکے میں سے آتش بازی کے مناظر دکھائی دیے۔ رنگ برنگی ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور چھوٹے بڑے پٹانے چل رہے تھے۔ اسی دوران میں حجام عبدالرحیم بھی آ گیا۔ میں نے اس سے آتش بازی کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ”اس کی ایک ٹاپیں دو وجہ ہیں مہرور بھائی... مم... میرا مطلب ہے تابش بھائی۔“

”وہ کون سی؟“

”بھائی وجہ تو شب برات کا تہوار ہے۔ کل یہاں اسٹیٹ کے مسلمان شب برات منائیں گے۔ دوسری وجہ کا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے چلا ہے۔ تل پانی اور زرگاں کے درمیان لڑائی وقتی طور پر تل گئی ہے۔ ہماری جان کاری کے مطابق تل پانی اور زرگاں کے خاص خاص لوگن میں بات چیت ہوئی ہے جس میں دونوں طرف سے تھوڑی اور سوچ و چار کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“

میں اور عبدالرحیم جھروکے کے سامنے کھڑے ہو کر آتش بازی کا نظارہ کرتے رہے... تل پانی کا کافی بڑا حصہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ جھیل کا ایک حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے کی آبادی میں سے گاہے بگاہے ہوائیاں چھوٹی تھیں اور ان کے رنگ آسمان پر بکھرنے کے ساتھ ساتھ جھیل میں بھی منعکس ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ خوب صورت لگتا تھا۔

عبدالرحیم نے کھولی کھولی آواز میں کہا۔ ”تابش بھائی! کیا واقعی... تم کو... کچھ یاد آتا ہے؟ کچھیلی شب برات کی کوئی بات بھی تمہارے دماغ میں ناہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”میں نے تمہارے گھر میں کھانا کھایا تھا۔ سلطانہ بی بی نے بڑے پیار سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر

سے کوئی باہر نہیں گیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ابھی دیوان کی چار دیواری میں ہی ہیں۔“ رحیم نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔“ چوہان پرسوج لہجہ میں بولا۔ ”اس کی نگاہیں دور ایک سرخ رنگ کے بند پھانک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ تل پانی کے سرکاری اصطبل کا پھانک تھا اور یہ اصطبل دیوان خانے کے اندر ہی تھا۔ پھانک کے سامنے ایک دو گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔“

”کیا سوچ رہے ہو؟“ میں نے چوہان سے پوچھا۔ ”اگر وہ دونوں، رات کو حکیم خدا بخش صاحب کی طرف نہیں گئے اور نہ ہی اس گیٹ سے باہر نکلے ہیں تو پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اصطبل کی طرف گئے ہوں۔“

”مطلب؟“

چوہان نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے انچارج پہرے دار سے پوچھا۔ ”رات کو یہاں سے گھوڑا گاڑیاں گزرتی رہی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ پہرے دار نے جواب دیا۔ ”تین چار گزری ہیں۔ چھوٹے سرکار کے کچھ مہمان تھے جو آدھی رات کے بعد واپس گئے۔ ایک دودھ لانے والی گاڑی تھی... ایک شاید اور بھی۔“

”تم اندر آنے والی گاڑیوں کو ہی چیک کرتے ہو یا باہر جانے والی گاڑیوں کو بھی؟“

”اندر آنے والیوں کو ہی چیک کیا جاتا ہے جی... یا پھر کوئی خاص آرڈر ہو تو...“

چوہان نے ایک گہری سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال یہ ہے تائبش... سلطانہ اب ہمیں یہاں نہیں ملے گی۔ پھر بھی ہم تسلی کے لیے چیک کر لیتے ہیں۔“

... چوہان نے بالکل درست کہا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا۔ سلطانہ کے غائب ہونے کی خبر پورے دیوان میں پھیل چکی تھی۔ ہر جگہ ہلچل نظر آرہی تھی۔ سلطانہ دیوان کی عمارت میں کہیں نہیں تھی۔

اب اس کی تلاش کا سلسلہ دیوان کی عالی شان عمارت سے باہر شروع ہوا۔ مراد شاہ کے فوری حکم کے تحت گھڑ سواروں کی ٹولیاں ارد گرد کے علاقے میں پھیل گئیں اور خاص وعام سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔

میں شدید شاک کی کیفیت میں تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ کل رات تک وہ بہت نارمل نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہتری کی طرف اس کا سفر شروع ہو

پھر وہ میری طرف مڑی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مالک! سلطانہ بی بی کمرے میں تھیں ہیں۔ وہ نہیں بھی تھیں ہیں۔“

”نفسل خانے میں دیکھا؟“

”جی مالک۔“

میں صفیہ کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ کل رات میرے اصرار پر جو لباس سلطانہ نے پہنا تھا، وہ ایک طرف فرش پر پڑا تھا۔ پھولوں کے سارے کپڑے بھی ٹوٹے پھوٹے ایک طرف دھرے تھے۔ بالو بستر کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ باقی بستر پر بہت کم سلوٹیں تھیں اور یوں لگتا تھا کہ سلطانہ اس پر تھوڑی دیر کے لیے ہی لیٹی ہے۔

”کہاں جا سکتی ہے وہ؟“ میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔

”کچھ پتا نہیں جی! بی بی کا بھیجتا طلال بھی نہیں ہے۔ لگت ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گئی ہیں۔“

ایک دم میرا دھیان اس چھوٹی تلوار کی طرف گیا جو میں نے ایک دن پہلے سلطانہ کے تنکے کے نیچے سے نکالی تھی۔ میں نے وہ ساتھ والے اسٹور نما کمرے کی الماری میں رکھی تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ تلوار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

میں تیزی کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے باہر آیا۔ میں نے باوردی پہرے داروں سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان سلطانہ بی بی اپنے نو عمر بھتیجے طلال کے ساتھ یہاں سے گزری تھی۔ اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی اور چہرہ بھی نصف چھپا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شدید بخار میں ہے اور چھوٹے سرکار نے اس سے کہہ رکھا ہے کہ وہ جب چاہے، ان کے ذاتی معالج کو دکھا سکتی ہے۔

میں پہرے داروں سے بات کر رہی رہا تھا جب چوہان اور رحیم بھی وہاں آ گئے۔ ہم فوراً چھوٹے سرکار کے ذاتی معالج حکیم خدا بخش کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ حکیم صاحب دیوان کے اندر ہی ایک رہائشی جھے میں رہتے تھے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو میرے دل میں چھپا ہوا اندیشہ درست نکلا۔ سلطانہ اور طلال رات کو یہاں آئے ہی نہیں تھے۔

چوہان نے کہا۔ ”وہ دیوان کے شمالی گیٹ کی طرف گئے ہوں گے۔“

ہم شمالی گیٹ پر پہنچے۔ ابھی رات کی ڈیوٹی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ یہاں وہی پہرے دار موجود تھے جنہوں نے رات بھر اس گیٹ کی نگہبانی کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس راستے

مہندی لگائی ہوئی تھی۔ اسے یہ مہندی تم نے ہی لگائی تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتی پھرتی تھی کہ تم نے اسے مہندی لگائی ہے۔ بے ڈسٹکی ہی مہندی تھی، پر وہ اتنی خوش تھی کہ کچھ تاپیں پوچھو... اور پھر ہم اوپر چھت پر چلے گئے تھے۔ آتش بازی دیکھتے رہے تھے... اور تم نے سلطانہ بی بی کے ساتھ مل کر درجنوں موم بتیاں روشن کی تھیں... کچھ تو یاد ہوگا تمہیں؟“

مجھے ابھمن ہونے لگی۔ ”نہیں... مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ میں کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے رحیم نے بھی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

تاہم اس کے جانے کے بعد میں اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ کل شب رات کا تہوار تھا۔ اس موقع کو سلطانہ کو نارمل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اگلے روز سلطانہ کو مجبور کیا کہ وہ نیا لباس پہنے۔ میں اس کے لیے گیندے اور موہے کے بہت سے پھول اور گجرے لایا۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ وہ آج مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ پکا کر کھلائے۔ میری اس فرمائش نے اس کا چہرہ زرد کر دیا۔ بہر حال، میرے اصرار کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ وہ جھلمل کپڑوں میں ملبوس پہلی بار گھر کے باورچی خانے میں گئی تو ملازما میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ خوش گوار ٹھنڈک والی ایک خوشبودار شام تھی۔ سلطانہ نے لکھنوی طرز کے چاول بنائے اور بادام کشمش والا زعفرانی حلوہ پکایا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر پہلی بار ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جھروکوں سے باہر تاروں بھرا آسمان تھا اور آتش بازی کے رنگ تھے۔ کہتے ہیں کہ تنھے بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک ناویدہ رابطہ ہوتا ہے۔ جب والدین خوش ہوں تو وہ بھی سکون اور راحت محسوس کرتا ہے۔ بالو کی آنکھوں میں بھی آج مسکراہٹ تھی۔ اس شام مجھے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے حادثے کے بعد سلطانہ نارمل زندگی کی طرف آ سکتی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے زہرناک مایوسی کے بادل چھٹ سکتے ہیں۔

لیکن میں غلط تھا۔ جو کچھ میں سوچ رہا تھا، وہ ہونے والا نہیں تھا... اور وہ ہونے والا تھا جو اس شام میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں نے سلطانہ اور بالو کو کمرے میں چھوڑا اور اپنے کمرے میں واپس آ کر سو گیا۔ میری آنکھ صبح سویرے ایک تیز آواز سے کھلی۔ میں بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ملازمہ صفیہ برآمدے میں کھڑی چلا رہی تھی۔ ”سلطانہ بی بی... سلطانہ بی بی!“

زبان کے

ذریعے مصوری

ہانگ ارنان دنیا کا وہ واحد مصور تھا جو زبان سے تصویریں بناتا تھا۔ وہ اپنے منہ کو ٹیوب اور زبان کو برش کی طرح استعمال کرتا تھا۔ ہانگ ارنان ایک میز پر جھک کر ریشم کے بڑے سے ٹکڑے پر خوب صورت پھول، مناظر اور تئلیاں بناتا تھا۔ اس نے اسی طرح شاہکار چینی تصاویر بنائی ہیں، دنیا کا یہ منفرد اور عجیب روزگار آرٹسٹ منہ میں باری باری مختلف رنگ بھر لیتا تھا اور انہیں زبان کے ذریعے تصویریں منتقل کر دیتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ طریقہ بہت ہی فرحت بخش اور دلچسپ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں رنگوں کا ذائقہ محسوس کر کے مصوری کرتا ہوں۔

حاصل ہونے کا انتخاب واہ گیٹ سے

جائے گا لیکن اب وہ منظر سے اوجھل تھی۔ اس کے اوجھل ہونے کا انداز ذہن میں مزید اندیشے ابھارتا تھا۔

چوہان کے ذہن میں بھی ایسے ہی اندیشے تھے۔ وہ پرسوج انداز میں بولا۔ ”تائبش! مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خطرے پیدا کرے گی۔“

”جارج گورا اور اس کے قریبی ساتھی... وہ جارج گورا کو معاف نہیں کر سکی۔ وہ جس خانوادے سے تعلق رکھتی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ آن پر مرٹنے والے لوگ ہیں۔ حاکم لوگ پیار سے ان کی جان بھی لے لیں تو دے دیتے ہیں مگر ان کو سر جھکا کر جینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ راجپوت برادری کی وہ لڑکی ہے جو انگریزوں کے دور میں حیدر آباد دکن سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ فن سپاہ گری میں ہمیشہ سے تاجک ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں بھی تلوار کی دھنی ہوتی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اور طلال یہاں سے نکل کر زرگاں کی طرف گئے ہوں گے؟“

”یہ ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عزت کے شیرے کے لیے سر تاپا قہر ہے۔ ایسے میں وہ راستے کی مشکوں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچے گی۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے۔ اسے پتا ہوگا کہ عام حالات میں بھی جارج گورا کے

گردخت حفاظتی حصار ہوتا ہے۔ ان حالات میں تو اس کے قریب چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہوگی۔ وہ اپنی جان گوانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پائے گی۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ فوری طور پر زرگاں کی طرف نہ جائے۔ ابھی یہیں کہیں تل پانی میں چھپ کر لائحہ عمل بنائے... طلال اس کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی برادری کے کچھ اور افراد کی مدد لینے کے بارے میں بھی سوچ سکتی ہے۔“

”ایسی سوچ بیمار تو ٹھنڈے دل و دماغ سے کی جاسکتی ہے تاہن! وہ جس طرح یہاں سے گئی ہے، لگتا ہے کہ اس کے اندر ایک آگ ہے۔ یہ آگ اسے شاید ہی کہیں رکنے دے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق مراد شاہ صاحب نے راستے کی چوکیوں کو خبردار کروایا ہے۔ اگر وہ زرگاں کے رخ پر گئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اسے راستے میں کہیں ٹریل کر لیا جائے۔“

”یہ بات وہ بھی تو سوچ سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے وہ فوری طور پر زرگاں کا رخ نہ کرے۔“

اسی دوران میں اچھے تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کے دو باوردی ماتحت تھے۔ ماتحت دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ اچھے نے اندر آ کر ہمیں بتایا۔

”اندرون شہر سے اطلاع ملی ہے کہ اسلحہ کی ایک دکان پر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو ایک اکیلا لڑکا تھا۔ وہ ایک رائفل ایک پستول اور کچھ ایمونیشن کوٹ کر لے گیا ہے۔ دکان دار کے بازو پر تلوار کا زخم آیا ہے۔ تفتیش کرنے والے تھانے دار نے شک ظاہر کیا ہے کہ یہ لڑکا، سلطانہ بی بی کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال، اس خواص سے وشواس سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

یہ اہم اطلاع تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور فوراً اچھے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی میں ہم دیوان کی عالی شان عمارت سے نکلے اور اندرون شہر کی طرف چل دیے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تل پانی کے گلی کوچوں میں زندگی معمول کے مطابق رواں تھی۔ جنگی تناؤ وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا اور اس تبدیلی کے آثار لوگوں کے چہروں پر بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ بازاروں میں خریداریوں کا رش تھا۔ باغوں اور دیگر تفریح گاہوں میں بھی رونق تھی۔ بہر حال، لوگوں کے ذہنوں میں یہ شک بھی موجود تھا کہ اس صورت حال کے پیچھے زرگاں والوں کی کوئی سازش نہ ہو۔

گھوڑا گاڑی ایک ایسی آبادی میں پہنچی جہاں پرانی طرز کی دو تین منزلہ گنجان عمارتیں تھیں۔ یہاں گلیاں تنگ اور راستے پیچ دار تھے۔ ایک جگہ گاڑی سے اترنے کے بعد ہم

پیدل ہی ایک بازار میں داخل ہوئے۔ ایک دکان کے سامنے پولیس کے باوردی سپاہی موجود تھے۔ پولیس کی وردی یہاں، انڈیا کی عام پولیس سے ملتی جلتی تھی۔ بس پگڑی کا اضافہ تھا۔ پولیس والوں نے اچھے کو فوجی افسر کا پرٹوکول دیا۔ اسے سیلوٹ کیا گیا اور بڑے احترام سے موقع واردات پر پہنچایا گیا۔ فوجی دکان دار مدین لال دکان میں ہی موجود تھا۔ اس کے بازو پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور فریبہ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

تھانے دار کے اشارے پر اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔ ”جناب! دو پہر کے سبے گاہک وغیرہ کی آشنا کم ہی ہوت ہے۔ بھوجن کے بعد میں ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ ملازم لڑکا سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے ہی سویا تھا کہ ایک دم آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ پر کان نقاب اور ہاتھ میں دو فٹ لمبی تلوار تھی۔ اس نے تلوار یہاں... میری گردن پر رکھ دی اور کہا کہ میں بولا تو وہ گلا کاٹ دیوے گا۔ اس نے مجھ سے شوکیس کی چابی مانگی۔ میں چابی لینے کے بہانے تھوڑا سا آگے گیا اور پھر میں نے جلدی سے باہر نکلنا چاہا۔ وہ میرے وچار سے زیادہ بھرتیلا تھا۔ اس نے تلوار چلا کر میرا بازو گھائل کر دیا۔ میں یہاں گر پڑا، اس کرسی کے پاس۔ یہ دکان کا پچھلا کمرہ ہے۔ بازار سے گزرنے والے کسی بندے کو پتا بھی نہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ اس نے شوکیس کی چابی مجھ سے لی۔ بڑے سکون کے ساتھ شوکیس کھولا۔ اس میں سے ایک سات ایم ایم رائفل اور ایک کوٹ پائل نکال لیا۔ رائفل کے کوئی دو میٹرے راونڈ بھی وہ خبیث اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اس نے جاتے جاتے ہم کو دھمکی دی کہ اگر ہم نے زبان کھولی تو وہ پھر آوے گا اور تب ہماری ہتھیا کیے پٹانا ہیں جاوے گا۔“

دکان دار نے اپنی ساری پتا ایک ہی سانس میں کہہ ڈالی۔

”جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، تمہارا ملازم کہاں تھا؟“

اچھے نے پوچھا۔

”اس غریب کو اس نے یہ سامنے والے غسل خانے میں بند کر چھوڑا تھا جی۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے آواز تک نہیں نکالی۔“

”اب وہ کہاں ہے؟“

”وہ ذرا کمزور دل کا ہے جی۔“ تھانے دار نے کہا۔

”اس کو بے ہوشی ہو رہی تھی۔ اسے ساتھ والے اسپتال میں بھرتی کر لیا ہے۔“

ہمارے یہاں آنے سے پہلے تھانے دار محمود نے تفتیش

کا کچھ کام کیا تھا۔ اس نے فوجی افسر اچھے کو اس تفتیش سے آگاہ کیا۔ اچھے اور تھانے دار محمود کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ یہاں گھوڑوں کے بھی نمبر ہوتے ہیں اور یہ نمبر ان کی پیٹھ پر بڑے اہتمام سے داغے جاتے ہیں۔ ان نمبروں کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو عام جگہوں پر گاڑیوں کے نمبروں وغیرہ کی ہوتی ہے۔ ایک قریبی دکان دار نے بتایا تھا کہ واردات کرنے والا گھوڑے پر آیا تھا۔ اس گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر بھی اس دکان دار کو کسی حد تک یاد تھا۔ اچھے نے اس دکان دار کو طلب کیا۔ وہ مزید گواہوں کے بیان بھی سننا چاہتا تھا۔ میں اس طویل تفتیشی کارروائی سے اکتا کر گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ میرے ذہن میں پلچل مچی تھی۔ سلطانہ اور اس کا جھجکا کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہ سوال ایک آہنی تیغ کی طرح میرے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔

فوجی گاڑی اندر سے بہت آرام دہ تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مٹی پر دے پڑے ہوئے تھے۔ تاہم ان پردوں کی جھریوں میں سے باہر کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ بازار کی گہما گہمی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک منظر نے مجھے بری طرح چونکایا۔ یہ ایک تیس چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ اس نے ایک ڈنی دار چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ایک ٹھیلے والے کے عقب میں کھڑا وہ کھوجی نظروں سے فوجی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز مشکوک تھا لیکن جس چیز نے مجھے چونکایا، وہ اس کی صورت تھی۔ میری نگاہوں میں وہ مناظر گھوم گئے جب اپنے ہوش و حواس میں واپس آنے کے بعد میں نے پہلی بار اسٹیٹ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ مجھے جنگل سے پکڑ کر واپس لائے تھے۔ ان واقعات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے ان سب لوگوں کے چہرے یاد تھے۔ یہ شخص بھی ان میں سے تھا۔ میری نظر دھوکا کھائیں کھار ہی تھی۔ لیکن یہ شخص زرگاں سے کوسوں دور یہاں تل پانی کے اس بازار میں کیسے موجود تھا؟ میں نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ مضطرب نظر آتا تھا۔

میرے جسم میں لہریں دوڑ گئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مڑا اور مخالف سمت میں چل دیا۔ میں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ واضح طور پر بوکھلا گیا۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے بھی رفتار تیز کر دی۔ یہ منہجان بازار تھا۔ وہ کسی بھی وقت نگاہوں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میں مسلسل اس کے پیچھے ہوں تو وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس بازار میں زیادہ تر خواتین ہی خریداری کر رہی تھیں۔ کپڑوں، چوڑیوں اور گہنوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ہر طرف برقعے یا رنگ دار چادریں دکھائی دیتی تھیں۔ میں دوڑا تو مردوزن سے میرا تصادم شروع ہو گیا۔ کئی خواتین میرا دھکا لگنے سے گریں اور چلائیں۔ ایک فریبہ اندام قلفی فروش میری نگر لگنے سے آرائشی سامان کی ایک دکان میں جا کر اور وہاں کھلبلی مچ گئی۔ مجھے ارد گرد کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہ بس بھاگنے والے شخص پر تھی اور میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک جگہ وہ ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکرا کر گرا اور پھر فوراً اٹھ کر ایک تنگ گلی میں کھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گلی میں گیا۔ یہ کوئی مریج مسالے کا بازار تھا۔ ہر طرف مسالوں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

”پکڑو... پکڑو۔“ میں نے پکارنا شروع کیا۔

میری پکار پر کسی نے فوری عمل تو نہیں کیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ مجھے ہجوم میں سے بھاگنے کے لیے نسبتاً آسانی سے راستہ ملنے لگا۔

... اگلے دو منٹ میں اندرون شہر کی ان بھری پُری گلیوں میں یہ اندھا دھند تعاقب جاری رہا۔ اس دوران میں کئی خواستے اٹھے اور کئی مردوزن کو چوبیس وغیرہ سہا پڑیں۔ وہ شخص بھاگتا بھاگتا ایک سہ منزلہ پرانی عمارت میں داخل ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ بعد میں بھی عمارت کے اندر تھا۔ ایک عجیب سی تلخ، جھلٹا ہٹ مجھ پر سوار ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک ترنگ سی بھی تھی۔ یہ ترنگ کیا تھی؟ شاید خود کے اندر ہونے والی اہم تبدیلیوں کے بعد میں لاشعوری طور پر کہیں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا تھا۔ کسی سے ٹکرانا چاہتا تھا، نہ تو آ رہا ہونا چاہتا تھا۔

... اور اس عمارت میں گھسنے کے بعد یہ موقع مجھے مل گیا بلکہ اتنی شدت سے ملا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔

دو بٹے کئے افراد تیزی سے میرے سامنے آئے۔ وہ بھی سانولے تھے اور صورتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندو ہیں۔

”اوسے... کون ہو؟“ ان میں سے ایک نے ہراساں آواز میں کہا پھر وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔

میں نے ایک کے چہرے پر کہنی کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا لکڑی کے ایک تخت پر گرا اور وہاں رکھے تاش کے پتے چاروں طرف پکھر گئے۔

میں نے دوسرے شخص کی ٹاف میں گھٹنا مارا اور پھر سر کی نگر سے اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں دو افراد

Scanned and Uploaded By Nadeem

پھیلا دی تھی۔

چوہان نے مجھے ٹولا اور ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔
”تم ٹھیک تو ہونا تابش؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان اور اے وغیرہ کی چڑھی ہوئی سانسیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ میرے پیچھے ہی پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

اے کے سپاہیوں نے مرنے والے کے ساتھیوں کو ایک قطار میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ کچھ سپاہی عمارت میں پھیل گئے اور دیگر افراد کو تلاش کرنے لگے۔

”یہ کون لوگن ہیں؟“ اے نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

”باقیوں کا تو پتا نہیں... مگر اس بندے کو میں کسی حد تک جانتا ہوں۔“ میں نے ٹائل دار فرش پر مردہ پڑے گہرے سانولے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

”کون ہے یہ؟“ اس مرتبہ چوہان نے پوچھا۔

”تھم کا ایک قریبی ساتھی۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہوگا لیکن تمہارے ذہن سے نکل گیا ہے۔ جب مجھے اور سلطانہ کو یہاں تل پانی سے واپس زرگاں بھجوا یا گیا تو یہ شخص موہن کمار کے ساتھیوں میں شامل تھا۔“

چوہان نے چونک کر مردہ شخص کا خونخوار چہرہ دیکھا۔ پھر شاید اس نے بھی کسی حد تک اسے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔

”تم نے اسے کہاں دیکھا؟“ چوہان نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل بتا دی۔ اس دوران میں اسے کے ماتحت افراد عمارت کے مختلف حصوں سے قریباً پانچ مزید افراد کو ہانک کر گراؤنڈ فلور پر لے آئے تھے۔ یہ سارے افراد کٹر ہندو لگتے تھے۔ یہ سب کے سب جواں سال تھے۔ اس عمارت کی مختلف دیواروں پر گواہیں، کلہاڑیاں اور رائفلیں آویزاں تھیں۔ بھرتی، ہنومان اور کالی ماتا کی مورتیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک دو جگہ ہندی کے کچھ پوسٹر بھی نظر آئے۔ پوسٹروں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ یہ عسکری نوعیت کے ہیں۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ جگہ جو شیلے ہندو نوجوانوں کی ایک بیٹھک ہے۔ اس عمارت کی دوسری منزل پر ایک بڑا جنازہ میز تھا۔ وہاں جسمانی کسرت کی جاتی تھی اور لڑائی بھڑائی کے گڑ بھی سیکھے جاتے تھے۔ عمارت میں موجود پوسٹرز سے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ مسلمان مخالف پروپیگنڈے کا اڈا بنی ہوئی ہے۔

سڑھیوں سے چھلائیں لگاتے ہوئے نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس کا پیچھا کر کے میں یہاں پہنچا تھا۔ اب اس شخص کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ کلہاڑی کا خوفناک پھل چمک رہا تھا مگر وہ مجھے کسی کھلونے کی طرح لگی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کلہاڑی مجھے خراش تک نہیں پہنچا سکتی۔ شاید یہی وہ اعتماد تھا جسے میں آج تک تلاش کرتا رہا تھا۔ اور یہی وہ اعتماد تھا جس کے بارے میں باروندا جی کہتا تھا کہ جب یہ بندے کے پاس ہو تو پھر اسے لڑنے اور جیتنے کے لیے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں رہتی۔

کلہاڑی کا اندھا دھند وار جو میرے سر پر کیا گیا تھا میں نے آسانی سے بجایا اور کلہاڑی بردار کے جڑے ہوئے ٹانگ رسید کی۔ جڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح اور شفاف تھی۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب اس گھر کا بیرونی دروازہ ایک بار پھر دھماکے سے کھلا۔ اس مرتبہ اندر داخل ہونے والے میرے ہی ساتھی تھے... چوہان اور کپتان اے وغیرہ...

اے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے عقب میں اس کے باوردی سپاہی تھے۔ ”خبردار... خبردار!“ اے گرجا۔ ”گولی بار دوں گا۔“

یہ ایک ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان کے پاس سے سرگوشی کرتی گزری۔ یہ فائر زمین پر گرے ہوئے اس بندے نے کیا تھا جس کا اندھا دھند تعاقب مجھے یہاں تک لایا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں کلہاڑی کی جگہ پستول نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری مرتبہ مجھے نشانہ بناتا، اے کی چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں اتر گئی۔

گولی لگنے سے اس کے جسم نے جھٹکا کھایا مگر اس نے پستول پر اپنی گرفت قائم رکھی۔ تڑپ کر اس نے پستول کا رخ اے کی طرف کیا۔ تب اے نے پھر ٹرگر دیا۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور یہ دوسری گولی اس شخص کے جسم کے اسی حصے میں لگی جو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ یعنی اس کا جڑا۔ وہ ایک کربناک کراہ کے ساتھ پیچھے کی طرف اٹھ گیا۔

اے کے سپاہیوں نے رائفلیں سونت لی تھیں۔ ان کے خطرناک تیور دیکھ کر باقی افراد ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ ان کے رنگ اڑ گئے اور جانیں بچانے کے لیے انہوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر دیے۔ شوٹ ہونے والے شخص کا خون تیزی سے اس کی ڈبی دار چادر کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔

عمارت سے باہر گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ جھوم ہر لمحے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیوں کی آواز نے اس گنجان علاقے میں ہر طرف سنسنی

کپتان اسے کی ہدایت پر تھانے دار محمود نے مرنے والے شخص کی لاش کو قبضے میں لے لیا اور عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کر لیا۔ امید تھی کہ گرفتار ہونے والوں کے ذریعے مزید انکشافات ہوں گے۔

”تمہاری پنڈلی پر چوٹ آئی ہے۔“ چوہان کی آواز نے مجھے چونکا یا۔

میں نے دیکھا، واقعی پنڈلی پر ایک گہرا کٹ آیا تھا۔ لڑائی کے دوران میں کوئی اتنی شے لگی تھی۔ خون بہہ کر نٹنے تک جا رہا تھا مگر یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ اس چوٹ نے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں دی تھی۔ اپنا بہتا ہوا خون دیکھ کر مجھے پریشانی کے بجائے عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ شاید جنگی کی تربیت نے مجھ پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کر دیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم دیوان میں واپس پہنچ گئے۔ یہاں سلطانہ اور اس کے بھیجے کی گمشدگی سب سے اہم موضوع تھی۔ ہر کوئی اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اسے کو امید تھی کہ اگلے چوبیس گھنٹے میں کوئی نہ کوئی کھوج ہاتھ آ جائے گا۔ یہ بات تو اب تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ آج سہ پہر اسلحے کی دکان پر واردات کرنے والا سلطانہ کا بھتیجا طلال ہی تھا۔ یہاں گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر سامنے آیا تھا۔ اسے کو یقین تھا کہ اس نمبر کے ذریعے پیش رفت ہوگی۔

رات کو ہاروندا جنگلی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے اسے تیز بخار بھی ہو جاتا تھا لیکن وہ اپنا ہر دکہ درد شراب میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ نشے کی وجہ سے اس کی خوش طبعی بھی برقرار رہتی تھی۔

میں نے اسے سہ پہر والی کارکردگی بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ”میں سمجھ گیا۔ یہ ہندو اکھاڑے کے لوگ تھے۔ یہ تو کافی سخت جان ہوتے ہیں۔ نئے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ پرانے ہتھیار چلانے کی بھی انہیں مہارت ہوتی ہے۔ اگر تم نے انہیں نچا دکھایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میری محنت بالکل ہی بیکار نہیں جا رہی۔“

”بالکل ہی بیکار نہیں جا رہی۔۔۔ سے کیا مطلب؟ کیا آپ میری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہو؟“

”مطمئن تو ہوں لیکن پوری طرح نہیں۔“ اس نے کہا پھر میری پنڈلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا باندھ رکھا ہے؟“

”میں نے بتایا ہے نا، یہاں چوٹ لگی ہے۔ کافی خون بہا ہے۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔ تم چوٹ کو چوٹ سمجھ رہے ہو۔ تم اس سے خوف زدہ ہو۔ تم نے اسے چھپا دیا ہے، باندھ دیا

ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی جنگی جانور شیر، چیتے، ٹائیگر وغیرہ کے بارے میں بھی سنا ہے کہ اس نے زخم پر پانی باندھی، دوا لگائی؟ حالانکہ انہیں زخم لگتے ہی رہتے ہیں اور ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ فطرت خود سب سے بڑا امر ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”اگر سمجھنا چاہتے ہو تو آہستہ آہستہ سمجھ میں بھی آنے لگے گا۔“ اس نے کہا اور میری پنڈلی کی پٹی اپنے ہاتھ سے کھول دی۔

اس دن مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ زخمی پنڈلی کے ساتھ ہی میں نے اور جنگی سنے سخت ترین مشق کی۔ میرے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔ میرا پاؤں لہورنگ ہو گیا۔ زخم پر لگنے والی پہلی ایک دوا ضریوں نے مجھے تکلیف دی لیکن پھر یہ تکلیف ایک طرح کی توانائی میں بدلنے لگی۔ ہر بار جب زخم پر چوٹ لگتی تو میرے اندر ایک ہجان سا پیدا ہوتا۔ ایک نچ لہرا بھرتی اور آتش بن کر میرے رگ دے میں دوڑ جاتی۔ میں درد اور برداشت کے نئے پہلوؤں سے آشنا ہو رہا تھا۔

اس رات ہاروندا جنگلی کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ یوں لگا کہ اس کی سانس رک جائے گی۔ اس کا ہڈیوں بھرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ جنگی تک وہ اطلاع پہنچا دوں جو میں نے کئی دن سے خود تک محدود رکھی ہوئی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جنگی کو اضافی دکھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ابھی تک کپتان ابے کوئل پانی میں شکستہ کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ بہر حال، وہ تنہی سے اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

... اگلے تین دن تک سلطانہ اور طلال راجپوت کی تلاش شدومد سے جاری رہی مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ گھوڑے پر دانے ہوئے نمبر سے بھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں تین مختلف افراد مشکوک قرار دیے گئے تھے اور ان سے پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔

اکھاڑے سے جو نو جوان پکڑے گئے، انہوں نے کئی انکشافات کیے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور جارج وغیرہ کوئل پانی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ہم آہنگی ایک آنکھ نہیں بھار رہی۔ تل پانی میں مسلمان اکثریت میں تھے، اس کے باوجود وہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری سے رہ رہے تھے۔ اس رواداری اور ہم آہنگی کو ختم کرنے کے لیے حکم نے اپنے سازشی عناصر یہاں چھوڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک مثال چارون پہلے اکھاڑے میں ہلاک ہونے والا شخص تیش

آمنڈ تھا۔ یہ شخص ہندو نو جوانوں میں مرادشاہ وغیرہ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مرادشاہ اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار پر حاوی ہو چکے ہیں اور وہ غریب اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان عالموں کے پاس بیٹھتا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں دن بہ دن مسلمانوں کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سلطانہ کی گمشدگی نے مجھے از حد مضطرب کر رکھا تھا۔ مجھے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اچانک اس کے بارے میں کوئی اندوہناک خبر آجائے گی۔ اس کی تلاش میں چھوٹے سرکار کے ہر کارے دور دور کی خاک چھان رہے تھے۔ میں خود بھی دیوان سے باہر نکل کر اس تلاش میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن چوہان نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”تم ایک بات بھول رہے ہو تائش! تم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہو۔ تمہارے اندر ”چپ“ موجود ہے اور یہاں تل پانی میں حکم کے بہت سے جاسوس موجود ہیں۔ وہ تمہیں کسی بھی وقت ٹریس کر سکتے ہیں۔“ اس نے مجھے اٹینا والی بات بھی یاد دلائی اور کہا کہ اب مجھے اس بارے میں کوئی شک شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

وہ تو اس بات پر بھی ناخوش تھا کہ میں نے تین چار دن پہلے بازار میں اچانک تیش کو دیکھ کر اس کا اندھا دھند تقب شروع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سیکورٹی کے بغیر بالکل دیوان کی عمارت سے باہر نہ نکلوں۔

ننھا بالو بھی آج کل بہت مضطرب تھا۔ یاس کی دوری اکثر اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز رکھتی تھی۔ وہ اسے بانہوں میں نہیں لیتی تھی، اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی تھی لیکن اس کے قریب تو رہتی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں لینے کی اجازت تو دیتی تھی مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کی گود میں بلک رہتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کچھ کر رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز سن کر میں اس کے پاس چلا گیا۔ صفیہ اسے بانہوں میں لیے برآمدے میں چکر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ لاڈ بھرے انداز میں اسے پکارتی رہی تھی۔ ”کا کے کی امی جان آئے گی۔۔۔ کا کے کو گانا سنائے گی۔۔۔ کا کے کو جھولا جھلائے گی۔۔۔ کا کے کو دودھ پلائے گی۔۔۔ کا کے کی امی آئے گی۔“

وہ واقعی چپ ہو گیا۔ اپنی اشک بار معصوم آنکھوں سے صفیہ کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کی ساری بات سمجھ رہا ہو۔ اس دوران میں صفیہ نے بھی مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے اپنی کوزھنی درست کرنے لگی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بالو کو اٹھالیا۔ مجھے اس سے انس

محسوس ہوا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے، اس کا نم گال چوما۔ اس کا ننھا سینا اب بھی چھوٹی چھوٹی ہچکیوں سے دھل رہا تھا۔ اس کی ہچکی میں ممتا کی تلاش تھی۔

اسی اثنا میں مجھے چوہان تیز قدموں سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ”خیریت ہے چوہان؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچا کر بولا۔ ”پرانے شہر سے ایک لاش ملی ہے۔“

”کس کی؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ایک جواں سال عورت ہے۔ چہرہ بُری طرح مسخ ہے۔۔۔ پہچانا نہیں جا رہا۔ ابے کو شک ہے کہ۔۔۔“ چوہان کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ادھورے فقرے کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ میں نے دہل کر کہا۔ ”وہ کوئی اور ہوگی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔ تم شناخت میں مدد دے سکتے ہو۔“

میں نے لرزاں ہاتھوں سے بچہ واپس صفیہ کی گود میں دیا اور ڈاکٹر چوہان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جب میں نے سلطانہ کو آخری بار دیکھا تو اس نے کون سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی جوتی کون سی تھی؟ وہ زیور تو سرے سے پہنتی ہی نہیں تھی۔ اسے لباس وغیرہ سے ہی شناخت کیا جاسکتا تھا۔

ہم تھوڑا گاڑی میں بیٹھے اور شہر کے بارونق راستوں سے گزرتے ہوئے پرانی آبادی میں پہنچ گئے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ گھروں میں چراغ، لالٹینیں اور گیس لیمپ وغیرہ روشن ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں کسی خوش حال قبیلگی کی چار دیواری میں جزیرہ کی برقی روشنی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں بائیسکلوں پر لیمپ روشن کرنے کا رواج تھا۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں وغیرہ کی دونوں سائڈز پر بھی کیروسین آنکھ کے لیمپ روشن کیے جاتے تھے۔

ہم ایک تین چار منزلہ عمارت کے سامنے پہنچے۔ بالکونیوں اور محرابی دروازوں والی اس عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کے سپاہی اس ہجوم کو موقع واردات سے بچھتے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ابے بھی یہیں موجود ہے۔

میں چوہان کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے میں پہنچا۔ یہاں لکڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر ایک لاش سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی۔ چادر پر سر کی طرف خون کے بڑے

بڑے داغ نظر آرہے تھے۔ میری رگوں میں خون کی گردش عروج پر پہنچ گئی۔ کیا اس چادر کے نیچے سلطانہ بھی؟

اے کے حکم پر باقی افراد کمرے سے باہر نکل گئے۔

تھانے دار محمود بھی چلا گیا۔ اب صرف ڈاکٹر چوہان، اے اور میں کمرے میں تھے۔ اے کے چہرہ اتر اتر ہوا تھا۔ وہ ہولے سے بولا۔ ”چہرہ بالکل خراب ہو چکا ہے۔ شاید کلباڑی کے وار کیے گئے ہیں۔ دل کڑا کر کے دیکھنا پڑے گا۔“

چوہان نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اے نے لاش کے چہرے پر سے خون آلود چادر ہٹائی اور اسے کندھوں تک کھسکا دیا۔ واقعی کچھ نظارے آنکھوں کے لیے سخت اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ میں اندر تک لرز گیا۔ قاتل نے بڑی بے رحمی سے چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ اس نے کلباڑی وغیرہ سے پے در پے وار کر کے سر اور چہرے کی ہڈیاں چور کر ڈالی تھیں۔

پکتان اے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”نہیں۔ چہرے سے تو کوئی اندازہ نہیں ہو رہا۔“ میں نے رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

چوہان نے بھی میری تائید کی۔

”کپڑوں سے کچھ پتا چل رہا ہے؟“ اے نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں، کپڑوں سے بھی نہیں۔“

”لیکن یہ اسی طرح کے کپڑے ہیں جیسے سلطانہ بی بی پہنتی تھی۔“ اے بولا۔ اس نے لاش کا چہرہ تو ڈھکا رہنے دیا لیکن پہلو سے چادر ہٹا کر ایک بار پھر مقتولہ کے خون آلود کپڑے ہمیں دکھائے۔

میں نے کپڑوں کو دھیان سے دیکھا۔ یہ اسی طرح کی چمک دار... فرائیگ نمائش تھی جو سلطانہ پہنتی تھی۔ زیریں جسم پر تنگ موری کا پاجامہ تھا۔ میں نے ہاتھوں اور بازوؤں کی ساخت دیکھی لیکن ایک بار پھر کوئی اندازہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اے بولا۔ ”ابھی تھوڑے سے پہلے سلطانہ بی بی کے پتا مختار صاحب بھی یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔“

”وہ کیا کہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو چند سیکنڈ سے زیادہ دیکھنا نہیں سکے۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ ویسے انہوں نے بھی پہچانا تھا ہے۔“

چوہان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے تابش... کہ سلطانہ تمہاری بیوی ہے۔ بیوی اور شوہر کا رشتہ سب سے

نزدیکی ہوتا ہے۔ ایک شوہر کی حیثیت سے تم اسے اس کی جسامتی نشانی کی وجہ سے بھی پہچان سکتے ہو۔“ چوہان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ یوں تو ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اسے بھی معلوم تھا کہ میرا کیس کتنا مختلف ہے۔ پچھلے دو ڈھائی سال کا عرصہ میرے ذہن میں ایک بالکل صاف سلیٹ کی طرح تھا۔ اس پر کوئی نقش کوئی یاد موجود نہیں تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں نے طرح چوٹک گیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اے یا چوہان کے ذہن میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی شاید سلطانہ کے والد کے ذہن میں۔ کبھی کبھی یوں ہو جاتا ہے۔ کسی واقعے پر غور کرتے ہوئے نہایت دانا پنا لوگ بھی بالکل سامنے کے نکتے کو فراموش کر جاتے ہیں۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

ہم واپس کمرے میں پہنچے جہاں مسخ لاش رکھی تھی۔ دراصل مجھے کچھ روز پہلے کا وہ خون ریز واقعہ یاد آ گیا تھا جب تل پانی کے نواحی جنگل میں ”کھنڈر چوکی“ پر پاؤں سے اور اے کے بندوں میں زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ سلطانہ نے بھی اس لڑائی میں مردانہ وار حصہ لیا تھا اور ٹیلے پر چڑھائی کرتے ہوئے اس کا ایک پاؤں زخمی بھی ہو چکا تھا۔ یہاں دسی بم کا کوئی چھوٹا ٹکڑا لگا تھا۔

اب یہی زخم سلطانہ کی شناخت بن سکتا تھا۔ میں لکڑی کے بوسیدہ تخت پر پڑی لاش کی طرف بڑھا تو میرے اعصاب چنٹنے لگے۔ یہ بڑا جگر پاش مرحلہ ہوتا ہے۔ چادر اٹھا کر لاش شناخت کرتے ہوئے داغ مآؤف ہو جاتے ہیں اور سینے پھٹ جاتے ہیں۔ کیا اگلے چند سیکنڈ میں، میں اس اندوہناک خبر سے آگاہ ہونے والا تھا کہ میری مبینہ بیوی اور بالوکی ماں کبھی ہمارے درمیان واپس نہ آنے کے لیے جا چکی ہے۔

میں نے لاش کے خون آلود پاؤں پر سے چادر ہٹائی۔ میری نگاہ دھندلا گئی۔ اس دھندلائی ہوئی نگاہ نے دیکھا کہ لاش کے پاؤں پر زخم نہیں تھا۔ یہ سلطانہ کی لاش نہیں تھی۔

”نہیں چوہان۔“ میں نے بد نصیب مقتولہ کے پاؤں دوبارہ چادر سے ڈھک دیے۔ ”یہ سلطانہ نہیں ہے۔“

چوہان اطمینان کی طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ خود بھی اس بات پر بھونچکا رہ گیا کہ یہ بنیادی بات اس کے اور اے کے ذہن میں کیوں نہیں آ سکی۔

”شدید تشویش میں اس طرح کی غلطیاں ہو جاتے ہیں۔“ اے نے کہا۔

میں نے تائید کی اور پوچھا۔ ”یہ لاش ملی کیسے؟“

اے نے بتایا۔ ”یہ مکان کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔ مالک مکان نئے شہر میں جا چکا ہے۔ آج دوپہر کو بچے ملے۔ میں کھیل رہے تھے۔ ان کی گیند ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے اندر چلی گئی۔ دو بچے گیند لینے کے لیے اندر گئے تو انہیں یہ تازہ لاش نظر آئی۔ انہوں نے شور مچا دیا۔“

”یہ کسی مسلمان لکڑی کی لاش ہے۔“ چوہان نے کہا۔

”اور خاص بات یہ ہے کہ یہ جگہ اس گلی سے زیادہ دور نہیں جہاں تین چار دن پہلے ہندو اکھاڑے میں ستیش آنند کو گولی ملی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اس قتل کا تعلق اکھاڑے والے واقعے سے ہو سکتا ہے؟“

”یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔“ چوہان نے کہا۔

میرے ذہن میں آنندھی سی چل رہی تھی۔ میں لاش والے کمرے سے باہر نکل آیا۔ دل کی دھڑکنیں ابھی تک زبردست تھیں۔ اگر یہ سلطانہ کی لاش ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس کا جواب کافی تکلیف دہ تھا۔ تو کیا میں لاشعوری طور پر سلطانہ سے وابستگی محسوس کرنے لگا تھا؟ اس کی زندگی اور موت میرے لیے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی؟

لاش میں سے اب ہلکی ہلکی بو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اس بو سے گھبرا کر باہر گلی میں نکل آیا۔

ایک گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اس کے جسم پر فوجی وردی تھی اور وہ اے کے ماتحتوں میں سے تھا۔ یقیناً اس کے پاس اے کے لیے کوئی خاص خبر تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اے کے پاس پہنچ گیا۔ اس ماتحت نے سیلیوٹ کرنے کے بعد پکتان اے کو اطلاع دی۔

”جناب! شہر کے شمالی برج کے پاس ایک لڑکی کا کھوج لگا ہے۔ وہ ایک چھوٹی بچی پر سوار تھی اور اسے خود ہی چلا رہی تھی۔ اسے ایک ناکے پر روکا گیا لیکن وہ ر کے بغیر آگے بڑھ گئی۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ عجیب علاقے میں چلی گئی اور پھر بھی چھوڑ کر ایک گودام میں گھس گئی۔ وہ اب بھی اسی تین منزلہ گودام میں ہے۔ ہمارے ساتھیوں نے گودام کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“

”تو اس کو پکڑا کیوں نہیں؟“ پکتان اے نے جھج جھج کر پوچھا۔

”اس گودام میں بہت سا آتش گیر مادہ پڑا ہے جی۔ گندھک اور سلفر وغیرہ۔ اگر لڑکی کے پاس کوئی ہتھیار ہے

اور اس نے گولی وغیرہ چلا دی تو بڑا مسئلہ ہو جاوے گا۔“

”وہ کیسی ہے؟“ اے نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ہمارے سامنے تو ان کی ہی اندر گھسی ہے۔ اگر اندر پہلے سے اس کا کوئی ساتھی وغیرہ ہو تو کہنا نہیں جا سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔“ اے نے کہا۔

تھانے دار محمود کو لاش کے حوالے سے ”اہم ہدایات“ اور مشورے دینے کے بعد اے میرے اور چوہان کے ساتھ فوجی گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہم تیز رفتاری سے پانی کے شمالی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ت کے تو بچنے والے تھے۔ زیادہ تر گلیاں اور سڑکیں نیم تاریک دکھائی دے رہی تھیں۔

کہاں تو سلطانہ کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی اور کہاں اب اوپر نیچے اطلاعات مل رہی تھیں۔ راستے میں اے نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔ ”تم نے لڑکی دیکھی ہے؟“

”جی جناب! لیکن بس ایک جھلک ہی دکھائی پڑی تھی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔ نقاب میں سے بس آنکھیں ہی نظر آوت تھیں۔ وہ کافی ہوشیار اور دلیر لگت ہے جی۔ اس نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے کوئی تین میل تک دوڑایا ہے۔“

اسی گفتگو کے دوران میں ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ نسبتاً کشادہ علاقہ تھا۔ یہاں درخت وغیرہ بھی تھے۔ دائیں طرف سے تازہ ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ یقیناً اس طرف تل پانی کی بڑی جھیل تھی۔ یہاں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک سراسیمگی سی پانی جا رہی تھی۔ پولیس اور فوج کے جوانوں نے گودام کی عمارت کو گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ تماشا کی دور گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں پر موجود تھے۔

اے نے بڑی بڑی مونچھوں والے اس پولیس افسر سے بات کی جس نے لڑکی کا تعاقب شروع کیا تھا۔ اس نے دور کونے میں کھڑی ایک چھوٹی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس پر آئی تھی جی۔ ہم نے روکا تو یہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔ اس نے کالے رنگ کا برقع پہنا ہوا ہے۔ اور بالکل بڈ رنگت ہے۔“

”تمہیں یہ کیسے شبہ ہوا کہ یہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ ہو سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سلطانہ بی بی کے ساتھ اس کا نوعمر بھتیجا بھی ہے۔ ہمارے خیال میں اس بچی میں بھی ایک لڑکا موجود تھا لیکن وہ راستے میں کہیں اتر اور تنگ گلیوں میں غائب ہو گیا۔“

”کسی نے اس لڑکے کو دیکھا؟“ پکتان اے نے

”ناہیں، صاف تو ناہیں دیکھ سکے... بس کشمیری دروازے کے پاس اس کی ایک جھلک دیکھی گئی ہے۔“

کچھ دیر صلاح مشورہ ہوا۔ میں نے اسے سے کہا۔

”اگر اندر سلطانہ ہی ہے تو پھر اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ میں اندر جاؤں... اور اکیلا ہی جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنی بات سننے پر مجبور کر لوں گا۔“

”اس کام میں بہت احتیاط کرنا پڑے گی جی۔“ پولیس افسر نے کہا۔ ”وہ کسی کی بات ناہیں سن رہی۔ آتما ہتھیا کی دھمکیاں بھی دے رہی ہے۔“

”کیا کوئی اس سے پہلے گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

موجھیل پولیس افسر نے ایک پٹھان چوکیدار کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ درمیانی عمر کے اس شخص کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ بھی نظر آتا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہی لڑکی گودام کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ”بی بی اوپر کی منزل پر دائیں طرف والے کمرے میں ہے جی۔ اس کمرے کا ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی ہے۔ ام اوپر گیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ام سے کہا کہ اگر ام آگے آیا تو وہ کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دے گا۔ ام ذرا سا اور آگے گیا تو اس نے اپنا پاؤں کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور کودنے کے لیے ایک دم تیار ہو گیا... وہ بہت خطرناک نظر آ رہا ہے جی۔“

”کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہے اس کے پاس؟“ میں نے پوچھا۔

”ام بھروسے سے کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔“

میں نے اسے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں اندر جاتا ہوں۔“

اس معاملے پر تھوڑی سی بحث ہوئی پھر اچھے اور چوہان نیم رضامند ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ ”وہ جو کوئی بھی ہے، اسے سب سے پہلے یہ بتا دو کہ یہاں بہت سا آتش گیر سامان پڑا ہے۔ اگر اس کے پاس ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلانے کی غلطی کی تو سب کچھ دھماکے سے اڑ جائے گا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جسم میں سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ وہی میٹھی میٹھی لہر جواب مجھے خطرے سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ گودام میں گہری تاریکی تھی۔ بس ایک دو کمروں میں لائٹیں یا گیس

لیپ کی روشنی موجود تھی۔ میں صرف ایک ڈارچ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ایک پستول بھی میرے لباس میں موجود تھا لیکن یہ پستول مجھے صرف اسی وقت استعمال کرنا تھا جب کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہتا۔

گودام کے اندر گھستے ہی مجھے ایک ہال کمرے میں لکڑی کی بہت سی پیٹیاں نظر آئیں... یہاں گندھک کی بو صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں تاریک سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی اور پھر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے آواز دی۔ ”سلطانہ... سلطانہ... کہاں ہو تم؟“

جواب نہ آوا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا۔ چند آخری سیڑھیوں پر رک کر میں نے ڈارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں پھینکا۔ کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں یہاں سے کسی طرح نکلنے میں تو کامیاب نہیں ہو گئی۔ میں نے پھر آواز دی۔ ”تم کہاں ہو؟ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ جو تم کہو گی ویسا ہی ہوگا لیکن بتاؤ چلے کہ تم چاہتی کیا ہو؟ میری بات کا جواب دو۔ تم کہاں ہو؟“

اس بار بھی جواب میں مکمل خاموشی رہی۔ میں نے ڈارچ کا روشن دائرہ سیڑھیوں پر اور گرد آلود فرش پر پھینکا۔ زمانہ قدموں کے نشان واضح طور پر نظر آئے۔ ان نشانات کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جس کا ذکر پٹھان چوکیدار نے کیا تھا۔ مجھے چوہان والی بات یاد آئی اور میں نے بے آواز بلند پکار کر کہا۔ ”دیکھو... تم جو کوئی نہیں ہو... ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہاں ان کمروں میں بہت سا بارود پڑا ہے۔ اگر یہاں کوئی گولی وغیرہ چلی یا اس طرح کی کوئی اور بے احتیاطی ہوئی تو سب کچھ ختم ہو سکتا ہے۔ میں بھی بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ تم میرے سامنے آؤ اور بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟“

نیم روشن کمرے میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے کسی سے کچھ لینا دینا ناہیں... بس مجھے یہاں سے چلے جانے دو۔ خدا کے لیے...“ اس کی آواز بھرا گئی۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ یہ سلطانہ کی آواز نہیں تھی۔ یہ کوئی اور تھی لیکن ابھی میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں آواز دوبارہ سننا چاہتا تھا۔

میں نے بے آواز بلند کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن تم سامنے آؤ۔“

”مم... میں... سامنے آنا ناہیں چاہتی۔ کچھ لوگوں کی طرف سے... میرے جیون کو خطرہ ہے... وہ مجھے مار دیں گے۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔ وہ سلطانہ نہیں تھی۔ وہ بات

جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھ کو جانے دو۔ میں بالکل زردوش ہوں۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں۔“

میں نے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ کمرے میں اس کا ہیولا نظر آیا۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ وہ ادھ کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور کسی سبب سے بوجھل نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا رویہ جارحانہ نہیں ہے۔ غالباً اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس خوف زدہ تھی اور اس خوف کی وجہ سے خودکشی کی دھمکی دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز سن کر مجھے لگا کہ وہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا جو وہ خود کو سپاہیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنی جان دینا زیادہ آسان محسوس کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو، میں تمہیں ہر طرح کی تسلی دیتا ہوں۔ اگر تم بغیر کچھ بتائے یہاں سے جانا چاہتی ہو تو بھی جا سکتی ہو لیکن اگر تم اپنا کوئی مسئلہ بتانا چاہتی ہو تو ہم اس کے لیے بھی حاضر ہیں۔ میں تمہاری مدد کے لیے کسی زمانہ پولیس افسر کو بلا لیتا ہوں۔“

”ناہیں، میں کسی سے کچھ کہنا ناہیں چاہتی۔ میں بس یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“

میں ذرا آگے بڑھا تو وہ ایک دم کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ وہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ لائٹن کی مدھم روشنی میں اس کا سر پائیکس دھمکی آمیز دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک لڑکی کے عقب میں واقع ایک کھڑکی کے شیشے زوردار چھناکے سے ٹوٹے اور ایک پرچھائیں برق رفتاری سے لڑکی پر پھٹی۔ لڑکی بلند آواز سے چلائی۔ دونوں اوپر نیچے فرش پر گرے۔ شوخی قسمت، گرتے وقت لڑکی پر پھٹنے والے شخص کا سر دیوار سے ٹکرایا، اس کی گرفت ایک سیکنڈ کے لیے لڑکی پر کنٹرول ہو گئی۔ وہ چٹنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔ وہ اندھا دھند کھڑکی کی طرف بڑھی۔ انداز سے عیاں تھا کہ وہ نتیجے سے بے پروا ہو کر چھلانگ لگا دے گی۔ میں اس سے قریباً پانچ میٹر کی دوری پر تھا۔ یہ حتی الامکان تیزی سے حرکت میں آنے کا وقت تھا... اور میں نے حرکت کی۔ اپنی ٹانگوں کی پوری طاقت سے میں نے لڑکی کی طرف ”رش“ کیا۔ یہ سیکنڈ کے ایک مختصر ترین حصے کا کھیل تھا۔ وہ جب کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ چکی تھی، میں نے اسے کمر سے دیوچ لیا اور پھر پلٹ کر کمرے میں پھینک دیا۔ اس کے برقعے کا بالائی حصہ اتر کر دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی

دیوار سے لٹکی ہوئی لائٹن بھی فرش پر لڑھک گئی۔ لائٹن سے اچھلنے والے تیل نے فوراً آگ پکڑ لی۔ دو کرسیاں دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو گئیں۔ یہ سنگین ترین صورت حال تھی۔ ہم بارود کے ڈھیر پر تھے اور چنگاری کے بجائے پورا الاؤ روشن ہو گیا تھا۔ اس الاؤ کی روشنی میں مجھے دو چہرے نظر آئے۔ ایک تو اس شخص کا چہرہ جو کھڑکی توڑ کر لڑکی پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ کپتان اچھے تھا۔ دوسرا لڑکی کا چہرہ۔ وہ میری گرفت میں تھی۔ بالائی برقع اترنے سے اس کے بال کھل چکے تھے۔ یہ بہت لمبے بال تھے... غیر معمولی حد تک لمبے۔ میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی... ہرگز نہیں تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے اس حسین لڑکی کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ اگر میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو یہ شکنتلا تھی۔ باروندا جنکی کی گمشدہ محبوبہ۔ وہ بہت حد تک میری دیکھی ہوئی تصویر سے مل رہی تھی۔

اس بارے میں زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

”دروازہ بند کر دو اسے۔“ میں نے پکار کر کہا۔

اچھے خود بھی محسوس کر چکا تھا کہ آگ کو محدود رکھنے کے لیے دروازہ بند کرنا ضروری ہے۔ اس نے ایک کمرہ دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور دونوں جلتی ہوئی کرسیاں کے بعد دیگرے کھڑکی سے باہر گئی میں پھینک دیں۔ اس کا یہ اقدام اس کی حاضر دماغی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ آگ ایک دم سست گئی۔ اگلے چند سیکنڈ میں اچھے نے اسے مکمل طور پر بجھا دیا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بم کا سگنا ہوا فیتہ کاٹ کر اسے پھٹنے سے روک دیا جائے۔ اچھے کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

لڑکی ابھی تک میرے بازوؤں میں دبی ہوئی تھی اور خود کو چھڑانے کے لیے اندھا دھند زور لگا رہی تھی۔ اچھے کے جوان دندنا تے ہوئے سیڑھیوں پر نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھ سے برسر پیکار ہاتھیں کو سنبھال لیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لمبے رشتی بال بار بار چہرے کو چھپا رہے تھے۔ وہ چلا رہی تھی۔ ”چھوڑ دو مجھے... مر جانے دو مجھے...“

میں حالات کی دھما چوٹری پر حیران ہو رہا تھا۔ ہم یہاں سلطانہ کے شہبے میں پہنچے تھے۔ یہ خیال تو ذہن میں موجود تھا کہ جو لڑکی یہاں موجود ہے، شاید وہ سلطانہ نہ ہو... لیکن یہ خیال ہرگز ذہن میں نہیں تھا کہ سلطانہ کی تلاش تو کام رہے گی لیکن ایک اور تلاش کامیاب ہو جائے گی۔ اچھے اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار کے علم پر کئی روز سے شکنتلا کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے اور اب وہ کسی حد تک مایوس

ہوگی۔ کہیں وہ شادی مرگ کا شکار تو نہیں ہو جائے گا؟

راستے میں شکنتلا نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ کل پانی میں آنے کے بعد وہ جان بوجھ کر اوجھل ہوئی ہے۔ وہ یہاں ایک متوسط آبادی میں اپنی ایک پرانی کنبلی کی ملازمہ کے پاس قیام پذیر تھی۔ نور اس نامی یہ لڑکی اور اس کا خاوند چینی کے برتنوں پر نقش نگاری کا کام کرتے تھے۔ آج وہ دونوں میاں بیوی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہوں نے کچھ کام کر رکھا تھا جو بازار میں دے کر آنا ضروری تھا۔ مجبوراً شکنتلا نے نور اس کے ملازم کو ساتھ لیا اور بازار میں برتن دے کر آئی۔ واپسی پر پولیس والے پیچھے لگ گئے۔ شکنتلا ہرگز ان پر اپنی شناخت ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے بھی دوڑادی۔ راستے میں جو بندہ خوف زدہ ہو کر کنبلی سے اتر، وہ نور اس کا ملازم ہی تھا۔ وہ بھی چینی کے برتنوں پر پھول بوٹے بنانے کا کام کرتا تھا۔ میں نے شکنتلا کی باتوں میں حکم کے خطرناک ہرکارے رنجیت پاڈے کا نام بھی سنا۔ وہ اس شخص سے خاص طور پر خوف زدہ نظر آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ میں باروندا جبکی کے پاس اس کے کمرے میں موجود تھا۔ جھروکوں سے باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ دیوان کے کسی اندرونی حصے میں کوئی ستار نواز بڑے میٹھے سروں میں ستار بجا رہا تھا۔ کنبلی اس کی سنگت میں ہارمونیم کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔

جبکی دیوار سے فیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا۔ کیا خیال ہے، آج آرام نہ کریں؟“ جبکی نے کہا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے اس طرح کی بات کی تھی۔ ورنہ وہ تو چھٹی کی بات پر آگ بگولا ہو جاتا تھا اور اپنا پسندیدہ فقرہ دہراتا تھا۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ تم ہڈ حرامی دکھاؤ گے تو کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

”کیا بات ہے جبکی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ”ہاں، ایک دم فرسٹ کلاس ہوں۔ بس دو پہر کو بخار نے چھوٹی سی چھلانگ لگائی تھی اور ایک سو دو سے ایک سو چار پر چلا گیا تھا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں تو یہ میرے ساتھ کرتا ہی رہتا ہے۔ شام کو کھانے کے بعد کھانسی کا دورہ پڑا اور ٹاک سے تھوڑا سا خون بھی آیا۔ لگتا ہے کہ خون کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے میرے اندر۔“ وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں

بھی ہو چکے تھے۔ لیکن آج شب اس گودام میں بالکل اتفاقیہ طور پر ایک ایسی لڑکی سامنے آگئی تھی جو میرے اندازے کے مطابق شکنتلا ہی تھی۔ اس کے غیر معمولی لمبے بال اس کی شناخت کو معیتر کر رہے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ اہم ترین اندازہ درست ثابت ہو گیا کہ آج رات اس گودام میں ہم اتفاقیہ طور پر شکنتلا کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ شکنتلا سہانی ہے۔

وہ واقعی حسین تھی۔ اس کی خوب روپیشانی پر پسینا موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ بند کمرے میں میرے، اچھے اور چوہان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ ”میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں جانتی ہوں، چھوٹے سرکار اگر مجھ سے ملنا چاہت ہیں تو میری بھلائی کے لیے ہی چاہت ہوں گے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ان کی یہ کربا مجھ کو مہنگی پڑے گی۔“

”کیوں مہنگی پڑے گی؟ کیا آپ کو چھوٹے سرکار پر اور ہم سب پر وشواس نہیں ہے؟“ اچھے نے تنک کر پوچھا۔ ”میں وشواس کی بات نہیں کرتی۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ لوگوں کو میرے کارن کسی آزمائش سے گزرنا پڑے۔ سب جانت ہیں کہ کل پانی میں بھی حکم جی اور جارج کے جاسوس موجود ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکت ہیں۔“ ”آپ بے فکر رہیں۔“ اچھے نے رعب سے کہا۔ ”آپ کو چھوٹے سرکار کی خاص حفاظت میں دیوان کے اندر رکھا جاوے گا۔“

”کچھ لوگوں تو یہ کہت ہیں کہ دیوان کے اندر بھی حکم جی کے بندے موجود ہیں۔“ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ وہ واضح طور پر بہت خوف زدہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کل پانی میں گننام رہے۔

”آپ کو ضرورت سے زیادہ ڈرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے افسوس ہے کہ آپ دیوان کی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہی ہیں۔“ اچھے نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم شکنتلا کو خاص فوجی گھوڑا گاڑی میں سوار کر کے دیوان کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میری نگاہیں اس کے سر پر اور اس کے سیاہ آبشار جیسے طویل بالوں پر جمی تھیں۔ تو یہ زرگاں کے شاہی محل کا وہ نو دمیدہ پھول تھا جس نے باروندا جبکی جیسے مضبوط شخص کو عشق میں دیوانہ کیا تھا۔ اور کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ میری نگاہوں میں باروندا جبکی کا چہرہ گھومنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ جب میں اسے شکنتلا کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دوں گا تو اس کی کیا حالت

”آپ دوا بھی تو نہیں کھاتے ہو۔ حالانکہ...“
”چھوڑ دو دوست!“ اس نے میری بات کاٹی۔ ”جب دوا کھا کر بھی مرنا ہے تو پھر کیوں نہ دوا کے بغیر ہی یہ گھائی پار کر لی جائے۔“
آج وہ واقعی تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا۔ ”آپ مرنے کی باتیں نہیں چھوڑو گے اور ہم آپ کو مرنے کے لیے نہیں چھوڑیں گے... آپ جو مرضی کر لو، ہم آپ کو سنبھال کر اپنی زندگی کی طرف لے آئیں گے۔“
”بہت مشکل ہے۔“

”آپ خود ہی تو کہتے ہو، مشکل کو آسان کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ میں نے کل ہی انور خاں اور مراد شاہ صاحب سے بات کی ہے۔ ہم آپ کے لیے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس جاپانی ڈاکٹر کو مقامی لوگ بہت مان رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ کو اسٹیٹ سے باہر بھی بھجوا سکتے ہیں۔“

”اسٹیٹ سے باہر جا کر کیا کرنا ہے؟ میری روح اسٹیٹ کے اندر ہے۔ میں یہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔“
اس نے آتشیں سیال کے کئی تلخ گھونٹ بھرے اور تریک میں آگیا۔ ٹیکہ اپنی کمر کے ساتھ رکھ کر وہ نیم دراز ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا پسندیدہ نیپالی گیت گانے لگا۔

اس کی آواز دل سوز تھی۔ اس میں درد لہریں لیتا تھا اور ”سوچ کی گہری نیلی جھیلوں“ میں سنہری دھوپ کے اندر یادوں کی کشتیاں ڈولتی تھیں۔

وہ گاتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے رہے۔ وہ چپ ہوا تو میں نے اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”جی! آپ جس کو دن رات یاد کرتے ہو... وہ آپ کے سامنے آ جائے تو پھر؟“

”کس طرح؟“ اس نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔
”جس طرح کوئی انہونی ہوتی ہے... جس طرح کالی سیاہ رات کے اندر سے سورج نکلتا ہے... جس طرح دم گھونٹنے والا جس، بارشوں کو سنبھال کر لاتا ہے... جیسے جتنی ریت کے اندر سے چشمہ پھوٹتا ہے۔“

اس نے آنکھیں تھوڑی سی کھولیں اور مجھے قدرے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ”آج تو تم بھی شاعری کر رہے ہو۔“
”آپ کی صحبت کا اثر ہے جی... لیکن... آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اگر آپ کی شکنتلا ایک بار پھر

”ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جن سے میرا درد بڑھ کر ناقابل برداشت ہو جائے۔“
”میں صرف بات نہیں کر رہا۔ میں آپ سے ایک سنجیدہ سوال پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم بُری طرح چونک گیا۔ اس کے میلے کچیلے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ وہ چند سیکنڈ تک خیر کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا پھر لرزاں ہونٹوں کے ساتھ بولا۔
”کیا... تم نے... اسے کہیں دیکھا ہے؟“

میں نے اس کا اکلوتا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور بے دے جوش سے کہا۔ ”ہاں، میرے محترم استاد! میں نے اسے دیکھا ہے... اور دیکھا ہی نہیں... وہ میرے ساتھ ہے... اسی چار دیواری میں... اسی چھت کے نیچے۔“
فرط حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں... وہ ہکلا یا۔ ”دیکھو... ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔“
”میں آپ سے مذاق کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر... یہ کیا ہے؟“
”آپ کی طلب کا صلہ۔ آپ کے دکھ درد کا مداوا۔ آپ کے انتظار میں اتنی شدت تھی کہ کوئی بھیج کر آپ کی طرف آگیا۔ ہاں جی... وہ یہاں ہے۔ ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ آپ کی شکنتلا ہی ہے۔ وہ کئی دوسری عورتوں کے ساتھ زرگاں کے راج بھون سے بھاگ نکلی ہے۔“

جی! پر واقعی شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے راکھ کے ڈھیر تھے۔ اب وہاں عجب سی چمک نظر آنے لگی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے میسا کی اپنی بغل کے نیچے رکھی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ انتہائی اضطراب سے بولا۔ ”وہ کہاں ہے؟“
مجھے بتاؤ... وہ کہاں ہے؟“

”یہیں پر ہے۔ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔“

”تم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہے؟“ وہ لرزاں آواز میں بولا۔

”نہیں، ابھی کچھ نہیں۔“
”وہ شکنتلا ہی ہے نا؟ میرا مطلب ہے، تم نے اسے اچھی طرح پہچان لیا ہے نا؟“

”ایک سو ایک فیصد۔“

”مم... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے تابی کی انتہا کو

اپنی لاشی ٹپکتا ہوا وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ دروازے تک پہنچ کر وہ ایک تخت رک گیا۔ اس کے اندر کی چکا چوند جیسے ایک دم تاریکی میں بدل گئی۔ کوئی چیز بھگ گئی اس کے اندر۔ میں نے محسوس کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا، تب بے دم سا ہو کر وہیں دہیز کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ایک کندھا آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ٹیک دیا۔ ”کیا ہوا جی؟“ میں نے اس کا دوسرا کندھا تھام کر پوچھا۔

اس کا سر گھٹنوں کی طرف جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ اس نے یہ جھکا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔ تب وہ نقابست بھری دل دوز آواز میں بولا۔ ”تین... تین... اگر وہ واقعی یہاں ہے تو بھی... میں اس سے مل نہیں سکتا۔ میں ایسی بُری حالت میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ ہم نے بہت اچھے دن دیکھے ہیں... جب دونوں خوب صورت تھے۔ دونوں کے چہرے گلاب تھے۔ اب نہیں... اب نہیں... میں اسے اپنی بدبودار... بر باد زندگی کا تماشا نہیں دکھا سکتا۔“ اس کی آواز بھینکتی چلی جا رہی تھی۔

”آپ ایسا کیوں کہتے ہو جی... جو کچھ بھی ہے لیکن آپ جی! ہو۔ جس طرح آپ نے اسے چاہا ہے، اس نے بھی چاہا ہے۔ اور جو چاہتے ہیں وہ ظاہری حالتوں پر نہیں جاتے۔ وہ جا ہی نہیں سکتے۔“

”نہیں تابش، نہیں۔“ اس نے سر جھکائے رکھا اور اسے مسلسل نفی میں ہلاتا رہا۔ اس کے لیے جھاڑ جھکاڑ بال اس کے چہرے پر جھولتے رہے۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ بلب کی روشنی میں جیسے ہرجان دار و بے جان شے جو حیرت دکھائی دیتی تھی۔ جھروکوں سے باہر سرد اور سفیدے کے بلند درختوں پر چاندنی اٹھیلیاں کرتی تھی۔ دیوان کی بلند و بالا بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتے اپنی موجودگی کا احساس دلارہے تھے۔

کچھ دیر بعد جی! کے سر پا میں ایک نئی طرح کی ترنگ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا گرد آلود سر اٹھایا اور میرا بازو تھام کر بولا۔ ”تابش! میں نے تمہیں آج تک جو کچھ دیا ہے اس کے بدلے میں تم سے ایک چیز... صرف ایک چیز مانگتا ہوں۔ کیا تم... دو گے؟“

”آپ نے جو کچھ دیا ہے جی... وہ اُن مول ہے۔ پلیز! آپ اس کو بیچ میں نہ لاؤ۔ آپ صرف یہ کہو کہ آپ کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

اس نے کانپتے ہاتھ اور ہانپی سانسوں کے ساتھ دھسکی

کے دو بڑے گھونٹ لیے۔ دھسکی کے قطرے اس کی جھاڑ جھکاڑ داڑھی میں چکتنے لگے۔ وہ نم ناک لہجے میں بولا۔ ”تابش! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں... لیکن... لیکن اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔“

”مگر جی! آپ...“
”نہیں تابش! اب کچھ نہیں کہنا۔ میں نے یہی چیز تم سے مانگی ہے، یہ مجھے ویسے ہی دے دو، جیسے میں چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ نہ کوئی دلیل دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری پہلی اور آخری خواہش پوری نہیں کی۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ وہ عجیب موڈ میں تھا۔ اس کے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش طاری تھی۔ وہ بیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ساری تفصیل پوچھی کہ شکنتلا سے میری ملاقات کیسے اور کیونکر ہوئی۔ میں نے اسے کافی کچھ بتا دیا... پھر ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ وہ شکنتلا کو کہاں اور کیسے دیکھے گا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات کو تفصیل میں جا کر سوچ رہا تھا اور اپنی سوچ میں مجھے بھی شریک کر رہا تھا۔ قریب ایک گھنٹے میں سب کچھ طے ہو گیا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی سوچ بھی انوکھی تھی۔

پروگرام کے مطابق مجھے کل شام کے وقت جی! کو اس کمرے میں لے جانا تھا جہاں میں سوتا تھا۔ یہ کمر سلطانہ کے کمرے کے ساتھ واقع تھا۔ شکنتلا چونکہ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی، لہذا جی! کے لیے ممکن تھا کہ وہ میرے کمرے سے اسے تسلی کے ساتھ دیکھ سکے۔ پروگرام کے مطابق میرے کمرے میں بالکل تاریکی رہنی تھی اور دونوں کمروں کی ایک درمیانی جالی دار کھڑکی کو میں نے تھوڑا سا کھول دینا تھا۔ جی! کو گاہے بگاہے کھانسی بھی ہونے لگتی تھی۔ اگر کہیں ایسا کچھ ہو جاتا تو وہ کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں گھس سکتا تھا۔

اگلی صبح شکنتلا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب کافی حد تک تارل تھی۔ ایک وحشت زدہ ہرنی کی سی کیفیت جو اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی، اب معدوم ہو چکی تھی۔ چھوٹے سرکار سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی اور اس نے اپنی گفتگو سے شکنتلا کی تشویش کا کافی حد تک دور کر دی تھی۔ صفیہ سمیت تین ملازمین ہم وقت شکنتلا کی خدمت پر مامور کر دی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ شکنتلا کی اضافی تسلی کے لیے قیام گاہ کے باہر گارڈ بھی بٹھادیا گیا تھا۔

شکنتلا نہایت نفیس مزاج کی مالک تھی۔ لباس اور خوشبو

وغیرہ کے معاملے میں اس کا انتخاب بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں وہ شاہانہ رکھ رکھاؤ تھا جس کا تعلق یقیناً راج بھون کے ماحول سے تھا۔

شکنتلا میرے بارے میں فقط اتنا جانتی تھی کہ میں ان افراد میں سے ہوں جو ماضی میں بدھا کا مقدس مجسمہ چوری کرنے کے الزام میں پاکستان سے پکڑ کر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں لائے گئے تھے۔ اور بعد میں مختار راجپوت کی بیٹی نے خود کو ”راج بھون کی فیرو“ بننے سے بچانے کے لیے مجھ سے شادی کر لی تھی۔

وہ پاکستان کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی۔ خاص طور سے کھلاڑیوں اور اداکاروں کے بارے میں۔ اس نے مجھ سے لاہور، انارکلی، کلفٹن اور موہنپور جیسی جگہوں کے متعلق دلچسپی سے سوالات کیے۔ اپنی ہندی میں وہ انگریزی کے الفاظ بھی روانی سے استعمال کر جاتی تھی۔

وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھی۔ اس کی سفید رنگت میں گلابی پن کی آمیزش تھی اور خدوخال سے خاندانی نجابت چمکتی تھی۔ راج بھون میں یقیناً اسے حکم جی کی دراز دستیوں اور من مانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس اکھاڑ پچھاڑ نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو کچھ زیادہ گہنا یا نہیں تھا۔

وہ ذرا کھوئے کھوئے انداز میں میری طرف دیکھنے کے بعد بولی۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ تاہن! کیا رات کو یہاں کوئی گا رہا تھا؟“

میں چونک گیا۔ تاہم اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”مہمان خانے کی طرف ہارمونیم بج رہا تھا لیکن گانے کا تو پتا نہیں۔“

”ہارمونیم تو میں نے بھی سنا تھا لیکن... یہ اور آواز تھی۔“

اور یہ زیادہ دور سے بھی نہیں آوتی تھی۔

”کس طرح کی آواز تھی؟“ میں نے تفصیل چاہی۔

اس کے چہرے پر شدید الجھن نظر آئی۔ وہ درود یوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کوئی بہت مدھم آواز میں گا رہا تھا۔ پتا نہیں کون سی زبان تھی لیکن... طرز... کچھ سنی ہوئی سی لگت تھی۔“

”یہاں بہت سے گانے والے ہیں۔ چھوٹے سرکار خود بھی اچھی موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔ شام کے بعد اکثر راگ رنگ کی محفل جتی ہے۔“

”تاہن، یہ محفل والا میوزک ناہن تھا۔“ وہ بدستور الجھن زدہ تھی۔

میں کچھ دیر تک شکنتلا کے ساتھ موجود رہا۔ ملازمہ صفیہ بھی بالوکو لے کر وہاں آگئی۔ شکنتلا نے بالوکو اٹھا کر پیار کیا۔ وہ سلطانہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے سلطانہ کی ساری روداد

معلوم ہو چکی تھی۔ وہ بھی اس خبر پر پریشان تھی کہ سلطانہ کی خطرناک ارادے کے ساتھ دیوان کو چھوڑ چکی ہے۔ شکنتلا کا دھیان بھی سیدھا جارج کی ستم ظریفیوں کی طرف ہی جا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سلطانہ، جارج سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گی اور یہ کوشش خود سلطانہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی۔

وہ بالوکو پیار کرتی رہی۔ مجھ سے سلطانہ کی تلاش کے بارے میں باتیں بھی کرتی رہی اور صفیہ کو چھوٹی موٹی ہدایات بھی دیتی رہی لیکن اس کے چہرے پر الجھن کی لکیریں موجود رہیں۔

اس کی الجھن کی بنیاد پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس نے کل رات جیسی لگاتے سنا تھا۔ یقیناً وہ نیپالی گیت پہلے بھی کبھی اس کے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ اب وہ آواز اس کے دل و دماغ میں ماضی کا کوئی نقشہ کھینچ رہی تھی۔ یہ تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ جیسی زندہ حالت میں یہاں اس چار دیواری میں موجود ہوگا... مگر بھولی بھری آواز نے اسے پریشان ضرور کیا تھا۔

شام کو میں نے ایک بار پھر شکنتلا کو الجھن زدہ حالت میں دیکھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ ایک اندرونی روش پرہیز رہی تھی۔ وہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دو پہلے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ صفیہ سے پوچھ رہی تھی۔ ”دیوان کے اس رہائشی حصے میں کتنے گھر ہیں؟“

”دس بارہ تو ہوں گے جی۔ ایک دو بڑی کونھیاں بھی ہیں۔“

”یہاں کون کون رہتا ہے؟“

”زیادہ تر تو چھوٹے کارکار اور مراد شاہ جی کے مہمان ہی ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جو زرگاں سے آپ کی طرح جیون بھی کر رہا ہوں پتہ ہے۔“ وہ دونوں باتیں کرتے کرتے آگے نکل گئیں۔

صفیہ اور دیگر ملازموں کی جیسی کے بارے میں کچھ خاص معلوم نہیں تھا۔ انہیں بس یہ پتا تھا کہ کوئی سخت بیمار، شرابی شخص یہاں آیا ہے۔ کسی لڑائی میں اس کی ایک ٹانگ اور بازو جسم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔

... وہ شام میرے لیے ایفائے وعدہ کی شام تھی۔ آج میں نے اپنے محسن باروندا جیسی کے لیے کچھ ایسا انتظام کرنا تھا کہ وہ اپنی گمشدہ محبت کو جی بھر کر دیکھ سکے۔ پوری تسلی کے ساتھ اس چہرے کا دیدار کر سکے جس کی یاد وہ کئی موسموں سے اپنے فگار سینے میں چھپائے پھرتا ہے۔ شکنتلا مجھ سے وہ ساری روداد پوچھنا چاہتی تھی جب میں جارج گورا کے محل نما گھر سے

☆ ☆ ☆

جیسی اور میں آہستہ آہستہ جھٹکتے تھے۔ یہ جیسی ہی کا کراہنا تھا جیسی کے بیمار جسم کی ہلکی سی باس کمرے میں رچی بسی تھی۔ جیسی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان آنکھوں میں تشکر، خوشی، حسرت اور ممنونیت کے جذبات گزرتے تھے۔

”مجھے لگتا ہے کہ اب میرے لیے مرنا اور آسان ہو گیا۔“ وہ شہتہ انگریزی میں بولا۔

”آپ پھر وہی بات کر رہے ہو... اب تو آپ کو جینے

لگتا تھا اور چھپتا چھپتا انور خاں وغیرہ تک پہنچا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام کو اس کے پاس آؤں گا اور سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔ میرے اس وعدے کے پیچھے دراصل باروندا جیسی سے کیا ہوا وعدہ ہی تھا۔

شام کے بعد میں تھوڑے سے تاؤ میں تھا لیکن سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہی ہوا۔ میں جیسی کو پہلے ہی ساتھ والے کمرے میں پہنچا چکا تھا۔ شکنتلا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ باتیں تو میرے ساتھ کر رہی ہے لیکن اسے دیکھ کوئی اور رہا ہے۔ اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ، اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز سب کچھ کسی کی بے حد مشتاق نگاہوں کے گھیرے میں تھا۔ آج وہ کچھ زیادہ خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ شام کچھ زیادہ حسین تھی یا پھر اس کی اپنی ذات کی وجہ سے شام کا حسن بڑھ گیا تھا۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے گلابی آنچل کے نیچے اس کے طلائی جھمکے دکھتے تھے اور اس کی صراحی وار گردن کے پس منظر میں اس کے بے مثال بالوں کا آبشار نظر آتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ آنکھیں اس کے سراپا کو پلکوں سے چوم رہی ہیں۔

ہاں... وہ بڑی رومانی شام تھی۔ لیکن اس شام میں جس طرح کارومان ہو رہا تھا، وہ عام ڈگر سے بہت مختلف تھا۔ کوئی سراپا شوق تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کوئی سراپا غفلت تھا اور اسے دیکھا جا رہا تھا۔

ہماری نشست ختم ہونے کے قریب تھی جب قریبی کمرے سے کھانسی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ یہ جیسی کی آواز ہی تھی۔ کھانسی شروع ہونے کے فوراً بعد اس نے شاید اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ شکنتلا نے قدرے چونک کر پوچھا۔

اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

”کوئی ملازم ہے شاید۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر جالی دار کھڑکی کا اُدھ کھلا پٹ بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں شکنتلا سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

جیسی اور میں آہستہ آہستہ جھٹکتے تھے۔ یہ جیسی ہی کا کراہنا تھا جیسی کے بیمار جسم کی ہلکی سی باس کمرے میں رچی بسی تھی۔ جیسی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان آنکھوں میں تشکر، خوشی، حسرت اور ممنونیت کے جذبات گزرتے تھے۔

”مجھے لگتا ہے کہ اب میرے لیے مرنا اور آسان ہو گیا۔“ وہ شہتہ انگریزی میں بولا۔

”آپ پھر وہی بات کر رہے ہو... اب تو آپ کو جینے

ہلکی سی روشنی تھی۔ میں دروازہ کھولنے کے بجائے کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کے ایک نیم واپٹ میں سے میں کمرے کا وسطی منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ اس منظر نے میرے پاؤں زمین میں گاڑ دیے اور میں جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ میں نے کمرے کی خاموش نیلی روشنی میں شکنتلا کو دیکھا۔ وہ فرش پر دوڑاؤ بیٹھی تھی۔ اس کے بال اس کی گود میں کنڈلی مارے ہوئے تھے۔ شکنتلا کے سامنے جیسی تھا۔ وہ گہرے نشے میں بے سدھ پڑا تھا۔ بس اس کی سانس کی آمد و رفت سے پتا چلتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے سنولائے ہوئے جسم پر بس وہی ایک لنگوٹ تھا۔ اس کی ایک ایک پبلی اور ہڈی علیحدہ سے گنی جاسکتی تھی۔ اس کا چہرہ خستہ جانی کی بدترین مثال تھا۔

شکنتلا ایک نلک اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں سے تواتر کے ساتھ پانی کے موتی گر رہے تھے۔ میں تھیر کے عالم میں دیکھتا چلا گیا۔ شکنتلا کے چہرے پر محبت کسی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ اس کے نازک نتھنے جذبات کی شدت سے بے ساختہ پھڑک رہے تھے۔ پھر میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ جیسی کی حالت اور بدبو کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھی۔ جیسی کے سر ہانے کی طرف بیٹھ کر اس نے جیسی کا سراپنی گود میں لے لیا۔ ”جیسی... جیسی...!“ شب کے جادو کی سنائے میں اس کی جذباتی سرگوشی گونجی۔ یہ سرگوشی محبت کے اس عظیم رشتے کی گواہ تھی جو بظاہر کچے دھاگے سے بھی کمزور ہوتا ہے لیکن جس کی طاقت دو انسانوں کو اس طرح باندھتی ہے کہ جبر و قسم کی سخت ترین آندھیاں بھی انہیں علیحدہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ حکم اور جارج گورا جیسے ہزار ہا لوگ اس نازک دھاگے کو توڑنے کے لیے ہر زمینی حربہ آزماتے رہے ہیں لیکن ہر بار انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ بے شک وہ پیار کرنے والوں کو مارنے میں کامیاب ہوئے لیکن پیار کو نہ مار سکے۔ ہاں... یہ وہی پیار بھری سرگوشی تھی۔

اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے اس کے گرد آلود بال سہلائے، اس کے گال تھپتھپائے۔ اسے کئی بار ہولے ہولے جھنجھوڑا۔ ”جیسی... جیسی... آنکھیں کھولو۔“ اس نے اس کا سر اپنی ہانہوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی ہنسی زلفوں نے بھر کر جیسی کا سر اور کندھے ڈھانپ لیے۔ وہ اسے چومنے لگی، ہولے ہولے پکارنے لگی۔ پھر میں نے جیسی کے جسم میں حرکت دیکھی۔ ہڈیوں کا وہ قریب المرگ ڈھانچا بیدار ہو رہا تھا۔

کی بات کرنی چاہیے اور آپ کو کون سی پڑے گی۔ بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے، اب آپ کو بھی تبدیل ہونا پڑے گا۔ ہم نے اب آپ کو بھلا چکا کر کے چھوڑنا ہے۔ کل بہت اچھے ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔“

اس نے اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کو چھت کی طرف اٹھایا اور کھانتے ہوئے بولا۔ ”میں بہت سا سفر طے کر چکا ہوں۔ اب مجھے واپس بلانے کی باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔“

”اب آپ کو واپس آنا پڑے گا جناب... کیونکہ اب واپسی کی نہایت خوب صورت اور شان دار وجوہات موجود ہیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اب ایسا نہیں ہو سکے گا تابش! اب تو زندگی کی شام گہری ہو چکی ہے۔“

”یہ شام نہیں تھی جناب! بس بادل تھے جن کی وجہ سے آپ نے دوپہر کو شام سمجھ لیا تھا۔ بہت جلد آپ کی زندگی کا سورج نصف النہار پر چمکے گا۔“

دو فنی میں سر ہلاتا رہا پھر بولا۔ ”میں ایک بار پھر تمہیں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں غلطی سے بھی شاکن (شکنتلا) کو میرے سامنے مت لاتا۔ یہ میرے لیے اتنا ہی سخت ہو گا جتنا ایک ہزار بار جان کنی کے عذاب میں سے گزرتا۔“

میں نے اسے یقین دلایا کہ میری اپنی سوچ جو بھی ہوگی میں وعدے کی پابندی کروں گا۔ اس کی مرضی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس رات جیسی نے معمول سے زیادہ سنی۔ اس کی گونج خود دروازہ ہی ترپتر ہوئی۔ وہ اپنی آنکھیں بہت کم کھول رہا تھا جیسے وہ شکنتلا کے دیدار کی راحت کو اپنی پلکوں میں محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ مجھے اس کی باتوں سے شک ہو رہا تھا کہ وہ اب کی طرح یہاں سے نکل جانے کا سوچ رہا ہے... اس کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ موسم میں اب کافی خنکی آچکی تھی۔ غالباً ٹھنڈکی وجہ سے ہی میں بیدار ہوا تھا۔ میں سبل لینے کے لیے الماری کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نظر کھڑکی سے گزر کر اس رہائشی پورشن کی طرف گئی جہاں جیسی قیام پذیر تھا۔ یہ پورشن باقی حصے سے علیحدہ تھا اور وہاں تک جانے کے لیے ایک خم دار گلی سے گزرنا پڑتا تھا۔ مجھے جیسی کے کمرے کی طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ یہ غلاب معمول تھا۔ وہ تاریکی میں سوتا پسند کرتا تھا۔ میں کمرے سے نکلا۔ چاروں طرف ہوکا عالم طاری تھا۔ بس کہیں کہیں بو جھل آنکھوں والے پہرے دار منڈلا رہے تھے۔ میں خم دار گلی سے گزر کر جیسی کے کمرے تک پہنچا۔ یہ دیکھ کر مجھے شاک پہنچا کہ جیسی کے کمرے کا تالا کھلا ہوا ہے۔ اندر نیلگوں بلب کی

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ایک شخص فوراً سزا کا سہارا لے کر جس نے مجھے کی چوری پر نہیں پکڑا تھا۔ انہوں نے دھوکے سے غار پر ہڈیوں دیا تاہم انہیں ناکامی ہوئی لیکن ہمارا ایک ساتھی فیروز اس حملے میں مارا گیا۔ اس کے رتور عمل کے طور پر اسحاق نے ماریا کی ایک انگلی کاٹ کر پانڈے کو بھیج دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جبکی وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چو کی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہمیں گھیر لیا گیا اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہم چو کی سے نکلے لیکن اس کو شش میں احمد اور ہمیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گئے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ وہاں چوہان اور اسحاق میں بحث چلی کہ میری وجہ سے دشمن ان تک پہنچ جائیں گے۔ یہ سن کر میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر مڑا بھی کے نشانات ملے اور میں اسے کھوجتا ہوا رونا دھونیاں تک جا پہنچا۔ اس کا اس طرح ملنا میرے لیے حیرت ناک تھا۔ یہ ایک کھنڈر نما چو کی تھی مگر پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔ میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ ایک موقع پر میں بے بس ہونے والا تھا مگر پھر چوہان، انور خاں اور چھوٹے سرکار کے لہکار وہاں پہنچ گئے اور دشمن کو وہاں سے مار بھاگایا۔ اس کامیابی میں سلطانہ نے اہم کردار ادا کیا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے اور جبکی کو مل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ وہ ننھے بالوں سے بھی بے اعتنائی برت رہی تھی۔ پھر مجھے لگا کہ وہ زندگی کی طرف ٹوٹ رہی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تل پانی پہنچنے والوں میں شکتلا بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ اس کی تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شکتلا تک پہنچ گئے۔ شکتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شکتلا کو جبکی کے بارے میں نہیں بتایا۔ تاہم جبکی نے شکتلا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ اسے چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا، سامنے نہیں آتا چاہتا تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ شکتلا کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ مگر ایک رات میں نے وہ منظر دیکھا جسے دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ شکتلا جبکی کے کمرے میں تھی۔ اس کا سر شکتلا کی گود میں تھا۔ وہ جبکی کو آوازیں دے رہی تھی۔ وہ گہرے نشے میں تھا۔ پھر میں نے جبکی میں حرکت دیکھی۔ ہڈیوں کا وہ قریب المرگ ڈھانچا ہوا رہا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

شکتلا نے اسے خود سے جدا کیا۔ تربتر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی دیکھنے لگا۔ بالکل خالی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ منظر دیکھ لوگ بھی خالی لگا ہوں سے۔۔۔۔۔ جیسے اس منظر کو اپنے کسی حسین دیکھیں۔ میں نے اس پورشن کی طرف آنے والے تمام سینے کا حصہ سمجھ رہا ہو۔ پھر ہولے ہولے جبکی کے ہڈیوں کے دروازے مقفل کرادیے۔

بھرے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے اور صبح کے وقت میں نے محسوس کیا کہ جبکی کی سانس پھیلنے چلے گئے۔ شکتلا نے ایک بار پھر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ ”جبکی! یہ کیا ہو گیا؟ تم کیا کل رات سے ہی مسلسل بگڑ رہی تھی۔ اسے فوری طور پر سے کیا بن گئے۔۔۔۔۔ جبکی! یہ سب میرے کارن ہوا ہے۔ ڈاکٹر کی ضرورت تھی اور جا پانی ڈاکٹر کو دس گیارہ نا؟ میں ہی تمہاری دوشی ہوں نا؟ جبکی! مجھے بتاؤ، میں ہی بچے سے پہلے نہیں پہنچتا تھا۔

دوشی ہوں نا؟“

جبکی خاموش تھا۔ بس کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ کر حال بتاتی۔ وہ بھی تفصیل جان کر حیران رہ گیا۔ وہ اپنے لیتا تھا۔ اسے جیسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک میڈیکل باکس کے ساتھ آیا۔ ہم کمرے میں داخل حقیقی منظر دیکھ رہا ہے۔ میں کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔ ہوئے اور جبکی کو بہ مشکل شکتلا سے علیحدہ کیا۔ پھر بھی میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔ حسن و عشق کی جو ملاقات آج وہ مکمل طور پر علیحدہ نہیں ہوئی۔ اس نے جبکی کا ہاتھ میں نے دیکھی تھی، وہ کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی۔ مسلسل اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چوہان نے جبکی کے دانش تھی۔ یہ بات سمجھنا اب میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سائز چیک کیے۔ اس کا بلڈ پریشر بہت کم ہو چکا تھا اور نبض ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

جبکی کی حالت کے پیش نظر جا پانی ڈاکٹر لی وان نو بچے ہی دیوان میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک اسسٹنٹ اور ایک بڑا میڈیکل باکس بھی لایا تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک جا پانی ڈاکٹر لی وان، جبکی کی حالت کے ساتھ نبرد آزما رہا۔۔۔۔۔ اس کی سیمانی سے جبکی

کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ اس کی سانس میں بھی قدرے روانی آگئی لیکن ڈاکٹری دان ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ مریض ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ خاص طور سے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔

رات بارہ ایک بجے کے قریب جبکی کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ شکنتلا نے اسے مسلسل اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا۔ اس کا سر شکنتلا کی گود میں تھا۔ وہی اسے دوا وغیرہ بھی کھلا رہی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ جبکی شراب کے سوا کسی اور شے کے لیے منہ کھول ہی نہیں سکتا اور دوا کے لیے منہ کھولنا تو اچھے بھلے لوگوں کے لیے کافی مشکل ہوتا ہے۔ شکنتلا کے کہنے پر جبکی نہ صرف دوا کے لیے منہ کھول رہا تھا بلکہ دوا کو نگل بھی رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر شکنتلا اس کے منہ میں جلتا ہوا انگارہ بھی رکھ دے گی تو وہ بغیر آہ کیے اسے گلے میں اتار لے گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی مگر جبکی کی حالت میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ چوہان ہی کی ہدایت پر دو تین بار شکنتلا نے تھوڑی تھوڑی شراب بھی جبکی کو پلائی مگر لگتا تھا کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ یا تو وہ اتنی کم مقدار میں تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یا پھر اس کی طبیعت ابتر تھی۔

دوپہر کو چوہان اور میں نے شکنتلا کی بہت منت سماجت کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لے اور کچھ کھائی لے لیکن وہ تو اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ شام کو جاپانی ڈاکٹری دان نے جبکی کو گلو کوز کی ڈرپ لگائی اور ڈرپ میں کچھ دوائیں بھی انجیکٹ کیں۔ اس سے یہ ہوا کہ جبکی غنودگی میں چلا گیا۔ اس کی سانس بھی کچھ ہموار ہو گئی۔ رات کو ہم نے پھر زور لگایا اور شکنتلا کو ایک دو گھنٹے آرام کے لیے آمادہ کر لیا لیکن وہ کہیں مٹتی نہیں۔ وہیں جبکی کے کمرے میں ایک گوشے میں سمٹ کر لیٹی رہی۔

میں نے جبکی کا سر اپنے زانو پر لے لیا۔ آج سردی خاصی زیادہ تھی۔ کھڑکیوں کی درزوں میں سے سرد ہوا سرسراتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھی۔ جبکی حسب معمول ایک لنگوٹ میں تھا۔ میں نے اس پر ایک کمبل ڈالنا چاہا۔ اس نے اضطراب کا اظہار کیا اور کمبل پیچھے ہٹا دیا۔

پھر اس نے سر کے اشارے سے کہا کہ میں اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ

کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی سرگوشی میں بولا۔ ”تم..... بھی..... اپنا کمبل اتار پھینکو۔“

میں نے کمبل نہیں لیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جبکی علامتی یا رمزیہ بات کر رہا ہے۔ مجھے بتا رہا ہے کہ میں بھی جسمانی راحتوں کے حوالے سے اپنا طریقہ بدلوں۔ وہ پہلے بھی مجھ سے اس موضوع پر بات کرتا رہا تھا۔ آج پھر اس نے اسی موضوع پر چند سرگوشیاں کیں۔ اس نے اٹک اٹک کر بے حد لڑکھڑاتی آواز میں جو کچھ کہا، وہ اس طرح تھا۔ ”..... تن آسانی ہمیں کمزور کرتی ہے۔ ہم جتنی زیادہ جسمانی سختیاں جھیلے ہیں، اتنے ہی مضبوط اور زور آور ہوتے ہیں۔ افریقا کے ریگستانوں میں جہاں دوپہر کے وقت ریت انگاروں کی طرح دھکتی ہے، جان دار زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح جی ہوئی برف کے اندر بھی آبی مخلوق سانس لیتی ہے۔..... تو پھر ہم کیوں موسموں کا بجر نہیں جھیل سکتے؟ ہم کیوں..... بھوک پیاس..... تھکن اور درد سے نہیں لڑ سکتے..... ایسا ہو سکتا ہے..... اور جو لوگ ایسا کرنا سیکھ جاتے ہیں..... کوئی ان سے جیت نہیں سکتا۔“

بات کرتے کرتے اس نے میری طرف دیکھا۔ جیسے جانتا چاہ رہا ہو کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اس کی پیشانی سہلائی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی سرگوشی جاری رہی۔ ”جو درد، تکلیف اور سختی کا سامنا کرتے ہیں، وہی راحت، خوشی اور رخ کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ بڑا ہی سادہ فارمولا ہے..... جتنا زیادہ دکھ، اتنی زیادہ خوشی..... جتنی زیادہ تکلیف، اتنی زیادہ کامیابی.....“

وہ دھیرے دھیرے بولتا رہا اور میں سنا رہا۔ اس کی باتیں میرے دل کے اندرونی تاروں کو چھیڑتی تھیں۔ ”کچھ“ تھا اس میں جو وہ مجھے دینا چاہتا تھا..... اور جو کچھ وہ دینا چاہتا تھا اس کے لیے میرے اندر ایک خلا موجود تھا۔

صبح سے کچھ دیر پہلے اس کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ شکنتلا پھر بے چین ہو کر اس کے سرہانے آن بیٹھی۔ اس نے اس کا سر پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔ شکنتلا کا لمس پاتے ہی جبکی جیسے پھر سے جی اٹھتا تھا۔ امید پیدا ہونے لگتی تھی کہ وہ بے شمار دیگر مقابلوں کی طرح موت سے یہ مقابلہ بھی جیت جائے گا۔

صبح سویرے ڈاکٹری دان بھی آگیا۔ وہ اپنے ساتھ

کچھ خاص انجکشن لایا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ انجکشن جبکی کی طبیعت سنبھالنے میں بہت مدد دیں گے۔ اپنی دواؤں میں سے ان انجکشنز کا مل جانی دان ایک کرشمہ سمجھ رہا تھا۔

یہ انجکشنز بھی گلو کوز کی ڈرپ کے ذریعے ہی جبکی کی ورید میں انجیکٹ کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹری دان ڈرپ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ شکنتلا کو موقع سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن وہ تو جیسے جبکی کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کسی صورت جدا ہونے کو تیار نہیں تھی۔ ابھی ڈاکٹر نے جبکی کو ڈرپ لگائی نہیں تھی کہ اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا مدقوق چہرہ بالکل زرو پڑ گیا اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ ڈاکٹری دان نے جبکی کے واسطے سانسز چیک کیے اور وہ بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ ”نمبر پچر بہت شوٹ کر گیا ہے۔ فی الحال ڈرپ نہیں لگائی جاسکتی۔“

”بلڈ پریشر کیا ہے؟“ ڈاکٹر چوہان نے پوچھا۔ ”وہ بھی بڑھا ہوا ہے۔“ ڈاکٹری دان کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ یہاں مشکل ہو جائے گی۔ آپ لوگ گاڑی کا انتظام کریں۔ اگر کار وغیرہ ہو جائے تو بہتر ہے۔“

چوہان بھاگتا ہوا باہر گیا اور دو چار منٹ بعد واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ کار تو نہیں ملی لیکن گھوڑا گاڑی آگئی ہے۔

ہم نے ہلکے پھلکے باروندا جبکی کو احتیاط سے اٹھایا اور گاڑی میں پہنچا دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ادھورے جسم کا وزن بیس پچیس گلو سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک آرام دہ فوجی گاڑی تھی۔ چار نہایت توانا گھوڑے اسے کھینچ رہے تھے۔ ہم برق رفتاری سے ڈاکٹری دان کے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ اب سورج کافی اوپر آچکا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھیں۔ بلند عمارتوں کے خوب صورت چوہارے اور عبادت گاہوں کے گنبد و کلس اس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آرام دہ گاڑی حتی الامکان رفتار سے جاری تھی۔ جبکی کا سر شکنتلا کے زانو پر تھا۔ اس نے خود کو پوری طرح جبکی پر جھکا رکھا تھا۔ یکایک جبکی کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ مل کھا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر چوہان اور شکنتلا نے سہارا دے کر اسے بٹھادیا۔ شکنتلا نے بہ مشکل

بالر کے سامنے ایک ایسا بیس مین تھا جو بیس ہلانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اس کی ہر بال یا تو ساکت بیس سے ٹکراتی، یا دائیں بائیں بغیر کوئی نقصان پہنچانے گزر جاتی۔ تنگ آکر وہ امپائر کی طرف مڑا۔ ”جناب! یہ تو بیس استعمال ہی نہیں کر رہا ہے، اس صورت میں کیا یہ آؤٹ نہیں؟“

”نہیں۔“ امپائر نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اگر یہ بیس استعمال کرے گا تو آؤٹ ہو جائے گا۔“

نوجوان بیس مین بہت زیادہ نروس تھا۔ یہ محض اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب بھی کریر پر موجود تھا۔ وہ سخت بھی محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے بیٹ کر وکٹ کیپر کو دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھ سے زیادہ خراب کھیلنے والے بھی دیکھے ہوں گے۔“

وکٹ کیپر خاموش رہا۔ بیٹس مین نے اپنی بات دہرائی۔ ”میں نے تمہاری بات سن لی تھی۔“ وکٹ کیپر نے جواب دیا۔ ”لیکن میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

اسے ایک گھونٹ پانی پلایا۔ اس نے جبکی کو اپنے سہارے بٹھایا ہوا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور خالی خالی نظروں سے گھوڑا گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر تل پانی کے باغات نظر آرہے تھے۔ ہم اب آبادی کے مضافات میں تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ جبکی کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس کے مر جھائے ہوئے ہونٹ نیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر شکنتلا کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر شکنتلا نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بہت مدھم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ شکنتلا بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر شکنتلا نے ڈاکٹر چوہان سے مخاطب ہو کر دل دگار آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر! گاڑی روکائیے۔“

چوہان چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے شاہی کوچیان سے کہا کہ وہ گاڑی روک دے۔ گاڑی رک گئی۔ جہاں گاڑی رکی، وہاں سرسبز کھیتوں کے درمیان دور تک شفاف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس پانی پر عجیب سی نیلاہٹ تھی۔ یہ نیلاہٹ دراصل کنوئ کے بے شمار

وہ فلموں کا کوئی روایتی ولن نہیں ہے جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف اپنے چچوں کے زور پر دادا گیری کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر یورپین کی طرح خود کو بہت اسمارٹ سمجھتا ہے اور اسے اپنی طاقت کا گھمنڈ بھی ہے۔ میں اس کے اس گھمنڈ کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے سامنے پستول پھینکا تھا اور مجھے دعوت دی تھی کہ میں یہ پستول اٹھا کر اس پر چلاؤں۔۔۔۔۔ تب میں ایسا نہیں کر سکا تھا لیکن اب میرا دل کہتا ہے کہ میں ایسا کر سکوں گا۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ میرا دل سچ کہہ رہا ہے یا پھر اب بھی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔

”جلد بازی نہ کرو تابش! تمہیں خود کو آزمانے کے بڑے موقع ملنے والے ہیں۔“ چوہان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”لڑائی ختم نہیں ہوئی، صرف ٹلی ہے۔ کوئی بھی نیا واقعہ کسی بھی وقت اس آگ کو بھڑکا سکتا ہے۔ تمہیں پر سوں رات والی خبر ملی ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ”ابھی یہ خبر پوری طرح پھیلی نہیں لیکن چند گھنٹوں میں ہر ایک کی زبان پر ہو گی۔ کل رات زر گاں میں تین بندے قتل ہوئے ہیں۔ یہ تینوں زر گاں کی جیل کے افسر ہیں اور جارج کے ماتحت۔ ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ جگہوں پر قتل کیا گیا ہے۔ دو کو گھر میں اور ایک کو عیاشی کے اڈے پر۔ ان تینوں بندوں کو بڑی بے دردی سے تیز دھار آلے کے وار کر کے مارا گیا ہے۔ شہر میں سخت خوف و ہراس پایا جا رہا ہے۔“

”کس کا کام ہو سکتا ہے؟“

”زر گاں میں تو عام خیال یہ ہے کہ قاتل وہی ہیں جنہوں نے کچھ دن پہلے جارج کی بہن ماریا کو اغوا کیا اور پھر اپنے مطالبے منوانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ماریا کو اغوا کرنے والوں میں تمہارے اور اسماعیل کے علاوہ فیروز اور احمد تھے۔ وہ دونوں تو ختم ہو چکے ہیں اور تم دونوں یہاں تل پانی میں ہو۔“

”تو پھر کون ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

چوہان خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں برقی سی کوند گئی۔ دھیان سیدھا سلطانہ اور اس کی دونوں لمبی تلوار کی طرف گیا۔

”بھی گناہ سمجھتا۔“ میں نے کہا۔

”مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم آنے والے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہی نظام قدرت ہے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ اس بات کا تو اطمینان ہے کہ جبکی کا آخری وقت نسبتاً آسان ہو گیا۔ اس نے اس ہستی کی پانچویں میں جان دی جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔“

میں تصور کی نگاہ سے جبکی کا وقت رخصت دیکھنے لگا۔ آخری لمحوں میں جبکی کی خواہش پر ہم نے گھوڑا گاڑی کنول کے پھولوں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیسے جان دی۔ مگر میرا خیال تھا کہ شکنتلا آخری وقت تک اسے چومتی رہی ہو گی۔ اسے اپنی بانہوں کا گداز دیتی رہی ہو گی۔

چوہان بولا۔ ”چلو آؤ، باہر چلتے ہیں۔ آج کئی دن بعد دھوپ نکلی ہے۔ ذرا گھومیں پھر گے۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”تمہارا غم ذرا ہلکا ہو گا۔ جبکی کی طرف سے دھیان بٹے گا۔“

”لیکن میں دھیان ہٹانا نہیں چاہتا۔ میں اسے یاد رکھنا چاہتا ہوں اور وہ سب کچھ یاد رکھنا چاہتا ہوں جو وہ مجھ سے کہہ گیا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ بھی جو وہ کہہ نہیں سکا۔“

”کیا کہہ نہیں سکا؟“

”وہ جو اس کی جسمانی حالت کہتی تھی۔ اس کی اجازت آنکھیں کہتی تھیں۔۔۔۔۔ وہ بھی ہماری طرح حکم جی اور جارج کا ڈسا ہوا تھا۔ وہ زبان سے نہیں کہتا تھا لیکن جارج کی بے رحمی کے لگائے ہوئے چر کے اس کے سینے میں تو تھے نا۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ چوہان نے سرد آہ بھری۔

”میں اپنا حوصلہ آزماؤں چاہتا ہوں چوہان۔“

میں نے گشہ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”میں جارج گورا سے روبرو ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بہت سارے قرض ہیں مجھ پر۔“

”تم جذباتی باتیں کر رہے ہو تابش! جارج کوئی پہلوان نہیں ہے جسے تم لٹکاؤ گے تو وہ کشتی لڑنے کے لیے تمہارے سامنے آجائے گا۔“

”وہ ہے پہلوان۔۔۔۔۔ چوہان! ہمیں ماننا پڑے گا کہ

کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہم کنارے سے پانی میں چلے گئے۔ وہ گھوڑا گاڑی کی ایک آرام دہ نشست پر سائت لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر آسودگی تھی اور نقوش گواہی دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہموار طریقے سے زندگی کی سرحد پار کر گیا ہے۔ چوہان نے اس کا جسم ایک کھیل سے ڈھانپ دیا۔ گاڑی کے اندر سے یہی لگ رہا تھا کہ یہ کوئی جھیل ہے اور ہم کشتی میں بیٹھے ہیں۔

ہم گھوڑا گاڑی کو اس پانی سے باہر لائے۔ شکنتلا اب بھی جبکی کے ساتھ بیوست تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اس نے اپنے جھکے اتار دیے۔ قیمتی ہار بھی اتار پھینکا۔ اس کے بعد اس نے کسی بیوہ کی طرح اپنی چوڑیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر مار کر توڑ ڈالیں اور ایک سفید چادر سے اپنا سراپا ڈھانپ لیا۔

دل دریا سمندروں ڈو گئے، کون دلاں دیاں جٹے نو

☆☆☆

جبکی کی موت نے مجھے گہری افسردگی کا شکار کر دیا۔ میں اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا جہاں میں اور جبکی مشق کیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ میں چھت سے جھولتے ہوئے سینڈ بیگ کو دیکھتا رہتا اور وہ سارے مناظر میری نگاہوں کے سامنے آتے جن میں جبکی میرے ساتھ تھا۔۔۔۔۔ شکنتلا بھی بے پناہ غم کے گھیرے میں تھی۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ صفیہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار یہ مشکل اس کو تھوڑا بہت کھلا دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر تعین ہی لگتا تھا کہ وہ ایک جوان بیوہ ہے۔

ایک دن چوہان میرے پاس آن بیٹھا۔ وہ اچے کے ساتھ مل کر سلطانہ کی تلاش سرگرمی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ تاہم اس سلسلے میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ ہم کچھ دیر تک سلطانہ کے بارے میں بات کرتے رہے پھر گفتگو کا رخ حسب معمول جبکی اور شکنتلا کی طرف مڑ گیا۔

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”کاش، ہم کسی طرح جبکی کو بچا سکتے۔“

چوہان بولا۔ ”ہم نے اپنی سی کوشش تو کی ہے تابش! اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو بڑی تیزی سے خرچ کیا۔۔۔۔۔ شاید وہ خود بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔“

”لیکن اگر اسے پتا ہوتا کہ وقت ایک بار پھر اسے شکنتلا کے روبرو لائے گا تو وہ موت کے بارے میں سوچنا

پھولوں کی تھی۔ جبکی نے شاید اس خوب صورت منظر کو دیکھ کر یہی گاڑی رکوائی تھی۔ شکنتلا اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے کوچیان کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا گاڑی اس پانی میں جا سکتی ہے؟

کوچیان نے آگے جا کر پانی کا جائزہ لیا پھر اثبات میں سر ہلادیا۔ اب وہ روتے ہوئے بولی۔ ”گاڑی کو پانی میں لے جاؤ۔“

ہم سب جان گئے تھے کہ یہ جبکی کی خواہش ہے اور شاید یہ خواہش آخری خواہش کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ بس تھوڑی دیر کا مہمان تھا اور لگتا تھا کہ جاپانی ڈاکٹری دان نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے جبکی کی اس انوکھی خواہش کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اتر گئے۔ صرف جبکی اور شکنتلا موجود رہے۔ وہاں زمین پر پانی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ کوچیان گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہانکتا ہوا آگے تک لے گیا۔ وہاں چاروں طرف سنہری دھوپ تھی اور کنول کے ہزار ہا پھول سرما کے اولین جھونکوں میں ہولے ہولے رقص کر رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی سفید پتے یا سرسبائی کی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔ گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ کوچیان گھنٹوں گھنٹوں پانی میں چلتا ہوا واپس آ گیا۔

سب کی آنکھیں نم تھیں۔ چمیلی متش گاڑی کنول کے اُن گنت پھولوں کے درمیان سائت کھڑی تھی اور اس گاڑی میں شکنتلا اور جبکی کے ہولے نظر آ رہے تھے۔۔۔۔۔ جبکی کو وہ کشتی اور وہ جھیل تو نہیں مل سکی تھی جو اس کی سنہری یادوں کا حصہ تھی لیکن اس سے ملتا جلتا منظر ضرور مل گیا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ شکنتلا کی بانہوں میں تھا۔ ایسا تو شاید سمجھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ ایک عظیم نیپالی فائٹر تھا لیکن اس کے چٹائی جسم کے اندر ایک شاعر کا سا گداز بھی موجود تھا اور یہ شاعر ایک آئیدیل موت چاہتا تھا۔ ایک خوب صورت الوداعی منظر۔۔۔۔۔ اور یہ سب کچھ اسے مل گیا۔

ہونی ہو کر رہتی ہے اور قدرت کے اصول آسانی سے نہیں بدلتے۔ سورج نصف النہار کے قریب تھا جب جبکی مر گیا۔ چمکیلے پانی کے درمیان اور ہزار ہا پھولوں کے بیچ۔ اس کی آخری پچی شکنتلا کی ریشمی گود میں جذب ہوئی۔ شکنتلا کے رونے کی آوازوں سے ہمیں پتا چلا کہ

Scanned and Uploaded By Nadeem

”کھل کر بات کرو۔“

”ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اس نظر نہ آنے والی زنجیر کو کیسے کھول سکتے ہیں جو حکم اور جارج نے تمہارے پاؤں میں ڈال رکھی ہے۔۔۔۔۔ میرا مطلب اس بانیکر وچپ سے ہے جو تمہارے جسم میں رکھی گئی ہے۔“

میرے اندر ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ کسی وقت میں واقعی اس اہم ترین نکتے کو بھول جاتا تھا کہ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہو چکا ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں گا، کچھ نادیدہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں گی اور میری ہر جدوجہد کو ناکام کر دیں گی۔

”تم چاہتے ہو کہ میں آپریشن کے ذریعے وہ چپ اپنے جسم سے نکلاؤں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، یہ بے حد ضروری ہے۔ آئندہ تم نے جو کچھ بھی کرنا ہے تابش، اس کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ تم واقعی آزاد ہو یا نہیں۔ مثال کے طور پر اگر تم اس اسٹیٹ سے نکلتا ہی چاہو تو بھی تمہارے اندر کی یہی چپ تمہارے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بنے گی۔۔۔۔۔ تم ہمیشہ کی طرح لاچار ہو کر رہ جاؤ گے۔“

”لیکن اب تو صورت حال بدل چکی ہے، میں یہاں تل پانی میں ہوں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن چکی ہے۔ اگر میں چھوٹے سرکار سے یہ درخواست کروں کہ وہ مجھے یہاں سے نکلنے دیں تو کیا وہ میری درخواست کو رد کر دیں گے؟“

”بات درخواست کی نہیں ہے تابش! شاید تمہیں اس بات کی جانکاری نہیں کہ اسٹیٹ سے باہر جانے والے راستوں پر چھوٹے سرکار اور حکم کی مشترکہ نگرانی ہے اور یہ بڑی سخت نگرانی ہے۔ نکاسی کے راستوں پر موجود ان ساری چوکیوں پر تل پانی کے ساتھ ساتھ زرگاں کی سکیورٹی فورس بھی موجود رہتی ہے۔ دونوں طرف کے اہل کاروں کی مکمل اجازت اور تسلی کے بغیر کوئی شخص سرحد پار نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“

چوہان نے اس حوالے سے مجھے مزید تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ جنگل میں اپنی بھاگ دوڑ کے دوران میں، میں جابجا پرانی حفاظتی چوکیاں اور مچائیں وغیرہ دیکھ چکا تھا۔ انور خاں نے بھی مجھے اس راجوڑے کی سرحدی نگرانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر چوہان نے کہا۔ ”میری

جب کافی دیر گزر گئی تو وہ ڈرتی ڈرتی باہر نکلی۔ اسے گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے ہی دھواتا تھ منہ کے بل پڑا نظر آ گیا۔ اس کے فرہ جسم پر درجنوں زخم تھے۔ لگتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی تیز دھار آلے کے وار کیے گئے ہیں۔ اس کا پستول بھی قریب ہی پڑا ہوا ملا ہے۔ شاید آخری وقت میں اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی روتی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دوسری واردات جارج گوراکے گھر کے بالکل پاس ہوئی ہے۔ یہاں بھی جیل کے ایک بڑے افسر اردن لال کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ غسل خانے میں قتل ہوا ہے۔ اس کا گلا پہلے اس کے ازار بند سے گھونٹا گیا۔ پھر تیز دھار آلے کے پے در پے وار کیے گئے۔ اردن کی پتی ساتھ والے کمرے میں بے خبر سوئی رہی۔ تیسرے قتل کے بارے میں ابھی تفصیل سامنے نہیں آئی ہے۔“

ہم کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اگر ہمارا شک درست تھا اور ان واقعات کے پیچھے واقعی سلطانہ اور ظلال تھے تو پھر آنے والے دنوں میں حالات کوئی بھی سنگین رخ اختیار کر سکتے تھے۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی طرح زرگاں چلا جاؤں؟“

”لگتا ہے کہ تمہاری سوئی ابھی تک وہیں انگی ہوئی ہے۔ تم جارج تک پہنچنا چاہتے ہو۔“

”اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے چوہان۔۔۔۔۔ سلطانہ زرگاں میں ہے۔ وہ جارج کو نشانہ بنانا چاہ رہی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ اس کوشش میں اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔ تو کیا مجھے اس کی مدد نہیں کرنی چاہیے؟ یہاں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ اپنی جان گنوا لے یا کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو جائے؟“

چوہان مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”ابھی تو یہ سب مفروضے ہی ہیں تابش! ہم ابھی دھواں سے نہیں کہہ سکتے کہ زرگاں میں درحقیقت کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اور جو کچھ ہوا ہے، اس میں سچ سچ سلطانہ اور ظلال ملوث ہیں بھی یا نہیں۔“ اس نے دو لمحے توقف کر کے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور قالین پر گاؤنکے کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ”تابش! میرے خیال میں فی الوقت سوچنے والی جو سب سے اہم بات ہے، وہ کچھ اور ہے۔“

اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی آنکھیں یاد آئیں۔۔۔۔۔ اور ان آنکھوں میں خاموشی سے کوندتی ہوئی وہ بجلی جو خون کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی تھی۔

میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ”تم صاف کیوں نہیں بتاتے۔۔۔۔۔ یہ کس نے کیا ہے؟“

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”ابھی دھواں سے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جو شک تمہارے ذہن میں آیا ہے، وہ میرے ذہن میں بھی ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ذہن میں بھی آئے گا۔ ابھی تک جو اطلاع پہنچی ہے، اس کے مطابق ان تینوں وارداتوں کا کوئی چشم دید گواہ تو نہیں لیکن شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو افراد کا کام ہے۔۔۔۔۔ اور انہوں نے خاص قسم کی تلواریں استعمال کی ہیں۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سلطانہ واقعی وہاں پہنچ چکی ہو؟“

”ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔“ چوہان نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔۔۔۔۔“

ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح چوہان کا دماغ بھی گھڑ دوڑ کا میدان بن چکا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ ”اب کیا ہو گا چوہان؟ اگر وہ واقعی زرگاں میں ہے تو پھر وہ لوگ اسے اور ظلال کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔“

”ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے تابش! ابھی تو ان لوگوں کو اپنی پڑی ہوئی۔۔۔۔۔ تین اہم ترین بندے قتل ہوئے ہیں۔ دھواں تھ نام کا جو اسسٹنٹ اپنے گھر کے کمرے میں مارا گیا ہے، وہ پرلے درجے کا عیاش مشہور تھا۔ زرگاں کے بازار حسن میں جو بھی خوب صورت طوائف پیشہ شروع کرتی تھی، اسے پہلے دھواتا تھ کے پاس حاضری لگوانی پڑتی تھی۔ اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والی طوائف اور اس کے وارثوں پر سخت مصیبت نازل ہوتی تھی۔ کل رات بھی دھواتا تھ اپنے بیڈ روم میں ایک نئی لڑکی کو پیشے کا ”اجازت نامہ“ دے رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اتفاقاً اس کے دونوں ملازم نشے میں مدہوش پڑے تھے، اٹھ نہیں سکے۔ دھواتا تھ نے پہلے ملازموں کو گالیاں دیں پھر دستک دینے والے کی ایسی کی ایسی کرتا ہوا باہر نکلا۔ نوجوان طوائف زادی کمرے میں انتظار کرتی رہی۔

رائے تو یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ڈاکٹر لی وان سے رابطہ کریں اور انہیں اس بارے میں پوری تفصیل بتائیں۔ وہ ایک اچھے سرجن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر وہ تمہارا آپریشن کریں تو وہ کامیاب رہے گا۔“

۔۔۔۔۔ ہم اسی روز رات کو ڈاکٹر لی وان سے ملے۔ اس کا چھوٹا سا اسپتال تل پانی کے مضافات میں ایک خوش گوار آب و ہوا والی جگہ پر تھا۔ لی وان کو چھوٹے سرکار اور دیوان کے خصوصی معالج کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ وہ بہت کم لیکن کارآمد بات کرتا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”مجھے باروندا جی کی موت کا بہت دکھ ہے۔ درحقیقت اس میں کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔ اگر وہ چارچھ مہینے پہلے ہمارے پاس آ جاتا تو شاید ہم کچھ کر سکتے۔“

”آپ کو پتا ہے کہ وہ اصل میں کون تھا؟“ چوہان نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے چھوٹے سرکار اجیت رائے نے بتایا ہے۔ اور یہ سب جان کر میرے دکھ میں اضافہ ہوا ہے۔ جاپان میں مارشل آرٹ کی قدر و بگڑ ملکوں سے زیادہ ہے۔ نیپالی فائٹر جی کی کا نام وہاں بھی بہت سنا جاتا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ نامور ہیرو بھی ایک لاغر مریض کی شکل میں میرے سامنے آئے گا اور لاغر بھی ایسا کہ اس پر حسرت کی نظریں ڈالنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کیا جاسکے گا۔“

ہم نے کچھ دیر تک جی کی کو یاد کیا۔۔۔۔۔ پھر چوہان اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے ڈاکٹر لی وان کو میرے انوکھے مسئلے کے بارے میں بتایا۔ حسب توقع ڈاکٹر لی وان بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ چوہان کے کہنے پر اس نے میرے سر کے عقبی حصے کو ٹٹول کر دیکھا اور ان اسپر کا معائنہ بھی کیا جو میری گڈی پر موجود تھے۔ ڈاکٹر چوہان اور ڈاکٹر لی وان انگریزی میں بات کرتے رہے۔ ان کی گفتگو میں میڈیکل کی مشکل اصطلاحات بھی آرہی تھیں۔

ابتدائی معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان مجھے اپنی لیبارٹری میں لے گیا۔ یہاں ایک چھوٹی ایکس رے مشین اور الٹراساؤنڈ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ڈاکٹر نے میرے دو تین ٹیسٹ لیے۔۔۔۔۔ اس نے فوری طور پر تو کچھ نہیں بتایا تاہم ہمیں ایک دن بعد دوبارہ آنے کے لیے کہا۔

۔۔۔۔۔ میں اور چوہان تیسرے روز دوپہر کے وقت

پھر لی دان کے شفاخانے پہنچے۔ وہ کچھ خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر چوہان کو الٹرا ساؤنڈ کے پرنٹس دکھائے۔ ایکسرے پر غور و خوض ہوا۔ ایکسرے میں چمکتی ہوئی مائیکرو چپ بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھ سے دوچار سوال پوچھنے کے بعد چوہان اور لی دان دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے دس پندرہ منٹ مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد وہ باہر آئے اور ڈاکٹر چوہان نے مجھے چلنے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر لی دان نے میرا شانہ ہتھکتے ہوئے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔“ راستے میں گھوڑا گاڑی کے اندر چوہان نے مجھے بتایا۔ ”لی دان کا خیال ہے کہ یہ آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بہتر سہولتوں کی ضرورت ہے۔“

”کیوں؟“

”وہی بات جس کا ہمیں بھی ڈر تھا۔ تم نے بھی ایکسرے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر اسٹیل وغیرہ نے چپ پلانٹ کرتے ہوئے پوری پوری خباثت دکھائی ہے۔ یہ چپ تمہاری ریڑھ کے بالائی حصے سے بالکل اٹچ ہے۔ اور تمہیں بتانی ہو گا کہ ریڑھ میں ”اسپائنل میزو“ ہوتا ہے جو جسم کا بہت نازک حصہ ہے۔“

”تو پھر؟“

”لی دان کا کہنا ہے کہ چپ کو نکالنا ناممکن نہیں ہے مگر اس کے لیے ایک اچھے نیوروسرجن اور جدید آپریشن تھیمز کی ضرورت ہے۔“

میں نے لمبی سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ دھاک کے وہی تین پات۔ چپ نکلوانے کے لیے ضروری ہے کہ میں اسٹیت سے باہر جاؤں اور باہر جانے کے لیے ضروری ہے کہ میں چپ نکلواؤں۔“

”فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر لی دان رسک لینا نہیں چاہ رہا۔ ورنہ وہ خود بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایک اچھا سرجن ہے۔ اگر اس کام میں خطرہ محسوس کر رہا ہے تو پھر یقیناً خطرہ ہو گا۔“

”لیکن اگر میں خطرہ مول لینا چاہوں تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں لی دان سے ہی آپریشن کرانا چاہوں تو؟“

”میں نہیں سمجھتا کہ لی دان مانے گا۔ ایسے لوگ اپنے پروفیشن سے بڑے کبڈ ہوتے ہیں۔ انہیں ایسے

معاملوں میں گائیڈ نہیں کیا جاسکتا۔“

گھوڑا گاڑی اب شہر کی گنجائش میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ نیلگوں جھیل پر کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کنارے کے لاتعداد مکانوں میں روشنیاں جگمگانے لگی تھیں اور ان روشنیوں کے عکس پانی میں جھلک رہے تھے۔ کنارے کے سبزہ زاروں میں بچے چمک رہے تھے اور خوش پوش لوگ ہنس کھیل رہے تھے۔ یہ دلکش مناظر تھے لیکن میرے سینے میں عجیب سی یاسیت بھرتی جاری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ اتر پردیش کے جنگلات میں واقع بھانڈیل اسٹیت نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑی جیل ہے اور میں اس جیل کی بلندو بالا دیواروں کو کبھی پار نہیں کر سکوں گا۔

یہ بڑے عجیب دن تھے۔ مجھ پر عجیب سی بے حسی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی شروع ہو چکی تھی لیکن میرے جسم پر اب بھی گرمیوں والا لباس ہی رہتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ میں رات کو کمرے یا لحاف بھی نہ لیتا۔ اسی طرح پڑا رہتا۔ یوں لگتا کہ میں جان بوجھ کر اپنے جسم کو اذیت دینا چاہتا ہوں۔ اذیت کا حصول میرے لیے ایک مشغلہ بننا جا رہا تھا۔ میں بند کمرے میں گھنٹوں سینڈ بیگ سے مصروف رہتا اور خود کو سخت ترین ورزشوں میں غرق کر دیتا۔ میرے پاؤں سوچ جاتے، ناخنوں سے خون رسنے لگتا۔ مجھے لگتا کہ میں بے ہوش ہونے والا ہوں لیکن میں رکتا نہیں۔ میرے کانوں میں جیکی کی سرگوشیاں گونجتیں۔ اس نے کہا تھا۔ ”..... جہاں برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے، وہاں سے کچھ حاصل کرنے کی حد شروع ہوتی ہے۔“ میں دیوانوں کی طرح اپنا کام جاری رکھتا پھر نیم جان ہو کر یا چکر اکر گر جاتا۔

میرے جسم پر کوئی زخم لگ جاتا تو میں دوا لگانے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ اگر چوہان زبردستی اس پر کچھ باندھ دیتا تو میں موقع ملتے ہی اتار پھینکتا۔ اپنے زخم کو مزید زخمی کرنا بھی مجھے اب اچھا لگتا تھا۔ میرے اندر کچھ زبردست تبدیلیاں آرہی تھیں۔ میرا جسم بتدریج تکلیف سہنے کا عادی ہو رہا تھا۔ اب چوٹ میری ہمت کو توڑتی نہیں تھی، میرے اندر کی آگ کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے کسی دشمن کا سامنا کروں۔ کوئی ہو جو اپنی تمام تر نفرت کے ساتھ میرے سامنے آئے۔ میں اسے ماروں اور وہ مجھے مار دے۔ کوئی

بھی ہو۔ انگلینڈ کا جارج گورا ہو جس نے مجھے خود میری نظروں میں گرایا تھا، زرگاں کا حکم جی ہو جو ایک آسیب کی طرح اسٹیت کے باشندوں کے ذہنوں پر سوار تھا یا پاکستان کا سینٹھ سراج ہو جس کے ہاتھوں پر میری مقتول ماں کا خون تھا..... ہاں، کوئی بھی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس کو جواب دوں۔ اسے پتا چلے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور مجھے پتا چلے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

سلطانہ کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔ ایک ہی رات میں قتل کی تین وارداتوں کے بعد کوئی نیا واقعہ بھی نہیں ہوا تھا۔ حالات میں ایک پراسرار سی خاموشی تھی۔

ایک دن سردی زیادہ تھی۔ بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کمروں میں انگلیٹھیاں روشن تھیں اور مرد و زن گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں اپنے اندر کی آگ کو بجھانے کے لیے کھلی جگہ پر چلا آیا۔ بارش کی سرد بوچھاڑوں نے مجھے لمحوں میں شرابور کر دیا۔ میں نے بالائی جسم پر فقط ایک پتلی سی قمیض پہن رکھی تھی۔ وہ میرے جسم سے چمک گئی۔ میں چلتا ہوا دیوان کی عمارت سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر بھی میں رکا نہیں اور جھیل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سخت سردی اور بارش کے سبب ہر طرف سناٹا تھا۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ یوں، پانی کی بجائے بوچھاڑوں میں بھاگنا مجھے اچھا لگا۔ شاید میں لاشعوری طور پر اپنی برداشت کو آزمانا چاہتا تھا، اپنا دم خم پر کھنا چاہتا تھا۔ اکثر شام کے وقت میں جھیل کے کنارے کنارے تین چار میل تک بھاگتا تھا لیکن آج کا بھاگنا مجھے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ جس نے مجھے دیکھا، حیرت سے دیکھا۔ میں بھاگتا بھاگتا درختوں کی طرف نکل آیا۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور سانس سینے میں نہیں ساری تھی اور یہی کیفیت میرے دل کو بھاتی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ چند گھڑ سوار میرے پیچھے آرہے ہیں۔ جلد ہی میں جان گیا کہ یہ کوئی اور نہیں دیوان کے ہی محافظ تھے۔ جب میں باہر نکلتا تھا، یہ حفاظت کی غرض سے اکثر میرے آس پاس رہتے تھے اور آج تو میں کچھ زیادہ آگے نکل آیا تھا۔

میں گھنے درختوں میں داخل ہوا تو گھڑ سوار میرے قریب پہنچ گئے۔ یہ کپتان اچے کے ہی ماتحت تھے۔ ایک حوالدار نے آگے آ کر کہا۔ ”جناب! آپ زیادہ آگے نہ

جائیں۔ موسم بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔“ میں نے بھتا کر کہا۔

”لیکن آپ کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ تم اپنی یہ لعنتی ذمہ داری پوری کرتے رہو۔“ میں نے کہا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ گھلا جوتا میرے پاؤں سے نکل گیا۔ میں نے دوسرا بھی اتار پھینکا۔ اب میں ننگے پاؤں تھا۔ میرے تلوے راہوں کی سختی سے آشنا ہو رہے تھے۔ میں انہیں مزید آشنا کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر خواہش جاگتی تھی کہ میرے پاؤں میں کانٹے ٹوٹیں اور میں دوڑتا رہوں۔ دوڑتے دوڑتے میری سانس ٹوٹ گئی اور ٹانگیں یکسر جواب دے گئیں۔ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہا۔ میں نے اپنا رخ تاڑ توڑ پانی برساتے آسمان کی طرف کر لیا۔ اپنی ٹانگیں اور بازو پھیلا دیے۔ کڑکتی سردی میں بریلے پانی کی ساری سختی اپنے سراپا پر جھیلنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میرے ٹکراں گھڑ سوار مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئے ہوں گے اور وہیں میرے اٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

لیکن مجھے اٹھنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں وہیں لیٹا رہا۔ باروندا جیکی کے فلسفے کے مطابق درد میں ڈوب کر درد کی حقیقت معلوم کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے درد، اذیت اور بے سکونی کا احساس کم ہوتا گیا۔ بج بٹ پانی میرے جسم پر اپنا اثر کھونے لگا۔ مجھے غنودگی سی ہونے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزری۔ تب اچانک مجھے لگا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ میں نے بو جھل پلکیں اٹھائیں۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ شام کے جھپٹے میں وہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اچے کے باوردی حوالدار رب نواز نے اس کے اوپر ایک بڑی چھتری تان رکھی تھی۔ چوہان بولا۔ ”تاہش! یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو؟ تم اپنے دشمن آپ بے ہوش ہوئے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے، ایسے موسم میں اس طرح باہر نکلنے کا؟“

”کیا ہو گا؟ مری جاؤں گا؟“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”اپنا نہیں تو ان لوگوں کا خیال ہی کرو جو تم سے وابستہ ہیں۔“

”کون لوگ؟“

کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ میں بے چینی کے اس احساس کو کوئی نام تو نہیں دے سکا تاہم بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے میں ایک چھوٹا بلبل روشن رہنے دیا تھا۔ اس کی ہلکی نیلی روشنی آنکھوں کو تکلیف نہیں دیتی تھی۔

اچانک وہ بندہ اسٹور روم کے دروازے سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کا سیاہی مائل چہرہ تھمرا ہوا تھا اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے سگریٹ سلگایا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ میرا پستول ہولسٹر میں تھا اور یہ ہولسٹر دیوار سے لٹک رہا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر اس کی سرسراہٹ سرگوشی نے میرے قدم روک دیے۔ ”ناہیں، میرے پپو صاحب! زیادہ پھرتی دکھانے کی ضرورت ناہیں۔ پستول بہت دور ہے۔ اس سے بہت پہلے آپ کی کھوپڑیاڑ جائے گی۔“ وہ پھٹکارا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ رنجیت پانڈے تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔ اس سے پہلے سرنگ کے دھانے پر میں نے اس کی ادھوری سی جھلک دیکھی تھی۔ آج وہ پورے کا پورا میرے سامنے تھا۔ وہ کسی گینڈے کی طرح ٹھوس تھا۔ گہری سانولی رنگت کے ساتھ براؤن آنکھیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں لیکن اس کی آنکھیں براؤن تھیں اور ان میں دنیا بھر کی خباثت جمع تھی۔ یہ ایک نہایت عیار و غماک شخص کی آنکھیں تھیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”تو تم ہو پانڈے؟“

”جی پپو صاحب! مجھ کھاکسار (خاکسار) کو ہی پانڈے کہوت ہیں۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہر پلے انداز میں کہا۔

”تم یہاں کیسے آئے؟“

اس نے ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑا۔ ”آپ جناب نے بڑا بچے دار سوال پوچھا ہے۔ اس کا جواب تو کئی میٹر لمبا ہے۔۔۔ مختصر یہ کہوں گا کہ ایسا کبھی ہوا ناہیں ہے کہ آپ کے اس کھاکسار نے کہیں پہنچنا ہو۔۔۔ اور پہنچ نہ سکا ہو۔ بس یہ دروازے اور دیواریں اسے کھد بہ کھد رستہ دیتے چلے جاتے ہیں۔“

اس کے کالے ماتھے پر ایک چھوٹا نقشہ تھا جو اس کے کتر ہند ہونے کی نشانی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کچھ

”سلطانہ۔۔۔ تمہارا بچہ۔۔۔“

”سلطانہ جا چکی ہے۔۔۔ اور جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ بھی تو مل جاتے ہیں۔“

”سلطانہ جا تو چکی ہے۔۔۔ لیکن زندہ ہے۔ اسے کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے بارے میں تازہ اطلاع شاید تم نے نہیں سنی۔“

”کیسی اطلاع؟“ میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند ذرا کم ہوئی۔

”زرگاں والوں نے کھوج لگالیا ہے کہ جارج کے تین ماحتوں کو قتل کرنے والی سلطانہ ہی ہے۔“

”کیسا کھوج؟“

”ایک مقتول کی ہاتھوں کی انگلیوں سے کچھ لمبے بال ملے ہیں۔ اس کے علاوہ زرگاں کے ایک تیل گاڑی والے نے گواہی دی ہے کہ واردات کی شام ایک عورت اور ایک لڑکے نے اس کی گاڑی میں سفر کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ عورت، مختار راجپوت کی بیٹی ہی تھی۔“

”اس سے کیا فرق پڑے گا؟“

”اس سے یہ فرق پڑے گا کہ سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس کی رکھشا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

”اب تک سوچ ہی تو رہے ہیں۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

چوہان نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور واپس دیوان میں آ گیا۔ راستے میں وہ مجھے مسلسل سمجھاتا رہا۔ میرے طرز زندگی کو حماقت قرار دیتا رہا اور میانہ روی کے مشوروں سے نوازتا رہا۔ اس کی باتیں مجھ پر بے اثر تھیں۔ میں کسی اور ہی رنگ میں رنگتا چلا جا رہا تھا۔ قریب المرگ باروندا جیسی کچھ بیج بو گیا تھا میرے اندر اور یہ بیج اب لہلہاتے پودے بن رہے تھے۔

قیام گاہ پر واپس پہنچ کر میں نے چوہان کے بے حد اصرار پر کپڑے بدلے۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ہم دونوں نے چائے پی اور لکھنوی طرز کے کباب کھائے۔ رات نو دس بجے کے قریب چوہان واپس چلا گیا۔ میں نے آتش دان بجھا دیا۔ مجھے ہر طرح کی آسائش سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر تک کھڑکی میں بیٹھ کر رم جھم برستی بارش کا نظارہ کرنے کے بعد میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو

تر ہو گیا۔ کہیں گہرائی میں ایک انگڑائی سی بیدار ہونے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پانڈے! میں جانتا ہوں کہ تو کمزور شخص نہیں ہے۔۔۔ اور ناکام بھی نہیں ہے لیکن آج کی رات تو بڑا بد قسمت ثابت ہوا ہے۔“

”کیا مطلب پو صاحب؟“

”آج تو ایک غلط وقت پر، غلط جگہ پر، غلط شخص کے سامنے ہے۔ کاش! تیرے ساتھ ایسا نہ ہوا ہوتا۔“

اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ میرے منہ سے ایسی بات سنے گا۔

سگریٹ کی راکھ کباب والی پلیٹ میں جھاڑ کر اس نے طویل کش لیا۔ ”پو صاحب! آپ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی نشہ و شہ تو نہیں کیا ہوا۔۔۔ یا پھر آپ اس کھا کسار کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں ہیں۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں نیلاز ہوا آتا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے پتلون کی پلیٹ میں سے اپنا کولٹ پھیل نکال لیا۔ نال کارخ میرے سینے کی طرف تھا۔ وہ کسی شیش ٹاگ کی طرح پھٹکا۔ ”میں صرف دھکاتا ہوں ہوں پو۔۔۔ گولی مارتا ہوں اور میرا نشانہ کھاتا ہوں جاتا۔“

ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ میرے اندر کا سرکش ریلو اچھل گیا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ میرے پاؤں کی ضرب بالکل نشانے پر لگی۔ میرے پاؤں کی ”آپر پام“ نے پانڈے کے پٹل اور پٹل والے ہاتھ کو ایک ساتھ نشانہ بنایا۔ کولٹ پٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر چھت سے ٹکرایا اور ایک الماری کے پیچھے اوچھل ہو گیا۔ میں اندھا دھند پانڈے پر جا پڑا۔ میرا سر پوری شدت کے ساتھ اس کے سینے پر لگا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میرا مقابلہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس کے سیاہ جسم میں گوشت پوست کے بجائے جیسے فولاد بھرا ہوا تھا۔ میرے سر کی ضرب سے وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گیا اور اس کی پشت دیوار سے ٹکرائی۔ بچیں یہی محسوس ہوا کہ دیوار میں طاقتور اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے ٹکرایا تھا، اس سے کئی گنا تیزی سے واپس میری طرف آیا۔ اس کا فولادی ہاتھ میرے جڑے پر پڑا اور آنکھوں میں ستارے سے رقص کر گئے۔ یکایک وہ کسی مشتعل جانور

اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہے تھے تاہم میرے کانوں تک پہنچ گئے۔

”کیا کہا تم نے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ شاہ صاحب نے تل پانی کی راج گدی حاصل کرنے کے لیے جو راستہ چنا ہے، وہ کچھ زیادہ ٹھیک نہیں۔ شاید وہ اپنا دھیرج کھو بیٹھے ہیں اور دونوں بھائیوں کو لڑانے پر تل گئے ہیں۔ لڑائی ہوئی تو بہت زیادہ کھون بہے گا۔ بہت سارے لوگن مریں گے۔ بس چند ایک ہی جندہ بچیں گے۔ چند ایک پر حکومت کرنے کا کیا کھا ک بجا آوے گا اپنے شاہ صاحب کو۔۔۔۔۔ وہ جس راستے پر پہلے چل رہے تھے، وہ زیادہ اچھا تھا۔“

”تم کس راستے کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے گھبر لہجے میں پوچھا۔

”شاہ صاحب کا راستہ آپ کو نہیں پتا پو صاحب! یہ تو بڑا سیدھا سادہ راستہ ہے۔ ایک دم فنا سنگ۔۔۔۔۔ جو بھی نجر آوے اس کو پکڑ کر مسلمان بنا دو۔۔۔۔۔ نہ بنے تو لایع اور دھونس سے کام لو۔۔۔۔۔ پھر بھی نہ مانے تو اس کا جینا حرام کر دو۔ یہاں تل پانی میں یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ لوگن کو پکڑ پکڑ کر مسلمانیا جا رہا ہے۔ اور تو اور سنا ہے کہ اپنے چھوٹے سرکار بھی اپنے دھرم کو غا دینے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ان سے یہ راج گدی چھن جاوے۔ پھر اس گدی پر اپنی تشریف کا نو کرار کھیں گے اپنے یہی شاہ صاحب۔۔۔۔۔ اور پھر اس کے بعد پتا ہے کیا ہو گا۔۔۔۔۔؟“

میں سوالیہ نظروں سے پانڈے کا سانولا تہمتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”اس کے بعد شاہ صاحب کی خبریں جیسے گی زر گاں پر۔ وہ زر گاں کو سومات سمجھ لیوے گا اور محمود گج نوی بن کر بار بار اس کو ڈھانے کی کوشش فرماوے گا۔ بڑا فتور ہے سالے کی نیت میں۔۔۔۔۔ بڑا فتور ہے۔۔۔۔۔“

میں پانڈے کی صورت دیکھ رہا تھا اور میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ وہ کش لے کر بولا۔ ”باہر بڑکھا ہو رہی ہے۔ کھاسی سردی ہے۔ تم کوئی چادر وغیرہ لے لو۔ ہم کو کافی لمبا سفر کرنا ہے۔“

میرے اندر کی جلیں میں کھلا ہوا میٹھا میٹھا درد و فزوں

میں کوئی بہت زہریلا مچھر گھس گیا ہے۔ اس نے ڈنک مار مار کر اس کے پیچھے میں آگ لگا دی ہے۔ اب وہ ہر ایک پر جیسے مارتی پھرتی ہے۔ اس جھانسی کی رانی کے گلے میں پٹا ڈالنے کا بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔ آپ جناب کو اپنا مہمان بنالیا جاوے اور ہم جیسے کینے دن رات آپ کی سیوا میں مصروف ہو جاویں۔ جب اسے آپ کی سیوا کی سچا رٹ ملے گی تو یقیناً وہ سوچنے پر مجبور ہو جاوے گی۔“

اس کی بک بک اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی۔ جو شیل دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

”اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے نا پو صاحب۔۔۔۔۔ کہ میں بہت کھاس قسم کا حرامی ہوں۔ بھگوان نے میری آنکھ میں ایک بہت پلید جانور کا بال رکھا ہوا ہے۔ یہ کبھی ہوتا ہے کہ میں نے آپ جیسے کسی پو کو مہمان بنانا چاہا ہو اور وہ بن نہ سکا ہو۔ ہاں جی، یہ کبھی ہوتا ہے۔“

اس نے حیرت انگیز سکون سے دونوں ٹانگیں میز پر رکھیں اور بے پروائی سے رائیں کھجانے لگا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی ایک مسئلہ ہو تو آپ جناب کو بتاؤں بھی۔ یہاں تو اب مسئلوں کا ڈھیر لگ گیا ہے اور سب سے منحوس مسئلہ تو تمہارا یہ مراد شاہ صاحب ہی ہے۔ خبر نہیں یہ کس لاپتا بندے کا لطفہ ہے۔ میں تو اس کی حرام کاریوں کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہوت ہوں۔ یہ کچھ برس پہلے اسٹیٹ کی فوج میں ایک معمولی کپتان تھا۔ آج سواہ سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ اس کی ہوس کسی طرح کھتم ہونے میں نہیں آئی۔ آج یہ راج گدی پر بیٹھنے کے سنے دیکھ رہا ہے۔ اس کے یہ سنے بس اسی صورت میں پورے ہو سکت ہیں کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے کھون کے پیاسے بن جاویں اور پھر لڑ کر رہا ہے اسی کارن کر رہا ہے۔“

”تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میں مراد شاہ صاحب کے خلاف اب ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔“

”اوہو، نکلتی ہو گئی پو صاحب! مجھے شام کر دیجیے۔ مجھے ایسا ناہیں کہنا چاہیے تھا۔ بے شک میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ مراد شاہ کی شان بیان کرنے کے لیے بالکل بھی کافی نہیں ہے۔ لیکن کچھ بھی ہے، وہ آپ کا بیج بان ہے۔ آپ کی دم پر تو پاؤں آئے گا ہی۔“ آخری الفاظ

کرنے کا سوچا لیکن اس کی سانپ جیسی نظریں ایک ساتھ اس پورے کمرے اور کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ پھر پھٹکا۔ ”ناہیں پو صاحب! آپ حرکت کریں گے تو گولی چلاتا پڑے گی اور آپ کی بد قسمتی یہ ہووے گی کہ میرا نشانہ بھی کھتا (خطا) نہیں جاتا۔“

میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت سہے اور وہ مجھے ویسا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے پستول اپنی پتلون میں سامنے کی طرف اڑسا ہوا تھا۔ یہ اس کا بے پناہ اعتماد تھا کہ اس نے پستول اپنے ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ درجنوں پھرے داروں کی موجودگی میں نہ صرف دیوان کی عمارت کے اندر پہنچا بلکہ میرے کمرے تک بھی پہنچ گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

میں نے اسے نگاہوں نگاہوں میں تولد۔ میرے جسم میں عجیب میٹھا میٹھا سادرد ہونے لگا۔ ایک لہری سر کی طرف سے چلی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ میرا سینہ ہلکے ہلکے جوش سے دھڑکنے لگا۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت جاگ اٹھی۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ”آپ کے گھر مہمان آیا ہے یہ کسی کمین بندہ۔ کوئی کھاطر توا جع ناہیں کریں گے؟“

”کس قسم کی خاطر تواضع چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ”اجی کوئی شراب یا لونڈیا تو ناہیں مانگ رہا۔ بس ہنس کر بات کر دیجیے۔ یہی ہماری کھاطر ہو جاوے گی۔“

”سیدھی بات کرو۔ چاہتے کیا ہو؟“ میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اس نے میری سنجیدگی محسوس کر کے سگریٹ کے دو طویل کش لیے اور دھوئیں کے گاڑھے مرغولے چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”پو صاحب! یہ کھا کسار آپ کو لینے آیا ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہووے گا۔“

”کہاں؟“

”زر گاں۔ حکم جی کے پاس۔“

”کیوں؟“

”اس کیوں کے دو تین جواب ہیں پو جی۔۔۔۔۔ لیکن سب سے کھاس جواب یہ ہے کہ آپ کی پتی کی ناک

Scanned and Uploaded By Nadeem

کی طرح مجھ پر مل پڑا۔ وہ خالی ہاتھ تھا مگر لگتا تھا کہ اس نے ہتھوڑے پکڑے ہوئے ہیں۔ چند سیکنڈ میں مجھے درجنوں تھلکے خیز ضربیں اپنے جسم پر سہا پڑیں۔ میں کئی بار سنگ سرخ کی دیواروں سے ٹکرایا، گرا اور اٹھا۔۔۔۔۔ اور پھر میرا دواؤ چل گیا۔ میں نے اسے ایک ایسی چوٹ لگائی جو کسی فائینگ مقابلے میں تو سراسر فاول ہوتی لیکن اس دودو لڑائی میں بالکل بر محل تھی۔ میں نے لینے لینے اس کی رانوں کے عین درمیان ٹھوکر ماری۔ وہ تڑپ کر پیچھے کی طرف گیا۔ مجھے اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اگلے تین چار منٹ تک ہم دونوں کے درمیان ایک خطرناک معرکہ ہوا۔ کھڑکیوں کے شیشے چٹکا چوڑ ہو گئے، فرنیچر ٹوٹ گیا اور قیمتی ڈیکوریشن پیرز کمروں کے فرش پر بکھرے دکھائی دیے۔

یہ ایسا پُر زور ہنگامہ تھا کہ ارد گرد موجود ہر شخص ہڑبڑا کر اٹھا اور موقع کی طرف لپکا۔ ان میں کئی مسلح پہرے دار بھی تھے۔ وہ رنجیت پانڈے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے مگر میں نے دھاڑتے ہوئے انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ میں پانڈے سے دودو لڑنا چاہتا تھا۔ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ میری وحشت نے پانڈے جیسے خطرناک مد مقابل کو بھی ٹھنکا دیا ہے۔ وہ جو مجھے ”پوپو“ کہہ کر اپنے اندر کے گھمنڈ کا اظہار کر رہا تھا، اب چونکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی گرے جینوں کی جیب میں سے چمک دار پھل کا چاقو نکال لیا۔ اس کے چاقو کے دو جان لیوا وار میں نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر روکے۔ اس کے بعد اس کرسی سے اسے اندھا دھند دھکیلتا ہوا برآمدے میں جا گرا۔ میں دھاڑ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے خالی ہاتھوں سے پانڈے کو پھاڑ کر رکھ دوں۔ لیکن فولاد کو ہاتھوں سے پھاڑنا بھی تو ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ایک سخت جان فائٹر تھا۔ میری ضربیں سہہ رہا تھا اور ان سے بچنے کی کامیاب کوشش بھی کر رہا تھا۔ اچانک پانڈے کا دواؤ چل گیا۔ اپنے سینے پر میری ٹانگ کھا کر وہ برآمدے کی ایک دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہاں دیوار پر بجلی کا ”ڈی پی“ لگا ہوا تھا۔ مین سوچ بھی موجود تھا۔ اس نے پھرتی سے مین سوچ آف کر دیا۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

”دیکھو۔۔۔۔۔ پکڑو۔“ ایک دم بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

کوئی تارچ لینے کے لیے بھاگا۔ ”تم کہاں ہو تاجپش؟“ چوہان کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں ٹھوٹا ہوا مین سوچ کی طرف گیا اور اسے آن کر دیا۔ ایک دم قرب و جوار روشن ہو گئے۔ بیرونی دروازے کے پاس ایک پہرے دار تڑپ رہا تھا۔ چاقو کے وار نے اس کے پیٹ کو اس طرح چاک کیا تھا کہ انتڑیاں باہر آ گئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس شخص نے بے جگری کا مظاہرہ کیا تھا اور تاریکی میں اندازے سے پانڈے پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی۔

دیوان میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ زبردست سرگرمی نظر آرہی تھی۔ پانڈے کی تلاش میں پہرے دار ہر طرف دوڑے پھر رہے تھے۔ دیوان کے بیرونی گیٹ کے پاس ہوائی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ رکھوالی کے کتوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

ابجے کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ماتحتوں سے مخاطب تھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی اندر ہی ہو۔ باہر نکلنے کے رستے ”سیل“ کر دو۔“ انور خاں بولا۔ ”بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ کچھ بھی کر جائے گا۔“

ابجے کی ہدایت پر دو بڑے گھڑ سوار دستے تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف گئے۔ انہیں آس پاس کی آبادی کا محاصرہ کرنا تھا۔ یہ احساس ہر چہرے کو وحشت زدہ کر رہا تھا کہ پانڈے جیسا خطرناک بندہ اس وقت دیوان کے آس پاس یا دیوان کے اندر موجود ہے۔

میرے منہ سے خون رس رہا تھا۔ ایک پاؤں پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے مجھے ٹٹول کر دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور الماری کے پیچھے گرا ہوا رنجیت پانڈے کا سرکاری پستول نکال لیا۔ اور پھر وہ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ پانڈے موقع سے غائب ہو گیا تھا مگر جاتے جاتے اپنی سفاکی کا انٹ ثبوت دے گیا تھا۔ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ چوہان اور میں ٹڑکھڑا کر رہ گئے۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے کو آڑ کر برآمدے میں گرتے دیکھا۔ بارود کی بو ناقابل برداشت تھی۔ ہر طرف سے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان میں نسوانی آوازیں بھی تھیں اور یقیناً شکنلا اور ملازمہ صفیہ کی آوازیں بھی ان میں شامل تھیں۔

”یہ کیا ہوا چوہان؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرے خیال میں بم بلاسٹ ہے۔“ چوہان کی آواز جیسے کہیں دور سے میرے سیٹیاں بجاتے کانوں میں پڑی۔

ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ یہاں دل دوز مناظر تھے۔ ابجے کے کم از کم پانچ ماتحت لاشوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ کسی کا بازو غائب تھا، کسی کی ٹانگ۔ کئی افراد شدید زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ آہ و بکا کر رہے تھے۔ لاشوں میں مجھے ابجے کا ماتحت حوالدار رب نواز بھی نظر آیا۔ اس کے سر کا ایک حصہ صاف اڑ چکا تھا۔

”اوہ خدایا۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا؟“ چوہان نے لرزاں آواز میں کہا۔

”یہ اسی حرا مزادے کا کارنامہ ہے۔ وہ جاتے جاتے یہاں کوئی ٹائم ڈیوائس رکھ گیا ہے۔“ ابجے پھٹکارا۔

”اگر یہاں ایک ڈیوائس ہے تو اور بھی ہو سکتی ہے۔“ چوہان نے کہا۔

چوہان کے اس فقرے نے سراسیمگی میں اضافہ کر دیا۔ اہل کار خوف زدہ نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگے۔ زخمیوں کو نکال کر سب اس جگہ سے دور ہٹ گئے۔ میرے جسم میں آگ روشن تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ حکم اور جارج کے سفاک اہل کار پانڈے نے ان تین عہدے داروں کی موت کا انتقام لیا ہے جنہیں چند روز قبل زرگاں میں قتل کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ تو کیا آگ خون اور بد لے کا کھیل شروع ہو چکا تھا؟

☆☆☆

اگلے تین چار گھنٹے میں سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس بات کا شبہ تو ہر ذہن میں موجود تھا کہ قل پانی میں اور دیوان کی عمارت کے اندر بھی زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ آج یہ بات پوری طرح ثابت ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے نہ صرف دیوان میں داخل ہوا تھا بلکہ ایک سنگین واردات کے بعد صاف نکلنے میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ پانڈے کے ساتھ ہی دیوان کے دو اہم ترین پہرے دار بھی غائب تھے۔ ان میں سے ایک ہندو اور دوسرا مسلمان تھا۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ پانڈے انہی دو افراد کی مدد سے دیوان میں داخل ہوا اور بعد ازاں صاف بچنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

میرے رہائشی پورشن کے اسٹور میں سے ایک دروازہ

قد عورت کا سیاہ برقع بھی ملا۔ معلوم ہوا کہ دیوان میں داخل ہوتے وقت پانڈے اسی برقعے میں تھا۔ اس کے علاوہ اسٹور میں ہی پلاسٹک کی ایک دستی ٹوکری بھی ملی جس میں چند کیلے اور سیب وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پانڈے، دھماکا خیز مواد اس ٹوکری میں رکھ کر اندر لایا تھا۔ صورت حال واضح ہونے کے بعد دیوان میں فوری طور پر کئی گرفتاریاں ہوئیں اور بہت سے لوگوں کو شامل تفتیش کیا گیا۔ عام لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔ اکثر کا تاثر یہی تھا کہ جارج گورا اور حکم نے ان تین ہلاکتوں کا جواب دیا ہے جو زرگاں میں ہوئی ہیں۔ انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی سکیورٹی انتظامات کو ناکام بنا کر دیوان میں گھس سکتے ہیں اور لوگوں کو مار سکتے ہیں۔

میری اور پانڈے کی لڑائی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں نے ٹانگ چلا کر اس کے ہاتھ سے کولٹ پستل چھڑایا تھا۔ یہ بڑا زوردار وار تھا اور اس وار کا بہت سا صدمہ میرے پاؤں کو پھیلنا پڑا تھا۔ پستل اور پاؤں کے تصادم سے پاؤں کا بالائی حصہ سوچ گیا تھا اور نیچا پڑ گیا تھا۔

اگلے روز صبح تک پورا پاؤں سوچ گیا اور چلنا مشکل ہو گیا۔ صبح سویرے چوہان اور انور خاں میرے پاس آئے۔ انور خاں نے جو شیلے انداز میں کہا۔ ”بر اور! تم تو راتوں رات مشہور ہو گئے ہو۔ ہر زبان پر تمہارا نام ہے۔ پانڈے اس اسٹیٹ میں دہشت کی علامت ہے۔ تم نے نہ صرف اس سے دودو مقابلہ کیا ہے بلکہ اسے بھگانے میں بھی کامیاب رہے ہو۔“

”لیکن وہ جاتے جاتے ایک زبردست چوٹ تو ہمیں دے گیا۔“ چھ بے گناہ لوگوں کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

انور بولا۔ ”اس کا صدمہ تو ہر ایک کو ہے لیکن اس بات کی خوشی بھی ہے کہ پانڈے جیسا شخص جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، یہاں سے چوٹیں کھا کر گیا ہے اور یہ چوٹیں ایسے بندے نے لگائی ہیں جو چند مہینے پہلے تک کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھا۔ پانڈے کو لگنے والی ان چوٹوں کا اثر آئندہ حالات پر پڑے گا۔ چھوٹے سرکار بھی تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کل رات مجھے بلایا تھا اور تمہارے سارے کوائف معلوم کیے تھے۔۔۔۔۔“

ہوئے کہا۔ ”وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حکم اور جارج کے لوگوں نے سلطانہ کو ایک ریست ہاؤس میں گھیر لیا ہے۔ طلال بھی سلطانہ کے ساتھ ہے۔ وہ کسی بھی وقت پکڑے جاسکتے ہیں۔“

پریشان کن خبر تھی۔ میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ چوہان کو جو کچھ پتا تھا، اس نے بتا دیا۔ وہ بولا۔ ”موہن کمار کے قتل کے بعد جب سلطانہ اور طلال نے بھاگنا چاہا تو پہرے داروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ طلال نے فائرنگ کی۔ اس میں دو بندے زخمی ہوئے۔ ایک کو معمولی اور دوسرے کو شدید زخم آیا۔ پھر طلال کے پستول میں گولی پھنس گئی۔ سلطانہ اور طلال نے اپنی چھوٹی تلواریں نکال لیں اور خود کو گھیرنے والوں کو بے دریغ زخم لگائے۔ اس افرا تفری میں وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے پاس گھوڑے تھے۔ موہن کمار کے پہرے داروں اور عام لوگوں نے گھوڑوں پر ان کا پیچھا کیا۔ ایک رات پہلے بارش ہوئی تھی اس لیے جنگل میں سلطانہ اور طلال کا کھراڑا ہونا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ قریب آٹھ گھنٹے کے تعاقب کے بعد ان دونوں کو انگریزوں کے زمانے کے ایک ریست ہاؤس میں گھیر لیا گیا ہے۔“

چوہان کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ سلطانہ اور طلال سخت مصیبت میں ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں طویل تبادلہ خیال ہوا۔ اسی دوران میں اسحاق، انور خاں اور اے بی بھی آگئے۔ یہ کرا ایک کانفرنس روم کی شکل اختیار کر گیا۔

اے بی نے بتایا۔ ”چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب پل پل کی صورت حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سلطانہ اور طلال کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ایک بڑا قدم ہووے گا۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے وہ اپنے مشیروں اور ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل چھوٹے سرکار ایک بڑی میننگ بلائیں جس میں طریقہ طے کیا جاوے۔“

”لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ سلطانہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا وہ کل یا پرسوں تک حکم کے درجنوں لوگوں کو خود سے دور رکھ سکے گی؟“

”ہاں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔“ اے بی نے کہا۔ ”لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہ ایک بڑا قدم ہووے گا۔“

جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا اندیشہ ہمارے ذہنوں میں بہت پہلے سے موجود تھا۔ سلطانہ جس انداز میں یہاں سے غائب ہوئی تھی، اس سے کوئی اور مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور اب نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔ موہن کمار کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ شخص حکم کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ یہی شخص تھا جو مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں کی محنت میں لے گیا تھا۔

اسحاق نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آج ہمارے ساتھی فیروز کی روح کو سکون ملا ہووے گا۔ وہ زندہ ہوتا تو آج اپنے دوست ہارون کے قاتل کا انجام جان کر ضرور جشن مناتا۔“

یہ مکافات عمل کی ایک جھلک تھی۔ چند ماہ پہلے چوڑے جڑوں والے کرخت چہرہ موہن کمار نے اپنے ایک وفادار ماتحت کو قتل کر کے ڈراما چاہا تھا۔ مقتول ہارون کی موت کا الزام سلطانہ پر دھر کر وہ اسے زرگاں واپس لے گیا تھا اور سمجھا تھا کہ اس کارنامے کے بدلے حکم جی اس پر ترقی اور منزلت کے نئے دروازے کھول دے گا لیکن اس سے پہلے ہی اس پر موت کا دروازہ کھل گیا تھا اور وہ اپنے ادھورے ایجنڈے سمیت اس میں داخل ہو گیا تھا۔

..... اسی دوران میں ایک باوردی سپاہی اندر آ گیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد انور خاں کو بتایا کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ اسے یاد کر رہے ہیں۔ انور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی خاص قسم کی گفتگو ہونے والی ہے۔“

یہ واقعی خاص گفتگو تھی۔ اس کے موضوع کا پتا مجھے شام کے بعد چلا۔ شکنتلا کو بلا بخار تھا۔ میں اس کی مزاج پر سی کے لیے اس کے رہائشی پورشن میں آیا ہوا تھا۔ وہ ایک سفید ساڑی میں غم اور الم کی تصویر بنی لیتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے آنسو تو خشک ہو گئے تھے، وہ کسی وقت ہنس بول بھی لیتی تھی لیکن اس کے اندر جو پچوٹ آئی تھی، وہ دھک بن کر اس کی آنکھوں سے پھٹکتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر ہلکا ہوا جاتی تھی کہ جبکی اس کی وجہ سے برباد ہوا۔ چند دن کی خوشیوں کے عوض وہ جاں کسل مصائب کا شکار ہوا اور پھر جواں عمری میں ہی خاک کے نیچے جا سو یا۔

میں شکنتلا کا دل بہلانے کے لیے اس سے باتیں کر رہا تھا جب چوہان اندر داخل ہوا۔ اس نے نئی اطلاع دیتے

ہوں۔ دوبارہ اس قسم کی حماقت کرو گے تو پاؤں کی ہڈی میں کوئی فریکچر بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ اور ممکن ہے کہ پہلے سے کوئی ہیڈ لائن فریکچر موجود ہو جو مزید خراب ہو جائے۔“

اس دفعہ اس نے بٹی باندھتے ہوئے بہت ساری کاٹن بھی پاؤں پر رکھی تھی۔ پتی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ بلاست میں مرنے والے ایک اور شخص کی آخری رسوم آج ادا کی گئی ہیں۔ لوگوں میں بہت طیش پایا جا رہا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں میں۔۔۔۔۔ کیونکہ مرنے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ اس نے کہا کہ نئی آبادی میں لوگوں نے آج ایک ٹھا کر کی حویلی کو آگ لگا دی ہے۔ ٹھا کر اور اس کے گھر والے غائب ہیں۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ دیوان میں گھسنے سے پہلے رنجیت پانڈے نے اس ٹھا کر کی حویلی میں چند گھنٹے گزارے تھے۔

چوہان پتی کو آخری گرہ دے رہا تھا جب انور خاں اور اسحاق تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی خاص خبر لائے ہیں۔

انور خاں نے آتے ہی کہا۔ ”حکم کا دست راست موہن کمار قتل ہو گیا۔ رات کو کسی نے اسے سوتے میں ذبح کر دیا۔“

”کب۔۔۔۔۔ کیسے؟“ چوہان نے پوچھا۔

”پرسوں رات۔۔۔۔۔ لیکن یہاں آج خبر پہنچی ہے۔“

قتل کرنے والے نے اس کا سردھڑ سے علیحدہ کر دیا اور اس کے پاؤں کی طرف رکھ دیا۔ زرگاں میں سخت خوف پایا جاتا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ بھی سلطانہ اور اس کے پیچھے کا کام ہے۔ اس بار واردات کی جگہ پر لوگوں نے انہیں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ اس کوشش میں تین چار بندے سخت زخمی بھی ہوئے ہیں۔ ایک کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ اسے گولی کا زخم آیا ہے۔“

”اوہ خدا! اب کیا ہو گا؟“ چوہان نے کہا۔ ”حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔ کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ دوسری طرف سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان بھی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کہا جا رہا ہے کہ وہ اس خونی واردات کے بعد قریبی جنگل میں گھسی ہے۔ حکم کے سیکڑوں سپاہی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔“

مجھ پر عجیب سی بیزاری طاری تھی۔ میں انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو رہا تھا لیکن مجھے ان میں کسی طرح کی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ دونوں جلد یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ مجھے اکیلا رہنا اچھا لگتا تھا۔ شاید میں آدم بیزار ہوتا جا رہا تھا۔

چوہان میرے پاؤں کی چوٹ کے بارے میں فکر مند تھا۔ اس نے کوئی وینو جین قسم کی دوامیر سے پاؤں پر لٹکانی اور بڑی احتیاط سے پتی باندھ دی۔ اس نے مجھے گرم پانی کی ٹکڑ کا مشورہ دیا اور یہ ہدایت بھی کی کہ میں پاؤں لٹکا کر نہ بیٹھوں۔ اس نے مجھے کھانے کے لیے چند گولیاں دیں اور بتایا کہ یہ پین کر لیں۔

چوہان کے جاننے کے بعد میں نے پین ٹکڑ گولیوں کو ہتھیلی پر رکھا۔۔۔۔۔ یہ گولیاں درد کو افاقہ دیتی تھیں لیکن ”بتانے والا“ مجھے بتا گیا تھا کہ درد سے افاقہ گولیاں کھانے سے نہیں ملتا، درد کا سامنا کرنے سے ملتا ہے۔ میں نے وہی کیا جو کرنا تھا۔ میں نے گولیاں پھینک دیں اور تھوڑی دیر بعد وہ پتی بھی اتار پھینکی جو چوہان باندھ گیا تھا۔ میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں میرا سینڈ بیگ جھول رہا تھا۔ مضروب پاؤں جیسے متوں بھاری ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے درد کا علاج درد سے ہی کرنا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ دانتوں پر دانت بجائے۔ پھر مضروب پاؤں سے ایک ضرب سینڈ بیگ پر لگائی۔ بے ساختہ ایک دردناک کراہ ہونٹوں سے نکل گئی۔ پورا جسم اذیت سے جھنجھٹا اٹھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ میں دیوانہ وار، زخمی پاؤں سے سینڈ بیگ پر ضربیں لگاتا چلا گیا۔

..... رات کو چوہان میرے پاؤں پر پھر پتی باندھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ ”اپنے دیوانے پن میں تم خود کو تباہ کر لو گے۔“

”تباہ تو ہونا ہی ہے۔ کیا تم مجھے اپنی مرضی سے تباہ بھی نہیں ہونے دو گے؟“ میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ پتا نہیں کیا ہو تا جا رہا ہے تمہیں۔“

”کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ پہلے بھی مرنے کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا تھا، اب بھی ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”بہر حال، ایک بات میں تمہیں پھر بتا دینا چاہتا

Scanned and Uploaded By Nadeem

اس کے بعد یقیناً نل پانی اور زر گاں میں لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ یہ چھوٹے سرکار کی مجبوری ہے کہ وہ ایسی کسی کارروائی سے پہلے ذمے دار لوگوں کو اعتماد میں لیں۔“

انور خاں نے ابجے سے پوچھا۔ ”برادر! تمہارے خیال میں چھوٹے سرکار کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔۔۔ وہ کیا کارروائی کر سکتے ہیں؟“

”ان کے ذہن میں دو تین تجویزیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بڑے دستے کے ساتھ ان لوگوں پر حملہ کیا جاوے جنہوں نے ریٹ ہاؤس کو گھیر رکھا ہے۔ انہیں تشریتر کر دیا جاوے اور یوں سلطانہ اور طلال کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل جاوے۔ سلطانہ اور طلال کے پاس وہی سات ایم ایم کی طاقتور رائفل ہے جو طلال نے مدن لال کے اسلحہ اسٹور سے لوٹی تھی۔ یہ رائفل ان کے بہت کام آسکتی ہے۔۔۔۔۔“

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میرا دل اور دماغ گواہی دے رہے تھے کہ سلطانہ کو فوری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر قاعدے ضابطے کی کارروائیوں میں وقت ضائع کر دیا جاتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میٹنگ برخاست ہوئی تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ رات کے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ ٹھنڈ پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ پلندی پر سے نل پانی کی روشنیاں دور تک دکھائی دیتی تھیں۔ جھیل میں ان روشنیوں کا جھلماٹا ہوا عکس یوں دکھائی دیتا تھا جیسے چمکیلے پیرا بن والی جل پر پیاں رقص کر رہی ہوں۔ جھیل کی تاریک سطح پر کہیں کہیں روشنی کے ہنڈولے سے متحرک تھے۔ یہ کشتیاں اور بجزیے وغیرہ تھے۔ سرشام تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اب بھی یہ کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

میں دیوان سے نکل آیا۔ اپنے اندر کی بے قراری کو کم کرنے کے لیے میں حسب معمول جھیل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ شروع میں ہوا سرد لگی لیکن پھر جسم گرم ہوتا چلا گیا اور پسینا آنے لگا۔ سانس تیزی سے چلنے لگی۔ یہ مشقت مجھے لطف دینے لگی۔ دیوان سے نکلنے ہی کچھ لوگ میرے پیچھے ہو لیے تھے۔ یہ چھ عدد گھڑ سواروں کا وہی نگران دستہ تھا جو دیوان خانے سے باہر میرے پیچھے رہتا تھا۔ پہلے اس دستے کا سالار حوالدار رب نواز ہوتا تھا۔ اب وہ تو دیوان میں ہونے والے بم دھماکے کا شکار ہو چکا تھا، لہجے قد کے ایک اور حوالدار نے

اس کی جگہ لے لی تھی۔

یہ نگرانی مجھے ہمیشہ جھنڈا ہٹ میں مبتلا کرتی تھی اور آج یہ جھنڈا ہٹ ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ میرے دماغ میں کچھ اور طرح کی پہچل تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نل پانی سے نکلنا چاہتا ہوں اور کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچنا چاہتا ہوں تو اس کے لیے مجھے سب سے پہلے ایک صحت مند و توانا گھوڑے کی ضرورت ہے۔ دیوان کے اندر بے شمار گھوڑے تھے۔ اسطبل ہر قسم کے جانوروں سے بھرا ہوا تھا مگر میں دیوان کے اندر سے گھوڑا لے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرتا چاہتا تو فوراً چھوٹے سرکار یا مراد شاہ صاحب کو خبر کر دی جاتی۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں دیوان سے باہر آنے کے بعد کسی گھڑ سوار کا گھوڑا چھینوں۔۔۔۔۔ یا پھر کسی گھوڑا فروش یا سائیس سے گھوڑا خریدوں۔ یہاں اسٹیٹ میں انڈین کر لسی ہی چلتی تھی۔ میرے پاس مقبول رقم موجود تھی۔ یہ چھوٹے سرکار نے بذریعہ ابجے مجھے جیب خرچ کے طور پر بھجوائی تھی۔ یہ رقم میرے لیے کوئی بھی اچھا جانور فوری طور پر خریدنے کے کام آسکتی تھی۔

مجھے اسحاق سے معلوم ہوا تھا کہ پرانے اور نئے شہر کے سنگم پر ”فیروزہ دروازے“ کے سامنے ایک بڑا مویشی خانہ ہے جو دن رات کھلا رہتا ہے۔ وہاں سے کوئی شخص کسی بھی وقت رقم دے کر جانور حاصل کر سکتا ہے۔

میں فیروزہ دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن نگران دستہ کرنا کاتبین کی طرح میرے ساتھ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے قریباً 100 میٹر کا فاصلہ رکھتے تھے۔ تاہم ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی وقت مجھے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ آج میں ان کی یہ کوشش ناکام بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے فیروزہ دروازے کی طرف جانا تھا اور کسی بھی نگران کے بغیر جانا تھا۔

جھیل کے ایک نواحی راستے پر بھاگتا بھاگتا میں دفعتاً گمنجان آبادی کی طرف مڑ گیا۔ بازار ابھی کھلے تھے۔ بیشتر دکانیں گیس کمپیس اور جزیئر کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔۔۔۔۔ آج ہندو برادری کا کوئی تہوار بھی تھا۔ اکثر جگہوں پر دیے روشن تھے اور پرشاد وغیرہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں بھجن گانے والوں کی نولیاں بھی نظر آتی تھیں۔ مختلف پکوانوں کی خوشبو اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑ سوار دستے نے مجھ سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کر دیا تھا۔ جب میں زیادہ بارونق

علاقے میں داخل ہوا تو حوالدار اور اس کے دو ساتھی گھوڑوں سے اتر آئے اور پیدل ہی میرے پیچھے چل دیے۔ مجھے ان کے اس طرح پیچھے آنے سے جھنڈا ہٹ ہونے لگی۔ ایک بار تو جی چاہا کہ واپس پلوں اور ان کے منہ توڑ دوں۔ انہیں اس قابل ہی نہ چھوڑوں کہ وہ اپنی منحوس نظریں مجھ پر جمائے رکھیں۔ مگر یہ اضطراری سوچ تھی۔ وہ حکم کے بندے تھے اور انہیں وہی کرنا تھا جو انہیں کہا گیا تھا۔

سیدھا چلتے چلتے میں تیزی سے ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوا اور اپنے نگرانوں کو چمکے دینے میں کامیاب رہا۔ یہ کپڑے کی دکانوں کا ایک تنگ سا بازار تھا۔ کچھ دکانیں بند ہو رہی تھیں، کچھ ہنوز جگمگا رہی تھیں۔ خوش لباس مرد و زن خریداری میں مصروف تھے۔ میں اس تنگ بازار سے گزر کر دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں مٹھائی اور کھلونوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک طرف گھوڑا گاڑیاں کھڑی کرنے کا بہت بڑا احاطہ تھا۔ سودو سو قدم چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اپنی ”نگرانی“ سے واقعی پیچھا چھڑا لیا ہے۔

میں نے ایک ادھیڑ عمر عطر فروش سے مقامی لب و لہجے میں پوچھا۔ ”جناب! آپ مجھے فیروزہ دروازے جانے کا راستہ بتا سکتے ہیں؟“

عطر فروش نے جو اپنے لباس سے مسلمان نظر آتا تھا، اگال دان میں پان کی پیک تھو کی اور رومال سے ہونٹ صاف کر کے بولا۔ ”ابھی سیدھا چلتے جائیے۔ پہلے پورا سہ سے دائیں طرف مڑ جائیے۔ آگے دو مینار والی مسجد آوے گی۔ وہاں کسی سے پوچھ لیتا، وہ بتا دیوے گا۔“

میں شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ بازار بارونق تھا۔ کہیں پاس سے کبابوں کی زبردست خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ انڈیا کے کئی علاقوں کی طرح اس راجواڑے کے لوگ بھی چٹ پٹے پکوانوں اور تہواروں میلوں کے شوقین ہیں۔ میں تھوڑی ہی دور کیا تھا کہ اچانک ٹھنک گیا۔ میں نے اپنے سامنے صرف تین بچپیس قدم کے فاصلے پر اپنے نگران حوالدار کو دیکھا۔ اپنے دراز قد کی وجہ سے وہ مجھے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ یقیناً مجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نظر سے بچنے کے لیے میں تیزی سے ایک مندر کے ادھ کھلے دروازے میں گھس گیا۔

یہ ایک بڑا مندر تھا۔ تہوار کی وجہ سے اندر کافی لوگ نظر آرہے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے وغیرہ بھی تھے۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں، خوشبو عین سلگ رہی تھیں اور پرشاد تقسیم ہو رہا تھا۔ میں جھوم میں چلا گیا۔ ”یہ تم کیا کرت ہو بھائی؟“ ایک خشک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ مندر کا ایک چاکر خشکی نظروں سے میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے دھیانی میں، میں جو توں سمیت اندر آ گیا تھا۔ ”اوہو۔۔۔۔۔ شام چاہتا ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا اور احاطے کے کنارے پر جوتے اتار دیے۔

چاکر بدستور ابھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ سر پر رومال رکھا اور پرارتھنا کرنے والے انداز میں دُر گادپوی کی مورتی کے سامنے جا بیٹھا۔ جونہی میں نے پرارتھنا کا انداز اختیار کیا، میری دائیں جانب بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص بڑی طرح چونک گیا۔ وہ اپنے حلیے سے سکے بند کٹر ہندو نظر آتا تھا۔

ماتھے پر قشقہ تھا اور سر پر بالوں کی ایک بڑھی ہوئی لٹ بھی تھی جسے بودی کہا جاتا ہے۔ وہ سفید دھوئی کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے چونکے اور دیکھنے کے انداز نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شاید وہ مجھے پیچھا کرتا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ چالیس پینتالیس سال کی ایک عورت، ایک بڑھیا اور ایک جوان سال عورت بھی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ بھی مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے پرارتھنا کا صحیح طور طریقہ تو معلوم نہیں تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک دو بار ماتھانکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اٹھتے ہی ادھیڑ عمر شخص اور اس کے گھروالے بھی اٹھ گئے۔ بس بڑھیا اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ادھیڑ عمر شخص میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں اندیشے کلبلائے لگے۔ اگر وہ مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے پہچانتا تھا تو اس بھرے پُرسے مندر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بیٹھی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ”تمہارا شہ نام پتا؟“

”گو۔۔۔۔۔ گوپال۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ بدستور میرے کندھے پر دھرا رہا۔ وہ بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ہماری ماتا جی ہیں اور یہ ہماری دھرم پتی ہیں شانتی اور

یہ ہو ہے مالا۔

دونوں عورتوں نے بڑی عقیدت سے مجھے پرنام کیا۔ میں نے بھی جواب دیا۔
ادھیڑ عمر شخص بولا۔ ”میرا نام رام پرشاد ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ”کیا ہم کہیں دو گھڑی بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“

”در۔۔۔ دراصل میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“
اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ میرا کندھا دبایا اور بولا۔ ”اگر بھگوان نے ہمیں یہاں، اس پوجا کے کمرے میں ملایا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے۔۔۔ بہت خاص وجہ ہے۔“

رام پرشاد کی پتی بولی۔ ”ہاں بیٹا! یہ بڑی شبہ گھڑی ہے کہ تم ہمیں یہاں ملے ہو۔ بھگوان نے چاہا تو اس میل کے کارن بہت بھلائی کا کام ہووے گا۔“
میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ فرش پر بیٹھی بوڑھی عورت بھی اپنی بیک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مجھے مسلسل دیکھنے چلی جا رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس کے پاس جھکا تو اس نے میرا سر چومنا اور کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ تشکر کے انداز میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

”تمہارے ساتھ کوئی اور تو نہیں ہے؟“ رام پرشاد نے پوچھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولا۔ ”چلو پھر آؤ ہمارے ساتھ۔ گھر جا کر سکون سے بات کرتے ہیں۔“

وہ مجھے لے کر مندر کے بغلی دروازے کی طرف آ گیا۔ اس کے گھر والے بھی ساتھ تھے۔ اسی بچاسی سال کی بڑھیا کو رام پرشاد کی بہو سہارا دے کر لارہی تھی۔ بغلی دروازے کے سامنے ہی ایک بڑی شاندار گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ سفید وردی والا کوچیان گاڑی کے پاس ہی موجود تھا۔ رام پرشاد اور اس کی بیٹی کو دیکھ کر وہ ایک دم مودب ہو گیا۔

میں نے سوچا، یہاں آس پاس حوالدار اور اس کے ساتھی موجود ہیں۔ مجھے کم از کم یہاں سے تو نکلنا چاہیے۔ میں رام پرشاد اور اس کی بیٹی کے ساتھ اس شاندار گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کھڑکیوں پر مٹکی پر دے تھے اور نشستیں کسی مرسیڈز کی طرح آرام دہ تھیں۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ رام پرشاد

نے کہا۔ ”واپسی پر تم جہاں کہو گے، یہ گاڑی بان تم کو چھوڑ آوے گا۔“

گاڑی کے اندر بھی ایک سنہری طاق میں نکشی دیوی، ڈرگادیوی اور رام کرشن وغیرہ کی مورتیاں موجود تھیں۔ رام پرشاد کی پتی نے پرارتھنا کے انداز میں کئی بار مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بیٹا! ہم کو پوری آشا تھی کہ تم آؤ گے۔ جو کام صرف تم کر سکتے ہو، وہ کوئی اور بھلا کیسے کرتا۔ بھگوان کے ہر کام میں کوئی عجز ہوتا ہے۔“

اب مجھے اس معاملے میں کچھ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو پرانی کہانیوں کے اس کردار کی طرح محسوس کیا جو اتفاقاً صبح سویرے سب سے پہلے کسی شہر کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے اور شہر کے لوگ اسے پکڑ کر کوئی خاص ذمے داری سونپ دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے یہی طے کر رکھا ہوتا ہے۔

گاڑی دھیمی رفتار سے شہر کے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ مجھے ایک جگہ ایک گھڑ سوار فوجی نظر آیا۔ میں نے پہچان لیا، یہ حوالدار کے ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے بالکل سامنے سے گزرنے والی شاندار گاڑی کے اندر اس کا ”مطلوب“ موجود ہے۔ جلد ہی گاڑی کھلے راستوں پر آگئی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

”زیادہ دور نہیں۔ ہمارا گھر پاس ہی ہے۔“
”لیکن۔۔۔ میں آپ کے کیا کام آسکتا ہوں؟“ میں نے مقامی لہجہ میں پوچھا۔

رام پرشاد کے بجائے اس کی پتی شانتی بولی۔ ”تم ہرانا میں بھگوان کا کام کرو گے۔ اس کام کے لیے بھگوان نے ہی تمہیں چنا ہے۔“

اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور سیاہ آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے لہجے میں مذہبی جوش و خروش تھا۔ اور بات صرف شانتی ہی کی نہیں تھی، لگتا تھا کہ یہ پوری فیملی ہی کٹر قسم کے خیالات رکھتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد گھوڑا گاڑی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ایک حویلی کے اندر چلی گئی۔ کوچیان نے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نیچے اتر آیا۔ رام پرشاد کی والدہ کو سہارا

دے کر نیچے اتارا گیا۔ وہ اپنی بہو اور پوتے کی بیوی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ میں اور رام پرشاد حویلی کی نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اندر کا ماحول وہی تھا جو ہندی فلموں میں ہوتا ہے اور خالص ہندوؤں کے رہن سہن کی عکاسی کرتا ہے۔ طاقتوں میں جا بجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجی ہوئی تھیں اور دیے روشن تھے۔ دیواروں پر آویزاں پینٹنگز میں بھی یہی رنگ ڈھنگ تھا۔ ہندومت میں لاتعداد دیوی دیوتا ہیں۔ کسی وقت تو ایسا لگتا ہے کہ ہر جاندار بے جان چیز کو دیوی دیوتا کا روپ دے دیا گیا ہے۔

ہم نشست گاہ میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک پنڈت جی آ موجود ہوئے۔ ان کی عمر ساٹھ ستر کے قریب تھی۔ ایک چرمی بیگ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بھی مجھے توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ میرا شانہ تھپکا۔ میرا نام، تاریخ پیدائش اور وقت وغیرہ پوچھا۔ یہ سب کچھ ایک کاغذ پر لکھا اور باہر چلے گئے۔

میری آنکھیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں جلد از جلد اس صورت حال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر رام پرشاد صورت حال پر کوئی بات کرنے کے بجائے میری خاطر تواضع میں لگ گیا۔ پہلے پھلوں اور مرہ جات سے تواضع کی گئی پھر بھوجن پر اصرار کیا جانے لگا۔ میں بہ مشکل انہیں روک پایا۔ میں نے کہا۔ ”انکل۔۔۔! سب سے پہلے میری آنکھیں دور کیجیے۔ آپ مجھے اس طرح یہاں کیوں لائے ہیں؟“

رام پرشاد نے کہا۔ ”میں تمہیں سب کچھ بتاؤں ہوں لیکن اس سے پہلے ایک دو میرے سوال بھی ہیں۔“

”جی پوچھیے۔“
اس نے میرے کواکف دریافت کیے۔ یعنی میں کہاں رہتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ بیاتا ہوں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں ان سوالوں کے جواب ذہن میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ میں نے اپنی رہائش جاکا عبدالغنی والے محلے میں بتائی۔ میں نے اسے بتایا کہ فیروزہ دروازے کے پاس میری کپڑے کی دکان ہے۔ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ رہتا ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔

وہ میرے جوابات سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”گوپال پتر! اس سنار میں دھرم سے بڑی کوئی

شے نہیں اور دھرم کا پالن ہم سب کا فرض ہے۔ جب دھرم درودھی لو کن کوئی غلط کام کرتے ہیں تو پھر یہ دھرم پریمیوں کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ ان کا سامنا کریں اور دھرم کی رکھشا کریں۔ میں لمبی چوڑی تمہید باندھنا نہیں چاہتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ہمارے راجاڑے میں کچھ لوگن دھرم کو نشٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل بھگوان سے بدھ چھیڑنے جیسا ہے۔ یہ لوگن ایک ایسے اپرادھی کو جیون دے رہے ہیں جس کی کم از کم سزا موت ہے۔ ہم تو دھرم کے ادنیٰ چا کر ہیں۔ ہماری سمجھ بوجھ معمولی ہے لیکن بڑے پنڈت مہاراج توجہ دیکھتے ہیں، ٹھیک ہی دیکھتے ہیں نا۔۔۔ انہوں نے جو کنڈلیاں نکالی ہیں، اس کے مطابق اگر اس اپرادھی کو شفا کر کے اسے جیون دیا گیا تو یہ پوری ہندو جاتی پر ایک بڑا ظلم ہووے گا۔ اور اس کی سزا ہر اس منس کو بھگتا ہووے گی جو اس ظلم کو روکنے کی شکتی رکھتا تھا۔“

”آپ کس اپرادھ کی بات کر رہے ہیں، انکل پرشاد؟“ میں نے اپنایت سے پوچھا۔

”ایک ناری نے ایک برہمن کی ہتھیلی کی ہے۔ اس کو بے دردی سے مارا ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ پرارتھنا میں مصروف تھا۔ یہ برہمن اس راجاڑے کے سب سے پوتر پرپوار کا فرد تھا۔ اوتاروں کی لڑی میں سے تھا۔ چاہے تو یہ تھا کہ اس پلید ناری کو وہیں کلڑے کر دیا جاتا اور اس کا ماس کتوں کو کھلا دیا جاتا لیکن اب کچھ لوگن اسے جیون دینے کا سوچ رہے ہیں۔ اسے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس دھرتی پر چلے، اس ہوا میں سانس لے اور کھائے پیئے۔“

میرے ذہن میں کھد بد شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”انکل! آپ کس ناری کی بات کر رہے ہیں؟“

”سے ایک بیچ ذات کی ہتھیارن۔“ وہ مبہم انداز میں بولا۔

”وہ مسلمان تو نہیں؟“

”ہاں۔۔۔ مسلمان ہی ہے۔“ رام پرشاد کے چہرے پر بہت سی نفرت یلغار کر آئی۔

ایک دم میرے ذہن میں دروازہ سا کھل گیا۔ لہو کی گردش رگوں میں تیز ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ”انکل پرشاد! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کی بات کر رہے ہیں۔“

رام پر شاد کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”ہاں گویا! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔۔۔۔۔ یہ وہی ہے جس نے کچھ دن پہلے موہن کمار جی کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کیا تھا۔ اس کتیا نے ان کا سر کاٹ کر شریر سے علیحدہ کر دیا اور ان کے چہرے میں رکھ دیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ یہ سب کس کے ساتھ کر رہی ہے۔ تم جانت ہو کہ موہن کمار کون تھے؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ناہیں، مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔“

رام پر شاد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”موہن کمار اوتاروں کی لڑی میں سے ہیں۔ یہ زر گاں کے بڑے پنڈت مہاراج کے داماد بھی تھے۔ کہا جات ہے کہ دو ہزار سالوں سے اس لڑی (سل) کے لوگن کا سر بھگوان کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکا لیکن اس پلید عورت نے یہ سر موہن کمار کے شریر سے کاٹ کر علیحدہ کر لیا اور پھر انہی کے چہرے میں رکھ دیا۔ ایک طرح سے اس خبیث ناری نے یہ بتایا کہ جو سر جھکتا نہیں تھا، وہ اپنے ہی چہرے میں گرا پڑا ہے۔“ بولتے ہوئے رام پر شاد کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

میں اس عجیب اتفاق پر حیران ہو رہا تھا۔ میں جو آج دیوان کی عمارت سے اس لیے نکلا تھا کہ کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچ سکوں، ایک ایسے کٹر ہندو سے آن ملا تھا جس کا دماغ بانڈی کی طرح ابل رہا تھا اور جو پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھ سے مسلسل سلطانہ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”انکل! میں نے تو سنا ہے کہ موہن کمار جی کی ہتھیا کے بعد سلطانہ کو جنگل میں گھیر لیا گیا ہے اور اب وہ اور اس کا بھتیجا جی نہیں سکیں گے۔“

رام پر شاد کے چہرے پر پھر عجیب سا رنگ لہرا گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی اشلوک پڑھنے کے بعد بولا۔ ”پر تو! یہی تو بھید ہے اس میں۔ وہ حرامزادی مرے گی ناہیں۔ بالکل ناہیں مرے گی۔ اسے زندہ پکڑا جاوے گا۔“

”آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“

”اس لیے کہ ہم کو اندر خانے کی جانکاری ہے۔ ہم سب جانت ہیں۔ کچھ لوگن ہیں جو سلطانہ کو زندہ

حالت میں زر گاں لے جانا چاہت ہیں۔ ان لوگن کا دھرم سے کوئی واسطہ ناہیں اور نہ ہی ان کو بھگوان کا کوئی خوف ہے۔ ان کو جانکاری ناہیں کہ ان کی یہ من مرضی راجوڑے کے باشندوں پر کتنی بھاری پڑے گی۔ کنڈلیاں سب کچھ بتا رہی ہیں مگر یہ گوری چڑی والے کنڈلیوں وغیرہ کو مانتے ہی کب ہیں۔۔۔۔۔“

ایک دم میرا دھیان جارج گورا اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے رام پر شاد کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انکل! کہیں آپ جارج گورا صاحب کی بات تو ناہیں کر رہے؟“

”اس کا نام اتنی عزت سے مت لو۔ وہ اس قابل ناہیں ہے۔ وہ اپنے مطلب کا بندہ ہے۔ وہ بدلے کی آگ میں جل رہا ہے اور اسے بس اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی فکر ہے۔ اگر وہ حکم جی کا سچا دوست ہوتا تو کبھی ایسا سوچتا بھی ناہیں۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہت ہیں کہ جارج گورا، سلطانہ اور اس کے پرچار سے بدلہ لینے کے لیے اسے زندہ اپنے پاس منگوانا چاہت ہے؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سلطانہ کو اپنی رکھیل بنا کر رکھے۔۔۔۔۔ وہ کوئی ایسا چکر چلائے گا کہ عام لوگن بھی سمجھیں گے کہ وہ مر گئی یا جیل سے بھاگ نکلی مگر وہ رہے گی جارج گورے کے پاس ہی۔۔۔۔۔ جارج گورا کی طرح کے بندے کسی کو آسانی سے شکار نہیں کرتے ہیں۔“

”کنڈلیاں کیا کہتی ہیں؟“ میں نے رام پر شاد سے پوچھا۔

”اس ناری کا مرنا بہت ضروری ہے، ورنہ کوئی بہت سخت آفت آوے گی۔ کوئی ایسی بیماری جس میں راجوڑے کے بہت زیادہ لوگن مر جاویں یا پھر کوئی باڑ۔۔۔۔۔ یا آپس کی لڑائی جس میں بے شمار بے گناہوں کی ہتھیا ہو جاوے۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہووے گا ضرور۔ یہی پنڈت مہاراج کا وچار ہے اور ان کا وچار کبھی غلط ناہیں ہوتا۔“

”پنڈت مہاراج کیا چاہت ہیں؟“

”ان کی خواہش ہے کہ اس ناری کو زندہ ناہیں رہنا چاہیے۔ اور اگر اسے ایک خاص منش (بندہ) خاص ڈھنگ سے مارے گا تو ٹھیک پرائیوٹ ہووے گا اور بلا ٹل جاوے گی۔“

”میں سمجھا ناہیں، خاص منش کون؟“

رام پر شاد نے پھر منہ میں کوئی اشلوک پڑھا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔ ”مہرا اندازہ ہے کہ وہ منش تم ہو۔ بہر حال، ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ کھل کر سامنے آ جاوے گا۔ پنڈت بھگوان داس تمہاری کنڈلی بنا رہے ہیں۔“

”کنڈلی بنا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کنڈلی سے پتا چل جاوے گا کہ وہ منش تم ہی ہو جس کی طرف ایشور نے پنڈت مہاراج کو اشارہ دیا ہے، یا کوئی اور ہے۔“

”کیا پنڈت مہاراج نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ناہیں، انہوں نے بس نشانی بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم چوتھی تاریخ کو چاند ڈوبنے کے فوراً بعد کالی کے مندر میں پوجا شروع کر دیں۔ پوجا کے دوران میں جو پجاری ہمارے پرچار کے دائیں طرف آ کر بیٹھے گا، وہی اصل منش ہووے گا۔ اسی کے ہاتھوں وہ اپرا دھن قتل ہووے گی تو ایشور خوش ہوں گے اور ٹھیک پرائیوٹ بھی ہو جاوے گا۔“

”میں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے کسی کے پران لوں گا؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

رام پر شاد نے تسلی بخش انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بغم زدہ گھانسی کی آواز سنائی دی اور پنڈت بھگوان داس ایک لمبا چوڑا زانچہ لے کر آ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”گویا سنہا تمہاری کنڈلی میں کچھ گڑبڑ نظر آوت ہے۔ کیا تمہارا پورا نام یہی ہے؟“

میں نے تصدیق کی۔ وہ کچھ دیر لفظوں اور ہندسوں میں الجھتا رہا۔ آخر بولا۔ ”پھر ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنا جنم دن ٹھیک نہ بتایا ہو کیونکہ اس کنڈلی میں بہت سے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ ایک دو لوگ تو ایسے ہیں جو تمہاری کنڈلی میں ہو ہی ناہیں سکتے۔ اس کے علاوہ۔۔۔۔۔“

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس پنڈت کو نہیں مانتا تھا اور نہ اس کی کنڈلی کو۔۔۔۔۔ لیکن اس کا یوں مجھے میں پڑ جانا مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”اپنے جنم دن کے بارے میں مجھے پورا دوشواں ناہیں ہے۔ میری ماما ایک تاریخ بتاوت ہیں

اور پتا کو دوسری تاریخ پر بھر دیا ہے۔“

پنڈت کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اپنی چندیا کھجا کر بولا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔ میری کنڈلی کے حساب سے بھی تمہارا جنم دن منگل وار کے بجائے بدھ وار بنتا ہے اور چاند کی اٹھائیس تاریخ۔“

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پنڈت بھگوان داس نے جلدی جلدی کنڈلی میں کچھ تبدیلیاں کیں اور مطمئن لہجہ میں رام پر شاد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”دیکھیں، سب کچھ ٹھیک بیٹھ گیا جی۔۔۔۔۔ یہی وہ منش ہے جس کی طرف پنڈت مہاراج نے اشارہ کیا تھا۔ بھگوان نے چاہا تو وہ اپرا دھن مرے گی اور اسی کے ہاتھوں مرے گی۔“ پھر وہ میری طرف گھوم کر بولا۔ ”تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں ایشور نے ایک بڑے کام کے لیے چنا ہے۔“

”میں کچھ سمجھ ناہیں رہا۔“ میں نے پھر گھبراہٹ ظاہر کی۔

سوکھے سڑے پنڈت نے کچھ بولنا چاہا مگر رام پر شاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مجھ سے کہا۔ ”گویا پترا! گھبرانے کی کوئی بات ناہیں ہے۔ ہم تمہیں کسی مصیبت میں ناہیں ڈالیں گے۔ میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔“

پنڈت اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گھرانے کے باقی افراد کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے گیا ہے کہ وہ کالی کے مندر سے مطلوبہ بندے کو ہی لے کر آئے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے رونے لگا گزرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ رام پر شاد کی بوڑھی والدہ ہی تھیں۔ وہ شاید کسی مورتی کے سامنے پرارتھنا کر رہی تھیں۔ پھر وہ اپنی بہو اور بہو کی بہو کے سہارے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے میرا سر چوما اور کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔

اتنے میں ایک گھوڑا گاڑی حویلی کے پورچ میں آ کر رکی۔ رام پر شاد نے کھڑکی سے جھانکا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مسرور لہجہ میں بولا۔ ”ستیش آیا ہے میرا بیٹا۔ تم سے مل کر بہت خوش ہووے گا۔“

ایک دو منٹ بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ جسم نہایت ورزشی اور چہرے سے سختی چمکتی تھی۔ عام برہمن زادوں کی طرح اس کے ماتھے پر بھی سفید قشقہ تھا۔ وہ بگولے کی طرح

Scanned and Uploaded By Nadeem

کریں۔

”تو پھر کیا..... وہ اندر گھسنے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

”ناہیں۔ مجھے ایک اور طرح کی جانکاری ملی ہے اور میرا دوا چار ہے کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔ تل پانی کا ایک مسلا ہے چاچا عبدالغنی۔ سلطانہ اس کے گھر میں بھی رہتی رہی ہے اور اس پر بڑا دوشواس کرت ہے۔ وہ اس کے لیے بھوجن لے کر اندر ریست ہاؤس میں جاوے گا۔ اس بھوجن میں بے ہوشی کی دوا ملی ہووے گی۔“

”لیکن وہ غنی ہو گا تو مسلا۔ اندر جا کر اس نے بھوجن کا بھید کھول دیا تو؟“ ستیش نے پوچھا۔

”وہ ناہیں کھولے گا یار۔“ اس کے دوست کی آواز آئی۔ ”وہ خود بھی یہ چاہے گا کہ کہیں سلطانہ بالکل نراش ہو کر آتما ہتھیا وغیرہ کی کوشش نہ کرے۔ پر تو عارضی طور پر ہی سہی لیکن اس کا بیون فوج جائے..... مجھے دوشواس ہے کہ عبدالغنی وہی کرے گا جو بلرام وغیرہ اس سے کہہ رہے ہیں۔“

ستیش کے ایک دوست نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”یار! ویسے ایک بات ہے۔ یہ جارج گور صاحب سے بڑی اونچی شے۔ سچویشن جو بھی ہو، یہ اپنی دل پشوری کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ ڈھونڈ ہی لیوت ہے۔ اب دیکھو، کیسے ہاتھ دھو کر اس سلطانہ راجپوت کے پیچھے پڑا ہے۔“

”ناری بھی تو زوردار ہے۔“ دوسرے دوست نے لوفر لہجے میں کہا۔

پہلا بولا۔ ”ہاں، ناری گور صاحب کی کمزوری ہے۔ خاص طور سے مسلمان ناریاں۔“

”میں تمہاری اس بات سے اتفاق ناہیں کرتا۔“ ستیش نے کہا۔ ”ناری اس کے لیے ناری ہی ہے۔ ہندو ہو، چاہے مسلم ہو..... یا کوئی اور..... تم یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ اگر وہ ایک حد تک رہا تو ٹھیک ہے، اگر اس نے حد پار کی تو پھر اس کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔ حکم جی کو بھی اپنی آشیر باد بس اس سے تک اس کے ساتھ رکھنی چاہیے جب تک وہ اپنی سیما (حد) کو پار ناہیں کرتا۔“

آہٹ ہوئی اور میں دروازے کے سامنے سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں آ کر میں دیر تک سوچتا رہا۔ سلطانہ مصیبت میں تھی..... تاہم اندازہ ہو رہا تھا

کہ اس کی زندگی کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ریست ہاؤس کو پوری طرح گھیر لیا گیا تھا مگر فوجی افسر بلرام چاہتا تھا کہ سلطانہ اور طلال کو زندہ پکڑ کر جارج کے پاس لے جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگ ہر حربہ آزما رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ سلطانہ اپنے سابقہ میزبان عبدالغنی پر بھروسہ کرے گی۔ وہ اس کے ذریعے اسے بے بس کرنے کا پلان بنا رہے تھے۔

صبح سویرے ہی بھجن کی آواز حویلی میں گونجنا شروع کر دیتی تھی اور پوجا کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ مہمان خانے کے اندر بھی پوجا کا کمراموجود تھا۔ میں اکیلے پوجا پاٹ کا ڈھونگ رچا لیتا تھا۔ اگر مجھے یہ ڈھونگ سب کے سامنے رچانا پڑتا تو بہت دشواری ہوتی۔ مجھے پوجا کے ابتدائی طور طریقے بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھے۔ میں نے ہندوؤں کے رہن سہن میں ایک دو غلطیاں بھی کیں تاہم وہ خوش قسمتی سے کسی کی نظر میں نہیں آسکیں۔

اگلے روز رات کو ستیش واپس چلا گیا۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے مجھ سے اپنے کمرے میں ملاقات کی۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک لمبی ناک والا درمیانی عمر کا شخص بھی تھا۔ وہ بالکل کلین شیو تھا۔ سر بھی منڈا ہوا تھا۔ ستیش نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کچھ باتیں بتائیں۔ یہ باتیں سلطانہ سے ہی متعلق تھیں۔ وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ”ہم اس اپرادھن کو زندہ سلامت زرگاں میں ناہیں جانے دیں گے۔ اس سلسلے میں پوری پلاننگ ہو چکی ہے۔ جب بلرام اور اس کے ساتھی سلطانہ کو ریست ہاؤس سے پکڑ لیں گے اور واپس زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے تو ہم ان کو راستے میں روکیں گے اور بھگوان نے چاہا تو کامیابی سے روکیں گے۔“

”کیا ان کے قافلے پر ہلا بولا جاوے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ ایسا ہی سمجھ لو.....“ اس نے گول مول بات کی۔

شاید وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر ستیش سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایسا حساس تو نہیں تھا کہ میری خاموشی اسے پریشان کرتی لیکن شاید جو کچھ وہ مجھ سے کرنا چاہتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ میری باخبری اور پوری رضامندی اس میں شامل ہو۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور جیب

بہت پختہ تھا کہ پانی کا سفر پاپ ہے۔ ماما جی کا کہنا تھا کہ کشتیاں وغیرہ بنانے کا کام دراصل پانی کے سفر سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے گھریلو فرنیچر بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کاروبار رام پرشاد ہی سنبھالتا تھا۔ اس کے بیٹے ستیش کی مصروفیات کچھ اور طرح کی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اب بھی وہ دس پندرہ روز بعد گھر لوٹا تھا۔ پرسوں اسے پھر چلے جانا تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ستیش کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ وہ شاید کسی تشدد پسند ہندو تنظیم کا رکن تھا۔ اس کے جو ایک دو دوست اس سے ملنے گھر آئے، وہ بھی خطرناک صورتوں والے ہی تھے۔ یہ کچھ اس قسم کے لوگ تھے جن سے چند دن پہلے میری اندرون شہر کے ایک ڈیرے پر مذ بھڑ ہوئی تھی۔ ورزشی جسم، کڑے تیور اور سانولی پیشانیوں پر سفید نقشے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں میں کوئی نقص تھا اور آواز بہت بھدی تھی۔

دوسری رات نو بجے کے قریب میں نے گھر کے ایک کمرے میں ستیش اور اس کے دو دوستوں کی تھوڑی سی بات چیت سنی۔ وہ بڑے پرجوش تھے اس لیے بلند آوازوں میں بول رہے تھے۔ شاید انہوں نے کسی طرح کا نقشہ بھی کیا ہوا تھا۔ ان کی یہ گفتگو سلطانہ کے بارے میں تھی۔

میں نے ایک مالا توڑی اور پھر اس کے باریک دانے اکٹھے کرنے کے بہانے دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ دروازے کی دوسری جانب ستیش کہہ رہا تھا۔ ”آج چوتھا دن ہے۔ میرا دوشواس ہے کہ وہ دونوں بس ایک دو دن اور نکالیں گے۔ وہاں ریست ہاؤس میں کھانے کو اناج کا ایک دانہ ناہیں۔ پانی بھی بند ہے۔ مٹی کھا کر تو گزارہ ناہیں کیا جاسکتا۔“

”ہاں، میرا دوا چار بھی یہی ہے۔“ ایک دوسری آواز آئی۔ ”حکم جی کے اہل کار کچھ نہ بھی کریں، صرف اپنا گھیرائی قائم رکھیں تو ایک دو دن کے اندر اس حرامزادی کو زندہ پکڑا جاسکتا ہے۔ جب بھوجن ہی ناہیں ہووے گا تو کتنے روزا کڑے رہیں گے چچی بھتیجا؟“

”مگر بلرام رائے کی اپنی سوچ ہے۔ آخر وہ اس آپریشن کا انچارج ہے۔ وہ اپنی کارکردگی دکھانا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے یہ ڈر بھی ہو کہ لاچار ہو کر سلطانہ اور اس کا بھتیجا آتما ہتھیا کی کوشش نہ

اندر آیا۔ سب کو پر نام کیا۔ اس نے اپنی دادی کے چرن چھوئے اور ذرا تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اسے پر نام کیا اور مؤدب کھڑا رہا۔ رام پرشاد اپنے بیٹے کو ایک طرف لے گیا اور چند باتیں کیں۔ یقیناً یہ سب کچھ میرے تعارف کے سلسلے میں ہی تھیں۔ نوجوان واپس پلٹا اور دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ جیسے نظروں نظروں میں مجھے اور میرے قد کاٹھ کو تول رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ اس نے میرے دونوں کندھے تھامے اور انہیں ہلکے ہلکے جوش سے ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی تڑپ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ ”اب تم نے نہیں رہنا ہے۔ ہاں، جب تک کام ناہیں ہو جاتا، تم کہیں رہو گے ہمارے مہمان بن کر۔ تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو اطلاع دے سکتے ہو بلکہ چاہو تو انہیں بھی یہیں بلا سکتے ہو۔“

”ناہیں جی! مجھے ان کی طرف سے کوئی ایسی خاص پریشانی ناہیں۔ میں کام کے سلسلے میں نکلا تھا اور مجھے ایک دو دن گھر سے باہر رہنا تھا۔“

”بہت خوب۔“ ستیش نے اپنا بڑا سرا پر نیچے ہلایا۔

..... میرے اگلے چوبیس گھنٹے اس حویلی کے شان دار مہمان خانے میں گزرے۔ میری ہر طرح خاطر مدارات کی جارہی تھی۔ ایک ملازم نندلال ہر وقت میری خدمت کے لیے موجود تھا۔ نندلال سے میری تھوڑی بہت بات چیت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ حویلی کی ساری صورت حال بھی میرے سامنے تھی۔ میں نے جو نتیجے اخذ کیے، وہ اس طرح تھے۔ یہ تل پانی کے کٹر ہندو گھرانوں میں سے ایک تھا۔ اس گھرانے کا سربراہ رام پرشاد تھا تاہم اس کی بوڑھی ماما کی بھی بہت مانی جاتی تھی۔ وہ اپنی بوڑھی ماما، پتی، بیٹے اور بہو کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ تل پانی میں ان لوگوں کا ایک کارخانہ تھا جہاں کشتیاں اور تفریحی بجرے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ یہ چیزیں پورے راجواڑے میں سلائی ہوتی تھیں لیکن دس بارہ سال پہلے رام پرشاد کی فیملی نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ان کی توہم پرستی اور مذہبی جنونیت کی وجہ سے تھا۔ رام پرشاد کی فیملی میں ایک موت ہو گئی جس کے بعد رام پرشاد کی بوڑھی ماما نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسا ہمارے کاروبار کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ منحوس کاروبار ہے۔ دراصل پرانے خیال کے ہندوؤں میں یہ عقیدہ

سے ایک کانڈ نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پر کچھ لکیریں سی کھینچی ہوئی تھیں۔ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ”یہ دیکھو گویا! یہ ہے وہ ریسٹ ہاؤس جہاں سلطانہ اور اس کا بھتیجا سپاہیوں کے گھیرے میں ہیں۔ پکڑے جانے کے بعد وہ اس راستے سے زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے۔ یہ دیکھو۔۔۔ یہ دیکھا جو نیچے کی طرف جارہی ہے، اس راستے کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں دیکھو، یہ دیکھا اس بیلے کے درختوں میں سے گزرتی ہے۔ یہ بیلے کے ساتھ ساتھ ایک موڑ ہے۔۔۔“ اس نے ایک توس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک دینی دینی سی زہریلی ہنسی اس کے سانولے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اس نے معنی خیز انداز میں لمبی ناک والے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس موڑ پر ہم سلطانہ اور اس کے بھتیجے کو باقی قافلے سے علیحدہ کر لیں گے اور بھگوان نے چاہا تو یہ کام بڑی صفائی سے ہووے گا۔“

”الگ کر لیں گے؟ میں کچھ سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ایک دفعہ پھر ایک غیر محسوس لیکن زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ وہ بولا۔ ”جب گاڑیوں اور گھوڑوں کا قافلہ اس موڑ پر سے تیزی سے گزر رہا ہو گا۔۔۔ سلطانہ والی گاڑی سیدھی نکلتی چلی جاوے گی۔۔۔۔۔ قریباً سو گز دور ٹیلوں کے اندر یہ تنگ وڑہ سا ہے۔ گاڑی اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی جاوے گی۔۔۔ اور پھر یہ وڑہ بند کر دیا جاوے گا۔“

”یہ کیسے ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے بندے اس وڑے کا راستہ روک لیں گے۔ جو اس راستے کو کھولنے کی کوشش کرے گا، پھانسی ہو جاوے گا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے ستیش کی آنکھوں میں پھر چنگاریاں دکھائی دینے لگیں۔

”بات سمجھ میں آرہی ہے جی۔“ میں نے کہا۔

”لیکن جناب! سلطانہ والی گھوڑا گاڑی باقی قافلے سے الگ کیسے ہووے گی؟“

”پر تو ایہ بڑا اہم سوال ہے لیکن اس سوال کا جواب تمہارے سامنے ہی بیٹھا ہے۔“ ستیش نے معنی خیز انداز میں کہا اور لمبی ناک والے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنی بھید بھری آنکھوں کے ساتھ بالکل خاموش تھا۔

”میں اب بھی سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ستیش اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”یہ اس سرکاری گاڑی کا گاڑی بان ہے جس میں سلطانہ اور طلال کو لے جایا جائے گا۔ یہ وہی کرے گا جو ہم کہیں گے کیونکہ یہ دھرم کی رخصشا کا مطلب سمجھتے ہیں۔ اسے پتا ہے کہ اس شہد کام میں اگر اس کے پران بھی چلے گئے تو یہ گھائے کا سودا نہیں ہے۔“

لمبی ناک والے کی لمبوتری آنکھوں میں وہی جنونیت نظر آئی جو ستیش کی آنکھوں کا جزو خاص تھی۔ ستیش نے بتایا کہ لمبی ناک والے کا نام بھولانا تھا ہے۔ جو نقشہ ستیش دکھا رہا تھا اور جس طرح کی پلاننگ کی بات کر رہا تھا، وہ سب کچھ واقعی متاثر کن تھا۔ ٹیلوں کے درمیان وہ ایک چھوٹا وڑہ نما تھا۔ اس کی دونوں جانب چھپنے اور گھات لگانے کے لیے بہت سی جگہیں تھیں۔ اگر کوئی اس وڑے میں سے گزرنے کی کوشش کرتا تو اسے بہ آسانی روکا جاسکتا تھا اور نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ ستیش اس ساری صورت حال کے بارے میں بہت پر امید اور پرجوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ مختار راجپوت کی اپرا دھن مٹی مرے گی اور اسی طرح مرے گی جس طرح بڑے پنڈت مہاراج کی خواہش ہے۔

ستیش کے جانے کے بعد میری پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں اس حویلی میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ رام پرشاد ہر گز نہیں چاہتا تھا کہ کام مکمل ہونے تک میں حویلی سے باہر قدم نکالوں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس حوالے سے پیر گھڑی میری نگرانی بھی کی جارہی ہے۔ مجھے باہر کے حالات کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کسی کو بتائے بغیر اچانک ہی دیوان کی عمارت سے نکلا تھا اور اب مجھے دیوان سے لاپتا ہوئے کم و بیش تین روز ہو چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری گمشدگی نے وہاں کھلبلی مچائی ہو گی۔ خاص طور سے چوہان اور انور خاں تو بہت پریشان ہوں گے۔ چند دن پہلے رنجیت پانڈے سے میری زبردست فکر ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے کی خطرناکی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ انور خاں اور چوہان یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ شاید میری گمشدگی کی وجہ رنجیت پانڈے ہی ہو۔ اس غلط فہمی سے دیگر مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

سلطانہ اور طلال کے موجودہ حالات کا علم بھی مجھے

نہیں ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ میرے ایک دو بار پوچھنے پر رام پرشاد نے بس یہی کہا تھا کہ بڑی جلدی اچھی سا چار سٹے کو ملے گی۔ وہ جس اچھی سا چار یعنی خبر کی بات کر رہا تھا، اس کی تفصیل مجھے ستیش بتا ہی چکا تھا۔ وہ لوگ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے لیکن کسی اچھی نیت سے نہیں بلکہ بدترین انجام سے دوچار کرنے کے لیے۔ خطرہ اس بات کا بھی تھا کہ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں سے چھپنے کی کوشش میں ہی کوئی المیہ نہ ہو جائے۔ اس کوشش میں سلطانہ اور طلال کو شدید نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

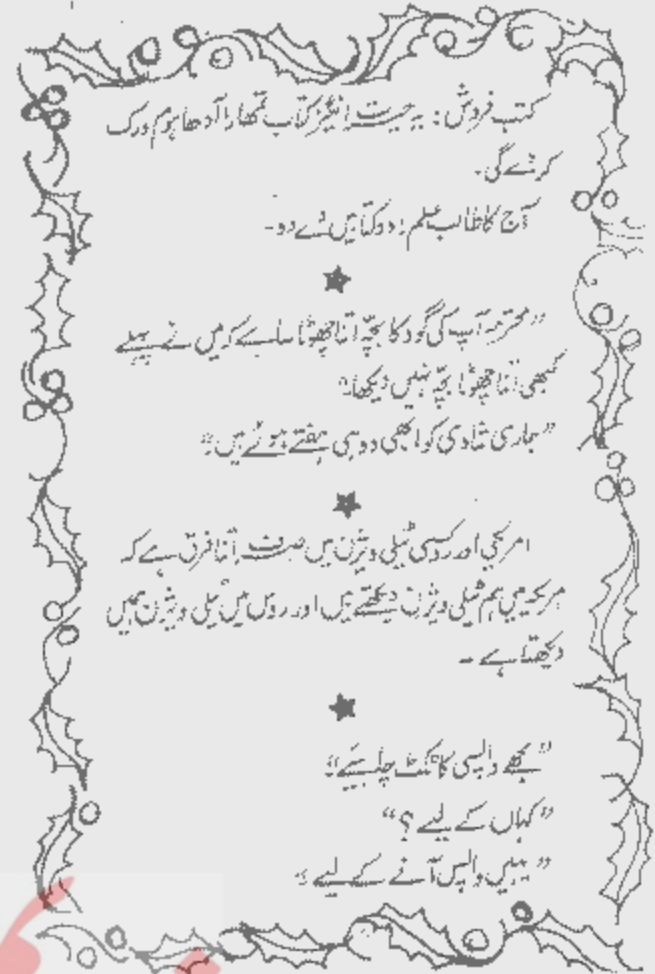
اگلے روز سہ پہر کے وقت میں حویلی کے گراسی لان میں بیٹھا تھا جب برآمدے کی طرف سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا، پندرہ سولہ سال کی ایک بالکل دہلی پتلی لڑکی دو موٹی تازی ملازموں کی گرفت میں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے بال کاٹنا چاہ رہی ہیں۔ ایک ملازمہ کے ہاتھ میں نیچی تھی۔ لڑکی کے شہد رنگ بال گھنے اور خوب صورت تھے۔

لڑکی رو رہی تھی۔ اس کے تاثرات بر ملا کہہ رہے تھے کہ وہ بال کٹوانا نہیں چاہتی۔ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ کرسی پر بیٹھی تھی اور زور زور سے بول رہی تھی۔ ”کلمو ہی! ہم تیرے فائدے کی بات ہی کرتے ہیں۔ تجھے پاپ سے بچانا چاہتے ہیں۔ نرنگ کی اتنی بڑی سخت ہے۔ تجھے اس پر دشا اس ہو تو کبھی اس طرح کی بات نہ کرے۔“

رام پرشاد کی نوجوان بہو بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر حقارت کے آثار تھے۔ وہ بولی۔ ”بڑی مانتا! آپ زبردستی نہ کریں۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ آپ اس بے چاری کو تھوڑا سا سے دیں۔“

”تو بیچ میں مت بول۔“ بوڑھی عورت چلا کر بولی۔ ”تو ہمیشہ دھرم درودھی بات کرتے ہو۔ یہ میرا گھر ہے۔۔۔۔۔ میرا پر یو ا رہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، یہاں میرا ادھکار رہے گا اور میرا حکم چلے گا۔“

”لیکن مانتا جی! یہ ہماری زر خرید داسی نہیں ہے۔ یہ ملازمہ ہے۔ اس کی بھی اپنی مرضی ہے۔ اور دھرم ”مرضی“ کا نام ہے، جو زبردستی کا نام نہیں۔۔۔۔۔ بھگوان کے لیے مانتا جی۔۔۔۔۔ آپ دھرم کے نام پر اپنی مرضی نہ چلائیں۔“



کتاب فروش: یہ حیرت انگیز کتاب تمہارا ادھار ہم دے کر دے گی۔

آپ کا طالب علم: دو کتابیں ملے دو۔

”محترم آپ کی گود کا بچہ اتنا چھوٹا سب سے کرم نے پیٹا کبھی اتنا چھوٹا بچہ نہیں دیکھا۔“

”جاری شادی کو ابھی دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔“

امریکی ادبی کرسی میں وینس میں صحت انا فرق ہے کہ ہر کیم میں ہم ملی وینس دیکھتے ہیں اور روس میں ملی وینس میں دیکھتا ہے۔

”مجھے واپس کالٹ چاہیے۔“

”کہاں کے لیے؟“

”میں واپس آنے کے لیے۔“

”تو اپنی زبان کو لگام دے مالا۔“ بڑھیا کا نیتی آواز میں بولی۔ ”بھگوان کا خوف کر۔ یہ وہ دھوا ہے۔۔۔۔۔ اگر یہ بیاتنا بن کر پھرتی رہے گی تو یہ کلجک ہو دے گا۔ اس کی نحوست ہم سب کو لے ڈوبے گی۔۔۔۔۔ اور سب سے پہلے یہ نحوست پڑے گی تجھ پر۔۔۔۔۔ دفع ہو جا یہاں سے۔۔۔۔۔ میں جو کرتی ہوں، مجھے کرنے دے۔“ آخری الفاظ بڑھیا نے بہت زور دے کر کہے۔

نوجوان لڑکی مالا نے ایک دم رخ بدلا اور پاؤں پٹختی ہوئی لان کی طرف آگئی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور طیش بھرے انداز میں کسی سنبے کا سوئیٹر مٹنے لگی۔ وہ اچھی صورت کی تھی اور اپنی بول چال سے پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ ایک امیر کبیر گھرانے کی برہمن بہو ہونے کے باوجود اس میں تکلف اور بناوٹ نہیں تھی۔ ایک دوبار وہ مجھ سے بات بھی کر چکی تھی۔

برآمدے میں، دیکھتے ہی دیکھتے ملازموں نے نوجوان لڑکی کے بال تینہنی سے کاٹ دیے۔ وہ استے بے ڈھنگے طریقے سے کانٹے گئے تھے کہ ترس آئے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اس کے کمزور چہرے کا

رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ بعد ازاں وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی۔ لڑکی کے کئے ہوئے بالوں کو غالباً جلانے کے لیے یا کسی اور رسم کی ادائیگی کے لیے ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ لیا گیا۔

مالا چُپ بیٹھی رہی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے سلاخیوں پر حرکت کرتی رہیں۔ ارد گرد کوئی نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”مالا بہن! یہ کیا جھگڑا تھا؟“ وہ جیسے ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”تم لو گن کو کبھی سمجھنا نہیں آئے گی کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ دھرم تو شانتی اور پریم کا نام ہے، تم لو گن نے اسے بدھ بنا رکھا ہے۔ ایک ڈراؤنا تماشا بنا رکھا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی، ہم اب بھی پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں۔۔۔۔۔ شوہروں کے ساتھ ان کی بیٹیوں کو زندہ جلانا چاہت ہیں۔ ذات پات پر مر رہے ہیں۔ کالی رسوں کی آڑ میں ایک دوسرے کا جیون تباہ کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہ طیش میں بولتی چلی گئی۔ ان لحوں میں وہ مجھے بھی رام پرشاد اور ستیش وغیرہ کے مذہبی جنون کا ایک حصہ سمجھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”بہن! لیکن یہاں ہوا کیا ہے؟“

”ہونا کیا ہے۔۔۔۔۔ ماتا جی اپنے لیے سورگ کا ٹکٹ لگا کر رہی ہیں۔ یہ لڑکی تم نے دیکھی ہی ہو وہ سب کی۔ مشکل سے ستر سال عمر ہے اس کی۔ یہ حویلی کی بیٹی ملازمہ ہے۔ دو مہینے پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا پتی چھوٹے سرکار کی سینا میں سپاہی تھا۔ پچھلے دنوں زرگاں والوں کے ساتھ جو جھڑپیں ہوئی ہیں، ان میں وہ گھائل ہوا اور تین دن بعد اس کا دیہانت ہو گیا۔ اب یہ لڑکی دھوا ہے اور اسے زندہ درگور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ماتا جی نے اسے ایک علیحدہ کوٹھڑی میں بند کر چھوڑا ہے۔ اسے دن میں بس ایک بار روکھا سوکھا بھو جن دیا جاوت ہے۔ یہ کھدر کے سفید کپڑے پہنت ہے اور زمین پر سوت ہے۔ اس کا جیون شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ جتنا عرصہ جیے گی، اسی طرح جیے گی۔ یہ ہے ہمارے ”دھرم پریمیوں“ کی ہڈی (سمجھ بوجھ) اور ان کا چلن۔ اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ تم بھی سب جانت ہو جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔“

ابھی ہم بات کر رہے تھے کہ مالا خشک گئی۔

کوئی پچاس قدم دور حویلی کے قریب گیت سے ایک گھوڑا گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کالے رنگ کی یہ وہی گھوڑا گاڑی تھی جس پر کچھ دن پہلے تند مزاج ستیش حویلی میں آیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دیکھتے ہی مالا مجھ سے بے تعلق ہو گئی اور اپنی ساری توجہ سویٹر بننے پر مرکوز کر دی۔ گھوڑا گاڑی سے ستیش برآمد ہوا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی نظر آنے لگی تھی۔ ان لحوں میں اس نے اپنی بیٹی کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے مستے کیا۔ مالا نے آگے بڑھ کر اس کے چرن چھوئے۔ ستیش نے مالا کی طرف توجہ دیے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لیتا ہوا مہمان خانے کی طرف آ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ستیش کی بائیں کلائی پر چھوٹا سا تازہ زخم نظر آ رہا ہے۔ میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر ستیش نے جوش سے میرے کندھے دبائے اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ”گوپال! ہم پھل (کامیاب) رہے۔ ہم نے وہ حاصل کر لیا جو چاہت تھے۔ مختار راجپوت کی بیٹی اب ہمارے پاس ہے۔۔۔۔۔“

مجھے اپنی ریزہ کی ہڈی میں سردی کی لہر محسوس ہوئی۔ تاہم اپنے اندرونی تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے بھی ستیش کے سامنے مسرت کا اظہار کیا اور اس سے پوچھا کہ سلطانہ کہاں ہے؟

وہ بولا۔ ”میں تمہیں اس کے پاس لے جانے کے لیے ہی تو آیا ہوں۔“

”اور اس کا بھتیجا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ حرامی بھی ساتھ ہے۔“

”کیا سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہوا؟“

”ایک سو ایک فیصد۔“ وہ دے دے جوش سے بولا۔ ”اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ حکم جی کے بندے زیادہ زور نہیں مار سکے۔ انہوں نے سلطانہ والی گاڑی کے پیچھے آنے کی کوشش کی مگر ہم نے درے پر رد کر لیا۔ بس تین چار منٹ کی فائرنگ کے بعد ہی وہ لو گن بھاگ گئے۔ کچھ ایسا جانی نقصان بھی نہیں ہوا۔ دو بندے ان کی طرف سے مرے، تین چار گھائل ہوئے۔ ہماری طرف سے صرف دو بندے گھائل ہوئے ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے جلدی جلدی مجھے صورت حال

سے آگاہ کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ کا ہاتھ کیسے گھائل ہوا؟“

وہ بے پروائی سے بولا۔ ”جتنی بڑی سہلتا (کامیابی) ملی ہے اس کے سامنے ایسے چھوٹے زخم کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ کسی شاٹ گن کا جھرا لگا ہے۔ گاڑی بان بھولانا تھا بھی تھوڑا سا گھائل ہوا ہے۔“

اسی دوران میں رام پرشاد بھی آنا د کھائی دیا۔ اس کی سفید دھوٹی بھی جیسے شادمانی سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے سے لگایا اور ماتھا چوما۔ ”شاباش! تم لو گن نے وہ کرد کھایا جس کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ میں بھاگ وان ہوں کہ تم میرے پتر ہو۔“

بڑھیا بھی لاٹھی ٹپکتی ہوئی آگئی اور پوتے کی بلا میں لینے لگی۔ پھر یہ سارا گھرا پوجا کے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک پرار تھا کرنے اور آرتی اتارنے کے بعد یہ لوگ باہر نکلے تو فخر سے پھولے نہیں سارے تھے۔ رام پرشاد نے چا کروں کو آوازیں دیں۔

”ساجن، مہندر امری۔۔۔۔۔ جلدی آؤ یہاں۔“

کئی نوکر دوڑتے ہوئے پہنچ گئے اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ”بہت سا پرشاد بنواؤ اور تقسیم کرو۔۔۔۔۔ تل پانی کے سارے بڑے مندروں اور استھانوں کے لیے چڑھاوے تیار کرو۔“

بڑھیا نے گنگا جھل منگوا یا۔ پوتے کو پلویا اور بیٹے کو بھی۔ پھر وہ ایک لمبی مالا لے کر بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھ گئی اور کوئی جاپ کرنے لگی۔ اس نے حکم دیا کہ پیچھی دروازہ بند کر دیا جائے اور کوئی فرد بھی اس دروازے سے پوجا کے کمرے میں داخل نہ ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اس شہ گھڑی میں پیچھی دروازے سے پوجا کے کمرے میں آنا اچھا شگون نہیں ہے۔ یہ سال خوردہ بوڑھی عورت پتا نہیں کون کون سے توہمات اپنے دماغ میں بسائے بیٹھی تھی اور دوسروں کو بھی ان توہمات میں شریک دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی بہو مالا کو مخاطب کر کے بولی۔ ”دیکھ رہی ہے مورکھ! ہم پاپ کے ایک کام سے بچے ہیں تو ایشور نے کتنی کامیابی دی ہے تیرے پتی کو۔ وہ کلمہ ہی اب اپنے کمرے کا پھل پادے گی۔ اس نے ایک دھرم اوتار کی ہتھیا کی تھی۔ اوتار کی آتما کو شائق دینے کے لیے

اس کلمہ ہی کا مرنا ضروری تھا۔“

بہو مالا ٹبر اسامہ بنا کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی دادی ساس کس پاپ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ یہ ملازمہ کا سرمونڈ کر اور اسے بے چارگی کی تصویر بنا کر انہوں نے دھرم کا پالن کیا ہے اس لیے ایشور نے انہیں فوری طور پر ایک اچھی خبر سنائی ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ستیش مجھے حویلی سے لے کر جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بیگ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وقت رخصت رام پرشاد کی توہم پرست والدہ ایک چودہ پندرہ سال کے خوبو لڑکے کے ساتھ آئی۔ لڑکے نے بیچ میں سے مانگ نکال رکھی تھی۔ ماتھے پر نقشہ تھا۔ حلیہ سادہ سنتوں جیسا تھا۔ بڑھیا کی ہدایت پر لڑکے نے میرے سر پر ایک نامعلوم خوشبودار تیل ڈالا اور مجھے گنگا جھل کے چند گھونٹ پلائے۔ اس کے بعد نیلگوں پتھروں کی ایک مالا سی میرے گلے میں ڈال دی۔ بڑھیا نے میرے اور ستیش کے ماتھوں پر تنک لگائے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ستیش کے ساتھ اس کی شان دار گھوڑا گاڑی میں حویلی سے روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے اب تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی تیزی کے ساتھ تل پانی کے مختلف بازاروں سے گزرتی رہی اور مضافات میں آگئی۔ مجھے یقین تھا کہ میں سلطانہ کے پاس ہی جا رہا ہوں لیکن سلطانہ کو میں کس حال میں دیکھوں گا اور مجھے سلطانہ کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اس کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی بات ضرور سمجھ میں آرہی تھی کہ کچھ انوکھا اور خطرناک ہونے والا ہے۔

کچھ آگے جا کر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ستیش کے ہاتھ میں ایک سیاہ پٹی نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ”گوپال! میں تم سے شہ چاہت ہوں لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ پٹی تمہاری آنکھوں پر باندھنا پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا۔

ستیش نے پٹی باندھ دی۔۔۔۔۔ گاڑی قریباً ایک گھنٹے تک مزید بجکونے کھاتی رہی۔ وہ ایک نیم پختہ

راستے پر چلنے کے بعد کچے راستے پر آگئی۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ جنگلی گلاب اور دیگر نباتات کی خوشبو میرے نتھنوں سے نکل رہی تھی۔ ایک طویل چڑھائی چڑھنے کے بعد گھوڑا گاڑی رک گئی۔ ستیش نے مجھے اسی حالت میں گاڑی سے اتارا اور سہارا دے کر کسی چار دیواری میں لے گیا۔ میری بیٹی کھول دی گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں جس جگہ پر موجود تھا وہ کسی کھنڈر سے مشابہ تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کسی پرانے استھان کی باقیات ہیں۔ ایک طرف کسی قدیم تالاب کے آثار تھے، دوسری طرف چند پختہ روشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس جگہ خوشبو بہت زیادہ تھی۔ میری آنکھوں پر بیٹی بندھی رہی تھی اس لیے ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ گھوڑا گاڑی خوشبو کے ایک بڑے ڈھیر میں سے گزر کر یہاں پہنچی ہے اور وہ جس خوشبودار جگہ سے گزری تھی، وہاں شاید بہت سے لوگ بھی کام کر رہے تھے۔ غالباً یہ کوئی بڑی پھلواڑی تھی۔

ستیش اور گاڑی کا کوچبان مجھے لے کر آگے بڑھے۔ ہم ایک تنگ سے سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ سرنگ قدرتی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلاسٹر جھڑ چکا تھا، جابجا اینٹیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ جا کر یوں لگا کہ سرنگ ختم ہو گئی ہے۔ یہاں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ بڑا تھا۔ سرخ پتھر کی چند ٹوٹی پھوٹی سلیں بھی یہاں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سلیں استھان کے کھنڈر کا حصہ ہی ہیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ ایسی ہی دوسلوں کے درمیان چھوٹا سا راستہ موجود ہے جسے جھاڑ جھنکاڑ سے چھپا دیا گیا ہے۔ کوچبان نے اس جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹایا اور ہم چارپائی کے سائز کی سلوں کے درمیان سے گزر کر اندر داخل ہو گئے۔ جھاڑ جھنکاڑ کو پھر اسی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ ستیش اور کوچبان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ستیش نے بیگ میں سے ایک نارنج نکال کر روشن کر لی۔ دائیں طرف اس سرنگ کی نیم پختہ دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ سے تھے جن سے مدھم ہوا اور روشنی اندر آتی تھی۔

مجھے اپنے سامنے لامتناہی سڑھیوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ یہ سڑھیاں سرنگ کے پتھر لیے فرش کو کھود کر بنائی گئی تھیں۔ ہم آگے بڑھنے لگے۔

”ابھی ہمیں کتنا جانا ہے؟“ میں نے بائیں ہوئی

آواز میں پوچھا۔

”بس پانچ دس منٹ۔“ ستیش نے جواب دیا۔

اتنے میں سامنے سے بھی نارنج کی روشنی دکھائی دی۔ تین بندے نظر آئے۔ انہوں نے قریب پہنچ کر ستیش کو پرنام کیا۔ ستیش نے جواب دیا۔ آنے والے دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو میں نے پہچان لیا۔ حویلی میں جو دوست ستیش سے ملے آئے تھے، ان میں یہ بھی شامل تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور ہونٹ بہت مومے تھے۔ یہ چیک دار شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

ستیش نے اس سے پوچھا۔ ”ہاں مہندر! کدھر جا رہے ہو؟“

”بس ذرا مالے تک۔۔۔۔ ابھی آجات ہیں۔“ اس کے ہاتھ میں ایک جال تھا۔ لگتا تھا کہ شاید یہ افراد کہیں پھلی وغیرہ پکڑنے جا رہے ہیں۔

”حالات ٹھیک ناہیں۔۔۔۔ ذرا خیال رکھنا۔“ ستیش نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔

ستیش اور مہندر کے درمیان دو تین فقروں کا تبادلہ ہوا پھر ہم نارنج کی روشنی میں آگے بڑھ گئے۔

کہیں قریب ہی پانی کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پانی کسی اونچی جگہ سے نشیب میں پتھریلی جگہ پر گر رہا ہے۔ جون جون ہم آگے بڑھے، یہ شور نمایاں ہوتا گیا۔ پھر ایک جگہ ہمیں اس پانی کی جھلک نظر آگئی۔ یہ پانی کسی نامعلوم سمت سے آگرا ایک چھوٹے آبشار کی صورت میں پتھروں پر گرتا تھا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر ایک تالاب کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ سفید جھاگ اڑاتے اس پانی کے اندر ایک بہت بڑا مجسمہ ٹوٹا ہوا بڑا تھا۔ وہ اوندھی حالت میں تھا۔ اس کی لمبائی تیس چالیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس کا ایک بازو ندارد تھا۔ چونکہ وہ اوندھی حالت میں تھا اس لیے صورت نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ وہ ہندو دھرم کے کسی دیوی دیوتا کا بت ہے جو استبداد زمانہ کے سبب بلندی سے اس پانی میں گرا ہے اور نامعلوم عرصے سے یہیں پڑا ہوا ہے۔ جس جگہ سے یہ بت گرا تھا وہ آبشار کے قریب تھی اور مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نارنج کی روشنی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ہم پتھر میں کھدی ہوئی سڑھیاں چڑھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی یہ سرنگ پھر تنگ ہونے لگی۔ اب دائیں دیوار پر نظر آنے والے

روزانہ نرسونج بھی نہیں ملے اس لیے قدرے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ سو ڈیڑھ سو قدم آگے جا کر مجھے ہکا بکا شور سنائی دینے لگا۔ میں اس شور کو کوئی واضح معنی نہیں دے سکا، بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ آس پاس کچھ لوگ موجود ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ چل پھر رہے ہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر کوچبان نے ہاتھ بڑھایا اور ایک رنگ آلود آئینی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میں چکر اسار گیا۔ میں جیسے ایک دم ایک تنگ دتار یک کو ٹھڑی سے نکل کر ایک وسیع و عریض اسٹیڈیم میں آ گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا زمین دوز ہال تھا۔ یہاں ستونوں کی دو قطاریں تھیں جنہوں نے بہت بڑی چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور ٹانگ چندی اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ ستون اور ستونوں کے نیچے پتھریلا فرش بھی خستہ حال تھے۔ دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگین شمشیں دھندلی پڑ چکی تھیں یا یکسر مٹ چکی تھیں۔ چند ایک۔۔۔۔ شکستہ مورتیاں بھی نظر آتی تھیں۔ شاید کسی وقت یہ وسیع ہال اس استھان کا ایک اہم حصہ رہا ہو گا لیکن اب یہ ایک کھنڈر تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ یہ کھنڈر بالکل صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ یہاں رہنے والوں نے اسے ایک آباد جگہ کی شکل دے رکھی تھی۔ مجھے ایک ادھیڑ عمر کافر بہ اندام شخص نظر آیا۔ عام ہندوؤں کے برعکس اس کی داڑھی تھی اور سر پر لمبی جٹائیں تھیں۔ وہ پنڈت کے بجائے کوئی سادہ سنت نظر آتا تھا۔ اس کی صورت میں عجیب سی کرنگائی تھی۔ اس شخص کے علاوہ یہاں پندرہ بیس جوان لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ سب بٹے کٹے اور ورزشی جسموں والے تھے۔ ان میں سے دو چار کے کندھوں پر رافٹیں بھی جھول رہی تھیں۔ ایک طرف سات آٹھ لڑکے اوندھے لیٹے تھے اور ایک شخص سے رانٹل چلانے اور نشانہ باندھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ دیواروں پر کلباڑیاں، لائٹیاں اور خنجر وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے ہی سمجھا جاسکتا تھا کہ یہ جگہ ایک تربیتی اکھاڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ستیش کو دیکھ کر سب نے اپنی مصروفیات روک دیں اور ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے خاص دلچسپی سے دیکھا جا رہا تھا۔ ستیش ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ چند نوجوان بھی ان دونوں کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ یقیناً یہ گفتگو میرے بارے میں ہی ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے مجھ پر طائرانہ نظر بھی ڈالی جاتی تھی۔

میں گاڑی کے کوچبان کے ساتھ ایک ہموار پتھر لیے فرش پر کھڑا تھا اور آٹھ دس فٹ نیچے ہال کی گہما گہما کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے ذہن میں کئی اندیشے کلبانے لگے۔ یہ کسی تشدد پسند گروہ کا ٹھکانا تھا۔ ایک ایسا ہی ٹھکانا (جو کافی چھوٹا تھا) میں نے تل پانی کی اندرونی آبادی میں بھی دیکھا تھا۔ وہاں فائرنگ میں کیتان اے کے ہاتھوں سے آند نامی بندہ ہلاک ہوا تھا اور کئی لڑکے پکڑے گئے تھے۔ اگر ان لڑکوں میں سے کوئی ایک اس جگہ موجود ہوتا تو کیا ہوتا؟ مجھے فوراً پہچان لیا جاتا اور ستیش کو بھی پتا چل جاتا کہ میں گویا نہیں ہوں۔۔۔۔۔ ایک مسلا ہوں اور اس سے پہلے آند جیسے شخص کے قتل میں ملوث رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد ستیش میری طرف مڑا اور مجھے لے کر ہال کمرے میں آ گیا۔ یہاں خستہ حال دیواروں میں پرانی لکڑی کے تین چار دروازے موجود تھے۔ ہم ایک دروازے میں داخل ہوئے اور ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ایک کوٹھڑی نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک بستر موجود تھا۔ لکڑی کی ایک الماری اور دو کرسیاں بھی تھیں جن کے آگے تین ٹانگوں والی گول میز رکھی تھی۔ یہاں بھی رادھا، کرشن، کشمی اور کالی پاتا وغیرہ کی چھوٹی بڑی مورتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا ترشول پڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ہندو دیومالا کے کسی قدیم منظر میں داخل ہو گیا ہوں۔

میں نے ستیش سے پوچھا۔ ”مختار راجپوت کی بیٹی یہیں پر ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔ بہت جلد تم اسے دیکھ سکو گے۔“

”کب تک؟“

”اس کا اصل سے تو مہا گرو ہی بتاویں گے۔ لیکن میرا چار ہے کہ یہ ملاقات آج رات یا کل شام تک ہو جاوے گی۔“

”یہ مہا گرو کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے ابھی ان کو دیکھا تو ہے۔ وہ داڑھی والے جٹا دھاری، جنہوں نے اپنے چہرے پر بھوت مل رکھا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ اسی سادھو نما شخص کی بات کر رہا ہے جس نے یہاں آتے ہی ستیش سے سوال جواب کیے تھے۔

میں نے ذرا جھجکتے ہوئے ستیش سے کہا۔ ”میں بہت

انجمن میں ہوں گی۔ چنانچہ آپ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ اور اس میں میرا کیا پارٹ ہووے گا؟

”شاید تم ڈر رہے ہو کہ تمہیں اس اپر اوہن کا خون کرنا پڑے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ماما جی نے کہا تھا کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں کرنا۔ اگر کچھ کرنا ہوا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہووے گا کہ تمہیں ایک انگلی جلانا ہووے گی۔۔۔ بس۔“

”میں چاہتے ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جاوے تاکہ میں واپس جا سکوں۔“ میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔

”بالکل ایسا ہی ہووے گا۔ اب تم کچھ کھانی کر سفر کی تھکاوٹ اتار لو۔ جب سے آوے گا، میں تمہیں خود دہلاؤں گا۔“

”نہیں، مجھے کوئی ایسی تھکاوٹ نہیں اور نہ ہی بھوک ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”میں تم میں کئی انوکھی چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ اتنی سردی میں بھی تم نے عام سے کپڑے پہن رکھے ہیں اور تم سردی کو کچھ زیادہ محسوس بھی نہیں کر رہے ہو۔ تم باقاعدگی سے بھوجن بھی نہیں لیتے ہو۔ شاید کبھی سارا دن فاقے سے بھی گزار دیوت ہو۔ میں نے ایک دن تمہیں تھنڈے پانی سے اشان کرتے دیکھا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ تم نے اپنے شریر کو تکلیف اور دکھ میں رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔۔۔“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس میرا رہن سہن ہی کچھ اس طرح کا ہے۔“

”ایسا کب سے ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں سمجھتا ہوں کشیش صاحب!“

”کسی وقت تو لگتا ہے جیسے تم کوئی چلہ کاٹ رہے ہو۔“ وہ ہولے سے مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ میں چلہ ہی کاٹ رہا ہوں۔ ایک ایسا چلہ جو اب شاید میری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔ مجھے کوئی ایسا ملا تھا جو درد کو میرا اوڑھنا بچھونا بنا گیا تھا۔ وہ مجھے بتا گیا تھا کہ درد کے ساتھ زندہ رہنا کیا ہوتا ہے اور درد کے پانیوں میں ڈوب کر راحت کے موتی کیسے نکالے جاتے ہیں۔ میں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہا تھا۔ اس راہ پر کانٹے تھے جو میرے پاؤں میں ٹوٹتے

تھے لیکن اب ان کانٹوں کے ٹوٹنے سے ایک سزاوارہ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں بدل رہا تھا۔ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔

وہ چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک شخص بڑا سا طشت لے آیا۔ اس میں منخائی، خشک میوہ جات اور گرم دودھ وغیرہ تھے۔ موسم اب سرد ہو چلا تھا۔ میں نے تھوڑی سی پیٹ پوچھا۔ ساتھ ساتھ میں خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔۔۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک نہایت سنگین صورت حال میں داخل ہو چکا ہوں۔ یہاں سلطانہ راجپوت موجود تھی۔۔۔ اور وہ میری بیوی تھی۔ وہ بے رحم حالات کی زد میں تھی اور خود بھی بے رحم ہو چکی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی جو ایک بچے کی ماں بھی ہے، یکا یک زندگی اور زندگی کے سارے تقاضوں سے اتنی دور جا سکتی ہے۔ وہ زرگاں میں گھسی تھی۔ اس نے پے در پے قتل کیے تھے اور آسیب بن کر لوگوں کے حواس پر چھا گئی تھی۔ صرف چند ہفتوں میں ہی اس کا نام راجاؤں کے ہر باشندے کی زبان پر آ گیا تھا۔۔۔ خاص طور پر موہن کمار کے قتل کے بعد تو اس کے نام کے حوالے سے تہنکے بچ گیا تھا۔۔۔ لیکن وہ جھلکے اور سنسنی کا یہ سلسلہ تا دیر برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ بے شک کچھ لوگ توقع کرنے لگے تھے کہ وہ کسی روز کسی آسیب کی طرح جارج گوریا سرجن اسپتال وغیرہ کو بھی جادو سے لے کر یہ ہو نہیں پاتا تھا۔ موہن کمار کے قتل کے بعد وہ گھیرے میں آ گئی تھی اور اب اپنے نو عمر بچے تھلے طلال راجپوت سمیت ان انتہا پسند کٹر لوگوں کے قبضے میں تھی۔ وہ اسے اپنے کسی نامعلوم عقیدے کے مطابق قرار واقعی سزا دینے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک حیرت ناک اتفاق یہ تھا کہ اس قرار واقعی سزا میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے میں خود بھی گوپال کے روپ میں یہاں موجود تھا۔

میں پچھلے تین چار روز سے یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے سلطانہ کے لیے کیا کرنا ہے؟ اسے کس طرح بچانا ہے؟ کیسے اس کی اور طلال کی زندگی کو محفوظ کرنا ہے اور پھر کسی سلاستی والی جگہ تک رسائی حاصل کرنی ہے؟ لیکن یہ سب کچھ تو تب ہی طے کیا جاسکتا تھا جب مجھے اصل حالات کا علم ہوتا۔ مجھے ابھی تک تاریکی میں رکھا گیا تھا۔ کچھ بھی کھل کر نہیں بتایا گیا تھا۔ اور اب جبکہ ڈراپ سین ہونے میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا، میں بدستور اندھیرے میں تھا۔

نو کیا اس اندھیرے کا مطلب یہ تھا کہ میں کچھ نہ کروں گا اور سلطانہ و طلال کو کسی بدترین انجام سے دوچار ہونے دوں گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کم از کم آسانی سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہاں موجود تھا اور اب ایسا لاچار بھی نہیں تھا کہ بھرپور تنگ و دوں نہ کر سکتا۔ میں اب اپنے اندر مرنے اور مار دینے کی ہمت رکھتا تھا اور اس ہمت کے ساتھ ساتھ میرے اندر کچھ اور بھی موجود تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا، مجھے بار وندا جی نے دیا تھا۔۔۔ اس کی باتوں نے، اس کے فن نے، اس کے فلسفے نے۔ وہ راہو عشق کا نیپالی مسافر، وہ صبح کا تارا، وہ ٹھنڈا ہوا چراغ۔۔۔ وہ اپنی بھتیجی ہوئی لڑکی سے میرے سینے میں ایک دیا روشن کر چکا تھا۔ اس دیے کی روشنی دھیرے دھیرے میرے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ ہاں، ان لوگوں کے لیے اب سلطانہ راجپوت کو مارنا آسان نہیں تھا۔ اگر یہاں سلطانہ کی لاش گرتی تو پھر اور بھی بہت سی لاشیں گرتیں۔

شام کا وقت تھا جب سکھ بچے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھجن کی گونج سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد میرے کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی فریب اندام سادھو اندر آ گیا جسے میں نے باہر اکھاڑے میں دیکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوئی اور بنیان تھی۔ چہرے پر بھوت اور گھٹے میں مالاکیں تھیں۔ یہ یہاں کا مہا گرو تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پر نام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کی آگیا دی۔ وہ بولا۔ ”تم خوش قسمت ہو۔۔۔ تمہیں ایشور نے ایک پوتر کام کے لیے چنا ہے۔ تم نے ضرور پچھلے جنم میں کوئی بڑا پٹن کیا ہووے گا۔“

میں نے مؤدب انداز میں سر جھکائے رکھا۔

وہ اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا دھرم آشتی اور پریم کا دھرم ہے۔۔۔ لیکن کبھی کبھی کچھ مورکھ اس آشتی کو تباہ کر دینے پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ ایسے میں یہ ممکن نہیں رہتا کہ آشتی اور پریم کا دامن تمام کر رہا جاوے۔ پھر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ لڑکی سلطانہ ہے۔ تاری ذات کمزور ہوت ہے۔ اس کے خلاف کوئی کھنور فیصلہ کرتے ہوئے دکھ بھی ہوت ہے۔ لیکن اب یہ ہماری مجبوری ہے کہ اسے اس کے بچے کی سزا دیوں اور فوراً دیوں۔ ایسا نہ ہوا تو ہم سب پر سختی آوے گی۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے گردہی کہ اس لڑکی کو

کرکٹ کا ایک شوقین بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔
”ایک بات ہے یہ“ اس کے دوست نے پوچھا۔
”بیوی نے دھکی دی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ کھیلو تو وہ مجھے چھوڑ جائے گی۔“
”اوہ، واقعی بڑی خبر ہے!“
”ہاں۔۔۔ یقین کرو۔“
میں اپنی بیوی کو بہت
سرس کر دیا گا۔“

جارج ہر وقت کرکٹ
کے بارے میں سوچا کرتا تھا
اس کی بیوی نے عاجز آ کر کہا۔
”تم ہر وقت صرف کرکٹ کے
بارے میں سوچتے ہو مجھے
یقین ہے، تمہیں وہ دن بھی یاد نہیں ہوگا جب ہماری شادی
ہوئی تھی۔“

”مجھے خوب یاد ہے۔“ جارج نے غریب لہجے میں کہا۔
”اس روز کا ڈورے نے سرے کے خلاف۔۔۔ ارن ٹاٹ
آؤٹ بنائے تھے۔“

موت کے علاوہ کوئی اور کڑی سزا دے دی جاوے؟“

”ناہیں۔“ گرو نے فوراً آئینا سرنگی میں ہلایا اور اس کی آنکھوں سے نفرت پھلکنے لگی۔ وہ بولا۔ ”یہ لڑکی ابھا گیا ہے۔ اس سے بے در پے اپرا دھ ہوئے ہیں اور ہر اپرا دھ ایسا تھا جس پر اسے موت کی سزا دی جاسکتی تھی۔ اس کا سب سے پہلا اپرا دھ یہ تھا کہ اس نے مقامی رواج کے مطابق حکم جی کی پری بننے سے انکار کیا۔ اس کے باپو نے چالاکی دکھائی اور اس کا بیاہ راتوں رات ایک ایسے مکے سے کر دیا جو اپنے ہوش حواس میں ہی نہیں تھا۔۔۔ بیاہتا ہونے کی وجہ سے یہ پری بننے سے رہ گئی۔ اس کا دوسرا بڑا دوش یہ تھا کہ اس نے ہاتھ پائی کر کے حکم جی کی چھوٹی پتی رتادیوی کا جہز توڑا اور پناہ کے لیے بھاگ کر یہاں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کے پاس آ گئی۔ اس کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دھیرے دھیرے حالات خراب تر ہو گئے ہیں اور اب زرگاں اور قتل پانی میں یدھ کی فوبت آ گئی ہے۔ اس یدھ میں پتا نہیں کتنی لاشیں گریں گی۔ اس لڑکی کا آخری اپرا دھ تو کسی صورت معافی کے قابل نہیں ہے۔ اس نے مہاتما جی

”اگر یہ بڑے پنڈت مہاراج کا حکم ہے تو پھر انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے گرو جی لیکن.....“

”لیکن.... کیا؟“ گرو نے پوچھا۔

”میں سلطانہ کے بستیجے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اس کا کیا کیا جاوے گا؟“

”وہ ابھی یہاں ہمارے پاس ہی رہے گا۔ اس کے بارے میں پنڈت مہاراج بعد میں فیصلہ کریں گے۔“

میرے ذہن میں آمد ہی سی چلنے لگی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ کسی کو زندہ جلائے کی بات کرنا اور چیز ہے لیکن سچ ایک جیتے جاگتے سانس لیتے وجود کو رسیوں سے باندھ کر آگ میں بھسم کر دینا اور بات۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس زمین دوز ہال میں اور اس سے ملحقہ کوٹھڑیوں اور رابداریوں میں کم و بیش ایک سو افراد موجود ہیں۔ مجھے ابھی تک ان میں کوئی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ یہ اپنے چہروں مہروں سے ہی شدت پسند لوگ نظر آتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے چہروں پر بھوت لٹ رکھا تھا اور گیر واد کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں کا کرتا دھرتا تو ایک جنگ جیت نامی شخص تھا جو مجھے ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا تاہم ستیش کو بھی یہاں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔

میں سلطانہ اور طلال کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان لیتے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی یہ پہچان ظاہر بھی کر دیتا۔ ایسی صورت میں میرا بھانڈا فوراً پھوٹ جاتا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک شخص نے دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر آ گیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے ایک تھا۔ یہ بھدی آواز والا وہی شخص تھا جو ذرا لکڑا کر چلتا تھا اور جسے میں حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔

عیار آنکھوں والا یہ شخص بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والوں میں سے تھا۔ اس نے سب سے پہلی اطلاع تو مجھے یہ دی کہ مختار راجپوت کی اپرا دھن بیٹی کو پنڈت مہاراج کے حکم کے مطابق موت کے گھاٹ اتارنے کا عمل آج نہیں ہو گا اس میں تھوڑی سی تاخیر ہے۔

کے ایک دھرم اوتار کو بیدردی سے قتل کیا ہے اور ان کا سر کاٹا ہے۔۔۔۔۔ زر گاں کے بڑے پنڈت مہاراج نے اس کے لیے جو سزا تجویز کی ہے، وہ دھرم کا پالنہ تو کرے گی ہی۔۔۔۔۔ اس اپرا دھن کے لیے بھی وہ سزا چھٹکارے کا سبب بنے گی۔ اس کے سارے باپ اپنی سزا سے ڈھل جائیں گے۔ اس کی آتما کو شانتی ملے گی۔۔۔۔۔“

”یہ سزا کیا ہے مہا گرو؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ناگ پھنی کی خشک لکڑی سے چتاتار کی جاوے گی اور اس میں اسے جلا یا جاوے گا۔“

”زندہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہو گی تو زندہ ہی لیکن اپنے ہوش حواس میں ناہیں ہو گی۔ اسے افیم کا ست پلا یا جاوے گا پھر اگنی میں رکھا جاوے گا۔“

میں اندر سے لرز گیا۔ اندھے عقیدے انسان کو کیسے کیسے کاموں پر مجبور کر دیتے ہیں۔ توہم پرستی دھرم کا لبادہ اوڑھ کر کسی آسیب کی طرح انسان سے چھٹی ہے اور اسے کائنات کی سب سے ناقص العقل شے بنا دیتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”مہا گرو! اس سارے عمل میں میرا کردار کیا ہووے گا؟“

”وہی جو بڑے پنڈت مہاراج نے تمہارے لیے چنا ہے۔ چاند کی چوٹی رات کو تم کالی کے مندر میں داخل ہوئے اور وہ پہلے منٹ بنے جو رام پرشاد کے پریوار کے ساتھ پوجا کے لیے بیٹھا۔ تم اب اگارش بنو گے۔“

”یہ اگارش کیا ہوتا ہے مہا گرو؟“

”جو کسی بُری آتما کو پاپوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے اس کی مدد کرتا ہے۔ تم سلطانہ کی چتا کو اگنی دکھاؤ گے۔“

میں سنائے میں رہ گیا۔ ساری بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ یہاں سلطانہ کو زندہ جلا یا جانے والا تھا۔ یہ کام ایک خاص شخص کے ہاتھوں ہونا ضروری تھا۔۔۔۔۔ اور پتا نہیں کیسے وہ خاص آدمی میں بن گیا تھا۔ جب کالی کے مندر کے پاس بھرے بازار میں اچھے کے حوالدار کی نظر سے بچنے کے لیے میں مندر میں گھسا تھا، مجھے ہر گز پتا نہیں تھا کہ میرا یہ اقدام مجھے لے کر کس راستے پر چل نکلے گا۔

مہا گرو نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پرتو! کیا تم اس کام کے لیے تیار ہیں ہو؟“

اس کی یہ اطلاع میرے لیے سکون کا باعث بنی۔ تاہم ابھی مجھے اس اطلاع پر پوری طرح یقین نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ستیش یا مہا گرو مجھے خود آکر بتائیں مگر ستیش نہ جانے کن مصروفیات میں الجھا ہوا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کی بات چیت میں بھدی آواز والا یہ ارجن نامی شخص مجھ سے مزید بے تکلف ہو گیا۔ وہ انتہا پسندی کی ہر تعریف پر پورا اترتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اس میں کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا، خاص طور سے مراد شاہ اور ان کے حواریوں کے لیے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ چھوٹے سرکار کو اپنا دھرم تبدیل کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور دھرم سے دھرم کے پانی کی راج گدی پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے منہ سے جیسے چنگاریاں چھوٹی تھیں۔

وہ بولا۔ ”ہم نے بہت سہ لیا ہے۔ اب ہم اینٹ کا جواب پتھر سے بلکہ گولی سے دیویں گے۔ اپنے ایک بالک کے بدلے میں ان کے دس بالکوں کی ہتھیا کریں گے۔ اپنی ایک عورت کے بدلے میں ان کی دس عورتوں سے بلاد کار کریں گے۔ اب ہمارے ہاتھ کوئی ناہیں روک سکتا۔ اب ہمیں چپ ناہیں رہنا چاہیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی چپ ناہیں رہنا چاہیے۔ میں تو تم کو بھی مشورہ دوں گا گویاں..... اب کنارے پر رہنے کا ناہیں، طوفان میں کودنے کا وقت ہے۔ جو کنارے سے تماشادیکھیں گے، وہ باپ کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو کسی جتھے میں شامل کر لو۔ ضروری ناہیں کہ یہ ہمارا ہی جتھا ہو۔ بھگوان کی کرپا سے اب اور بھی بہت سے لوگ یہ کام کر رہے ہیں..... وہ جوش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارجن نے گفتگو کا رخ ایک اور جانب موڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت چمکنے لگی اور مسکراتے لہجے میں زہر سرایت کر گیا۔ اس نے مجھے ایک اور مسلمان لڑکی کے بارے میں بتایا جو یہاں موجود تھی اور جسے اس کے کرموں کی قرار واقعی سزا مل رہی تھی۔ میں یہ سن کر لرز گیا کہ اس بے بس لڑکی کو یہاں موجود انتہا پسند ڈشکرے کئی روز سے زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

ارجن نے ایک آنکھ میچ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”اگر چاہو تو تم بھی اس بستی گنگا میں بائو دھوسکت ہو۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“

Scanned and Uploaded By Nadeem

وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”سیانے کہتے ہیں جو چیز بے کار جا رہی ہو، اسے بے کار جانے سے پہلے استعمال کر لینا چاہیے۔ اس چھو کری کو بھی ایک دو دن میں مکت (ختم) ہو جاتا ہے تو پھر کیوں نہ یہ کسی کے کام آجاوے۔“

”تمہارا مطلب..... بلاد کار سے ہے؟“

”بلاد کار ناہیں..... انصاف..... انصاف..... نیانے.....“ ارجن کے لہجے میں پھر بے پناہ زہر اتر آیا۔ ”اس حرامزادی کے بھائی نے ایک برہمن لڑکی کے ساتھ زیادتی کی۔ بیاہ کا جھانسا دے کر اسے اغوا کیا۔ کئی روز تک ایک کرائے کے مکان میں بند رکھا۔ خود اس کے ساتھ سوتا رہا، اپنے دوستوں کو بھی سلاتا رہا۔ اس ”پُن کام“ میں اس حرامزادے کی بہن بھی پوری طرح شریک تھی۔ وچولی بنی ہوئی تھی..... ملاقاتیں کراتی تھی۔“

میں حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ ”اب کہاں ہے وہ لڑکا؟“ میں نے پوچھا۔

”بھاگ گیا کتا، احمد آباد کی طرف..... لیکن ہمارے بندے پیچھے ہیں۔ ایک نہ ایک روز دھریں گے اسے۔“

”اور یہ لڑکی وہی ہے اس کی بہن..... ملاقاتیں کرانے والی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”ناہیں، یہ وہ ناہیں۔ اس بد ذات کو تو ہمارے جتھے کے جوانوں نے وہیں مار ڈالا تھا، اس کے گھر میں۔ مار مار کر بھرتا بنا دیا تھا اس حرامزادی کے تھوڑے کا۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ زندہ ہاتھ آگنی بھی گھر کے پیچھے کمرے سے۔ وہاں ایک بڑے جستی صندوق میں چھپ گئی تھی۔“

میری نگاہوں میں اس لاش کا منظر گھوم گیا جو چند دن پہلے ہم نے شہر کے ایک اندرونی محلے میں دیکھی تھی۔ تھانے دار محمود اور کپتان اچھے وغیرہ کو شک ہوا تھا کہ یہ شاید سلطانہ کی لاش ہے۔ مجھے لاش کا سب سے زیادہ آیا اور جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ ارجن نامی غنڈا اسی بد قسمت لڑکی کا ذکر کر رہا ہے.....

اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھاما اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ”میں رات کو دس گیارہ بجے کے قریب آؤں گا۔ ستیش بابو سے ان باتوں کا ذکر ناہیں کرنا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ابن آدم جب پستی میں گرتا ہے تو کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض لوگ انتہا پسندی کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو ہم پرستی کے خیر سے جنم لینے والے انتہا پسند ہر مذہب، ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔۔۔ اس کی ایک ناقابل تردید و کرب ناک مثال میرے سامنے تھی۔ میں کچھ ایسے لوگوں کے درمیان تھا جو انتہا پسندوں سے بھی آگے کی شے نظر آ رہے تھے۔ وہ بد اخلاقی اور سفاکی کی ہر حد سے گزر رہے تھے۔

مقررہ وقت پر ارجن میرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے کسی شے کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تازی تھی۔ وہ ایک راہداری سے گزار کر مجھے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں سات آٹھ بندے موجود تھے۔ کچھ تاش کھیل رہے تھے، کچھ لفافوں میں لیے سگریٹ پھونک رہے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ ان سب نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور چپکے چپکے مسکرائے بھی۔

ٹیشے کی ایک لمبی بوتل تازی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ارجن نے مجھے پینے کی پیشکش کی لیکن میں نے شکرے کے ساتھ انکار کر دیا۔ ہم گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ ارجن کوشش کر رہا تھا کہ میں باقی افراد سے بھی بے تکلف ہو جاؤں۔ وہ سب صورتوں سے چھپتے ہوئے بد معاش نظر آتے تھے۔ کئی ایک کے چہرے پر سننے و پرانے زخموں کے نشان موجود تھے۔ وہ مراد شاہ کے بارے میں اور اس کے ایک ہم زلف کے بارے میں نہایت نازیبا گفتگو کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ نکلی گالیاں ہی بک رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بیٹنگن کے پکڑے کھائے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کمرے کا ایک بنگلی دروازہ کھلا اور ایک لمبا ترنگا شخص تازی کے نشے میں ڈوبا اور اپنی قمیض درست کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ گنگنارہا تھا۔۔۔۔۔ رام تیری گزگا میلی ہو گئی۔۔۔۔۔ ہورام تیری گزگا میلی ہو گئی۔۔۔۔۔

اس نے دو تین پکڑے کھائے اور پھر دھب سے ایک چار پانی پر گر گیا۔ ارجن نے چند لمحے تک مجھے غور سے دیکھا پھر ایک آنکھ بھینچی اور مجھے اودھ کھلے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس صورت حال کو اب کچھ سمجھنے لگا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ سجائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ارجن نے سرور سلجھ میں کہا۔ ”بج رنگ ملی کی ہے۔۔۔۔۔ ہر شیر لگے ہو بھی۔“ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ”کچھ اور ناہیں تو یہی لے جاؤ۔“

میں نے پیکٹ ہوائیں دبوچ لیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر لائٹیں کی مدھم سی زرد روشنی تھیں۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک پلنگ پر بوسیدہ سے لحاف کے نیچے مجھے بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آئی۔ یہ ایک بیس بائیس سال کی لڑکی تھی۔ اس کے روکھے پھیکے بال منتشر اور چہرہ لائٹن کی روشنی ہی کی طرح زرد اور بیمار تھا۔ رورو کر اس کی آنکھیں پیچھی ہو چکی تھیں اور ہونٹ خشک ہو کر سیاہی مائل ہو چکے تھے۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح اپنے ارد گرد سے لا تعلق پڑی تھی۔ رخسار پر ایک دو کھیاں بھینھنا رہی تھیں۔

اس نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ شرم نہ خوف، نہ غصہ نہ بیزاری۔ وہ بس اسی طرح پھول دار لحاف کے نیچے بے لباس پڑی رہی۔ روندی مسلی ہوئی، پکلی ہوئی اجاڑی ہوئی۔ وہ جیسے صدیوں سے ایسے ہی پڑی تھی۔ آدم کے بیٹوں سے پوچھ رہی تھی۔ میں کائنات کا حسن ہوں۔ میں نازک ترین جذبوں کی کھکشاں ہوں۔ میں محبت کی خوشبو اور زندگی کی روح ہوں۔ میرے بے لوث جذبوں نے زندگی کو زندگی بنایا ہے۔ تو پھر۔۔۔۔۔ میں زندگی کو زندگی بنانے والی۔۔۔۔۔ زندگی سے اس قدر دور کیوں کر دی جاتی ہوں؟ کیوں مجھے نا کردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے؟ کیوں ہر ظلم و ستم کا رخ کسی نہ کسی طور میری طرف موڑ دیا جاتا ہے؟ مجھے کچل مسل کر ناقابل شناخت بنا دیا جاتا ہے؟ جیسے میں اب تمہارے سامنے پڑی ہوں۔ شاید تم بھول رہے ہو، میرے گرم ہونٹوں پر گلاب کھلا کرتے ہیں۔ میرے دل آویز جسم میں خوشبودار محبت کے چشمے بہا کرتے ہیں۔ میری بانہوں میں سا کر تم مرد و زن کی محبت کا ناقابل فراموش لمس حاصل کر سکتے تھے۔۔۔۔۔ لیکن اب تم کیا حاصل کرو گے؟ کچھ بھی نہیں۔ مجھے پانے سے پہلے ہی تم مجھے کھو چکے ہو۔ تم ایک سرد باسی گوشت پر جھپٹے مارو گے۔ بالآخر تمہارے جسے میں کراہت، ندامت اور کچھتاوے کے سوا

کچھ نہیں آئے گا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں لحاف کے نیچے پڑی اس لڑکی کی خاموش آواز سن رہا۔ یہ آواز میرے رگ و پے میں سمائی رہی۔ وہ جو کہہ رہی تھی، ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں ہولے سے اس کے قریب کر رہی پر جا بیٹھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی۔ اسے جیسے توقع نہیں تھی کہ میں بستر کے بجائے کرسی کی طرف بڑھوں گا۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ وہ میری طرف اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہر سلوک کے لیے تیار تھی لیکن اس سلوک کے لیے تیار نہیں تھی جو میں اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ میں نے لحاف کا کونا اوپر کی طرف کھینچا اور لڑکی کا عریاں کندھا اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے لباس پہننے کا کہوں لیکن میرے ایسا کرنے سے ارجن اور اس کے ساتھی چونک سکتے تھے۔۔۔۔۔ اور مجھے اپنا بہروپ برقرار رکھنا تھا۔

میں نے اس کے بوسیدہ بالوں کی لٹیں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہلکے سے بخار میں تھی۔ میرا نرم روتیہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔ ”کب سے ہو یہاں؟“

”کچھ یاد نہیں۔“ وہ سسکی۔ ”کیا واقعی تمہارے بھائی نے کسی لڑکی کو اٹھایا تھا۔۔۔۔۔ اور اپنے پاس رکھا تھا؟“

”میں۔۔۔۔۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔۔۔۔۔ اور یہ سب کچھ بتانے سے۔۔۔۔۔ کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ہونا وہی ہے جو پہلے ہوتا آیا ہے۔ تم بھی وہی کرو گے اور چلے جاؤ گے۔“ اس نے بیزاری سے اپنا منہ پھیر لیا۔

”ناہیں۔۔۔۔۔ میں وہ نہیں کروں گا جو ہوتا آیا ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں سو گند دیتا ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھا۔

میں اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسی طرح پھول دار لحاف میں سنی لیٹی رہی، میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھائی بے تصور تھا۔ وہ برہمن لڑکی خود ہی اس کے بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہر صورت اس سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ جب کوئی راستہ باقی نہ رہا تو وہ دونوں گھر چھوڑ گئے۔ بعد میں انہیں پکڑ لیا گیا اور اس کے بھائی پر بے شمار

جھوٹے الزامات لگا دیے گئے۔ اس کی بڑی بہن کو اس الزام میں مار دیا گیا کہ وہ اس برہمن لڑکی کی ملاقاتیں بھائی سے کرواتی تھی۔ وہ لوگ اسے اٹھا کر یہاں لے آئے اور اب وہ آٹھ دس دن سے یہیں پر بند تھی۔ اس کا نام شکیلہ تھا۔

یہاں اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا۔ وہ بدست خطرناک غنڈوں کا تحفہ مشق بنی ہوئی تھی اور چند ہی دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے گی۔ اتنی ہمت اس میں نہیں تھی کہ خود کشی کر سکتی ورنہ کب کا موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔

کمرے کے ایک کونے میں اس کا لباس بکھرا پڑا تھا۔ طاق دان میں لائٹن کے ساتھ کھانسی اور بخار وغیرہ کی دوا رکھی تھی۔ یہیں پر ایک کونے میں، میں نے ایک بیلچہ پڑا دیکھا جس کے دستے پر گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اور کسی دیوی غالباً کالی ماتا کی شبیہ کھدی ہوئی تھی۔ بیلچے کے پھل کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور زرد لائٹن کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے بیلچے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کالی ماتا کا بیلچہ ہے۔“ وہ نحیف آواز میں بولی۔ ”کالی ماتا کا بیلچہ؟ یہ یہاں کیوں رکھا ہے؟“ ”میں اس سے منی کھودتی ہوں۔“ وہ منمنائی۔ ”وہ کہوت ہیں کہ میں تلخی کے پودے کے بیج سے منی کھودوں گی تو مجھے وہاں سے شیواجی کے نام کی مہر ملے گی اور اگر چار دن کے اندر مجھے یہ مہر مل گئی تو پھر وہ مجھے چھوڑ دیوں گے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ میں اب جینا نہیں چاہتی۔ تم لو گن مجھے ماری دو تو اچھا ہے۔“ وہ واقعی زندگی سے بیزار نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف تو تھا مگر زندگی کا خوف شاید اس سے زیادہ تھا۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرنے کے لیے اپنا ہاتھ لحاف سے باہر نکالا تو مجھے اس کی ہتھیلی پر چھالے نظر آئے۔ اس کے بتائے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ چھالے بیلچہ چلانے کی وجہ سے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ”شکیلہ! اگر تم زندگی سے اتنی ہی بیزار ہو چکی ہو تو پھر ان لو گن کے کہنے پر بیلچہ کیوں چلاوت ہو؟“ ”یہاں کچھ بھی میری مرضی سے نہیں ہوتا۔“ وہ سسکی۔ ”کل میں نے منی کھودنے سے انکار کیا تھا،

میری قمیص پھاڑ دی گئی اور مجھے مارا گیا۔“
 میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک طرف ایک
 الماری پر تہ شدہ جائے نماز رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔
 ”یہ کس کی جائے نماز ہے؟“
 ”میری.... میں اس پر نماز پڑھت ہوں۔“
 ”کیا یہ لوگ تمہیں پڑھنے دیوت ہیں؟“
 ”ہاں، ان کو اعتراض نہیں۔ رات ہونے سے پہلے
 میں جو کچھ چاہوں کر سکت ہوں۔“ وہ دردناک لہجے
 میں بولی۔

میں اس صورت حال پر ششدر تھا۔ شیواجی کی مہر والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ بھی کسی کنڈلی کی وجہ سے کیا جا رہا تھا؟

میں نے اس شکلیہ نامی بد حال لڑکی سے سلطانہ کے بارے میں سن سگن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتا نہیں کیونکہ اسے بہت کم اس کمرے سے باہر نکلنے دیا جاتا ہے۔ ہاں دو دن پہلے رات کے وقت بجرنگ ملی اور ہنومان کی سیچے کے زوردار نعرے سنائی دیے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ خوشی میں ہوائی فائرنگ بھی کی گئی ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ اس وقت اس نے گرو جی کی دھرم پتی راوہاجی کو ایک ملازم سے باتیں کرتے سنا تھا۔ ملازم گرو کی پتی کو بتا رہا تھا کہ کسی لڑکی کو رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا ہے۔ وہ دیوی دیوتاؤں کو بڑے ناموں سے پکار رہی ہے اس لیے اس کے منہ میں مٹی بھر کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا گیا ہے۔

”کیا کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ یہاں آیا تھا؟“

میں نے پوچھا۔

”شاید کسی لڑکے کی بات بھی ہو رہی تھی۔“ شکیلہ نے تصدیق کی۔

میں قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک شکیلہ کے پاس رہا۔ اس دوران میں، میں نے دو تین سگریٹ بھی پھونکے۔ میں شکیلہ سے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ وہ جانتی ہے کہ وہ بچ نہیں سکتی اس لیے مرنے کے لیے تیار ہے۔ شاید وہ اپنے طور پر مزاحمت کا حق ادا کر چکی تھی اور اب اس نے خود کو کئی طور پر بدترین حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اس سے رخصت ہو کر باہر

آگیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔

میں اپنے سینے پر ایک بہت بڑا بوجھ لے کر اس کمرے سے نکلا۔ ار جن اور اس کے ساتھیوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے باہر آتے ہی ار جن کے ایک اور ساتھی نے اپنی مونچھوں کو سہلایا اور ٹوکی والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا رہا۔ میرے اندر آگ سی روشن تھی۔ جی چاہ رہا تھا، اس کڑا کے کی سردی میں تیز بارش ہو۔ میں برہنہ جسم کسی مجسمہ جھیل کے کنارے، سرد ہواؤں کو چیرتا ہوا بھاگتا چلا جاؤں۔ میرا سینہ اتنا ہانپ جائے کہ پھٹنے لگے، میرے پاؤں خون اگلنے لگیں۔ پھر میرے سامنے میرا کوئی پھرا ہوا دشمن آجائے۔ اس کی آنکھوں میں قاتل سرخی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر چھپنے اور میں پوری وحشت سے اس پر ٹوٹ پڑوں۔

میری سانس تیزی سے چلتے لگی۔ رنگ پٹھے تن گئے۔ میں اٹھ کر اس مختصر کونھڑی میں ٹھہرنے لگا۔ باہر ہال کمرے میں شور تھا۔ لگتا تھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ہلاکتا کر رہے ہیں۔ میں نے ایک میز پر چڑھ کر ایک روزن میں سے ہال کمرے میں جھانکا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ ایک طرف فرش پر لمبی چٹائی بچھی تھی۔ اس پر تین چار افراد بیٹھے کچھ گھوٹ رہے تھے۔ نکڑی کے رنگین ڈنڈوں پر ٹھنڈو چڑھے ہوئے تھے۔ پیالوں میں بھر بھر کر کچھ پیا بھی جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھنگ کا دور چل رہا ہے۔ ایک بٹا کتنا شخص جس نے چہرے پر بھبھوت ملا ہوا تھا، ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں گہرا سرمہ لگایا ہوا تھا، مجھے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین نوک والا نیزہ تھا جسے ترشول کہا جاتا ہے۔ وہ شیوہتی کے نام کے نعرے لگا رہا تھا اور کچھ افراد اس کے گرد رقص کر رہے تھے۔ دفعتاً میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میری تمام حیات سمٹ کر آنکھوں میں آئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ارد گرد کی ہر شے گردش میں آگئی ہے اور میں زمین سے اٹھ کر فضا کے بسیط میں معلق ہو گیا ہوں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پھر غور سے دیکھا۔ جو کچھ نظر آ رہا تھا، وہ تصویر یا قیل نہیں تھا۔۔۔ ایک جیتا جاگتا منظر تھا۔۔۔ مجھے عمران دکھائی دیا۔ ہائی کی دھواں دھواں فضا میں چہروں کے بخوم میں، میں نے اس کا روشن چہرہ صاف اور

واضح نہ تھا۔ اس کے گلے میں ایک گلابی رومال تھا، وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ بس ایک یادوسینٹھ کے لیے۔ پھر ایک انکی وہ چہروں کی بھیڑ میں تم ہو گیا۔

”عمران عمران!“ میں پھپھیزوں کی پوری طاقت سے چلایا۔

تب میں جست لگا کر میز سے اترا۔ ایک جھٹکے سے
کمرے کا دروازہ کھولا اور راہداری میں آ گیا۔ (اندھا
دھند بھاگتا ہوا میں ہال کمرے میں دھواں دھواں فضا
میں پہنچا اور اس مقام کی طرف لپکا جہاں میں نے اس کی
جھٹک دیکھی تھی۔ وہاں خاکستری رنگ کے گولی ستون
کے پاس وہ موجود نہیں تھا۔ ”عمران..... عمران.....!“
میں ایک بار پھر چلایا۔

کئی لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں دیوانوں کی طرح باروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ تب مجھے پتھر ملی سبزھیوں کے پاس جہاں ہاتھی کا ایک شکستہ مجسمہ موجود تھا، پھر گلابی رومال کی جھلک نظر آئی۔ میں لوگوں کو چہرہ تادیر نفٹ اشیاء سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھا۔ تاہم میرے وہاں پہنچتے پہنچتے گلابی رومال اور جھل ہو چکا تھا۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ کس کو ڈھونڈت ہو؟“ ایک راز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ہر آواز کو نظر انداز کرتا ہوا سبز حیاں چڑھتا گیا۔ دونوں طرف طویل برآمدے تھے اور شکستہ دونوں کی قطاریں تھیں۔ یہاں بہت سی کونھریاں بھی جود تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح مختلف کونھریوں (جھا نکرا رہا۔۔۔۔۔ لیکن کچھ نہیں ملا۔

میں وہیں ایک سیڑھی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کیا
 میری نظر دھوکا کھا رہی تھی؟ کیا میرا تصور مجھے فریب
 سے رہا تھا؟ اس کا تصور اکثر و بیشتر میرے حواس پر چھا
 تھا اور میں اسے اپنے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔
 یہ تصور اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ تصور اور حقیقت
 تمیز مشکل ہو گئی تھی۔۔۔؟
 ”کیا ہوا گویا؟“ ستیش کی آواز میرے کانوں
 میں بڑی اور میں چونک گیا۔

”کیا کسی جان پہچان والے کو دیکھا ہے تم نے؟“

میرے سوا ایک دوست کو اس کے بیٹے کے مسئلے میں اسکول طلب کیا گیا۔ میڈیٹر کو نوٹ کر کے اسکول ورک راضی ہو کر بڑی تشویش تھی۔
”دیکھیے انصاری صاحب“ اس

نے ہمیشہ دوست سے کہا: ”اپ کا بیٹا عاصم آج کل بڑھنے لگتا ہے۔“
 بھگتے پر کوئی توجہ نہیں دے۔ اس کی کلاس بچہ نے
 چھپا کر پانی پتے کی لڑائی کس کس نے لڑی تھی تو عاصم نے
 اب دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔

سید کے دوست نے کہا: ”یہ ستر صاحب! اگر میرا لڑکا کہتا ہے کہ اسے لڑائی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو یقیناً خیر ہے وہ بالکل معصوم اور سچا ہے کسی لڑائی جھگڑے سے ہاں ہونی تعلق نہیں ہو سکتا۔“

ہینڈ اسٹریکی زبان اچانک گنگے ہو گئی۔ وہ تعجب سے
سے دوست کی طرف دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

میرا دوست اپنے بیٹے کو اسکول سے لے کر گھر واپس
راستے میں ایک جگہ سرخ روشنی پر اُسے کار روکنی پڑی۔

میں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا: ”عام ایک بات سمجھ بیڑا سٹرکے سامنے تو میں نے تمہیں بچایا ہے لیکن اگر یہ بھی مجھے چاہیے کہ پانی پیت کی کڑائی سے تمہارا کوئی نالہ جسے تو میں تمہاری کھال دھوڑوں گا۔“

سے مبہم جواب دیا۔

..... تھا ایک پرانا دوست لیکن وہ یہاں
تھے؟ وہ ہم ہی ہوا ہے۔“

یہ بعد میں اس ہنگامے سے نکل کر پھر اپنے
جسم میں سنناٹا نہ تھی اور کان سائیں
رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو
چاہا جاتا ہے، وہ جدائی کے بعد بھی بیولوں کی
ہمارے ارد گرد موجود رہتے ہیں۔ ہمیں
ان کی جھلک نظر آتی ہے اور آوازوں پر ان
شبیہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے باروندا جیلی کی
سامنے تھی۔ میں نے اس کے چہرے میں
تک ڈھونڈ لی تھی۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ جھلک کچھ
میں نہیں تھی۔

سب مجھے کسی اور چہرے میں اپنے پچھڑے سے پار
دکھائی دی گئی؟ میں سوچتا رہا اور سر میں

نہیں سی اٹھنے لگیں۔ نہ جانے میں کب تک اس عجیب ذہنی کیفیت میں رہا۔ ہال کمرے سے دھیمہ شور اب بھی ابھر رہا تھا۔ میں اس شور کو سنتے سنتے سو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز شام تک بے چینی کی کیفیت رہی۔ اس بے چینی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ جھلک جو میں نے کل رات دھواں دھواں ہال کمرے میں دیکھی تھی۔ یہ میرا تصور ہر گز نہیں تھا اور اگر یہ چہروں کی مشابہت تھی تو بھی حیرت انگیز تھی۔ پریشانی کی دوسری وجہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تھے جو میں نے کل شب لٹی پر اکیلے کے ساتھ گزارے تھے۔ اس کھنڈر میں رات گلوں کے سائے تلے اور بارود کے گھیرے میں وہ بے بسی کی تصویر بن چکی تھی۔ اگر میں سلطانہ کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر ضروری تھا کہ شکلیہ کے لیے بھی ایسا ہی ارادہ رکھوں۔

میری مہمان نوازی کا پورا پورا خیال رکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کٹر ہندو ہونے کے باوجود ارجن نے مجھے چپکے چپکے یہ آفر بھی کر دی کہ اگر میں ماس یعنی گوشت کھانا چاہوں تو وہ بھی میا کیا جاسکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ سہ پہر کے وقت مجھے راہداری میں گردی کی پتی کی ایک جھلک بھی نظر آئی۔ وہ گرو سے خاصی کم عمر تھی اور خوب صورت بھی تھی.... اس کی ماں گرو سے سینہ دہر تھی اور وہ نہایت چمکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ دو دایاں مڑوب انداز میں اس کے ارد گرد موجود تھیں۔ تاہم مجھے گرو کی یہ جواں سال دھرم پتی کچھ سمجھی ہی نظر آئی۔

شام کے فوراً بعد ہال کمرے میں بالکل سی محسوس ہونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ آج رات یہاں مجھ کو کھانے والے ہیں۔ بھجن مسلسل پڑھے جا رہے تھے۔ گاہے بگاہے سکھ کی آواز سنائی دیتی تھی اور پھر ایک نفاہ سا پیٹا جانے لگتا تھا۔ لگتا تھا کہ ہال کمرے میں دوام بڑھتا جا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر وزن میں سے کتنا چاہتا تھا مگر میں نے جو تپائی روزن تک پہنچنے کے لیے استعمال کی تھی، وہ کسی ضرورت کے تحت باہر لے جائی جا چکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں منکسل اضافہ ہو رہا تھا.... چھٹی جس کہہ رہی تھی کہ سلطانہ سے عنقریب میری ملاقات ہونے والی ہے اور نہایت سنگین حالات میں ہونے والی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے فضا میں تھوڑی سی حدت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھی۔ اس پتھر میں سے اس نے میرے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی پر تھوڑا سا تیل ڈالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پرتو! تم تیار ہو؟“

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ ”مجھ کو لگتا ہے کہ تم کچھ کھوئے کھوئے ہو۔ کیا کسی کو ڈھونڈت ہو؟“ شور میں اس کی آواز بہ مشکل میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس لیے وہ زور سے بول رہا تھا۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہت ہو؟“

جواب میں اس نے رازدارانہ انداز میں جو کچھ کہا، اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ بولا۔ ”پرتو! میں جانت ہوں..... تم اپنے کسی بچھڑے سنگی کو دیکھ رہے ہو۔ تمہارے من میں آشا ہے کہ شاید ان کھن گھڑیوں میں وہ تمہیں کہیں آس پاس مل جائے۔“

”تت..... تم..... کس کی بات کرت ہو؟“

”عمران کی۔“ اس نے دوسرا دھا کا کیا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے جیسے ایک دم مل گئے۔ میرا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔

”تت..... تم..... اس کو کیسے جانت ہو؟“ میں نے دھندلائی نظروں سے اسے سر تا پا دیکھا۔

وہ مسکرایا۔ مجھے اس کے ہموار دانت کی قطار نظر آئی۔ اس کی ٹھوڑی کا گڑھا نظر آیا۔ اس کے ابھرے ہوئے رخسار دکھائی دیے۔ بھبھوت سے لٹھڑے ہوئے چہرے میں سے ایک اور چہرہ ابھرا۔ وہ میری زندگی کے سب سے حیرت ناک لمحے تھے۔ مجھے لگا کہ میں چکرا کر گر جاؤں گا۔ وہ اپنی اصل آواز میں بولا۔ ”اتنی جلدی بھول گئے جگر! تمہاری یادداشت میں واقعی کوئی گڑبڑ گونا گونا ہو چکا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو میری والدہ میرے کانوں میں بلکہ جسم کے دیگر سوراخوں میں بھی بادام روغن ڈال دیا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے میرا حافظہ اب تک بہت اچھا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہاری نگہداشت اس طرح سے نہیں ہوئی.....“

میں ارد گرد سے بیگانہ ہو کر جیسے ہواؤں میں معلق ہو چکا تھا۔

خط من کے اڑوں میں سفر کرتے جانناؤں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

اس لمحے میں ان سارے احسانات کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کیا جو وہ ایک بیوی کی حیثیت سے مجھ پر کرتی رہی تھی..... اور ان ساری قربانیوں کا بوجھ بھی جو وہ میری بے خبری میں میرے لیے دیتی رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ دیوانہ وار پگڈا کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھسی تھی اور اپنی جان پر کھیل کر مجھے باہر لائی تھی اور پھر اس کے بعد میری سلامتی کے لیے اس کی جدوجہد کا طویل دور شروع ہوا تھا۔ آج وہ خود شعلوں کی زد میں تھی۔ میں تو پھر بھی پگڈا میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا، وہ تو آج ہوش و خرد سے بیگانہ بالکل لاپچارہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لیے عجیب سی چاہت محسوس کی۔

چتا کے ارد گرد برپا شور و غل عروج پر پہنچ گیا۔ بہت سے جوشیلے نوجوانوں کے ہاتھ میں ترشول تھے۔ ان میں سے کچھ نے بھبھوت رمار کھا تھا یا اپنے چہروں پر رنگوں سے مختلف نقش و نگار بنائے ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایک خاص رسم کی ادائیگی کے لیے بالکل تیار ہیں.....

چتا کے بالکل سامنے لکڑی کی ایک اونچی چوٹی پر مہا گرو فقط ایک دھوتی پہنے، آلتی پالتی مار سے بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے مالا چپ رہا تھا اور گاہے بگاہے اشلوک بھی پڑھتا تھا۔ ایک بوڑھا بچاری آگے بڑھا اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک مشعل نما چیز تھما دی۔ میرے بدن میں سرد نہر دوڑ گئی..... تو بدترین لمحے پہنچ گئے؟ صاف چتا چل رہا تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں چتا پر تیل انڈیلا جانے والا ہے اور اس منحوس لکڑی کو روشن کیا جانے والا ہے تاکہ میں چتا کو آگنی دکھانے کا اعزاز حاصل کر سکوں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے سامنے بس ایک ہی راستہ ہے۔ اپنے ارد گرد موجود درجنوں رائفٹل برداروں میں سے میں کسی ایک کی رائفٹل چھین لوں اور اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دوں۔ مار دوں..... مر جاتا یا پھر کسی طرح سلطانہ کی مدد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کامیابی کا امکان معدوم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے دل نے گوانی دی کہ ”بہت کچھ“ ختم ہونے والا ہے اور اس ”بہت کچھ“ میں سلطانہ اور میں بھی شامل ہیں۔ ایک نوجوان جس نے چہرے پر بھبھوت ملا ہوا تھا، آنکھوں میں رنگ لگایا ہوا تھا اور فقط ایک دھوتی پہن رکھی تھی، وہ میرے قریب

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

والی لکڑی میں میں نے تیل ڈال دیا ہے۔ اس کو آگ دکھاؤ اور چتا جلانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

میرا دل چاہا کہ دوڑ کر عمران سے لپٹ جاؤں۔ اس کو اپنے بازوؤں میں کس لوں اور دھاڑیں مار مار کر روتا چلا جاؤں۔ میرا سر بدستور چکرا رہا تھا۔ عمران کا چہرہ میری آنکھوں کے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ سینے میں ایک دم ہی سیکڑوں سوال مچنے لگے تھے لیکن ابھی سوال و جواب کا وقت کہاں تھا۔ ابھی تو ہم ایک نہایت سنگین مقام پر پہنچے تھے۔ یہاں ایک جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا۔ جنونیوں کا گروہ کسی وحشی قبیلے کے لوگوں کی طرح یوانہ وار چپتا کے گرد ناج رہا تھا، سنگھ بجا رہا تھا اور تھارے بیٹ رہا تھا۔ جس جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا، وہ سلطانہ تھی... میری بیوی تھی۔

ایک دم مجھے لگا کہ میرے جسم میں توانائی کا ایک نیا مندر لہریں لینے لگا ہے۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ میرے دماغ کو بے نام حرارت اترتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ اب کوئی مشکل... مشکل نہیں رہی۔ اب کوئی دیوار میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔ اب میں اکیلا نہیں تھا... اب کوئی میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا تھا اور یہ ”وہ“ تھا جس کا دلیرانہ ساتھ کے لیے میں ایک مدت تک ترسا تھا۔

میرا آشوب گھڑیوں میں، میں نے پل پل جس کی توانائی مسکراہٹوں کا انتظار کیا تھا، وہ آ گیا تھا... وہ میرے سامنے کھڑا تھا... اس کی روشن آنکھیں، اس کا چوڑا سینہ، اس کے توانا بازو سب کچھ وہی کا وہی تھا۔ سب کچھ وہی کا وہی

مجھے لگا جیسے میں ایک بہت خوب صورت سپنا دیکھ رہا ہوں... لیکن یہ سپنا نہیں تھا۔ عمران جیتی جاگتی صورت میں میرے سامنے موجود تھا۔ بھوت سے لٹھڑے ہوئے چہرے کے اندر سے عمران کا جانا بچپنا چہرہ جھانک رہا تھا۔ قریباً تین برس پہلے کی اُس تاریک و مچر آشوب رات کو میں نے نالے کے پُل پر اسے آخری بار دیکھا تھا۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں مجھے وہ ایک تیز رفتار پانی پر ایک مِل صراط جیسے رستے پر کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے پھر اس کے پسٹے پر رائل کا رسٹ لگا۔ وہ ڈمگ لایا اور اجل کے پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ میری تمام تر حیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے آنکھوں پر بھر و سنا نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگا کہ حیرت اور خوشی کے سبب میرا دل سینے میں پھٹ جائے گا اور میں یہیں تیور کر گر جاؤں گا۔

بے پناہ شور کے درمیان میں نے سرسراہی آواز میں پوچھا۔ ”تم... زندہ ہو... عمران؟“

”عجیب بے وقوفی کا سوال ہے۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ سانس لے رہا ہوں، بول رہا ہوں، اس کے باوجود تمہیں شبہ ہو رہا ہے کہ میں قید حیات نہیں ہوں۔ اگر مُردے ایسے ہوتے ہیں تو پھر زندہ لوگ تو یقیناً قبروں میں آرام کر رہے ہوں گے... اور دوسری بات یہ ہے جگر کہ اس طرح ہونفوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر سمجھ نہ دیکھو، ان لوگوں کو شک ہو جائے گا کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بالکل سنجیدہ ہو جاؤ۔ تمہارے ہاتھ

کہ تم اس رات گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے... میں نے... میں نے اس رات خود تمہیں گولیاں لگتے دیکھی تھیں پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں اس ڈیک نائے کے کنارے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا تھا۔ کیا تمہیں پانی سے نکال لیا گیا تھا؟ میرا مطلب ہے... میرا مطلب ہے... میں ہکا کر رہ گیا۔

اس کی شوخی طبع پلٹ آئی۔ وہ میرے گلے سے لگے لگے بولا۔ ”میں پانی میں کہاں گرا تھا یا ر! میں تو آسمان کی طرف اٹھ گیا تھا... سیدھا اوپر بالکل راکٹ کی طرح۔ وہاں جب میں قطبی ستارے کے قریب پہنچا تو بہت سی ارواح خبیثہ سے میری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے زبردستی مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ یہ عقل دشمن ارواح خبیثہ آج کل امن اور آشتی کے خلاف ایک زبردست مہم چلا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے قطبی ستارے کے پاس ہی ایک ٹی وی چینل بھی قائم کر رکھا ہے۔ اس کا نام ہے ”فساد پس“ اور اس کا سلوگن ہے... ایک ہی رستہ ایک ہی منزل... افراتفری افراتفری۔ اس چینل میں ملازمت ملنے کی سب سے پہلی شرط ہی یہ ہے کہ بندے نے جاہلیت میں ڈبل ایم اے کیا ہو اور کم سے کم دس جگہ سے دھکے دے کر ملازمت سے نکالا جا چکا ہو۔ سو میرے بار! آج کل میں اسی ”فساد پس“ کا نمائندہ ہوں اور قریب قریب گھوم کر خبریں اکٹھی کر رہا ہوں۔“

میری آنکھوں سے مسلسل آنسو برس رہے تھے۔ میری کیفیت دیکھ کر اسے بھی کچھ سنجیدہ ہونا پڑا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ بید کی کرسیوں پر آ بیٹھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری یہ حیرت بجا ہے تابی! سینے پر براہ راست برسٹ کھا کر زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا لیکن ایک بات شاید تم بھول رہے ہو۔ جب ہم لاہور سے باہر گاڑی بھاگ رہے تھے اور سیٹھ سراج اپنے ہر کاروں سمیت ہمارے پیچھے تھا، تم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ میں پہلے سے کچھ صحت مند لگ رہا ہوں۔ میری صحت مندی یعنی موٹے پن کا راز وہ امریکن پلٹ پروف جیکٹ تھی جو میں نے قمیص کے نیچے پہن رکھی تھی۔ یہی جیکٹ میری زندگی کا بہانہ بنی۔“

عمران نے اپنا سویٹر اوپر اٹھایا اور قمیص و بنیان کے نیچے سے اپنے پیٹ پر گولی کے دو زخم دکھائے۔ ایک گولی تو شاید پہلو کا گوشت پیر کر نکل گئی تھی، دوسری پیٹ میں لگی تھی۔ وہ بولا۔ ”بس یہی دو گولیاں تھیں جو مجھے لگیں، باقی کی جیکٹ نے بلاک کر لیں۔“

مجھے تمہارے کمرے کا پتا ہے، میں آج آدھی رات کے بعد تمہارے پاس آؤں گی... میرا مطلب ہے آؤں گا۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ میں چزیں نہیں بلکہ چڑیلا ہوں... انسان تھا تو اچھی بھلی یادداشت تھی۔ اب تو ان لوگوں جیسا ہو گیا ہوں جنہوں نے بینکوں سے قرض لے رکھا ہے۔ اچھا، چلتا ہوں۔ لگتا ہے کہ گرو صاحب میری طرف ہی آرہے ہیں۔ وہ چوتھے سے اتر اور لوگوں کے جھوم میں گم ہو گیا۔ میری نگاہیں مسلسل اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ پھر کہیں گم نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ میں بے ساختہ اس کے پیچھے لپک جاتا، ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، شیش میرے پیچھے کھڑا تھا، وہ بولا۔

”یہ دقتی نرانشا ہے۔ گرو جی نے کہا ہے کہ دو دن میں سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ دو دن بعد ایک بار پھر یہ محفل سچے کی اور یہ اپرا دھن لڑکی اپنے انجام کو پہنچے گی۔“ شیش نے مشعل نما لکڑی میرے ہاتھ سے لے کر پانی کے برتن میں بجا دی اور مجھے لے کر چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ سلطانہ اسی طرح بے ہوشی کی حالت میں چتا کی لکڑیوں پر پڑی تھی۔ میں کن انھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری بیوی تھی لیکن دوسروں کی دسترس میں تھی۔ میں اسے بچونے کا جاز نہیں تھا۔

☆☆☆

رات ایک بجے کا وقت تھا، جب دروازہ کھلا اور عمران میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اب وہ معقول لباس میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک عام سی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے پر سفید بھبھوت بھی نہیں تھا۔ قمیص کے اوپر ایک نیلا سویٹر تھا۔ ہونٹوں پر وہی بیلاری مسکراہٹ تھی جو اسے عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور ہم بھاگ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ آنسو میری آنکھوں سے گرم آبشاروں کی طرح بہہ رہے تھے۔

”تم کہاں چلے گئے تھے یار! تمہیں کیا پتا میں نے یہ وقت تمہارے بغیر کیسے گزارا ہے؟“ میں نے سسک کر کہا۔ کوئی مزاحیہ فقرہ اچھالنے کے بجائے وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی جذباتی کیفیت میں ہے۔

میں آنسوؤں کے درمیان بولتا چلا گیا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں۔ مجھے کسی طرف سے تمہارے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں مل سکی تھی۔ میڈم صفورا بھی نہیں اس اسٹیٹ میں موجود ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا

انسان تھوڑی ہوں۔ میں تو ایک روح ہوں جو اس رات اپنے پیکر خاکی سے نکل آئی تھی جس رات مجھے سینے پر گولیاں لگی تھیں۔ اب میں ایک بدروح ہوں یا سلیس لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ ایک چڑیلا ہوں... یعنی چزیں کا مذکر... بڑی فانیو سٹار شخصیت ہے میری۔“

میں نے یونہی نیچے دیکھا تو وہ فٹ بولا۔ ”شاید تم میرے پاؤں ملاحظہ کر رہے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ پاؤں چزیں کے اٹنے ہوتے ہیں، چوہیلے کے نہیں۔ چوہیلے کے جسم کے ایک دو اور پارٹ اٹنے ہوتے ہیں جو میں فی الحال تمہیں دکھانے نہیں سکتا...“ وہ بے پرکی اڑا رہا تھا۔

اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ہلکا پھلکا انداز دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آج کوئی نہ کوئی کرشمہ ہو جائے گا۔ شاید یہ الیہ آج کل جائے جس کی پوری پوری تیاری کی جا چکی ہے۔

میں حیرت کا بت بنا کھڑا رہا اور عمران کی طرف دیکھ رہا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا سرمہ تھا۔ آنکھوں کے گرد رنگ لگایا گیا تھا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا شان دار کسرتی جسے چمک رہا تھا۔ مہا گرو آنکھیں بند کر کے مالا چپتا رہا اور آگے پیچھے جھولتا رہا... عمران کے اشارے پر میں نے اپنے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی کو آگ دکھا دی اور ساکت کھڑا ہو گیا۔

مہا گرو کی مراقبہ ٹاپ کیفیت طویل ہوتی جا رہی تھی۔ نقارے مسلسل بج رہے تھے۔ قریباً تین چار منٹ مزید ان تناؤ بھری صورت حال میں گزرے پھر اچانک مہا گرو نے اپنا مالا والا ہاتھ اٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔

نقارے رک گئے۔ بھجن اور اشوکوں کی آواز بھی تھم گئی۔ سب مہا گرو کی طرف دیکھنے لگے۔ مہا گرو کچھ کچھ انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا۔ ”یوگ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ شہ گھڑی تاہیں مل رہی۔ اس رسم کو پوری طرح سے ادا کرنے کے لیے ایک خاص سے کی ضرورت ہے، جو اب ہمارے پاس ناہیں ہے۔ اب اس خاص سے کی آشتی دن بعد ہی کی جاسکت ہے۔“

وسیع ہال کمرے کے اندر سنانا سا چھا گیا۔ چند افراد کی ٹولی ایک بار پھر اشوک پڑھنے لگی لیکن اب ان اشوکوں میں جوش اور یحجان کی جگہ ایک طرح کا ٹھہراؤ تھا۔ یہ مذہبی شعر اب طبع میں اچھال پیدا کرنے کے بجائے ہمواری پیدا کر رہے تھے۔

”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔ ”یہ روح کی کارستانی ہے اور روح تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ اگر تفصیل پوچھنا ہو تو وہ بھی تمہیں بتاؤں گا...“

تھا... ”اوتے باندرا میں پھر کہتا ہوں، ایسے مت گھورو۔ ان لوگوں کو خشک ہوگا۔ دائیں طرف جو پہلا دیا جمل رہا ہے، اس سے یہ لکڑی روشن کرلو۔“ عمران کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”عمران!“ میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ جو چتا میں لٹیٹی ہے، وہ میری بیوی ہے...“

”تو ایک شوہر کے لیے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ نہ مقدمہ، نہ عدالت، نہ سزا... ایسی چوبیشی کے انتظار میں تو شوہر لوگ اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔“

”عمران... اسے مذاق مت سمجھو... یہ میری بیوی ہے۔ میرے بچے کی ماں ہے۔ یہ سخت مصیبت میں ہے۔“

”تو میں اس مصیبت کو کون سا بڑھا رہا ہوں؟ میں اسے آگ لگانے کو تو نہیں کہہ رہا۔ بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ آگ لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اسے آگ نہیں لگے گی۔ کم از کم آج تو نہیں لگے گی۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔“ میری آواز بڑھ رہی تھی۔

”تمہاری سمجھ میں کبھی پہلے میری کوئی بات آئی تھی جو اب آئے گی؟“ اس نے کہا اور محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ تازی کے نشے میں وہ سب لوگ بڑی طرح اچھل کود رہے تھے۔ ترشول لہرا رہے تھے اور اشوک پڑھے جا رہے تھے۔ ہر آنکھ میں اس بے بس لڑکی کے لیے نفرت و انتقام کی چنگاریاں تھیں جو چتا کے اندر بے حس و حرکت لکڑی کے تختے پر لیٹی تھی اور جن آنکھوں میں چنگاریاں نہیں تھیں، ان میں بے بسی تھی۔

عمران نے مالا چپتے ہوئے مہا گرو کی طرف اشارہ کیا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا پیٹ کسی براؤن غبارے کی طرح پھولا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے کان کے قریب آ کر قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”چتا کو آگ دکھانے کی آگیا (اجازت) مہا گرو صاحب کو دینی ہے۔ اور وہ آگیا تب دیں گے جب شہ گھڑی آجائے گی... اور شہ گھڑی آج نہیں آئے گی۔“

”تنت... تمہیں کیسے پتا؟“ ”مجھے اس لیے پتا ہے کہ مہا گرو میرے قبضے میں ہے۔“

”تمہارے قبضے میں ہے؟ کیا مطلب؟“ ”بھئی میں نے اس پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں کوئی زندہ

میں ہے... خاص طور سے اس مٹن میں۔" وہ سرخ مٹن پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں اس کے بظاہر معصوم چہرے پر وہی جارحیت نظر آنے لگی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ادھر یہ مٹن دبے گا، ادھر رادھا دیوی کی پتلی کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ دھماکے سے اڑ جائے گی۔ اور محبوب کی کمر چاہے کتنی بھی پتلی ہو لیکن ہونی تو چاہیے تیار... اور میرے خیال میں مہا گرو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ کتنی آسانی سے کتنی خوفناک بات کہہ رہا تھا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ دھیما، سادہ، ہنس مکھ... اور ابھی اس کے ساتھ ساتھ بہت بھیاں تک بھی۔ اب اگر مہا گرو کی پتلی کی کمر کے ساتھ واقعی کوئی بارودی بیلٹ بندھی ہوئی تھی تو سوچنے کی بات تھی کہ یہ بیلٹ عمران کو کہاں سے لٹی تھی؟ اس بیلٹ اور بیلٹ کے ریہوٹ کنٹرول کی ایکروسی کیا تھی؟ اور یہ بیلٹ کس طرح رادھا کی کمر تک پہنچی تھی؟ میں یہ سب کچھ عمران سے پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ ان میں سے کسی ایک سوال کا معقول جواب بھی مجھے نہیں ملے گا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا... اور میں چونک گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا ہے کہ "ہم" نے گرو کی پتلی کو اپنا مہمان بنا رکھا ہے۔ "ہم" سے کیا مطلب ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"بچھلے تین سالوں میں کافی ہوشیار ہو گئے ہو تم اور کافی بدل بھی گئے ہو۔" اس نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں تعریف کی جھلک تھی۔ اس نے میرے سینے پر ہلکا سا مکا مارا پھر دائیں بائیں دیکھ کر رازداری کے انداز میں بولا۔ "تم جانتے ہو کہ اقبال میرا دم چھلا ہے۔ اور دم جہاں ہوگی، چھلا بھی وہیں ہوگا۔ وہ مہا گرو کی قیام گاہ پر سیوک کے طور پر موجود ہے، یعنی خادم کے طور پر... اور گرو کی پتلی کی "سیوا" کر رہا ہے۔ وہ پرسوں سے ذرا بیمار ہے نا۔" عمران نے آنکھ دبا کر کہا۔

مجھے یاد آیا کہ کل جب میں نے گرو کی پتلی رادھا کو داسیوں کے ساتھ راہداری سے گزرتے دیکھا تھا تو وہ کچھ گم صم نظر آئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر عجیب سی زردی تھی۔ اب صورت حال کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال یہاں موجود تھے۔ کیسے موجود تھے، اس کے

بھلاوے۔ بہر طور خیریت گزری۔ قدموں کی چاپیں آگے کل گئیں۔

عمران بولا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلطنت خطرے سے دور ہے لیکن وقتی طور پر۔ ہم نے یہاں کے مہا گرو کی پتلی رادھا دیوی کو اپنا "مہمان" بنا رکھا ہے۔ اسی "مہمان نوازی" کا دباؤ ہے جس کے سبب گرو کو شہ گھڑی نہیں مل سکی اور اس نے چتا جلانے کی رسم دونوں کے لیے ملتوی کر دی ہے۔ وہ سب کچھ اس نے مجبوری کے سبب کیا ہے لیکن اپنی پتلی کو مصیبت سے بچانے کے لیے وہ دیر تک اس منحوس رسم کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے پتلون کی جیب احتیاط سے ٹٹولی اور بولا۔ "جس طرح کچھ جنات کی جان طوطے میں ہوتی ہے، اسی طرح گرو کی دھرم پتلی کی جان بھی ایک طوطے میں ہے۔ اور یہ طوطا میرے قبضے میں ہے۔ میں جب چاہوں، اس طوطے کی گردن شریف موڑ کر گرو کی پتلی کو جہان بالا کی سیر کر سکتا ہوں۔ اور اگر دیکھا جائے تو گرو کی پتلی خود بھی ایک طوطے کی طرح ہے اور گرو کی جان اس دوسرے طوطے میں ہے۔ اگر پتلی جہان بالا کو گئی تو ہو سکتا ہے کہ گرو خود بھی اس کے پیچھے نکل جائے۔ اسے ادھیڑ عمری میں اور اتنی معمولی شکل صورت کے ساتھ اتنی جوان اور سندر پتلی ملی ہے، وہ ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔ پتلی کو جہان بالا کی سیر سے بچانے کے لیے وہ اپنی پوری پوری کوشش کرے گا۔"

"تم میری آنکھوں کو اور بڑھا رہے ہو عمران... تم جنوں اور طوطوں کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ایک چڑیلا ہوں اور صرف چڑیلا ہی نہیں، نیوز جیسٹل کا نمائندہ بھی ہوں۔ ایسا "ہم" بلاسٹ شخص، جنوں بھوتوں کی باتیں نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا؟"

اس نے ایک بار پھر پتلون کی جیب ٹٹولی اور اس میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹا سا برقی آلہ نکال لیا۔ اس کی صورت چھوٹے موبائل فون جیسی تھی لیکن موبائل فون کے کی بورڈ کی طرح اس پر زیادہ مٹن نہیں تھے۔ صرف تین مٹن نظر آرہے تھے۔ ایک سرخ اور دو سفید۔ یہ برقی آلہ سبز رنگ کا تھا۔ عمران نے کہا۔ "یہ دیکھو، اس کا رنگ ہر اسے اسی لیے تو میں اسے طوطا کہتا ہوں۔ گرو کی پتلی کی جان اس

لیے ابھی بہت سا وقت پڑا ہے۔ فی الحال ہم صرف وہ باتیں کریں گے جو کرنا بہت ضروری ہیں۔ ابھی تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں صرف تمہارے لیے یہاں موجود ہوں۔ اس گروہ کے لوگوں میں مجھے اہمیت کمار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک میں ایک اسمگلر ہوں اور انڈین "بی ایس ایف" سے جان چھڑاتا ہوں اس راجواڑے میں گھس آیا ہوں۔ فی الحال یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی رہیں گے۔ کسی طرح کی کوئی شناسائی بھی ہم دونوں کے لیے سخت ترین مشکلیں پیدا کر سکتی ہے۔ کچھ کچھ اندازہ تو تمہیں ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

"مجھے صرف ایک بات بتا دو، کیا سلطنت بچ جائے گی؟"

"تم بھی مجھے صرف ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

وہ عجیب نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چہرے کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ پھر اس نے ہولے سے پوچھا۔ "اور وہ، تمہارا جنون... ثروت؟"

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "عمران! جس طرح میرے سوالوں کے جواب بہت لمبے ہیں، اسی طرح تمہارے اس سوال کا جواب بھی بہت طویل ہے لیکن مجھے ابھی صرف اتنا بتا دو کہ ثروت کہاں ہے؟"

"میری آخری معلومات کے مطابق وہ جرمنی میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔"

"اور اس کی شادی؟"

"مجھے اس بارے میں ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ میں یہ جاننے میں ناکام رہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اور عاطف اور میری بہن فرح؟"

"تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی، وہ دونوں یہ خیریت اور بالکل حفاظت سے ہیں۔ میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔"

دروازے سے باہر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ عمران ایک دم چونکا ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ لائین کی گول تاب پر رکھ دیا۔ غالباً وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اگر خطرہ زیادہ محسوس ہوتا لائین

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو رز نے لگے۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ٹھنڈے ٹھار پانی میں گرا۔ پانی کی رفتار بڑی تیز تھی۔ میں غوطے کھاتا ہوا کافی آگے نکل گیا پھر سرکس کی ٹریننگ کام آئی۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلائے اور کسی طرح کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں ایک نوجوان زمیندار ریاست علی مجھے اپنی ٹرینٹر ٹرائی میں ڈال کر اسپتال تک لے گیا... پوری روداد کافی لمبی ہے۔ اگر اس کو مختصر نہیں کروں گا تو باقی رات اسی میں گزر جائے گی... اور تمہاری بھابی پوچھے گی... جن کتھاں گزاری آئی رات دے..."

"بھابی... کیا مطلب؟"

"تو یار کیا تم اکیلے ہی رستم زماں ہو جو آنا فانا شادی کھڑکا سکتے ہو؟ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو بڑی بڑی مصیبتوں کو دعوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔"

"کیا کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے تم نے؟"

"دیکھو، اگر اس فقرے میں تم نے شادی پر زور دیا ہے تو اور بات ہے لیکن اگر لڑکی پر زور دیا ہے تو تمہارا سوال اور بھی مذاقہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے، شادی لڑکی سے ہی ہوگی لیکن شادی بھی کیا ضروری ہے؟ یہ نیا دور ہے یار! اس میں شادی تو اس وقت کی جاتی ہے جب بچے کہتے ہیں... سویت پاپامی، اب شادی کر لیں۔ اور پھر شادی کے بعد تو ویسے بھی رومانس کو ایک دم فل اسٹاپ لگ جاتا ہے اور ہم تو بھی رومانس کے بندے ہیں۔ ایک پیارا سا چہرہ مل گیا ہے یہاں بھی۔ ہوسکا تو دو چار روز میں تمہیں ملواؤں گا اس سے۔ بڑی اونچی شے ہے۔ کتھک ناچ ناچتی ہے اور ناچ ناچ کر اس نے جسم ایسا شیشے جیسا کر لیا ہے کہ کیا بتاؤں... آف۔"

وہ بے تکان بول رہا تھا۔ حالات کی سنگینی اور میری بے پناہ حیرتوں کا جیسے اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "عمران! مجھے اب بھی اپنی آنکھوں پر بھر و سانس نہیں ہو رہا۔ لگتا ہے کہ ابھی دماغ کو ایک جھٹکا سا لگے گا اور سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا... مجھے بتاؤ عمران! تم یہاں کب اور کیسے پہنچے؟ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں یہاں ہوں؟ اور تم نے وہاں ہال کمرے میں بھیس کیوں بدل رکھا تھا؟ کیا تم اس گروہ میں شامل ہو؟ اور..."

"بس بس۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ایک ہی سانس میں تم نے اتنے سوال کر دیے ہیں کہ تمہارا نام گیزیک آف ورلڈ ریکارڈ میں آ سکتا ہے لیکن وہاں بھی تو سفارش اور تعلقات چلتے ہیں۔ دیکھو، میری بات سنو۔ ان سوالوں جوابوں کے

Scanned and Uploaded By Nadeem

”تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا، ورنہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔“

”لیکن تم تو کہتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے۔“

”مگر اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ کم از کم آج کی رات تو بالکل نہیں۔ اقبال زخمی ہو گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔ خود ہی دیکھ لیتا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن...“

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ جلدی کرو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے... میں سیدھا چلتا جاؤں گا تم آٹھ دس قدم چھوڑ کر میرے پیچھے آنا۔ میں جس دروازے میں گھسوں، تم بھی گھس جانا مگر احتیاط کرنا کہ کوئی تمہیں گھستے ہوئے دیکھے نہیں۔“

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ صورت حال واقعی سنگین ہے۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کمرے کی لائٹیں میں نے بجھا دی تھیں اور دروازہ اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کھنڈر اتھان کا یہ زیر زمین حصہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ راہداریاں خالی تھیں۔ لائٹوں اور گیس لمپس کی روشنیوں بھی جیسے غنودگی میں تھیں۔ ہم بڑے ہال کمرے کے قریب سے گزرے۔ وہاں بھی بڑے آتش دان میں کوئلے سنگ رہے تھے۔ ان کونلوں کے قریب بہت سے افراد چٹائیوں اور نمودوں پر بے سدھ پڑے تھے۔ ہال کمرے سے نکلنے والی ایک راہداری میں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ یقیناً یہ یہاں کے پہرے دار تھے۔ میں رات کو اکثر ان لوگوں کی آواز سن سکتا تھا۔ یہ بلند آواز میں قہقہے لگاتے تھے اور خود کو بیدار رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے دھول دھپا بھی کرتے رہتے تھے۔ ہم اس راہداری کے سامنے سے گزر گئے لیکن اس میں داخل نہیں ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا رخ اسی طرف ہے جس طرف سے ہم یعنی میں اور ستیش وغیرہ چار پانچ دن پہلے یہاں داخل ہوئے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ جلد ہی پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم اسی آبشار کے سامنے پہنچ گئے جو پتھروں پر گرتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اس حوض یا چھوٹی سی جھیل میں پتھر کا ایک بڑا مجسمہ اونڈھے منہ پڑا تھا۔ یہاں ایک طرف حوض کے کنارے کچھ دروازے نظر آئے۔ عمران ان دروازوں کے سامنے سے گزرتا ہوا اچانک ایک

بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ ان دونوں نے یہاں مہاروکی پٹنی کو آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا۔ وہ غالباً دھماکا خیز مواد کے نشانے پر تھی اور یہ مواد ریوٹ کنٹرول تھا۔ صورت حال کی سنگینی اور سنسنی میرے رگ و پے میں اترنے لگی اور ایک عجیب سی ترنگ سینے میں جاگ گئی۔ لیکن ابھی تک بہت کچھ اندھیرے میں تھا۔ میں عمران سے درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے ایک بار پھر تاکید کی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اس نے یا اقبال نے جب مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا تو وہ خود ہی کریں گے۔

جانے سے پہلے وہ تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔ ہم ایک بار پھر پُر جوش انداز میں گلے ملے۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”سب کچھ بتاؤں گا... سب کچھ۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے شہزادے، تھوڑا سا اور کرلو۔“

اس کے جانے کے بعد میں جیسے ایک طوفان کی زد میں رہا۔ راجاؤں کے اس دور دراز کھنڈر میں عمران یوں میرے سامنے آئے گا اور حالات ایک دم ایسا رخ اختیار کریں گے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اگلا سارا دن بھی عجیب کشمکش اور سوچ بچار میں گزرا۔ شبیلہ سے بھی دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حال میں تھی۔ اس کی بے چارگی بار بار میرے تصور کو جھوٹے لگاتی تھی۔ اس کے ساتھ یہاں ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا تھا اور اب پچھلے تین چار روز سے اس سے مٹی بھی کھدوائی جا رہی تھی۔ اس مشقت کا مقصد معلوم نہیں تھا... مجھے شک کی ستی ہوئی صورت یاد آئی، اس کے ہاتھوں کے چھالے پادائے اور دل اس کے لیے درد سے بھر گیا۔

اگلی رات پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس زیر زمین کھنڈر میں مکمل سناٹا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ شاید وہی دو چار افراد جاگ رہے ہوں جو پہرے پر تھے۔ کسی قریبی کمرے میں ارجن اور اس کے بھائی دوست بھی غالباً شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد آرام فرما رہے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے ہولے سے ہلایا...

”کون؟“ میں نے پوچھا۔

دوسری طرف عمران تھا۔ اس کی مدھم آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا۔

”خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ اس نے ترت جواب دیا۔

پہنتی ہے۔ پچھلے جنم میں یہ یقیناً کوئی بھینس یا بھینسی وغیرہ رہی ہے۔ اس جنم میں بھلوان نے اسے گرو کی دھرم پتی کی داسی بنایا ہے۔ ایک نمبر کی خزانہ عورت ہے۔ اقبال اسی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔

عمران نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر مجھے کراہنے والی عورت کی جھلک دکھائی۔ وہ واقعی کسی سومو پہلوان کی طرح صحت مند تھی۔ اس نے چاندی اور پتھر کے بہت سے کڑے پہن رکھے تھے۔ ان کڑوں نے اس کے بازو کنبھوں تک پھیلے ہوئے تھے اور نصف پنڈلیاں بھی اوچھل نظر آرہی تھیں۔ وہ کسی بھینس ہی کی طرح ٹائیکون کی رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ غول غول کی آوازیں نکال رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے مار پیٹ بھی ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر نیل تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں وہ سخت سردی محسوس کر رہی تھی اور اس کی بے چینی کا سبب بھی یہی تھا۔ عمران نے ایک طرف پڑا ہوا ایک لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد میں نے زخمی اقبال کو بھی دیکھ لیا۔ عمران نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ یہاں اقبال کا نام راج ہے اور میں گرو کی پتی کے سامنے اقبال سے شناسائی ظاہر نہ کروں۔ آج میں ایک طویل عرصے بعد اقبال کو دیکھ رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ ذرا سا فربہ ضرور ہوا تھا مگر اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جس چیز نے مجھے ششدر کیا، وہ اقبال کی آنکھیں تھیں۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں اور اتنی سوچ چکی تھیں کہ پہلوؤں کے درمیان بس ایک درز سی باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل پانی بھی رس رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی شدید تکلیف کے باعث مشکل سے ہی دیکھ پا رہا ہے۔ وہ ایک غالیچے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ہی ایک مسہری پر گرو کی سندر پتی رادھا کھیل اوڑھے لیٹی تھی اس کے سر ہانے ہو میو پیٹھک ادویہ کی کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی تھیں۔ لائین کی روشنی میں وہ ایک دم مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ اقبال نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے... ہمارے دل چاہ رہے تھے کہ بھاگ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جائیں مگر عمران کی ہدایات آڑے تھیں۔ ہمارے چہروں نے ہمارے جذبات کی عکاسی کی...

عمران نے اقبال یعنی راج سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”راج! یہ ہے گوپال... مجھو کہ یہ ہمارا نیا ساتھی ہے۔ اور گوپال! یہ راج ہے۔ اس خبیث موٹی نے راج کی پہنتی ہے۔ پچھلے جنم میں یہ یقیناً کوئی بھینس یا بھینسی وغیرہ رہی ہے۔ اس جنم میں بھلوان نے اسے گرو کی دھرم پتی کی داسی بنایا ہے۔ ایک نمبر کی خزانہ عورت ہے۔ اقبال اسی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔

دروازے میں داخل ہو گیا۔ عمران کی ہدایت کے مطابق میں نے ارد گرد دیکھا۔ دور فاصلے پر کسی شخص کا متحرک سایہ نظر آ رہا تھا۔ شاید کوئی دھری پیرے دار پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ تاہم وہ اتنی دور تھا کہ مجھے اس کی طرف سے دیکھے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ میں عمران کے پیچھے دروازے میں داخل ہو گیا۔

اندروں داخل ہوتے ہی پتا چل گیا کہ یہ مہا گرو کی رہائش گاہ ہے۔ طاقتوں میں جا بجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اور تصویریں تھیں۔ ایک دیوار پر جاپ کرنے کے لیے بہت سی مالا میں جھول رہی تھیں۔ گرو کی رہائش گاہ کے دو حصے تھے۔ ایک کو مردانہ اور دوسرے کو زنانہ کہا جاسکتا تھا۔ ہم مردانے حصے میں داخل ہوئے تھے۔ تاہم گرو صاحب یہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک الماری میں گرو صاحب کے مختلف لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی جوتیاں اور کھڑانویں وغیرہ پڑی تھیں۔ خشک میوے اور بیسن کا بہت سا راحلوہ ایک تھال میں ڈھکا رکھا تھا۔ عمران نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بولا۔ ”میں یہاں گرو کا ذاتی خدمت گارہوں۔ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ یہ حاجت خانے میں جاتا ہے تو لوٹا بھی مجھے پکڑنا پڑتا ہے۔ کسی وقت تو خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے طہارت بھی مجھے ہی نہ کرانی پڑے۔“

”اب کہاں ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”پانی میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ ہر سنیچر کی رات کو یہ جاپ اسے کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں گھر واپس آ جائے گا۔ آؤ، میں تمہیں اس کی سندر پتی سے ملاؤں۔“

عمران مجھے لے کر ایک دروازے سے گزرا۔ ہم گھر کے مردانے حصے سے زنانے حصے میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی درو دیوار پر خوب گاڑھا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں بہت سے ساز پڑے تھے۔ یہ غالباً بھجن گانے میں استعمال ہوتے تھے۔ کھٹک ٹاپنے والوں کی ایک بڑی تصویر بھی اس کمرے میں آویزاں تھی۔ مجھے ایک دروازے کے عقب سے کچھ دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت کراہ رہی ہے اور اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

”یہاں کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تیرہ من کی دھوبن، کیونکہ ایک من کے تو یہ زیور ہی

آنکھوں میں سرخ مریچیں چھنکی ہیں اور صرف مریچیں ہی نہیں تھیں ان میں کچھ اور الہام بھی تھا۔ پہلوؤں کے نیچے سے تھوڑا تھوڑا خون بھی رسا ہے۔ اس کی آنکھوں کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے... اس کی جگہ اب تمہیں چار پانچ گھنٹوں کے لیے رادھا دیوی کے پاس رہنا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں...“

”کیوں؟ تم بھی تو نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، مجھے ابھی تین چار گھنٹوں کے لیے یہاں سے جانا ہے۔ تالاب پر جا کر گرو جی کی سیوا کرنی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے میں اور گرو جی اکٹھے ہی واپس آئیں گے... ہر سنیچر کی رات کو یہی کچھ ہوتا ہے۔“

گرو کی پتی بالکل ساکت لیٹی تھی۔ ذرا سی جنبش بھی نہیں کر رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے جسم کو ہلایا تو کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ پھٹ جائے گی۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو پھانسی گھاٹ کی طرف چل کر جانے والے مجرم کے چہرے پر ہوتی ہے... موت کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر بہت گہری تھیں۔

عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا کہ اگر ہم چاہیں تو

والے اس سنگین معاملے کو ہر کسی سے چھپایا تھا بلکہ انہیں چھپانا پڑا تھا۔ ریہوٹ کنٹرول ہر وقت عمران یا اقبال کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ کسی بھی وقت گرو کی چیتھی بیوی کو ٹکڑوں اور لوتھڑوں میں تبدیل کر سکتے تھے۔ گھر کے اندر آنے اور ملنے جلنے والوں کو یہی پتا تھا کہ رادھا دیوی کی کمر میں شدید درد ہے اور وہ آج کل زیادہ وقت بستر پر ہی گزار رہی ہے۔ راج یعنی اقبال یہاں رادھا کے معالج کے طور پر موجود تھا۔ اقبال یوں تو عمران ہی کی طرح یہاں مہا گرو کا سیوک تھا، تاہم اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہو میو پیٹھک دواؤں کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتا ہے۔ وہ ہر دو تین گھنٹے بعد رادھا کو کوئی نہ کوئی دوا کھلا رہا تھا اور دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ وہ گرو کی پتی کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے۔ رادھا کی خاص داسی بھی ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ وہی پہلوان نما عورت تھی جسے ہم نے کچھ دیر پہلے ایک چھوٹے کمرے میں بندھا پایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ داسیاں رادھا کی خدمت کے لیے یہاں آتی جاتی تھیں مگر انہیں اصل صورت حال کا کچھ علم نہیں تھا۔ صرف پہلوان نما داسی بھاگ متی جانتی تھی کہ یہاں کیا چکر چل چکا ہے اور مالک و مالکن کتنی بڑی مصیبت میں ہیں۔ آج رات پہلے پہر پہلوان نما بھاگ متی نے نمک حلائی کی ایک زبردست کوشش کی تھی اور اقبال پر اس وقت حملہ کر دیا تھا جب وہ رادھا کی مسہری کے قریب چٹائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ایک دم اقبال پر چھٹی تھی اور اس کی آنکھوں میں پسی ہوئی مریچوں اور کسی تیز کیمیکل سے بنایا گیا سفوف ڈال دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو اقبال جیسے اندھا ہو گیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے عمران کو پکارا تھا۔ عمران اس وقت گرو کا حلوہ تیار کر رہا تھا۔ وہ غیر معمولی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے اقبال کو ”پہلوان داسی“ کے چنگل سے نکالا۔ اسے چند سیکنڈ کی دیر بھی ہوئی تھی تو پہلوان داسی بھاگ متی نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دینا تھا۔ وہ ریہوٹ کنٹرول اقبال سے چھین چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک ٹانگ ابھی تک اقبال کے ہاتھ میں تھی اور وہ بھاگ نہیں پار رہی تھی۔ عمران پہنچ گیا اور اس نے بھاگ متی کو اپنی گرفت میں جکڑا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے اقبال شدید کرب میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مسلسل خنجر گونے جارہے تھے۔

اقبال نے مجھے اپنی مختصر روداد سنائی اور وہیں بے دم سا ہو کر ایک چار پائی پر لیٹ گیا۔ اس نے بتایا کہ آنکھیں بند کر لینے سے اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈالنے سے اسے قدرے سکون ملتا ہے۔ میں باہر آیا تو عمران جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے

گیا۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں رہنے دو۔۔۔“

”بہن دو۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”اس کو ڈھیلا کرنے کا کام امیت زیادہ اچھے طریقے سے کر سکے گا۔“

”لیکن اس کو تو گرو جی کے ساتھ ہی واپس آنا ہے اور ان کے آنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی ہیں۔“ وہ ذرا کراہ کر بولی۔ وہ پتی کو گرو جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ناراض لہجے میں بولی۔ ”تم دھرمی ہو کر بھگوان کے سیوک اور اس کی دھرم پتی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کر رہے ہو۔ تمہیں ذرا خوف ناہیں کہ تمہارے اس اپرادھ کا انجام کیا ہووے گا؟“

میں نے کہا۔ ”یہی تو مشکل ہے دیوی جی! یہاں پاپ اور پُن کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ ایک ناری کو یہاں زندہ جلا یا جانے والا ہے، کچھ لوگ اسے بہت بڑا پُن کہہ رہے ہیں اور بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جن کے نزدیک یہ مہا پاپ ہے۔“

”ایسے فیصلے میں اور تم ناہیں کر سکتے۔ ایسے فیصلوں کے لیے ہی گرو جی اور ان جیسے دوسرے گیانی دھیانی لوگن ہوتے ہیں۔ ہم جیسے عام منشوں کو ان کے فیصلے ماننا پڑتے ہیں۔ اس لڑکی کے لیے یہ سزا بہت زیادہ نظر آدوت ہے مگر اس کا اپرادھ بھی تو چھوٹا ناہیں ہے۔ اس نے اوتار لڑی کے ایک منش کو بے دردی سے قتل کیا ہے۔ جو سزا اس لڑکی کو مل رہی ہے، وہ اس کا بھی بھلا کرے گی۔ اس کے پاپ ڈھل جاویں گے، اس کا اگلا جنم کسی بہت اچھے روپ میں ہووے گا۔“

وہ دیر تک بولتی رہی۔ میرے اور میرے دونوں ساتھیوں کی غدار کی بدترین انجام سے جوڑی رہی۔ آخر میں اس نے اپنا لہجہ نرم کیا اور مجھے سمجھانے بھجانے کی کمزور کوششیں کرنے لگی۔ وہ بولی۔ ”ایک بات یاد رکھو، گرو جی اپنے دھرم کے خلاف کچھ ناہیں کریں گے۔ وہ جانت ہیں کہ ایسا کرنے کا انجام کتنا بڑا ہووے گا۔ نرگ کی آگنی کے سامنے اس سنسار کی ساری سزائیں بالکل معمولی ہیں۔ گرو جی میری ہتھیا قبول کر لیں گے، اپنی ہتھیا بھی قبول کر لیں گے۔۔۔ لیکن سوچو، اس کے بعد کیا ہووے گا؟ کیا یہاں کے لوگن تمہیں زندہ چھوڑیں گے؟ کبھی ناہیں۔ اس لیے میں اب بھی کہتی ہوں کہ کوئی اور راستہ اختیار کر لو۔ اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ یہ سب کو بہت مہنگی پڑے گی۔“

”ضد چھوڑنا ہی تو مشکل ہے۔ کیا تمہارا پتی اور اس کے ساتھی اپنی ضد چھوڑ رہے ہیں؟“

ریموٹ کنٹرول میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سفید بٹن ایکٹیویشن کا ہے۔ اس وقت یہ آن ہے۔ یہ دوسرا بٹن لاک کا ہے۔ اس کو میں نے کھول دیا ہے۔ اب اس سرخ بٹن پر ذرا سادہ پڑے گا تو رادھا دیوی کا دھماکا ہو جائے گا۔ بھگوان کی کرپا سے دس پندرہ کلڑے تو ضرور ہوں گے۔ اس لیے احتیاط سے رہنا اور چوکس بھی۔۔۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اب بے فکر رہو۔ باہر سے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

”اور اگر آیا تو؟“

”فرض محال آیا تو دروازہ نہیں کھولنا۔ لائین کی ٹو بالکل بچی کر دو۔“

میں نے کو بچی کر دی۔ کمرانیم تاریک ہو گیا۔ عمران نے ریموٹ احتیاط سے میرے سامنے ایک تپائی پر رکھ دیا۔ مجھے ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ رادھا بھی لیٹی لیٹی اوتھن گئی تھی۔ اس کے کالے ٹھنڈے بالوں کی ایک لٹ اس کے زرد رخسار پر بھول رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ آج کل کچھ کھا پی نہیں رہی۔ اس کے ہونٹ سوکھ کر سانولے ہو چکے تھے۔ پتا نہیں وہ کیسے اس فرہ اندام ادھیڑ عمر گرو کی بیوی بن گئی تھی۔ شاید اس میں کچھ عمل دخل لالچ کا بھی رہا ہو۔ گرو کی اس رہائش گاہ اور رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی خوش حال ہے۔ استھان میں جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے اور نذر نیاز پیش کی جاتی تھی، اس کا بڑا حصہ یقیناً اس مہا گرو کے پاس آتا تھا۔ یہاں کے ریشمی پردے، غالیچے، قیمتی ساز و سامان اور خود رادھا کا لباس بھی گواہی دیتے تھے کہ اس جگہ خوش حالی کا دور دورہ ہے۔

کچھ دیر بعد رادھا نے منمنائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ میری کمر میں بہت زیادہ چھہ رہا ہے، کیا تم اسے تھوڑا سا ڈھیلا کر سکتے ہو۔“ اس کا اشارہ اپنی کمر کی بارودی بیلٹ کی طرف تھا۔

میں نے کھل ہٹایا پھر رادھا کی قمیص اوپر اٹھائی۔ ریشمی قمیص کے نیچے اس کی دبلی پتلی ریشمی کمر بھی اور کمر کے ساتھ براؤن رنگ کی وہ خوفناک بیلٹ ایک ایچ چوڑے اسٹریپس کے ذریعے بندھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ”اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہے تو میں اسے ڈھیلا کر سکتا ہوں لیکن اس میں خطرہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری نہیں ہے۔“

خطرے کا لفظ سن کر رادھا کا زرد رنگ کچھ اور زرد ہو

”وہ ضد ناہیں ہے۔ وہ تو دھرم ہے۔ بھگوان کی اکھشا ہے اور اس کے خلاف چلنا مہا پاپ ہے۔“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں دیوی جی۔ مہا پاپ اور مہا پُن کا فیصلہ ہی تو ہم سے ہو نہیں رہا۔ ہم اپنے جھوٹے عقیدوں اور واہموں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔“

اس نے لرز کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور پھر پوجا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”ایڈیو تمہیں شاکر ہے۔ تم اپنی ناگہی میں بہت غلط باتیں کہہ رہے ہو۔“

”یہ غلط باتیں نہیں ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ۔۔۔“ ”بس بس، اب چپ ہو جاؤ۔“ وہ تیزی سے میری بات کاٹ کر بولی۔ ”جن باتوں کی تمہیں جانکاری ناہیں، ان کے بارے میں بول کر اپنا انجام خراب مت کرو۔۔۔ بس چپ ہو جاؤ۔“

بات کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے خوف زدہ نظروں سے سبز رنگ کے ریموٹ کنٹرول کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ شاید عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ ریموٹ کنٹرول ایک طوطے کی طرح تھا اور اس میں گرو کی پتی کی جان تھی۔

اس دوران میں اندرونی کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ غوں غاں کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ پہلوان نما داسی شاید پھر مضطرب ہو رہی تھی۔ جس طرح بندھی ہوئی گائے بھینس ذبح ہونے سے پہلے ٹانگیں چلاتی ہیں، وہ بھی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ جب یہ سلسلہ دراز ہوا تو میں نے جا کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک ننھی سی چیز تیزی سے باہر نکل گئی۔ یہ ایک چوہا تھا۔ داسی بھاگ مٹی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت کتنی بھی دلیر ہو، چوہا، چھپکلی، کاک روج اور اس نوع کے دیگر جان دار اس کی کمزوری رہے ہیں۔ اگر عمران یہاں موجود ہوتا تو اس پچویشن پر چند دلچسپ فقرے ضرور چست کرتا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور واپس رادھا کے پاس آ گیا۔ اس نے صورت حال پوچھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی نوکرانی پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔ رادھا گاہے بگاہے عجیب انداز سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ آخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم نے اتنی سخت ٹھنڈ میں بھی بس یہ قمیص پہن رکھی ہے۔ تمہیں سردی ناہیں لگتی؟“

”نہیں لگتی۔ یا یوں سمجھ لو کہ لگتی ہے لیکن میں محسوس نہیں کرتا۔“

”کیا مطلب؟“

”بس یہ عقیدے عقیدے کی بات ہے۔ مجھے سردی جھیلنے میں مزہ آتا ہے، بالکل جیسے تمہارے پتی دیو کو سنچر کی رات ٹھنڈے پانی میں جاپ کر کے مزہ آتا ہوگا۔“

”لل۔۔۔ لیکن وہ پانی ٹھنڈا تو ناہیں ہوتا۔“

”تم نے ابھی خود بتایا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ فرماتے ہیں۔ امیت بھی یہی کہہ رہا تھا۔“

”وہ پانی اس لحاظ سے ٹھنڈا ہووے ہے کہ اسے آگ پر گرم ناہیں کیا جاتا۔“ وہ لیٹے لیٹے بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”یہ دھرم کی باتیں ہیں۔ میری تمہاری بدھی (عقل) میں ناہیں آسکتیں۔“

”لیکن اتنی بات تو ایک بالک کی سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ پانی کو آگ سے ہی گرم کیا جاسکتا ہے یا پھر دھوپ میں رکھ کر اس کی ٹھار ماری جاسکتی ہے۔۔۔ مگر آدھی رات کو تمہارے پتی دیو کو دھوپ کہاں ملتی ہوگی؟“

”آگ آگ میں فرق ہووے ہے۔“ رادھا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”گرو جی کہتے ہیں کہ سنچر کی رات والے پانی کو ایسے آدھ بجھے کوٹلوں سے گرم کیا جاسکتا ہے جن میں آگنی کی لپک نہ ہو۔ وہ تانے کے جس حوض میں بیٹھ کر جاپ کرتے ہیں، اس کے گرد اگر ملازم آدھ بجھے کوٹلے ڈالتا رہتا ہے۔“

رادھا نے اس بارے میں کچھ مزید تفصیل بتائی۔ وہ جیسے خود بھی باتیں کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا دھیان اپنی بیلٹ اور ریموٹ کنٹرول وغیرہ سے ہٹا رہے۔ وہ کسی حد تک سادہ بھی تھی۔ اپنے شوہر یعنی گرو جی کے کمالات کا بہت سارا رعب اس کے دل و دماغ پر موجود تھا۔ میں دل ہی دل میں گرو کی چالاک کی داد دے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ایسی سخت سردی میں ٹھنڈے پانی کے اندر بیٹھ کر جاپ کرنے میں کوئی گھپلا ہوگا۔ اب یہ گھپلا سامنے آ گیا تھا۔ گرو جی جیسے لوگوں کے پاس حیلے بہانے اور تاویلیں تو ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ پانی کو گرم کرنے کے لیے اس نے یہ تاویل ڈھونڈ لی تھی کہ پانی کو آگ سے گرم نہیں کیا جاسکتا لیکن آدھ بجھا انگارہ جس میں شعلہ نہ ہو، آگ نہیں کہلائے گا۔۔۔ واہ! کیا سچائی تھی؟

میں دوسرے کمرے میں جا کر گاہے بگاہے اقبال کی مزاج پرسی کرتا رہا۔ رادھا سے باتیں بھی کرتا رہا اور عمران کا

انتظار بھی۔ رادھا کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ جو شخص رات بھر آدھ بجے انگارے گرد کے حوض کے لیے مہیا کرتا رہتا ہے، وہ امیت یعنی عمران ہی ہے۔ وہ آدھی شب سے لے کر آخری پیر تک لکڑیوں کے ایک ڈھیر سے نبرد آزما رہتا ہے۔ تین بڑے چوہے چلتے رہتے ہیں اور تانبے کے حوض کو آدھ بجے انگاروں کی سپلائی جاری رہتی ہے۔

خدا خدا کر کے انتظار کا وقت کٹا اور دروازے سے باہر گرد اور عمران کی آمد ہوئی۔ یہ دروازہ مردانے حصے کی طرف تھا۔ میں درمیانی دروازے میں سے گزر کر مردانے میں پہنچا اور دروازہ کھولا۔ گرد نے خود کو ایک بھاری لمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ عمران مؤدب انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک اس نے اپنے چہرے پر بھوت مل رکھا تھا جو ابھی ابھی دھویا گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو مزید افراد بھی تھے۔ یہ نوجوان پجاری تھے۔ گرد کی طرح ان کے بال بھی پیگے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے گرد لمبل لپیٹ رکھے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی گرد کے ساتھ ہی پانی میں پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں۔ ان دونوں افراد کو گرد نے کچھ پرشاد دیا اور تھوڑی سی گفتگو بھی کی۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔ جب تک وہ موجود رہے، عمران کا رویہ گرد کے ساتھ بہت مؤدب رہا لیکن اس کے فوراً بعد وہ اپنے اصل روپ میں آگیا۔ اس نے گرد کو زانے میں چلنے کو کہا۔ انداز حکم دینے والا ہی تھا۔ گرد چارونا چار اپنی توند مٹاتا ہوا زانے میں آگیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ یہاں رادھا مسہری پر اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ میاں بیوی نے بے چارگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

گرد کو سردی لگ رہی تھی۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بھاگ متی نے انگلیٹھی ناہیں جلائی؟“

عمران نے اطمینان سے نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بھاگ متی نے انگلیٹھی تو نہیں جلائی لیکن اس نے تمہارے جانے کے بعد ایک اور طرح کی آگ لگانے کی کوشش فرمائی تھی۔ اس ناکام کوشش کے نتیجے میں اب وہ چھوٹے کمرے میں بندھی پڑی ہے۔“

”کیا کہنا چاہت ہو؟“ گرد بوکھلا گیا۔

”اس نے راج کی آنکھوں میں مریچیں جھونکیں اور اس سے طوطا (کنٹرول) چھیننے کی کوشش فرمائی۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ خاص قسم کی مریچیں بھاگ متی کو تم نے ہی سپلائی کی ہوں گی۔“

گرد کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”ناہیں... میں نے ایسا

کچھ نہیں کیا۔ میں بھگوان کی سوگند کھات ہوں۔“

گرد کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور بھاگ متی نے جو کچھ کیا ہے، اپنے طور پر کیا ہے... مگر عمران نے گرد پر دباؤ برقرار رکھا اور اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ کافی غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے گرد کو دوسرے کمرے میں لے جا کر اقبال کی حالت دکھائی اور پھر اسے دھکیلتا ہوا واپس رادھا کے پاس لے آیا۔ اس نے دونوں لہجے میں گرد سے کہا۔ ”میں اب تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم نے جو فیصلہ بھی کرنا ہے، ابھی کرو اور زیادہ سے زیادہ کل تک اس پر عمل ہو جانا چاہیے۔“

گرد نے اپنے موٹے بھدے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بے دم سا ہو کر لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چند لمبی سانسیں لیں اور جیسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”دیکھو امیت! بھگوان کی گنتی بڑی کرپا ہے کہ اس نے تمہیں ایک ہندو گھرانے میں پیدا کیا۔ انسان کے بھیس میں پیدا کیا اور سنسار کی ساری نعمتیں تم کو دیں۔ تم کسی مسلے یا عیسائی کے گھر میں بھی پیدا ہو سکتے تھے... تمہاری جون انسان کے بجائے کسی کتے کی بھی ہو سکتی تھی۔ ہم دن رات بھگوان کا شکر ادا کرتے رہیں تو بھی کم ہے۔ ہم شکر ادا نہیں کر سکتے لیکن کم از کم اس طرح کا مہا پاپ تو نہیں کریں۔ اس ناری کا چتا میں جلنا اس کے لیے ہی ناہیں، ہم سب کے لیے بھی چھٹکارے کا سبب بنے گا۔ اس کے اپرادھ کے مقابلے میں یہ سزا تو کچھ بھی ناہیں اور اگر...“

”تم یہ بکواس بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔“ عمران نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں یہ سب کچھ بہت دفعہ سن چکا ہوں۔ اب دونوک بات کرنی ہوگی۔ ہاں یا نہ...“

”مگر امیت...“

”بس گرد... ہاں یا نہ۔“ عمران نے بے لچک لہجے میں کہا۔

اس دفعہ رادھا بولی۔ ”اتنی جلدی مت کرو امیت... چلو، ہمیں دوپہر تک کا سہ اور دے دو۔“

”ناک تمہارے کسی چہیتے کو سرخ مریچوں جیسی چالاکی دکھانے کا ایک موقع اور مل جائے۔“ عمران نے تروت جواب دیا۔

”میں تمہیں وچن دیتا ہوں امیت، اب ایسا کچھ ناہیں ہوگا... اور میراوشو اس کرو، جو کچھ ہوا ہے اس میں بھی میرا یا رادھا کا دوش بالکل ناہیں۔“

”نہیں گرد۔“ عمران کا لہجہ دونوک تھا۔ ”تمہیں جو کچھ

کرنا ہے کل کرنا ہوگا، ورنہ اپنی اس چہیتی جتنی کے دس پندرہ نکلے اٹھانا ہوں گے، چتا کے پھول تیار کرنے کے لیے...“

عمران کے انداز نے گرد کا تاریک چہرہ تاریک تر کر دیا... وہ اپنے تھر تھر کانپتے جسم کو لمبل میں لپیٹتے ہوئے بولا۔ ”رادھا کو مارنے کے بعد تم تینوں بھی تو زندہ ناہیں رہ سکو گے۔ یہ کبھی ہونا نہیں سکتا کہ تیش اور بڑے گرد تم کو یہاں سے زندہ جانے دیں... اور سلطانہ کو تو پھر بھی مرنا ہی مرنا ہے۔ جیون بڑی پیاری چیز ہے امیت! یہ بھگوان کا تحفہ ہے... اسے یوں کھونا بدھی کی بات ناہیں ہے۔“

”تم ہمیں موت سے نہ ڈراؤ گرد... ہم موت کے آگے نہیں، پیچھے بھاگنے والے لوگ ہیں۔“ عمران نے اطمینان سے کہا۔ اس کے لہجے میں وہی جانی پہچانی سچائی تھی جس نے مجھے دیوانہ بنایا تھا۔ یہ اس شخص کا لہجہ تھا جو واقعی جان ہتھیلی پر لے کر پھرتا تھا۔ موت اس کی محبوبہ تھی اور وہ اس سے بغل گیر ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار تھا۔

گرد نے ایک بار پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ عمران نے بڑے انداز سے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا ریو لور نکال لیا۔ اس نے ریو لور کا جیمبر کھولا۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ عمران نے اس میں سے چار گولیاں نکال لیں۔ پھر چرخ کی دو دھنیں بارگھا کر ریو لور گرد کی گود میں چھینک دیا۔ گرد حیران سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں عمران کے اس پرانے کھیل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

عمران بولا۔ ”چلو، سب کچھ بھگوان پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ابھی تم پانی کے اندر بڑی لمبی پرار تھنا کر کے نکلے ہو۔ بہت سے آشیر باد تمہارے ساتھ ہوں گے۔ چلو، مجھ پر گولی چلاؤ... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

”کک... کیا مطلب؟“

”گولی چلانے کا مطلب گولی چلانا ہی ہوتا ہے، پرشاد کھانا نہیں۔ مجھ پر گولی چلاؤ، میری ٹانگ کا نشانہ لو۔ اگر گولی مجھے لگ گئی تو ہم تمہاری جتنی کی کمر سے بیٹی اتار لیں گے اور تمہیں بغیر کچھ کہے یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر گولی نہ چلی تو پھر ایسے ہی چرخ گھما کر میں تم پر گولی چلاؤں گا۔ اس طرح دیکھتے ہیں کہ بھگوان کی طرف سے کیا اشارہ ملتا ہے۔“

ریو لور گرد کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے لیے محسوس ہوا کہ شاید وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے... لیکن پھر جلد ہی اس کے تاثرات نارمل

ہو گئے اور وہی خوف آمیز بے بسی اس کے فرہ چہرے کو ڈھانپنے لگی جس کا مشاہدہ میں اب تک کر رہا تھا۔ اس نے ریو لور اٹھا کر دوبارہ عمران کے پاس رکھ دیا۔ ”تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ ناہیں آ رہی۔“ وہ کراہ کر بولا۔

”لیکن مجھے تمہاری ساری سمجھ آ رہی ہے... تم صرف سے ضائع کر رہے ہو اور کسی چیتکار کے انتظار میں ہو۔ لیکن ہم کب تک چیتکار کا انتظار کریں گے؟ کیوں نہ ہم خود ہی چیتکار کے پاس پہنچ جائیں۔“

”کیا مطلب؟“ گرد نے کہا۔

”مہاتما صاحب! یہ چیتکار ہی تو ہے۔“ عمران نے ریو لور کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گولی لگ گئی تو چیتکار... تمہیں نہ لگی تو بھی چیتکار... چلو اگر تم میں اتنی شقتی نہیں تو میں خود ہی گھوڑا باد دیتا ہوں۔ پہلے خود پر ثرائی کرتا ہوں... پھر تم پر...“ عمران نے بڑے اعتماد سے ریو لور کی سیاہ نال اپنی دائیں ران پر رکھ لی۔

گرد اور رادھا کے چہرے دیدنی تھے۔ خاص طور سے گرد کا چہرہ تو بالکل تاریک ہو گیا۔ عمران نے شہادت کی انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ عمران کے اس کھیل میں عمران کا اعتماد ہی سب کچھ تھا اور یہ اعتماد سادوں کی منہ زور بارش کی طرح تابڑ توڑ اس کے چہرے پر برس رہا تھا۔ ریو لور کی چرخ میں دو گولیاں موجود تھیں۔

چند ہی سیکنڈ بعد گرد کی ہمت جواب دے گئی۔ ”ٹھہرو۔“ وہ کراہا۔ ”ایسا مت کرو۔ اس طرح کی شریٹیں باندھنا دھرم میں پاپ ہے۔ تمہارے دماغ کو خون چڑھا ہوا ہے، تم شاید بدھی کی کوئی بات سوچ ہی ناہیں سکت ہو۔“

”تمہارے دماغ کو تو خون نہیں چڑھا ہوا، پھر تم اس زردوش لڑکی کو زندہ جلائے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟“ عمران پھنکارا۔

”میں یہاں کا کارمخار ناہیں ہوں۔ مجھ سے تو بس رائے مانگی جاوت ہے۔ اصل حکم تو بڑے گرد کا ہی چلتا ہے یا پھر ستیش کا۔“

”لیکن دھرم کے ٹھیکیدار تو تم ہو، بڑا اگر نوے سال کا بڑھا کھوسٹ ہو چکا ہے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آت۔ یہاں کوئی تمہاری رائے کے خلاف نہیں چل سکتا۔“

”جتنا دھرم کو میں جانت ہوں، اتنا وہ بھی جانت ہیں۔ میں کوئی غلط بات کہوں گا تو بھگوان کا دوشی ٹھہروں گا اور ساتھ ساتھ یہاں کے سب لوگ مجھ کو دوشی ٹھہرا لیں گے۔“

Scanned and Uploaded By Nadeem

وفادار شوہر

بہتے کی رات تھی۔

وہ کلب کے ہنگاموں میں رات تین بجے تک گن

رہا۔

گھر پہنچا تو اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔

اس نے شوہر کو دیکھا تو پوچھا۔ ”آج کلب میں کیا شغل

رہا؟“

”آج کلب میں عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

تسلا شروع ہونے سے پہلے سیکریٹری نے اعلان کیا کہ

جو شخص کھڑا ہو کر سب کے سامنے اس امر کا دعویٰ کرے

کہ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے اس نے اپنی بیوی

سے بے وفائی نہیں کی تو اس کی خدمت میں یہ نیا ہیٹ

پیش کیا جائے گا۔“

”تو پھر کیا ہوا؟“

”ڈائریکٹرم سن کر حیران ہو گئی کہ سارے مجمع میں

سے کسی بھی شخص نے اس امر کا دعویٰ نہیں کیا۔“

”مگر تم نے کیوں دعویٰ نہیں کیا؟“

”میں نے... میں تو کھڑے ہو کر اعلان

کرنے ہی والا تھا کہ یکا یک مجھے خیال آیا کہ یہ ہیٹ

میرے سائز کا نہیں۔“

چاند بی بی کا تعاون چکوال سے

گیا۔ اس نے بھی تو کالی ماما کے بیٹے اور مٹی کھودنے کی بات

کی تھی۔ میں محتاط قدموں سے آواز کی سمت بڑھا۔ کمروں کی

عقبی دیوار کے ساتھ کچے احاطے میں جہاں بہت سی خشک

لکڑیاں پڑی تھیں اور تین بڑے بڑے چولہے بنے ہوئے

تھے، مجھے دو تین سائے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ میں سمجھ

گیا کہ یہ وہی چولہے ہیں جن کا ذکر کچھ دیر پہلے گرو کی سادہ

لوح پتی را دھانے کیا تھا۔ ان چولہوں میں گرو کے جل جا پ

یعنی پانی کی پوجا کے لیے اُدھ نیچے انگارے تیار کیے جاتے

تھے۔ یعنی جو پانی 10 گلو لکڑی سے گرم ہو سکتا تھا، اس کے

لیے ڈیڑھ دو من لکڑی جلائی جاتی تھی۔ ایک چولہے میں ابھی

تک مدھم آگ روشن تھی۔ میں تین سالیوں کی حرکت اسی روشنی

بہتیاروں کی تعداد، ان کی صلاحیت، سب کچھ اس کے علم

میں تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے

یہاں موجود ہے... اور یقیناً اقبال بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

رات کے بھوجن کے بعد سب لوگ تاڑی سے شغل

کرتے تھے۔ عام لوگ تول کھول کر پیتے تھے لیکن پہرے

دار بھی اس ”نیک کام“ میں کسی حد تک شریک رہتے تھے۔ یہ

خاص قسم کی تاڑی تھی جس میں بھنگ کا نشہ بھی شامل کیا جاتا

تھا۔ ایک طرح سے یہ ان لوگوں کا مذہبی مشروب تھا جس کے

پینے میں پاپ کے اندیشے کے بجائے ثواب کی توقع رکھی

جاتی تھی۔ اس مشروب کے سر بمہر منگے گرو کی تحویل میں رہتے

تھے۔ گرو کے لیے یہ کام بہت آسان تھا کہ وہ اس تاڑی میں

کوئی ایسی چیز شامل کر دیتا جس سے پینے والے مکمل طور پر

انشاعیل ہو جاتے... اقبال کی آنکھوں کا کبڑا کرنے والی

خاص سرخ مرچوں جیسی کچھ اور چیزیں بھی گرو کے پاس

موجود تھیں... اور انہی چیزوں میں دھتورے کا وہ کشتہ بھی تھا

جسے تاڑی میں ملائے جانے کا پروگرام تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے اپنے ٹھکانے پر

واپس جانا چاہیے تاکہ کسی کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ اس نے

مجھے تسلی دی کہ سب اچھا ہونے والا ہے اور وہ موقع دیکھ کر کل

کسی بھی وقت مجھ سے ملاقات کرے گا۔ میں نے اس سے کہا

کہ وہ کسی طرح سلطانہ کی خیر خیریت دریافت کرے اور مجھے

بتائے، اس کے علاوہ شکلیہ کے بارے میں بھی باخبر رہے۔

میں نے انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہوئے اسے شکلیہ کی

حالت و زار کے بارے میں بتایا۔ وہ اس بارے میں پہلے

Scanned and Uploaded By Nadeem

میری اور عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گرو توضیح کرتے

ہوئے بولا۔ ”کسی بھی مندر، دھرم استھان یا دھرم شالہ میں

انسانی خون کا گرایا جانا سخت پاپ ہے۔ اگر اس بات کا

وشواس ہو جائے کہ ہمارے کسی کرم کے کارن خون بہے گا تو

پھر اس کرم سے رک جانا ضروری ہے...“

”اور تمہیں پورا وشواس کر لینا چاہیے کہ اگر تم ہماری

بات نہیں مانو گے تو خون بہے گا اور بہت زیادہ بہے گا۔“

گرو نے چند لمحوں کے لیے مسہری پر دراز اپنی خوب

صورت بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا گورا رنگ، بھرا بھرا

جسم، اس کے ریشمی بال... سب کچھ ان لمحوں میں برق کی

طرح اس کی آنکھوں میں لہرا گیا اور اس کے ساتھ ہی زندگی

کی وہ ساری چاشنی، حرارت اور رنگارنگی بھی جس کا تجربہ وہ

اس استھان کے ایک کھیا فرد کی حیثیت سے کر رہا تھا۔ وہ گہری

سانس لے کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ دھرم اور استھان کے پالن

کی خاطر میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں اس پوتر جگہ کو تمہی کے

خون سے گندانا نہیں ہونے دوں گا۔“

عمران کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے

مدد کے طریقہ کار پر کوئی بات نہیں کی۔ اس سے مجھے اندازہ

ہوا کہ طریقہ کار پر پہلے بات ہو چکی ہے اور اب جو کچھ ہوگا،

اس کے مطابق ہوگا۔

عمران نے قریب رکھی پلیٹ میں سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا

اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور دوسرا ٹکڑا گرو کی طرف بڑھاتے

ہوئے بولا۔ ”تمہیں اپنا اور اپنی پتی کا تیا جیون مبارک ہو۔“

گرو نے مجبوراً مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا لیکن اس کے

چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مٹھائی نہیں، کوئین کی گولی کھا رہا

ہے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں صورت حال مجھ پر واضح ہو

گئی۔ عمران نے گرو سے جس ”مدد“ کی بات کی تھی، اس کا

طریقہ کار پہلے بھی زیر بحث آچکا تھا۔ استھان کی پہرے

داری میں بائیس افراد کے ذمے تھی۔ یہ لوگ رات نو بجے

کے بعد اپنی ڈیوٹی پر آتے تھے اور صبح کا اجالا نمودار ہونے

تک رہتے تھے۔ ایک دوسرا جتھادون کے وقت پہرے کے

فرائض انجام دیتا تھا۔ چند دن کے وقفے سے یہ ڈیوٹی بدلتی

رہتی تھی۔ دن کے پہرے دار رات کی شفٹ میں چلے جاتے

”لیکن تم گرو اور استاد ہو... استاد ہی ہوتی ہیں یہ ہے کہ

کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے۔ اور درمیانی راستے تو ہر وقت

تمہاری مٹھی میں رہتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا

یہ سینچر کی رات والا استھان ہے۔ تم گرم پانی میں بیٹھ کر جاپ

کرتے ہو اور کوئی تمہیں پکڑ بھی نہیں سکتا۔ اس کی ایک مثال

تمہاری یہ پتی ہے۔ یہ تم سے دس پندرہ سال تو چھوٹی ضرور

ہے اور سندر بھی ہے۔ تمہارے جیسے گرو تو اکثر برہم چاری

ہوتے ہیں لیکن تم دونوں مزے لے رہے ہو۔ گرو گھنٹال بھی

ہنے ہوئے ہو اور اپنا بستر بھی گرم کر رکھتے ہو۔ یقیناً اپنے

لیے یہ رعایت بھی تم نے کسی نہ کسی پوتھی (کتاب) سے ڈھونڈ

ہی نکالی ہوگی۔“

گرو کی بولتی بند ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بات اچھی طرح

اس کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اپنے سامھی کے زخمی ہونے کے بعد

امیت (یعنی عمران) فیصلہ کن موڈ میں ہے۔

اس نے کچھ دیر تک مزید آئیں بائیں شاخیں کی پھر

ڈھیلا پڑ گیا۔ عمران سے اجازت لے کر اس نے تھوڑی دیر

تک پوجا پاٹ کی اور اپنی آنکھوں کو نم تاک کیا پھر کچھ پرانی

پوتھیاں لے کر بیٹھ گیا اور ان کے ورق الٹ پلٹ کرنے لگا۔

جہاں تک میں نے اس کا تجربہ کیا تھا، وہ ڈرامے باز گرو نہیں

تھا۔ اس کے دل میں دھرم کا خوف اور اپنے عقیدے کا پختہ

ہون بھی موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اور اپنی

پتی کی جان بھی پیاری تھی۔

اسی دوران میں عمران نے اگلی مٹھی دھکا کر گرو کے

قریب رکھ دی تاکہ وہ پوری یکسوئی سے اپنے ”مطلب“ کی

کوئی تحریر ڈھونڈ سکے۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ مونگ پھلی

نکال کر مجھے دی اور خود بھی ٹھکڑ ٹھکڑ کر کھانے لگا۔ اس کے

بعد وہ دوسرے کمرے میں اقبال کی خبر گیری کے لیے چلا

گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گرو پوتھیوں کی ورق گردانی سے

فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینا تھا۔ وہ نفی میں

سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دوسری مٹھیاں تو کسی نہ کسی طرح ثنا

ہو سکت ہیں لیکن موہن کمار کی مٹھیا ایک ایسا مہا پاپ ہے جس

کی چھوٹ کسی طور بھی ناہیں ہے...“

”تو پھر۔“ عمران نے معنی خیز انداز میں ہزر رنگ کی

ڈیوائس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بس ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں وچار کیا جا

سکت ہے۔“ اس نے ایک بوسیدہ کتاب میں سے ایک نشانی

لگے صفحے کو سامنے کیا اور اس پر لکھے ہوئے سنسکرت کی اشلوک

زیر لب پڑھنے لگا۔

جلن اب ٹھیک ہے۔ وہ اب رادھا دیوی کو سنبھال سکتا ہے۔

”اے کسی اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

”لیکن جگر! یہاں سب مریض ہیں... نفسیاتی مریض، روحانی مریض... جنونی اور پتا نہیں کیا کیا... میں ان کو کیا لعن طعن کروں، میں خود ایک چڑیلا ہوں۔“

پھر اچانک عمران کی نظر میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ ریت کے تھیلے کے ساتھ میں گھٹنوں تک جو طبع آزمائی کرتا تھا، اس نے میری انگلیوں کی گانٹھوں کو سہا کر دیا تھا اور یہاں سے جلد سخت چڑے جیسی ہو گئی تھی۔ میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا، تاہم مجھے یقین تھا کہ میں کسی دروازے کے موٹے سے موٹے تختے کو مکا مار کر توڑ سکتا ہوں۔ میں گا بے بگا ہے اپنی ضرب کی سختی کو جانچتا رہتا تھا اور مجھے روز افزوں بہتری کا احساس ہوتا تھا۔ عمران نے حیرت آمیز انداز میں میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے انگوٹھے سے میرے ہاتھ کی پشت کو سہلایا... پھر میرے دوسرے ہاتھ کی پشت کو دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے تابی؟ میں تم میں بہت زیادہ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔“

”اچھی یا بُری؟“ میں نے پوچھا۔

”اچھی... بلکہ شاید بہت اچھی... تم ایک... بدلے ہوئے شخص ہو اور یہ نشان جو تمہاری جلد پر ہیں، یہ بھی کوئی نئی کہانی سنار ہے ہیں۔ کہیں کوئی فائننگ شائننگ کا آرٹ تو نہیں سیکھ رہے ہو تم؟“

”فائننگ کا آرٹ تو نہیں... ہاں تم جینے کا آرٹ کہہ سکتے ہو۔“ میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”کوئی باکمال استاد ہی لگتا ہے بھئی۔“ عمران نے آنکھیں نیچیں۔ ”کون ذات شریف ہے؟“

”ہے نہیں... تھا۔“

”کون؟“

میں نے گہری سانس لی اور آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ ”وہ بہت انوکھا تھا عمران... بہت جدا... جب میں تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور مجھے ہر چہرے میں تمہارا چہرہ نظر آتا تھا تو ایک روز اچانک وہ میری زندگی میں آ گیا... تمہارا بدل بن کر... تمہارے عداوت کی طرح... وہ مجھے ایک پرانی کشتی میں ملا۔ وہ عشق کے راستے کا تباہ حال مسافر تھا... ایک کمزور پانچ اور حقیر سا شخص۔ لیکن وہ جو نظر آتا تھا، وہ نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک بڑا انسان چھپا ہوا تھا۔ ایک بہت طاقتور، دلیر اور دانا شخص۔ وہ مارشل آرٹ کا ایک

میں دیکھ سکتا تھا۔

ان میں سے ایک یقیناً لڑکی تھی۔ وہ کندھوں تک ایک گڑھے میں تھی، اس کے بازوؤں کی حرکت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رات کے اس بے سناٹے میں منی کھود رہی ہے۔ نہ جانے یہ کیا معما تھا۔ اس رات شکیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تلسی کے پودے کے نیچے اس لیے مٹی کھود رہی تھی تاکہ اسے وہاں سے شیواجی کے نام کی مہر مل سکے، اگر ایسا ہو گیا تو یہ لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ ارجن وغیرہ کا ڈھونگ ہی لگا تھا۔

میں شاید کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرتا اور کچھ ٹوہ لگانے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں ایک آواز نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک تو مہمند پھرے دار کی آواز تھی۔ اس کے ہاتھ میں نارنج چمک رہی تھی۔ ”مہاشے! یہاں کیا کر رہے ہو آپ؟“ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

پھر اس نے نارنج کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی اور چونکی ہوئی آواز میں بولا۔ ”گوپال صاحب! آپ یہاں... اس وقت... خیریت تو ہے؟“

”بس ذرا سینے میں جلن ہو رہی تھی اس لیے ٹہل رہا ہوں۔“

”اگر طبیعت خراب ہے تو بتائیے۔ یہاں دوا دارو کا انتظام بھی ہے۔“ اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شکیلہ کی صورت تادیر نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اس کا قصور کچھ نہیں تھا، اگر کوئی قصور تھا تو وہ اس کے بھائی کا تھا... اور وہ بھی بس اتنا کہ وہ ایک برہمن زاوی کے دل میں سما گیا تھا۔ اس قصور کی پاداش میں اس کی ایک بہن قتل ہو چکی تھی اور وہ خود زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اسے اس دردناک صورت حال سے نکلانے کے لیے آخری حد تک کوشش کروں گا۔ اگر میرے علم میں یہ بات نہ آئی ہوتی تو اور بات بھی، اب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر فراموش کر دینا ممکن نہیں تھا۔

”میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں گا؟ میں تو خود بھی اسے زیادہ نہیں جان سکا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے اب تو...“ وہ ایک دم کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کی ساری دلکشی، شگفتگی اچانک اندوہ میں ڈھل گئی۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے تیر گئے۔

”کیا بات ہے... تم کچھ کہنے لگے تھے؟“

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کنبی کھجائی اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن ایک بُری خبر ملی ہے۔“

میں ٹھٹک گیا۔ ”سلطانہ تو ٹھیک ہے؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”سلطانہ تو ٹھیک ہے... لیکن شکیلہ...“

”کیا ہوا شکیلہ کو؟“

”وہ... نہیں... رہی۔“

”نہیں رہی... کیا مطلب؟“

عمران کے لہجے میں عجیب سی آتش بھڑک گئی۔ ”انہوں نے مار دیا اسے۔ آج صبح سویرے تمہارے یہاں واپس آنے کے کچھ ہی دیر بعد۔“

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج گئیں... نگاہوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جو آج سحری کے وقت میں نے دیکھا تھا۔ کمروں کے پچھواڑے کچے احاطے میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس کچھ سائے حرکت کر رہے تھے۔

”اوہ خدایا۔“ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے عمران کہ ایسا ہو گیا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، آج صبح سویرے اس کے سر پر چوٹ لگا کر اسے مارا گیا... پھر اس کی اپنی کھودی ہوئی قبر میں ہی دفن کر دیا گیا۔“

”اپنی کھودی ہوئی قبر؟“

”یہ درندگی کی ایک اور یادگار مثال ہے۔ وہ بے چاری پچھلے چار پانچ روز سے خود ہی تھوڑی تھوڑی کر کے اپنی قبر کھود رہی تھی۔ یہ بھی یہاں کی محسوس رسوں میں سے ایک رسم ہے۔ دھرم دھنی کے جرم میں قتل کیا جانے والا کوئی شخص اگر اپنی قبر خود کھودتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے خون کا بوجھ، خون کرنے والوں پر کم سے کم ہو جائے گا۔ گروسو بھاش صاحب فرما رہے تھے کہ کوئی ایک ہزار سال پہلے یہ استھان ایک رانی گلاب کماری صاحبہ نے بنوایا تھا۔ وہ بہت اونچے

انٹرنیشنل سپراسٹار تھا۔ باروندا جینی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟“

”ہاں، کچھ کچھ لگ تو رہا ہے۔ شاید اس نے کسی فلم میں بھی کام کیا تھا۔“ عمران پُرسوج لہجے میں بولا۔

”فلم اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ زندہ رہتا تو شاید فلموں کی ضرورت بن جاتا... وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ساتھ کوئی خدائی تحفہ لے کر دنیا میں آتے ہیں۔“

”تو کیا وہ زندہ نہیں؟“

”ہاں عمران، وہ مر گیا... لیکن مرنے سے پہلے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا گیا۔ جو کمی تم نے رہنے دی تھی، وہ اس نے پوری کر دی۔ اس لیے تو کہتا ہوں کہ وہ تمہارا بدل بن کر مجھے ملا تھا۔“

”کیا ہوا اس کے ساتھ؟“

”وہی جو پیار کرنے والوں اور اس پر قائم رہنے والوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ دنیا نے اسے محبت کی سزا دی اور اس نے ہنستے ہنستے قبول کر لی۔“ میری آنکھوں کے کنارے پھر جل اٹھے۔

”یہ تو کوئی لمبی کہانی لگتی ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کہانی نے تمہیں بہت دکھی کیا ہے۔“

”ہاں، میرے بارے میں تمہارے اکثر اندازے بالکل درست ثابت ہوتے ہیں عمران۔ اس کی جدائی نے مجھے بُری طرح توڑا پھوڑا ہے... لیکن میں قدرت کی کرشمہ سازی پر حیران ہوں۔ جب میں تمہارا خلا بڑی طرح محسوس کر رہا تھا تو اسے پُر کرنے کے لیے باروندا جینی آ گیا اور جب باروندا جینی کے بعد مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا... مجھے پھر سے تم مل گئے۔ میں سچ کہتا ہوں عمران... مجھے ابھی تک اپنے حواس پر بھروسہ نہیں ہو رہا۔ تم کہاں چھپ گئے تھے؟ اور اب یہاں انڈیا کی اس دور دراز اسٹیٹ میں یہاں انتہا پسندوں کے اس ٹھکانے پر؟ یہ سب کچھ اتنا ڈرامائی ہے کہ بس ایک خیال کی طرح لگتا ہے۔“

”میں نے تمہیں کہا ہے تاکہ تمہیں سب کچھ بتاؤں گا اور پوری تفصیل کے ساتھ۔“

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ جذباتی نظر آیا مگر پھر اس کی فطری شوخی نمود کر آئی۔ وہ میرے ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔

”زبردست۔ اب یہ ہاتھ مردوں والے ہاتھ لگتے ہیں۔ اب تو تمہارے باروندا کے بارے میں مزید جاننے کو دل چاہتا ہے۔“

درجے کی بچاری تھیں۔ انہوں نے جیون بھر کنوارہ رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔۔۔ لیکن پھر ایک رات وہی کچھ ہوا۔۔۔ جو آج کل کی فلموں میں ہوتا ہے۔ ایک طوفانی رات میں ایک مسافر اس استھان میں آکر ٹھہرا۔ انسانی تقاضوں کے ریلے کے سامنے صبر و تحمل کی ساری رستی دیواریں بہہ گئی تھیں۔ یہ بات چچی نہ رہ سکی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رانی صاحبہ نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ اور یہ سزا موت تھی۔ کوئی انہیں موت کی سزا دینے کو تیار نہیں تھا۔ رانی صاحبہ کا رتبہ اور مرتبہ ہر کسی کو ڈرا رہا تھا۔ تب رانی صاحبہ نے خود اپنے لیے ایک گڑھا کھودا اور اپنے ایک وفادار سیوک کے ذریعے خود کو اس میں زندہ دفن کر لیا۔ تاہم کچھ روایتوں میں کہا جا رہا ہے کہ رانی گلاب کماری کا یہ بلیدان ان کی موت کے بغیر ہی قبول ہو گیا اور اگلے روز جب لوگوں نے مٹی ہٹائی تو رانی صاحبہ کا شیر و ہاں موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ حالت میں بنارس پہنچ چکی تھیں۔“

عمران کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ جلائی روپ پیش کر رہا تھا۔ اس کا یہی روپ تھا جو اس کی خوش مزاجی اور ٹھنڈے پن سے بالکل علیحدہ تھا۔۔۔ اور جو دیکھنے والے کو سراسر کر ڈالتا تھا۔

اس نے مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی اور آج رات کے لیے تیار رہنے کی ہدایت دی۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب مزید انتظار بالکل کرنا نہیں چاہتا۔ شاید میری طرح اس کے دل میں بھی یہ اندیشہ آن موجود ہوا تھا کہ شکیلہ کی طرح کہیں سلطانہ کے معاملے میں بھی تاخیر نہ ہو جائے۔ یہ بے حد خطرناک لوگ تھے۔ جنون کی حد تک کٹر اور انتہا پسند۔ وہ کسی لمحے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

عمران نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”تم سب کچھ روزانہ کے مطابق ہی کرنا۔ رات کا کھانا کھا کر لیٹ جانا اور لالٹین بجھا دینا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اقبال کو بھیجوں، وہ آکر تمہیں لے جائے گا۔“

اس نے اپنی ٹیٹھ کے نیچے سے ایک چھوٹا پتل نکالا۔ اسے رومال میں لپیٹا گیا تھا۔

”یہ رکھ لو۔۔۔ لوڈ ڈے۔ کل تمہیں اس کے مزید راونڈز دوں گا۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”یہ بڑی فائیو اسٹار چیز ہے۔“

میں نے پتل لے کر بستر کے نیچے چھپا دیا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں عمران سے شروت۔۔۔ عاطف اور فرح کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا

چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ عمران کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ شکیلہ نام کی اس لاچار لڑکی سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ وہ مرنے کے لیے بالکل تیار تھی اور وہ مر گئی تھی۔ ایک سفاک انتقام کی بھیٹ چڑھ گئی تھی۔ عجیب سے پچھتاوے نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب چند گھنٹے پہلے میں نے تاریکی میں پچھواڑے کے احاطے میں متحرک سائے دیکھے تھے۔ یقیناً یہ وہی وقت تھا جب شکیلہ کو قتل کیا جا رہا تھا۔ ایک باہی اور تھکی ہوئی زردی لڑکی تصور میں آئی۔ وہ بے خبری میں اپنی قبر خود کھود رہی تھی اور مشقت سے کراہ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے کس طرح مارا گیا تھا؟ وہ جلدی مر گئی تھی یا تکلیف سے؟ آہ۔۔۔ انسان کسی وقت جانوروں اور درندوں سے کتنی سبقت لے جاتا ہے۔

تل پانی کی شکیلہ لاچاری کی ایک ایسی ناقابل فراموش تصویر بن کر میرے ذہن سے چپک گئی جسے اب مدت تک خیالوں سے محو نہیں ہوتا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس پھرے دار کو سنے لگا جو سحری کے وقت وہاں آ گیا تھا اور جس کی وجہ سے میں جلد کمرے میں جانے پر مجبور ہوا تھا۔ اگر میں کچھ دیر وہاں اور کھڑا رہتا تو شاید یہ بات میری سمجھ میں آ جاتی کہ شکیلہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اگر ایسا ہو جاتا تو شاید میں اسے بچانے کے لیے کچھ کر سکتا۔ یہ ”شاید“ کا لفظ بھی بہت عجیب ہے۔ کوئی غیب داں کوئی پیشین گویا بڑے سے بڑا عالم بھی اس لفظ کا معامل نہیں کر سکا۔ باروندا جبکی نے ایک دن اس لفظ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ میرے دماغ میں گھومنے لگا۔

۔۔۔ جوں جوں رات قریب آ رہی تھی، میرے جسم میں سنسنی کی لہریں ابھرتی اور پھیلتی جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ دھیرے دھیرے ایک ہنگامے کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اس قسم کی تناؤ والی صورت حال مجھے تین چار سال قبل توڑ پھوڑ دیا کرتی تھی۔ میں اتنا اعصاب زدہ ہو جایا کرتا تھا کہ اپنے آپ پر ترس آنے لگتا تھا۔۔۔ لیکن اب موسم بدل چکے تھے۔ میں وہ نہیں رہا تھا جو کبھی تھا اور اب تو میں اور بھی طاقتور ہو چکا تھا کیونکہ عمران میرے آس پاس موجود تھا۔

قدیم استھان کے اس زیر زمین حصے میں روزمرہ کے معمولات جاری تھے۔ کہیں پاس ہی کسی جگہ پر پٹانے سے چھوٹ رہے تھے۔ یہ دراصل رافٹ شوٹنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے مصنوعی ٹارگٹ اور ربر کی

گولیاں استعمال ہوتی تھیں۔ گامے بگا ہے سکھ بننے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں یا پھر پوجا کی گھنٹاں درد دیوار میں گونجنے لگتی تھیں۔ مذہب کے نام پر ان لوگوں نے اپنا ہی ٹانگ رچا رکھا تھا۔ سفاکی اور ختم امرا جی اس ٹانگ کے اہم ترین عناصر تھے۔ عمران نے جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس سے پتا چلتا تھا کہ یہ استھان گھنے جنگل میں واقع ہے۔۔۔ اس کے اوپر ایک بہت بڑی پھلواڑی ہے۔ اس پھلواڑی کو بالکل صاف پانی سے سینچا جاتا ہے اور اس کے پھول تل پانی کے سارے مندروں اور استھانوں وغیرہ کو بھیجے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس پھلواڑی کے نیچے پرانے استھان میں انتہا پسندوں کا اڈا قائم ہے اور پھلواڑی میں کام کرنے والے میسوں مزدور درحقیقت خطرناک دہشت گرد ہیں۔

مجھے یہاں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لایا گیا تھا تاہم خوشبو کی وہ تیز لہریں میں نے ضرور محسوس کی تھیں جو یقیناً پھلواڑی کے اندر سے اٹھ رہی تھیں۔ یعنی اوپر خوشبو تھی اور نیچے بدبو بد صورتی۔

رات کے دس بجے تک آوازیں دھیرے دھیرے معدوم ہو گئیں اور استھان خاموشی اور تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اب بس کہیں کہیں لالٹینوں یا مٹی کے تیل والے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ لکڑی کے قدیم دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ستیش تھا۔ اس کے ماتھے کا سفید قشعہ اور آنکھوں کا سرخی مائل رنگ لالٹین کی روشنی میں نمایاں تھا۔ ”کہو گوپال! خیریت سے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔ کوئی تکلیف نہیں۔۔۔ لیکن انتظار کچھ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔“

”میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ پر تو کھن سے گزر گیا ہے۔ گرو جی کا کہنا ہے کہ ستاروں کی چال اچھی ہے۔ کل دوپہر تک سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ وہ شام کو شبہ گھڑی نکالیں گے اور رات آٹھ بجے تک تمہارا کام مکمل ہو جاوے گا۔“

”یہ آپ نے اچھی جانکاری دی ہے۔“ میں نے مؤدب انداز میں کہا۔

”ماتا جی نے تمہیں پیار بھیجا ہے۔۔۔ اور اب تک جو تکلیف تمہیں اٹھانا پڑی ہے، اس کے لیے پتا جی نے شکریہ ادا کیا ہے۔“

”ستیش جی! آپ کیسی بات کرت ہیں۔ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔ آپ کے پر یوار کی وجہ سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں ایک ادھر تاری کو اپنے ساتھ سے انجام تک پہنچاؤں۔ یہ

میرے لیے بڑے اعزاز کا کام ہے۔“

”مجھے دشو اس ہے، ایشور تمہیں اس کا بدل دے گا۔۔۔“

جس وقت میں برہمن زادے ستیش سے باتیں کر رہا تھا، میں نے اقبال کو دیکھا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ مجھے اور ستیش کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر وہ ٹھنکا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ یقیناً وہ ستیش کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ ستیش کے جانے کے بعد چار پانچ منٹ کے اندر دروازے پر پھر دستک ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اقبال ہی ہے۔ میرا خیال درست نکلا۔ اقبال نے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی، اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ ہاں، کل کے مقابلے میں افاقہ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں تو پہلے ہی تیار تھا۔ ستیش کی فراہم کردہ کپڑے کی جیکٹ پہن چکا تھا۔ یہاں میں نے کسی کے پاس چڑے کی جیکٹ یا جوتی نہیں دیکھی تھی۔ غالباً اپنے کنزپن کی وجہ سے وہ چڑے کا استعمال پاپ سمجھتے تھے۔

عمران نے کل رات مجھے جو پتل دیا تھا، وہ بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اقبال اور میں آگے پیچھے چلتے ہوئے گرو کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے اپنے درمیان پندرہ بیس قدم کا فاصلہ رکھا تھا۔ یہ قدیم استھان حسب سابق شب کے سناٹے میں اونگھ رہا تھا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے، کچھ سونے کی تیاری میں تھے۔ آہستہ گرنے کی آواز سنائی دینے لگی اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، یہ آواز نمایاں ہوتی گئی۔ پانی کے قدرتی تالاب کے اندر اوندھا پڑا مجسمہ دکھائی دیا اور پھر گرو کی رہائش گاہ کے دروازے کی جھلک نظر آئی۔ اس اوندھے پڑے جسمے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک علامت ہے، فرسودہ عقیدوں اور کہنہ رسوں کے زوال کی۔ یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ شاید سوچنے والوں کو دعوت فکر دے رہا تھا۔ انہیں وقت کے جدید تقاضوں کی طرف بلاتا تھا۔

ہم گرو کے گھر میں داخل ہوئے۔ زنانے میں اس کی جوان بیٹی ایک عکے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ کل ہی کی طرح ہندی تھا۔ اس کے قریب عمران فرشتہ اجل کی صورت موجود تھا۔ ”ہرا طوطا“ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرو بھی ایک طرف گم صم بیٹھا تھا۔ جوتی چیز نظر آئی، وہ بھاگ متی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھی ہوئے ہوئے پان چبا رہی تھی۔ اس کا ایک رخسار ابھی تک گہرا نیلا تھا۔ فضا کا تناؤ بتا رہا تھا کہ نازک ترین گھڑیاں آن پہنچی ہیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کو دیکھا۔ اقبال

بولے۔ ”ہال کمرے میں تو خاموشی ہے۔ شاید ایک آدھ بندہ ہی جاگ رہا ہو۔ درمیانی ہال کی طرف سے کچھ آوازیں آرہی تھیں مگر زیادہ روشنی وہاں بھی نہیں تھی۔“

عمران بولا۔ ”مجھے زیادہ خطرہ بس اس کیدو کی طرف سے ہے۔ وہ خانہ خراب پانی کی طرح پیتا ہے۔ ایک دو پیالوں سے تو اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی طرف سے تسلی کرنا ہوگی۔ آج اس کی ڈیوٹی کس طرف ہے؟“

”میرے حساب سے تو وہ سڑھیوں والے دروازے پر ہوگا۔ اردن، نیل اور گاڑی بان بھولانا تھ وغیرہ بھی وہیں پر ہیں۔“

عمران اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک چکر ادھر کا لگا آؤں۔ خاص طور سے اس کیدو کو دیکھ لوں۔“ کیدو سے اس کی مراد ارجن تھی۔

”پانچ دس منٹ اور ٹھہر جاؤ۔“ اقبال نے رائے دی۔ ان باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ گروسو بھاش نے اپنا کام کر دیا ہے۔ بھنگ اور دھتور اٹلی ہوئی تازی پیرے داروں کو پلائی جا چکی ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران اور اقبال پوری طرح تیار ہیں۔ عمران کے قریب ہی ایک سیون ایم ایم رائفل رکھی تھی۔ عمران کی جیکٹ کی جلیں پھولی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں بھی رائفل کے فالتو رائفٹرز اور میگزین موجود تھے۔ اقبال کی جیکٹ بھی اسی طرح بھاری بھر کم نظر آرہی تھی۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار چیک کیے اور مجھے مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمیں کیا اور کس طرح کرنا ہے۔

گرو کی پرزور درخواست اور گاڑی پر پہلوان نما ملازمہ کو کل رات ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ بھاگ متی نے ہی آج کسی طرح سلطانہ سے ملاقات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ تیار رہے، آج رات اسے اور اس کے بھتیجے کو یہاں سے نکال لیا جائے گا۔

جو کارروائی یہاں ہونے والی تھی، اس کے بارے میں ضروری ہدایات بھی بھاگ متی نے ہی سلطانہ تک پہنچائی تھیں۔ سلطانہ بڑے گرو کی ذاتی تحویل میں تھی اور اسے ایک ایسی کال کھڑی میں رکھا گیا تھا جس میں لوہے کا بس ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔

اس سے پہلے کہ عمران گھر سے باہر نکلتا، کچھ فاصلے سے چلانے کی آوازیں آئیں۔ کوئی شخص آہ و بکا کرتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں فوراً چھپا

دیں۔ اقبال نے مردانے میں جا کر باہر جھانکا اور پھر پریشان آواز میں بولا۔ ”یہ تو وہی لنگڑا ارجن ہے۔“

”اوہ گاڈ۔“ عمران نے بے ساختہ کہا۔ چند سیکنڈ بعد دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ارجن کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دی۔ ”گرو جی۔۔۔ دروازہ کھولیں۔۔۔ گرو جی۔“

گرو کے چہرے پر کچھ مزید ہوائیاں اڑنے لگیں۔ عمران نے گرو کو اشارہ کیا کہ وہ خود دروازہ کھولے۔

گرو نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ارجن لڑکھڑاتا اور ڈنگاتا ہوا اندر آ گیا۔ گرو نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سنبھالا۔ وہ بدست آواز میں بولا۔ ”گرو جی! غضب ہو گیا ہے۔ کسی نے تازی میں کچھ ملا دیا ہے۔ سب بے ہوش ہو گئے ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔۔۔ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔“ ارجن خود بھی جھوم رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو جائے گا۔

عمران کے اشارے پر گرو اسے جلدی سے زنان خانے میں لے آیا۔ ارجن پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھتیجی آواز میں بولا۔ ”جلدی سے کچھ کریں گرو جی! مجھے تو لگتا ہے کہ شاید حکم جی کے لوگن یہاں ٹھس آئے ہیں۔“

گرو نے تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ارجن ایک ایسے شخص کے پاس فریاد لے کر پہنچا تھا جو خود ساری صورت حال کا ذمے دار تھا۔ عمران کے اشارے پر گروسو بھاش، ارجن کو اس چھوٹے کمرے میں لے گیا جہاں دو دن پہلے تک فربہ اندام داسی بھاگ متی بندھی۔ عمران نے ارجن کو زور سے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر دہشت زدہ نظر آنے لگا۔ اس کے حواس جواب دیتے جارہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بس ایک آدھ منٹ میں وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح انا غلیل ہو جائے گا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا کر عمران نے چادر کی بگل ماری اور رائفل اٹھالی۔ یہ چھوٹے بیرل والی اسارٹ سی رائفل تھی۔ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ عمران مسلح ہے، کچھ ہی حال اقبال کا بھی تھا۔ عمران نے مجھے ایک مقرر نما گرم کپڑا دیا اور کہا کہ میں اس سے اپنا چہرہ ڈھانپ لوں۔

”اس سے کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم بعد میں اپنی بیوی سے منہ دکھائی وصول کر سکو گے۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی مرضی تھی کہ

سلطانہ مجھے گرو اور رادھا وغیرہ کے سامنے نہ پہچانے۔ ”چلو گرو جی۔“ عمران نے حکم سے کہا۔ ”اور تم بھی شریعتی جی۔“ عمران نے رادھا کی طرف اشارہ کیا۔

رادھا کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بوٹے سے قد کی متناسب جسم والی لڑکی تھی لیکن کمر میں بندھی ہوئی بیٹ کی وجہ سے اس کا پیٹ بھاری نظر آرہا تھا۔ بادی النظر میں وہ حاملہ لگتی تھی۔ گرو پہلے سے کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عمران سے سوال کیا۔ ”سلطانہ تمہارے حوالے ہو جاوے گی تو پھر تم رادھا کی کمر سے پٹی اتار لو گے اور ہمیں واپس آنے دو گے؟“

”میرے خیال میں یہ بات میں تم سے دس پندرہ دفعہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔۔۔ اور شاید اتنی ہی دفعہ راج (اقبال) نے بھی کہی ہے۔ اب صرف اسٹامپ پیپر پر لکھوا لگانے کی کسر رہ گئی ہے۔“

گروسو بھاش ایک دم خجل نظر آنے لگا۔ ہم آگے پیچھے گرو کی رہائش گاہ سے نکلے۔ گرو کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گڑوی تھی اور لکڑی کے موٹے دانوں کی مالا بھی۔ ایسی ہی مالا رادھا کے ہاتھ میں بھی تھی۔ اس کے صراحی دار گلے میں رات کی رانی کے پھولوں کا ہار بھی تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ وہ دونوں کسی خاص پوجا کے لیے بڑے ہال کمرے کی طرف جارہے ہیں۔ آبخار کے پاس سے گزر کر ہم استھان کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر ہم بڑے گرو کی قیام گاہ کی طرف آگئے۔ یہاں دیواروں پر مذہبی انتہا پسندی سے متعلق نعرے درج تھے اور دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ایک پتھریلی دیوار کے قریب کم از کم پانچ افراد بے سدھ پڑے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی ان کے پاس ہی تھیں۔ چار افراد ایک جگہ تھے، پانچواں کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ گراسے جس کی وجہ سے اسے چوٹ لگی ہے لیکن بعد ازاں یہ قیافہ غلط ثابت ہوا۔ منہ سے خون رسنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

گروسو بھاش نے اس زخمی پہرے دار کی جیسیں ٹٹولیں اور پیٹل کی دو لمبی چابیاں نکال لیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ نظر آرہا تھا۔ یہ موٹی دیواروں والی وہی کال کھڑی تھی جہاں سلطانہ کو رکھا گیا تھا۔ گرو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کے ہضمی قفل میں چابی گھمائی۔ وزنی دروازہ مدھم مدھم آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر لائٹیں کی زورور روشنی

میں مجھے سلطانہ اور پندرہ سولہ سالہ طلال نظر آئے۔ وہ دونوں دروازہ کھلنے کے انتظار میں ہی تھے۔ دونوں خستہ حال اور مدقوق دکھائی دیتے تھے۔ سلطانہ کی طرح طلال کے چہرے پر بھی چوٹوں کے نئے پرانے نشان تھے۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ سلطانہ کو کسی جانور کی طرح ایک زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ یہ زنگ آلود زنجیر اس کے دونوں پاؤں کو جکڑے ہوئے تھی۔ طلال زنجیر کے بغیر تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سلطانہ ان لوگوں کے نزدیک زیادہ خطرناک قیدی ہے یا پھر ہوسکتا تھا کہ اس نے قید کی حالت میں بھی مزاحمت جاری رکھی ہو۔ دوسری چابی سے گرو نے سلطانہ کی زنجیر کا قفل کھولا اور اس کے زخمی پاؤں آزاد کیے۔ سلطانہ نے مجھے دیکھا لیکن دیکھ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے اپنے گرد ایک پھول دار گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ طلال ایک بوسیدہ سے کوٹ میں تھا۔

ہم ان دونوں کو لے کر واپس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب ساتھ والے حجرہ نما کمرے کا دروازہ کھلا اور بالکل سفید بالوں اور جھڑیوں بھرے چہرے والا ایک نہایت بوڑھا شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ لائٹ کے سہارے بہ مشکل کھڑا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے باہر کا سارا منظر دیکھا۔ اس کا ریشہ زوہ سر کا نپٹا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھے منہ کے ساتھ گروسو بھاش سے کچھ کہا۔

گروسو بھاش نے آگے جا کر اپنا منہ بوڑھے گرو کے کان کے ساتھ لگایا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”مہاراج۔۔۔ اپنے بستر پر واپس جاؤ، سب ٹھیک ہے۔“ جواب میں بوڑھے گرو نے کچھ کہنا چاہا لیکن گروسو بھاش نے اسے تقریباً دھکیل کر واپس کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

گروسو بھاش کے رویتے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑا گرو اب بس نام کا ہی گرو رہ گیا ہے، ورنہ اب یہاں اس کی کوئی سزا نہیں ہے۔

ہم سلطانہ اور طلال کو لے کر واپس چل دیے مگر یہی وقت تھا جب ہم پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ارجن کسی طرح اس کمرے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب رہا ہے جہاں ہم اسے بند کر آئے تھے۔ وہ آفت کا پرکالا گرو کے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آبخار کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سینے کی پوری قوت سے چلا رہا تھا اور او بیٹا کر رہا تھا۔ ہم سے اس کا فاصلہ بس چالیس پچاس قدم ہی ہوگا۔ دو افراد بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئے اور اسے سنبھالا۔ ان

میں سے ایک طلال کی عمر کا ایک بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی اس استھان میں رضا کارانہ خدمت انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مختلف کمروں میں پھول سجاتے اور کھانا لاتے دیکھا تھا۔ دوسرا بچی عمر کا شخص تھا۔ ارجن نے ان دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔ ”گرو جی ان لوگوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انہوں نے پہرے والوں کو زہریلی تاڑی پلا دی ہے۔۔۔ کچھ کرو، جلدی کچھ کرو۔۔۔“

میں نے دیکھا کہ عمران کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ ”کتے کا بچہ۔“ وہ پھنکارا۔ اس کی یہ گالی یقیناً ارجن کے لیے تھی۔ اس نے اپنی چادر اتار پھینکی۔ چھوٹی نال والی رائفل سیدھی کی۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ قریباً 40 میٹر کی دوری پر گولی ارجن کے پیٹ میں کہیں لگی مگر اس گولی نے اتنا ہی نقصان کیا جتنا سر پر لگنے والی گولی کرتی۔ ارجن پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، گولی کھا کر سیدھا تالاب کی گہرائی میں گیا۔ میں نے دیکھا، اس کا سر پانی میں اوندھے پڑے پتھر کی طرح نیچے نیچے کے دیو پھل کندھے سے نکل آیا اور یقیناً کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

عمران کا دوسرا نشانہ ارجن کے قریب کھڑا دراز قد پہرے دار تھا۔ یہ گولی سر میں لگی اور بھیجا پھاڑ کر نکل گئی۔ نوعمر رضا کار لڑکا اندھا دھند بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ عمران نے اس کی طرف رائفل سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا کہ عمران اسے نشانہ نہ بنائے مگر میری سوچ کے مکمل ہونے تک وہ نشانہ بن چکا تھا۔ اسے پشت پر دو گولیاں لگیں اور وہ بھاگتے بھاگتے دو تین قلابازیاں کھا گیا۔

یہ سب کچھ بس دو یا تین سیکنڈ کے اندر ہوا۔ استھان میں ایک دم کھرام سا چل گیا۔ لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور دھماکوں کے ماخذ کی طرف بڑھے۔ کچھ رائفلیں بھی لہراتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم سلطانہ، طلال اور گرو وغیرہ سمیت اگلے قدموں سیزھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ سیزھیاں ہمیں بالائی منزل کی اس راہداری کی طرف لے جاسکتی تھیں جو نکاسی کے راستے کی طرف جاتی تھی۔

یکا یک ایک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ۔۔۔ یہیں رک جاؤ۔ میں گولی چلا دوں گا۔“

میں نے دیکھا، ایک دیوار کی اوٹ میں نیم سرخ آنکھوں والا ستیش موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید رائفل تھی۔

ستیش کی اس لٹکار نے ارد گرد موجود ہر شخص کو چوکس کر دیا۔ کئی رائفلیں نظر آئیں اور رائفل بردار ہماری سمت

بڑھے۔ اب فار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عمران کی طرح اقبال نے بھی چادر اتار پھینکی اور رائفل سیدھی کر لی۔ میں پہلے ہی کولٹ پمپل جیب سے برآمد کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر میں نے پمپل کی نال گردو سو بھاش کی کنپٹی سے لگا دی۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں مخالفین پر تان رکھی تھیں اور اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی ایک گولی بھی چل جاتی تو پھر خون ریزی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ستیش کا نشانہ لے رکھا تھا اور ستیش نے شاید عمران کا۔ عمران کی جانی پہچانی گرج میرے کانوں تک پہنچی۔ ”ستیش! ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے گرو کی لاش گرے گی۔۔۔ پھر اس کی جتنی چند رہیں ٹکڑوں میں تبدیل ہوگی۔ ہم نے اس کی کمر سے سی این بی باندھ رکھا ہے۔ بس۔۔۔ یہ ایک مٹن دبانے کی ضرورت ہے۔“ عمران نے گرین رنگ کا ریموٹ کنٹرول ہوا میں لہرایا۔

عمران کی طراری اب سمجھ میں آرہی تھی۔ اس کی سوچ ہمیشہ سے بڑی تیز رفتار رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے ارجن سمیت تین افراد کو گولی سے اڑایا تھا تو اس عمل میں تھوڑی سی سفاکی نظر آئی تھی، خاص طور سے نوعمر لڑکے کے قتل میں۔۔۔ لیکن اس کا یہ اقدام بلاوجہ نہیں تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی بچتا تو گرو سو بھاش کی وہ حیثیت نہ رہتی جو اب تھی۔ اب وہ استھان کا غدار نہیں تھا۔ زہریلی تاڑی سے اس کا تعلق صیغہ راز میں تھا۔ اب اس کی جان کی پروا کی جا سکتی تھی۔۔۔ اور ستیش اور اس کے رائفل برداروں کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ پروا کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

عمران نے اشارہ کیا۔ ہم سب اگلے قدموں پیچھے ہٹے۔ جوں جوں ہم پیچھے ہٹتے گئے، ستیش اور اس کے ساتھی آگے بڑھتے گئے۔ ان میں گاڑی بان بھولا نا تھا بھی تھا۔ اس کی اونچی ناک کے دونوں طرف اس کی عقابی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے ہٹنے والے ہر قدم کے بدلے ستیش اور اس کے ساتھی ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے لیکن گولی چلانے کی ہمت ابھی تک کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

ہم سیزھیوں پر پہنچے تو ستیش نے ایک بار پھر خونی لہجے میں دھمکی دی۔ ”ہم تم لوگوں کو اس طرح یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔ ہمیں گولی چلانا پڑے گی۔“

گرو سو بھاش گڑگڑایا۔ ”ستیش! انہوں نے رادھا کی کمر سے بارودی پٹی باندھ رکھی ہے، یہ مٹن دبا دیں گے۔“

گرو کی آواز میں دل دوز فریاد چھپی تھی۔ وہ ستیش سے اپنی اور اپنی جتنی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ دوسری طرف ستیش اور پمپل وغیرہ کو شرمناک شکست نظر آرہی تھی۔ وہ اپنی جس مجرمہ کو جان بھیک پر رکھ کر حکم جی کے ہر کاروں سے چھین کر لائے تھے، وہ ان کے ہاتھوں سے بھی چھین رہی تھی۔ اپنی قرارداداتی سزا کے قریب پہنچ کر وہ صاف بچ رہی تھی۔ ستیش نے پھر کہا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اتنا بڑا پاپ نہ کرو۔ یہ تم کو ہضم نہیں ہووے گا اور نہ ہم ہونے دیں گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، چلاؤ گولی اور دیکھ لو تمہارا۔“ اقبال نے بے پناہ اعتماد سے کہا۔ عمران اور اقبال کا یہی اعتماد تھا جو حریفوں کو لرزہ بر اندام کر دیتا تھا۔

ہم قدم قدم پیچھے ہٹتے گئے۔۔۔ ستیش اور اس کے ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے گئے۔ اب ہم سیزھیاں چڑھ کر اوپر آگئے تھے اور اس طویل راہداری میں تھے جس کی دونوں جانب ہوا کی آمدورفت کے لیے روزن سے بے ہوئے تھے۔ سب سے آگے عمران اور اقبال تھے۔ دونوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ان کے عقب میں گرو، رادھا اور میں تھے۔ میں نے پمپل کی نال گردو کے گنجنے سے لگائی ہوئی تھی۔ آخر میں سلطانہ اور طلال تھے۔ درحقیقت اس استھان کے اصل رکھوالے تو وہی ہیں بائیس پہرے دار ہی تھے جو تاڑی کی وجہ سے مدھوش پڑے تھے۔ یہ جو دوسرے لوگ تھے، ان میں ستیش اور اس کے ایک دو ساتھیوں کے علاوہ کسی میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ پورے جی جان سے ہمارے مقابل آسکتا۔

یکا یک ستیش کے چہرے پر شدید اضطراب کے آثار نظر آئے، شاید اس نے کچھ بھانپ لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کر پاتا، عمران اور اقبال جیسے کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق تیزی سے دائیں بائیں ہٹے اور انہوں نے راہداری کا ایک آہنی دروازہ بڑی پھرتی سے بند کر دیا۔ توتر کی خوفناک آواز سے تین چار گولیاں چلیں لیکن انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ایک گولی اقبال کے سر کے اوپر سے گزرتی، دو دروازے کے آہنی تختوں سے ٹکرائیں۔ عمران اور اقبال نے تیزی سے دروازے کا آہنی کھنکا چڑھا دیا۔

”بھاگو۔“ عمران نے پکار کر کہا۔

ہم سب پلٹ کر دوڑے۔ دوسری طرف دروازے کو اندھا دھند دھکے دیے جارہے تھے لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی

ٹینک کو پستول کی گولی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ بہت وزنی دروازہ تھا۔ گرو سو بھاش کو ہمارے ساتھ بھاگنا پڑ رہا تھا لیکن یہ کام اس کے لیے جتنا مشکل تھا، اتنا ہی مضحکہ خیز بھی تھا۔ اس کی توند بڑی طرح مل رہی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اپنی توند کے بوجھ کی وجہ سے اوندھے منہ گر جائے گا۔ ہم نے ڈیڑھ دو سو میٹر کا فاصلہ تیزی سے طے کیا اور جھاڑ جھنکاڑ سے بند راستے کو کھول کر کھلی جگہ پر آگئے۔ یہاں دو گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑی بان اندر ہی مکمل لیپے سو رہے تھے۔

عمران نے ایک گاڑی میں گھس کر گاڑی بان کو رائفل کے ٹھوکے سے جگایا۔ وہ سکھ تھا۔ وہ ششدر نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گرو سو بھاش کو پہچان لیا۔ عمران نے کہا۔ ”سردار! گرد جی کے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ ان کو محفوظ جگہ پر پہنچانا ہے۔ گاڑی ہانکو اور جتنی رفتار سے چل سکتے ہو چل پڑو۔“

سکھ گاڑی بان نے کہا۔ ”گرد جی کے لیے تو جان بھی حاضر ہے جی۔۔۔ پر وہ ہے کون جو گرد جی کا دشمن ہو رہا ہے۔۔۔؟“

”اس کا تو ابھی ٹھیک سے ہم کو بھی پتا نہیں۔“ اقبال نے کہا۔

اس دوران میں عمران نے دوسری گھوڑا گاڑی کے دونوں گھوڑے کھول دیے اور انہیں چھڑیاں مار کر بھاگ دیا۔ اب کوئی اس دوسری گاڑی پر ہمارا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ ہم سب سلطانہ اور طلال سمیت گاڑی پر سوار ہو گئے۔ گرد ابھی تک تذبذب میں کھڑا تھا۔ عمران نے حکم سے کہا تو وہ اور اس کی جتنی بھی سوار ہو گئے۔ عمران کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ابھی میاں بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ گرو اور رادھا کے سوار ہوتے ہی گاڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ ہم کچھ دیر تک ایک ڈھلوان راستے پر اترتے رہے۔ خوشبو کی زبردست لپٹیں ہمارے نختوں تک پہنچیں۔ میں نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ہم واقعی ایک بہت بڑی پھلواڑی سے گزر رہے تھے۔ تاروں کی روشنی میں دور تک پھول دار پودوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ دن کے وقت یہ منظر واقعی قابل دید ہوگا۔ ہم استھان سے دور آگئے تھے مگر ابھی تک خطرے سے دور نہیں تھے۔ عمران اور اقبال پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی نگاہیں عقب میں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا جب تاڑی کے کڑک نشے میں ڈگمگاتا ہوا ارجن پیٹ میں گولی کھا

کرتا لاپ نمائی میں گرا تھا اور اس کا سر بت کے شانے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا تھا۔ شکلیہ کام از کم ایک قاتل تو میری نگاہوں کے سامنے اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

☆☆☆

جب دن کا اجالا پھیلا، ہم اس قدیم استھان کی مہلک تاریکی سے قریباً تیس میل دور آچکے تھے۔ یہ کٹا پھٹا جنگلی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں راستہ مسدود ہو جاتا اور ہمیں چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا۔ راستے میں دو تین جگہ گھوڑوں کو آرام بھی دینا پڑا۔ اب ہم جنت کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ایک نشیبی علاقے میں تھے اور خود کو کافی محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ گھوڑے بڑی طرح تھک گئے تھے۔ ہمارے انجیر بنجر بھی مل گئے تھے۔ عمران نے گاڑی ایک ایسی ہموار جگہ پر رکوادی جہاں درخت جھنڈ کی صورت میں موجود تھے اور پانی بھی تھا۔ گھوڑے پانی پر لپک پڑے۔ ہم بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے نیچے اتر آئے۔ عمران کے چہرے سے خشونت رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک بار بھر شکلی کا ڈیرا تھا۔ ہم نے راستے میں بہت کم بات کی تھی اور میں تو تقریباً خاموش ہی رہا تھا۔ وہ مفکر نما گرم کپڑا بھی میں نے چہرے سے لپیٹ رکھا تھا جو عمران نے استھان میں مجھے دیا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ نیم تاریکی میں ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی تو پھر بھی قدرے گرم تھی، باہر سردی کی یلغار تھی۔ دوسروں کے برعکس میں صرف ایک ہلکی پھلکی قمیص میں تھا۔ سردی گرمی کو برداشت کرتا مجھے اچھا لگتا تھا اور اب میرا جسم اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ میری جیکٹ گاڑی میں موجود تھی لیکن میں اسے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

عمران نے گرو کو گاڑی سے باہر بلایا اور کہا۔ ”جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس شکلیہ نام کی لڑکی کی موت کے بدلے تم دونوں کو یہاں کسی کیچڑ والے گڑھے میں زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ تم قیامت تک سردی سے ٹھنڈے رہو۔ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟“

گرو نے پرنام کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں امیت... میں استھان کا کارمچتر ناہیں ہوں۔ مجھ سے صرف رائے لی جاوت ہے جو میں پوتھیوں (کتابوں) کے مطابق دے دیوت ہوں۔ میں کسی کو بچا سکتا ہوں نہ مار سکتا ہوں۔“

”تو پھر تمہاری کیا مرضی ہے؟ کیا تم استھان واپس جانا چاہتے ہو؟“ اقبال نے پوچھا۔

گرو کا جواب غیر متوقع تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اب میرے لیے وہاں بھی بہت خطرہ ہووے گا۔ مجھے اب وشواس ناہیں کہ تاڑی میں دھتورا ملانے والی بات زیادہ سے چھپی رہ سکے گی۔ لوگن یہی کہیں گے کہ میں نے اپنی اور پتی کی جان بچانے کے لیے اپنے ہی ساتھیوں کی جان لی ہے۔“

”تم نے کس کی جان لی ہے؟ تمہارا دوش تو صرف اتنا ہے کہ تم نے پہرے داروں کو دھتورے والی تاڑی پلائی ہے۔“

”میرے دو چار میں بات اس سے بڑھ کر ہے۔ تاڑی نے پہرے داروں کو صرف بے ہوش ناہیں کیا۔“

”کیا مطلب؟“

”ان میں سے کئی مر گئے ہیں۔“ گرو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ”میں نے جب پہرے دار کی جیب سے چابیاں نکالی تھیں، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا... اس کی سانس بند ہو چکی تھی۔ ایک دوسرے پہرے دار کو بھی میں نے اسی حالت میں دیکھا ہے۔“

ہم سنائے میں رہ گئے۔ پتھریلی دیوار کے پاس پہرے دار جس طرح گرے پڑے تھے، وہ منظر واقعی تشویشناک تھا... مگر ان میں سے کچھ یکسر ختم ہو چکے تھے، یہ بات اب گرو سے پتا چل رہی تھی... گرو کراہتے ہوئے بولا۔

”اس کے علاوہ جو تین لوگن تمہاری گولیوں سے مرے ہیں، ان کی موت کا کارن بھی تو میں ہی ٹھہراتا ہوں... مجھے ناہیں لگتا کہ اب میں اور رادھا واپس استھان جا سکتے ہیں۔“

”تو پھر کیا چاہتے ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں ناہیں آتا۔ ہم... میں برباد ہو کر رہ گیا ہوں۔“ گرو بے دم سا ہو کر ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گیا۔ عمران کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ گرو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اتنی ٹھنڈی ٹھارہ زمین پر دھرتا دو گے تو تمہاری تشریف سن ہو جائے گی۔ دماغ تو تمہارا پہلے ہی سن ہو چکا ہے، اوپر نیچے سے مفلوج ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے۔ تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے۔ تمہارے جیسے برباد حال اور بے ٹھکانا لوگوں کے لیے ایک بڑی اچھی جگہ ہے میرے پاس۔ نیوز چیلن ”فساد پلس“ میں وہاں تمہیں ملازمت دلا سکتا ہوں۔ دماغ تو تمہارا آل ریڈی سن ہے، تم بڑی آسانی سے اینکر پرسن بن سکو گے۔ اینکر پرسن سمجھتے ہوتا تم؟ وہی شخص جو تین چار افراد کو سامنے بٹھا کر سوال پوچھتا ہے اور کسی کو جواب نہیں دینے دیتا۔ اور جب کوئی جواب دینے لگتا ہے تو بریک لے لیتا ہے۔“

”اور اس کی بیوی کا کیا بنے گا؟“ اقبال نے پوچھا۔

”گرو صاحب کی تو مدد دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے اچھے کھانے پکالتی ہوگی۔ اس لیے اسے آسانی سے کسی کھیلوں کے پروگرام کی میزبان بنایا جا سکتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کھیلوں کی میزبان؟“ اقبال نے حیرت ظاہر کی۔

”اگر وہ اچھے کھانے پکاتی ہے تو پھر اسے کسی کوکنگ پروگرام کی میزبان ہونا چاہیے۔“

”اؤئے باندرا! کوکنگ پروگرام کی میزبان تو بنے گی کوئی کھلاڑی۔ ان ٹی وی چینلز میں کوئی کام ڈھنگ سے ہو جائے تو پھر یہ انتظامیہ کی بہت بڑی نالائقی سمجھی جاتی ہے۔ منتظم افراد کو دقیا نوس اور نامعقول گردانا جاتا ہے۔ وہ شرم سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ گرو جی! آپ فرمائیں کیا پروگرام ہے؟“

گرو نے اپنے گننے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ ناہیں آ رہا۔ جو کچھ ہم دونوں کے ساتھ ہونے والا ہے... اس سے تو بہتر ہے کہ تم ہمیں گولی ہی مار دو۔“

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ بولا۔ ”ٹینگی اور پوچھ پوچھ۔“ وہ جلدی سے گھوڑا گاڑی میں گیا اور رادھا کو لے کر باہر نکل آیا۔ وہ ساڑی میں تھپی۔ اوپر سے اس نے ایک گرم شال لے رکھی تھی۔ وہ سکڑی سسئی ہوئی باہر آگئی۔ استھان میں چلنے والی گولیوں اور ان سے ہلاک ہونے والے تین افراد کی موت کا منظر جیسے اب تک اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ عمران کے کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل کو بے حد ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”یہ کیا کرنے لگے ہوا اقبال؟“ عمران نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”گرو جی کو قتل کرنے لگا ہوں۔“

”لیکن یہ تو گرو کی پتی ہے؟“ عمران نے کہا۔

”اسی میں تو گرو کی جان ہے یا رادھا اسے ماروں گا تو گرو خود بخود عالم بالا کی سیر کو نکل جائے گا۔“

عمران نے نفیسی انداز میں سر ہلایا۔ گرو اور رادھا دونوں کے رنگ ہلدی کی طرح نظر آنے لگے۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے۔ عمران نے رادھا کو کچھ فاصلے پر اس طرح بٹھا دیا کہ اس کی ٹیک ایک درخت کے ساتھ لگ گئی۔ اقبال نے سبز ریوٹ کنٹرول ہاتھ میں لے لیا۔ رادھا تھرتھہر کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ وہ جوان بھی، خوب صورت تھی۔ ابھی مرنا

نہیں چاہتی تھی۔ ایک بڑھے، بے ڈھنگے شوہر کی وجہ سے اسے بھی موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے گھگھائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ غالباً بھگوان کا واسطہ دیا کہ اس کی جان بخش دی جائے... عمران اور اقبال نے بالکل کان نہیں دھرے۔

عمران نے کہا۔ ”میرے خیال میں سلطانہ کو بھی یہ منظر دکھانا چاہیے۔ وہ کہاں ہے؟“

اقبال نے آگے جا کر گاڑی میں جھانکا اور بتایا کہ وہ سو رہی ہے۔

وہ راستے میں بھی اونٹھتی رہی تھی اور اب گاڑی کے اندر ہی سوئی ہوئی تھی۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ واقعی سوئی ہوئی ہے یا ارد گرد سے نانا توڑنے کے لیے ایسا ظاہر کر رہی ہے۔ راستے میں طلال نے عمران کو چپکے سے بتایا تھا کہ اس کی خالہ کو وہاں استھان میں کوئی ایسی شے کھلائی جاتی رہی ہے جس سے وہ زیادہ تر اونٹھتی رہی ہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کال کٹھڑی میں بھی اپنی مزاحمت جاری رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں زنجیر پہنائی گئی اور اسے کوئی نشہ آور دوا بھی دی جاتی رہی...۔

سکھ گاڑی بان نے عمران کی ہدایت پر خشک ٹکڑیاں جمع کر کے الاؤ بھڑکا دیا تھا اور اب عمران بڑے سکون سے اس الاؤ کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور جیکٹ کی چپ سے چنے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے ابھی چند گھنٹے پہلے تین افراد کو جان سے مارا ہے۔ وہ گرو کو سر تا پا دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار اقبال! مجھے نہیں لگتا کہ یہ اپنی پتی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد یہ خود بخود مر جائے گا۔“

”نہیں مرے گا تو کیا ہوگا۔ ایک گولی ہی اور ضائع کرنا پڑے گی۔“

عمران نے پہلی بار اقبال کو اس کے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ نام سن کر گرو سو بھاش کو پتا چل گیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کے مردہ چہرے پر ذرا سی زندگی چھلکی۔ وہ آخری کوشش کے طور پر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں ایک بار پھر کہتا ہوں، میں بالکل زردوش ہوں۔ وہاں استھان میں مجھ سے صرف رائے لی جاتی تھی جو میں پوتھیوں میں سے پڑھ کر دے دیتا تھا۔ میں اور کچھ ناہیں کرتا تھا۔“

”تم سب کچھ کرتے تھے اور کر سکتے تھے۔“ عمران نے ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ ”جب تم میاں بیوی کو اپنی جان کا خطرہ پڑا تو تم نے دھرم کو موم کی ٹاک بنالیا۔ جو شہ گھڑی تم

باندھی گئی تھی۔ کھولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ رادھا سی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بالکل ساکت تھی۔ اس اندیشے سے شاید سانس بھی نہیں لے رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

یہ لمحے بڑے نازک محسوس ہو رہے تھے۔ گرو نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اقبال نے ذرا زور لگایا تو ایک اسٹریپ جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔۔۔ رادھا بے ساختہ چلا اٹھی۔ ساتھ ساتھ وہ زیر لب اشلوک بھی پڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال رادھا کی کمر سے بیلٹ علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک سنسنی خیز صورت حال کا اچھا دی اینڈ تھا۔ الاؤ کی آگ اب کافی پھڑک اٹھی تھی اور ٹھنڈے ہوئے جسموں کو راحت پہنچا رہی تھی۔ دن کی روشنی میں قرب و جوار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ یہ علاقہ جنت اور کیکر کے خودرو درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ پتوں پر اوس چمک رہی تھی اور یہ اتنی زیادہ تھی کہ زمین بھی غم نظر آتی تھی۔ ہلکی دھند سردی کے احساس میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب عمران نے گھوم کر کچھ دیکھا اور پکارا۔ ”کچڑو۔“

اقبال گھوڑا گاڑی کے قریب تھا۔ وہ عمران کی آواز سن کر پلٹا اور دوڑا۔ تب مجھے پتا چلا کہ اقبال کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ بھاگنے والے سلطانہ اور طلال تھے۔ وہ نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکلے تھے۔۔۔ وہ اندھا دھند گھنے درختوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سکھ گاڑی بان ہوشیار سنگھ لکڑیاں اکٹھی کر کے مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو سلطانہ اور طلال کو روکنے کے لیے ان کے راستے میں آیا۔ یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ سلطانہ نے بھاگتے بھاگتے پوری قوت سے ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے دتے کی کلپاڑی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ کلپاڑی ہوشیار سنگھ کی تھی اور اس نے گاڑی کی اگلی نشستوں کے نیچے چھپا رکھی تھی، سلطانہ نے وہاں سے نکال لی تھی۔ اپنی کلپاڑی کا وار ہوشیار سنگھ کی گردن پر لگا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور خشک لکڑیاں اس کے ہاتھوں سے نکل کر چاروں طرف بکھر گئیں۔

میں اور عمران بھی ایک ساتھ الاؤ کے پاس سے اٹھے اور اقبال کے پیچھے لپکے۔۔۔ ”رک جاؤ۔۔۔ گولی مار دوں گا۔“ اقبال بھاگتے بھاگتے دباڑا۔

وہ دونوں نہیں رکنے کے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ میں تیس قدم

میں اتنی شگتی تھیں اس لیے۔۔۔ ایسا کرنا پڑا۔۔۔“ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

”تمہاری عمر زیادہ ہو گئی ہے، شریر میں طاقت نہیں۔ اس کے باوجود تم نے ایک نو عمر لڑکی کو چینی بنایا ہوا ہے۔۔۔ اس کا مطلب ہے جب تم اور زیادہ بوڑھے ہو جاؤ گے تو تین چار پتلیوں کے بغیر تو تمہارا گزارہ ہی نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تمہیں زیادہ بوڑھا ہونے ہی نہ دیا جائے۔ کیا خیال ہے عمران؟“

”بالکل بجا ارشاد فرماتے ہو تم۔“ عمران نے تائیدی اور ریوٹ کنٹرول کو ”ایکٹی ویٹ“ کر دیا۔ ایک ننھا سا سرخ بلب جل اٹھا۔ گرد کی گھٹی بندھ گئی۔ رادھا کا رہا سہا لہو بھی پچڑ گیا۔ بالکل آخری کوشش کے طور پر گرد نے ایک بار پھر وہی انداز اختیار کیا اور غنڈی جگہ پر اوٹدھالٹ گیا۔ اس کے ہاتھ عمران کے پاؤں کو چھو رہے تھے۔ وہ زندگی کے لیے گڑگڑایا۔ ”ہمیں شاکر دو۔ میں تمہیں وچن دیوت ہوں، ہم دونوں جیون بھر تمہارے ادنیٰ سیوک بن کر رہیں گے۔ جو تم کہو گے وہ کریں گے۔ اپنی غلطیوں کا پراںچوت کریں گے۔ بس ہمیں ایک موقع دے دو۔۔۔“

رادھا نے بھی اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا تھا اور گھڑی سی بن کر روتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ عمران ان دونوں کو چھوڑے گا یا نہیں لیکن کم از کم رادھا کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھا، پھر اقبال کی طرف۔ کچھ دیر تک لرزاں وترساں میاں بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ تب گہری سانس لے کر بولا۔ ”تم دونوں کو کچھ شرطیں ماننا ہوں گی۔۔۔“

وہ دونوں جیسے ہلکے پڑے۔ یقیناً انہیں ایسے ہی محسوس ہوا تھا جیسے تختہ دار پر عین آخری وقت میں زندگی کی نوید مل گئی ہو۔ گروسو بھاش گھگھکی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہمیں ہر شرط منظور ہے۔ بغیر سنے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ ہم جیون بھر تمہاری غلامی کریں گے۔“

عمران نے ریوٹ کنٹرول کو ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا۔ اس نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے رادھا کو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ وہ معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس نے اسے کمر عریاں کرنے کو کہا۔ رادھا نے پہلے شال اتاری پھر ساڑی کا پلو گرا کر کمر عریاں کر دی۔ اب مختصر چولی سے ساڑی کی بیلٹ تک اس کا تراشا ہوا جسم دن کی روشنی میں دکھ رہا تھا۔ اقبال نے عمران کو آنکھ ماری پھر بڑی احتیاط سے بیلٹ کے اسٹریپس کھولنے شروع کیے۔ وہ کافی کس کر

گرو جیسے مرنے سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ فریادی انداز میں زمین پر گر پڑا اور دہائی دینے لگا۔ ”میرا جیون بخش دو۔ میں سو گند کھاؤں ہوں، جیون بھر تمہارا داس بن کر رہوں گا۔ تمہاری غلامی کروں گا۔“ وہ جانتا تھا کہ اگر عمران کہہ رہا ہے تو مار بھی دے گا۔ وہ استھان میں عمران کے ہاتھوں تین افراد کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

عمران اور اقبال لطف لے رہے تھے۔ عمران نے گرو کو حکم دیا کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھے۔

وہ اپنی توند سے مٹی جھاڑتا ہوا بیٹھ گیا۔ استھان میں سائڈ کی طرح دندنانے والا گرو یہاں اس ویرانے میں کچھ سے زیادہ حقیر نظر آ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”میں نیوز چینل فساد پس کا نمائندہ ہوں۔ میں نے اپنی فیلڈ میں بڑے بڑے مطلبی لوگ دیکھے ہیں لیکن تم تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ ابھی تم نے فرمایا ہے کہ۔۔۔ میرا جیون بخش دو۔۔۔ یعنی اب تم نے اپنی داد فریاد میں سے اپنی پتی کو بھی خارج کر دیا ہے۔ صرف خود کو بچانا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ فقرہ سنہری حرفوں میں لکھا جانے کے قابل ہے۔۔۔ بھی واہ۔“

”ناہیں۔۔۔ ناہیں۔۔۔ وہ تو بے دھیانی میں کہہ دیا۔۔۔ ہم دونوں تم سے جیون کی بھلکھا مانگتے ہیں۔“ گرو کر رہا۔

رادھا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اقبال نے آگ کے پاس بیٹھتے ہوئے، رائفل گود میں رکھی اور بولا۔ ”تم نے لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ دھرم کو جدھر چاہو اپنی مرضی سے موڑ لیتے ہو۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر چاپ کرنا ہے۔ بتاؤ، اس معاملے میں تم لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟“

گرو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ ہکلا یا۔

”میں نے۔۔۔ تو صرف۔۔۔“

”بکو اس نہیں چاہیے۔“ اقبال نے طیش میں اس کی بات کاٹی۔ ”ہاں یا نہ میں بتاؤں۔ تم دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟“

گرو کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس لرزش کی وجہ سے اس کی گرد آلود توند میں بھی ارتعاش تھا۔ اس نے اپنی ناک سے بہنے والا رقیق مادہ، اپنی چادر کے پلو سے صاف کیا اور پھر نہایت ندامت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیوں کرتے تھے ایسا؟“ اقبال نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ اقبال نے زیادہ کراخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو وہ کراہا۔ ”میری عمر زیادہ ہو گئی ہے شریر

نے پانچ منٹ میں ڈھونڈ لیتی تھی، وہ تمہیں دو گھنٹے بعد بھی نہیں ملے۔ پھر تم نے پوچھیوں کے اندر سے ہی یہ مسئلہ بھی ڈھونڈ لیا کہ اگر استھان میں خون ریزی کا خطرہ ہو تو۔۔۔ جناب عالی۔۔۔ تاڑی میں دھتورے والی بھنگ ملائی جاسکتی ہے۔ اور یہ تو بس ایک دو چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں، ایسی پتا نہیں کتنی قلابازیاں تم اپنی مرضی سے لگاتے رہتے ہو اور اسے مقدس پوچھیوں کے سر تھوپتے رہتے ہو۔“

گرو لا جواب ہو گیا مگر اس نے اپنی داد فریاد جاری رکھی۔ وہ پھر گھگھکیا۔ ”دیکھو پرتو! تم لوگ ان اس وقت غصے میں ہو اور غصہ بدھی کو کھا جاتا ہے۔ میں سچ کہت ہوں، میرا ادھکار وہاں زیادہ تاجیں تھا۔ تم شہ گھڑی کی بات کر رہے ہو، اگر میں وہاں دوسری بار بھی شہ گھڑی نہ نکالتا تو پھر مجھے کیوں ایک موقع اور دیا جاتا۔ اس میں بھی شہ گھڑی نہ نکلتی تو ستیش وغیرہ بڑے گرد کی طرف سے خود ہی شہ گھڑی نکال لیتے اور لڑکی کو جلا دیتے۔ میں سچ کہت ہوں۔“ گرو کی آواز زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس نے اشلک بار آنکھوں سے اپنی جوان پتی کی طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، جوانی اور خوب صورتی میں طاقت ہوتی ہے۔ تم بھی جان بچانے کے لیے کچھ کہو، شاید ان لوگوں کے دل سچ جائیں۔ لڑکی سسک کر بولی۔ ”تم لوگ مسلمان ہو اور میں نے ساتھ ساتھ کہ مسلمان اپنے قیدی سے اچھا برتاؤ کرت ہیں۔ بے شک ہم دونوں تمہارے اپرا دھی ہیں مگر اپنے کرموں پر تم سے شرمندہ ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر تم سے جیون کی بھیک مانگت ہیں۔“ وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ”قیدی تو وہ بد نصیب شکیلہ بھی تھی۔ وہ بھی رو رو کر زندگی کی بھیک مانگتی رہی ہوگی۔“

گرو ہلک کر بولا۔ ”میں بڑی سے بڑی سو گند کھانے کو تیار ہوں۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے ستیش، پنیل اور ارجن وغیرہ کرتے ہیں۔ خاص طور سے ستیش کی بات چلتی ہے اور ستیش وہی کچھ کرت ہے جو اس کی مانتا کہوت ہے۔ وہ بڑھیا بڑی کٹھور عورت ہے۔“

عمران بولا۔ ”تم موت کو سامنے دیکھ کر خود کو اس کٹھور پن سے علیحدہ کر رہے ہو۔۔۔ ورنہ تم بھی اس بے رحمی کا اٹوٹ انگ ہو۔ تمہاری منت سماجت پر تمہاری سزا تو معاف نہیں ہو سکتی۔ ہم بس اتنا کر سکتے ہیں کہ تمہیں زیادہ تکلیف نہ پہنچائیں اور جلدی سے تمہارے پرانوں کو تمہارے شریر (جسم) سے نکتی دلا دیں۔“ عمران نے ریوٹ کنٹرول اقبال کے ہاتھ سے لے لیا۔

Scanned and Uploaded By Nadeem

شوہر۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“ میں نے اس کے شانوں پر اپنی گرفت سخت کر دی۔

”میرا کوئی نہیں... مجھے چھوڑ دو...“ اس نے ایک دم اپنے شانے چھڑائے اور اٹھنا چاہا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا پھر اٹھنے کا دوسرا تھپڑ۔ اس کے ریشمی بال اچھل کر رہ گئے۔ اس نے چند سیکنڈ کے لیے سشدر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے تھپڑوں نے اس کی ہسٹریائی کیفیت کو ایک دم کنٹرول کیا۔ اس کے جذبات کی شدت نے دفعتاً رخ بدلا۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں گھاس میں اس کے قریب ہی بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دل دوز آواز میں روتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ روتے روتے سسکنے لگی۔ ”میں اس کتے کو جندہ ناہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے مار دوں گی... یا خود مر جاؤں گی۔“

میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کن طرف ہے۔ وہ اسی شخص کی بات کر رہی تھی جو میرے دل کا بھی داغ تھا۔ وہ شیطان صفت جارج گورا کی بات کر رہی تھی۔

☆☆☆

میں نے ایک بار سلطانہ کو اپنے ساتھ لگایا تو پھر خود سے جدا نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے اسے میں گھوڑا گاڑی کی نیم گرم فضا میں لے آیا۔ اس کا آنسوؤں سے ترتر چہرہ میرے سینے سے بہت تھا۔ طلال کو کچھ آلود گڑھے سے نکالا جا چکا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔ اقبال اور سلطانہ کی دھینگا مشتی میں جو ایک گولی اتفاقاً چل گئی تھی، اس نے ہوشیار سنگھ کے ایک گھوڑے کو زخمی کر دیا تھا۔ تاہم یہ زخم بھی سنگین نوعیت کا نہیں تھا۔ گولی، چمکے گھوڑے کی گردن کو چھیلی ہوئی گزر گئی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی مرہم پیٹی میں مصروف تھا۔ گروسو بھاش اور رادھا اسی طرح الاؤ کے گرد سر نہوڑائے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کی کیفیت عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے زخموں سے پُور جسم میں جتنا بھی پانی ہے، وہ آج آنکھوں کے رستے بہا دے گی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی گرم دھاریں میری گردن سے ہو کر میرے سینے تک جا رہی تھیں۔ وہ دل گیر آواز میں بولی۔ ”میں اپنا بدلہ لوں گی مہروز... میں اس سفید سور کو یونہی ناہیں چھوڑوں گی۔“ اس کا لہجہ غیر معمولی تھا اور اس کا جذبہ بھی۔

آگے جا کر طلال بُری طرح پھسلا اور ایک آٹھ دس فٹ گہرے بارشی گڑھے میں جا گرا۔ اس گڑھے کی تہ میں دو تین فٹ تک کیچڑ کھڑا تھا۔ کچھ آگے جا کر اقبال نے سلطانہ کو چھاپ لیا۔ سلطانہ نے گھوم کر بے دریغ سیدھی کلباڑی کا وار کیا لیکن مد مقابل بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔ اقبال نے تیزی سے جھک کر یہ وار بچایا۔ سلطانہ نے چلا کر دوسری مرتبہ کلباڑی گھمائی۔ تاہم اس بار اقبال نے شروع میں ہی اس کی کلائی جکڑ لی۔ سلطانہ کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ اس نے زور مارا اور اقبال جیسا شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں اوپر نیچے جنگلی گھاس میں گرے۔ سلطانہ اوپر تھی اور کسی صورت کلباڑی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ دیوانہ وار زور لگا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال کی انگلی بے ساختہ راکفل کے ٹریگر پر دب گئی۔ دھماکے سے گولی چلی اور گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا بُری طرح اچھل کود کرنے لگا۔

میں سلطانہ کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی تندہ تیزی اور بے خونی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ آج میرے سامنے تھا۔ وہ ایک جنگجو راجپوت نظر آتی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یہی لگا کہ شاید وہ اقبال کو بُری طرح گھاسل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اپنا صاف نما کپڑا چہرے سے اتار پھینکا تھا۔ ”سلطانہ... سلطانہ“ میں نے پکار کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ اس کے لمبے بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا کہ اس نے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا لیکن پھر ایک وہ بُری طرح ٹھکی۔ اقبال نے ایک جھٹکے سے کلباڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

”سلطانہ! ہوش کرو، یہ میں ہوں...“

چند سیکنڈ میں اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو لڑنے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جیسے اس حیران کن صورت حال کا تجربہ کر رہی تھی۔ تب اس کے چہرے پر ایک بار پھر خشونت نظر آئی۔ اس نے اپنا جسم جڑایا اور گراہ کر بولی۔ ”مجھے چھوڑ دو... مجھے جانے دو... میں کسی کی ناہیں... میرا کوئی ناہیں... مجھے جانے دو۔ مجھے مر جانے دو۔“

”ہوش کرو سلطانہ... میں مہروز ہوں... تمہارا“

میں نے اسے اپنے ساتھ بچھپتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تم ایسی بات نہ کرو۔ اس شیطان کو میں اس کے انجام تک پہنچاؤں گا... اگر میں نہ رہا تو پھر تمہارا جوجی چاہے کرنا۔“

اس نے میرے سینے سے سراٹھایا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان میں حیرت، خوشی، بے یقینی، بہت کچھ کچکا ہو گیا تھا۔ شاید اسے بھروسہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے جو الفاظ سنے ہیں، وہ میں نے کہے ہیں۔

میں نے اس کا سر دوبارہ اپنے ساتھ لگا لیا۔ پچھلے چند مہینوں میں سلطانہ نے مجھے بتدریج بدلتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ مجھے بہت زیادہ مختلف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ”سلطانہ! ڈیڑھ دو سال پہلے تم نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ کوئی اور تھا۔ اب جو شخص تمہارے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھا ہے یہ اور ہے۔ میں کہیں یقین دلاتا ہوں، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ تم دیکھنا، قدرت کی مدد شامل حال ہوگی۔ اس شخص کا انجام تمہاری توقع سے زیادہ بُرا ہوگا۔“

”میں تمہارے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی... یہ میرے بس میں ہی ناہیں ہے۔“ وہ کراہی۔

”تو تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے لیے خطرہ مول لے لوں؟“

”میری بات چھوڑ دو مہزوج... میں اب مجرمہ بن چکی ہوں۔ میں نے چار بندوں کو قتل کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اب یہ لوگ مجھے جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر جب میں نے مرنا اِج ہوئیں گا تو پھر کیوں نہ میں اس کتے کو مار کر مروں۔“

میں نے پُر عزم انداز میں اس کا شانہ دبایا۔ ”کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا سلطانہ۔ تم نے جو دکھ سہنے تھے، وہ سہہ چکی ہو۔ اب کوئی آج نہیں آئے گی تم پر۔ میں تمہاری طرف بڑھنے والا ہر ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔“

اس نے ایک بار پھر میرے سینے سے سراٹھایا اور حیرت آمیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی ٹانگ بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ گھنے بال نصف چہرے کو ڈھانپ رہے تھے اور نصف کو نمایاں کر رہے تھے۔ وہ دھوپ چھاؤں کا عجیب امتزاج تھی۔ کہیں آگ تھی، کہیں شبنم، کہیں ریشم تھی، کہیں فولا... میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہاں گھوڑا گاڑی کی اس نیم گرم فضا میں میرے اور سلطانہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ ننھے بالو کا ذکر بھی بار

بار آیا۔ سلطانہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اس منحوس استھان میں کب اور کس طرح پہنچا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے یہ روداد بتائی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ میں ایک ہندو گوپال کی حیثیت سے اس استھان میں موجود رہا ہوں۔ سلطانہ نے طلال کو بھی اندر بلا لیا تھا۔ طلال کی پنڈلی پر چوٹ آئی تھی جہاں اقبال نے پٹی وغیرہ باندھ دی تھی۔ وہ خاموش آنکھوں والا ایک ناراض اور بہت گہرا لڑکا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا لیکن جتنی کرتا تھا، وہ بہت وزنی ہوتی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنی خالہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار باحیثیت افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے مگر جب اس کی خاموش آنکھوں میں کوندتی ہوئی نفرت میں جھانکا جاتا تو یقین آنے لگتا تھا۔ اس کی مسیں ابھی پوری طرح بھیگی نہیں تھیں لیکن چھاتی چوڑی اور قوئی اسٹیل کی طرح سخت تھے۔ اسے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ حکم کے بندوں نے ریٹ ہاؤس سے ان دونوں کو پکڑنے کے بعد اس کی خالہ کو بُری طرح مارا پیٹا تھا اور وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہاں اسے خود جو چوٹیں لگی تھیں ان کی پردا اسے نہیں تھی۔

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہم کھانا کھانے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ یہ کھانا ہم کو چاچا عبدالغنی نے دیا تھا۔ ہم کو جرابھی شک ناہیں تھا کہ اس میں کچھ ملا ہوئیں گا۔ اگر ہم ہوش میں ہوتے تو حکم کے لوگ نہ ہمیں ہاتھ بھی نہ لگا سکتے۔“

اس نے یہ بھی بتایا کہ استھان میں حراست کے دوران میں کچھ لوگ اسے ترغیب دیتے رہے ہیں کہ اگر وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے تو وہ اس کی جان بخشی کر دیں گے۔

اسی دوران میں کہیں پاس سے فار کی آواز آئی۔ یہ گن فار تھا۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ میں نے گھوڑا گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا، فار کی آواز یقیناً عمران نے بھی سنی تھی لیکن وہ مطمئن بیٹھا تھا۔

”یہ کیسی آواز تھی؟“ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر عمران سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اقبال نے کوئی شیر وغیرہ مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، بہت دن ہو گئے ہیں شیر کے کباب کھائے ہوئے۔“

اقبال ارد گرد موجود نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فار اس نے کیا ہوگا۔ جلد ہی صورت حال سمجھ میں آگئی۔ اقبال اور سردار ہوشیار سنگھ ایک مادہ ہرن کو اٹھائے ہوئے جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ اس میں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ عمران

ایک دم خوش نظر آنے لگا۔ وہ پکار کر بولا۔ ”تاہی! باہر آ جاؤ۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی تک تمہارا ولیمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے اس فرض سے سبکدوش ہونے کا۔“

میں نے سنی آن سنی کر دی۔ وہ گھوڑا گاڑی میں آ کر خود مجھے اور سلطانہ کو باہر لے گیا۔ اس کی نگاہوں میں سلطانہ کے لیے محبت تھی۔ اس نے اسے آگ کے قریب بٹھایا اور اس کے شانوں پر گرم چادر رکھی۔ پھر چپکا۔ ”بھابی! اب میں آ گیا ہوں۔ اب تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے اس نامعقول بندے کو میں تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا۔ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔ سمجھو کھ پتلی بن جائے گا، جس طرح چاہو نچا لینا۔۔۔ لیکن اس کے لیے تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی۔ یہ دیکھو۔۔۔ میں تمہارے پاؤں پکڑ لیتا ہوں۔ انکار نہ کرنا۔۔۔“

اس نے واقعی شاہی سے سلطانہ کے پاؤں تھام لیے۔ سلطانہ نے گھبرا کر چھڑانا چاہا تو اس نے اقبال کو بھی اشارہ کر دیا۔ اس نے بھی جھٹ سلطانہ کے پاؤں تھام لیے۔۔۔ اقبال ذرا سا مسکرا رہا تھا۔ عمران نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر پر چھانپڑ سید کیا اور بولا۔ ”کھوتے کے پتر! رونی صورت بناؤ۔ آنکھوں میں تھوڑی سی نمی لاؤ۔ بھابی کو منانا ہے، کوئی گودا پکڑائی وصول نہیں کرتی ہے۔“

اقبال نے فٹ رونی صورت بنالی۔ عمران کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ ”خدا کے لیے بھابی! بس ایک بات ماننی ہے۔ پچھلی ساری باتوں کو بھول جانا ہے۔ جو کچھ ہوا، جیسا ہوا، سمجھو وہ بس ایک جڑا خیال تھا۔ گزر گیا، فنا ہو گیا۔ اگر اسے یاد رکھنا ہے تو ہم رکھیں گے۔ ہم تیرے بھائی۔۔۔ تیرے نامعقول شوہر کے معقول یار۔۔۔ ہاں، ہم وہ سب کچھ یاد رکھیں گے اور یاد رکھنے کا حق بھی ادا کریں گے۔ تیرا کلیجا ایسے ٹھنڈا کریں گے بھابی کہ انڈیا کا بچہ بچہ مدتوں تک یاد رکھے گا۔۔۔ لیکن تمہیں ہماری بات ماننی ہے اور سب کچھ بھول جانا ہے۔“

سلطانہ حیرت سے گنگ تھی۔ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی عمران اور اقبال کی طرف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا پالا کیسے لوگوں سے پڑا ہے۔ میں اسے کیا بتاتا۔ مجھے خود آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

”میرے پاؤں چھوڑیں۔“ سلطانہ نے کراہ کر کہا۔

”چھوڑ دیتے ہیں بھابی! لیکن پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔ اگر فوری طور پر وعدہ نہیں کر سکتی ہو تو کم از کم ہمیں امید ضرور دلانا پڑے گی۔“ عمران نے کہا۔

”اور امید دلانے کا طریقہ یہ ہے کہ تمہیں ایک بار۔۔۔ مسکرا کر دکھانا ہوگا۔“ اقبال نے لقمہ دیا۔

وہ روپائی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی جاگ گئی۔ ”میں تاہیں مسکرا سکتی۔“ وہ دل دوز انداز میں بولی۔

”بالکل۔۔۔ بالکل غلط۔ بلکہ یہ فقرہ ہی غلط ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”خاص طور سے ایک مسلمان تو ایسا فقرہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔ تم آج نہیں مسکرا سکتی ہو لیکن کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تم کل یا پرسوں بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ اگلی جمعرات یا اگلے مہینے کی پندرہ بیس تاریخ تک بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ یہ تو غیب دانی کا دعویٰ ہے اور ایسے دعوے اس گروسو بھاش جیسے لوگ تو کر سکتے ہیں، ہم نہیں۔“

”تم نے بالکل غلط فقرہ کہا ہے بھابی! اب تو ہم تمہارے پاؤں بالکل نہیں چھوڑیں گے۔“ اقبال نے کہا۔

”اور مجھے رو کر نہ دکھانا۔“ عمران نے لقمہ دیا۔ ”میں تم سے زیادہ رو سکتا ہوں اور اگر میں ایک بار رو پڑوں تو پھر مجھے چپ کرانا آٹھ دس بندوں کا کام نہیں ہوتا۔ ہاتھوں سے نکل نکل جاتا ہوں۔۔۔ پچھاڑنا لھاتا ہوں۔ محلوں کے محلے اکٹھے کر لیتا ہوں۔۔۔ اور کئی یاروں کو روتے روتے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہوں۔“

سلطانہ نے ایک بار پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

”اس نامعقول کی طرف نہ دیکھو بھابی!“ عمران نے اس کا چہرہ پھیر دیا۔ ”جو کچھ کہتا ہے، ہمیں کرنا ہے۔ تمہارے پاؤں چھوڑنے نہ چھوڑنے اور رو کر خود کو ہلکان کرنے جیسی ساری اتھارٹی ہمارے پاس ہے۔ تمہیں مسکراتا پڑے گا۔ اگر نقد و نقد نہیں۔۔۔ مسکرا سکتی ہو تو ارادہ ظاہر کرنا پڑے گا۔ ارادے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بھابی! آدھا ثواب تو ارادے سے ہی مل جاتا ہے۔ بس تاریخ دے دو کہ کس دن مسکراؤ گی؟ ہم اسی سے مطمئن ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کچھ بھی کہہ نہیں پایا ہی تھی۔ اقبال نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ”چھا بھابی! چلو اتنا بتا دو کہ آج کی تاریخ میں مسکراؤ گی یا پھر کسی دن؟“

سلطانہ کی آنکھیں مسلسل رستی رہیں اور وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ عمران نے کہا۔ ”میں اس کو تھوڑا سا اور آسان کر دیتا ہوں۔ آخر باؤی لینگوٹج بھی کوئی چیز ہوتی ہے بھابی! اگر تم۔۔۔ اگر تم اپنا بایاں پاؤں ہلاؤ گی تو اس کا مطلب ہوگا کہ آج ہی کسی وقت ہمیں اپنی مسکراہٹ سے نوازو گی۔ اگر دایاں پاؤں ہلاؤ گی تو مطلب ہوگا کہ کسی اور دن۔ یعنی ٹوٹل

انکار نہیں، ٹھیک ہے؟“

چند سیکنڈ بعد شاید سلطانہ کا ایک پاؤں بے ساختہ ہی مل گیا تھا۔ عمران چپکا۔ ”زبردست۔۔۔ زبردست۔۔۔ یور آر گریٹ بھابی! تم نے ہمارا مان رکھ لیا۔ چلو دایاں پاؤں ہلایا لیکن ہلایا تو سہی۔ کوئی بات نہیں۔ ہم تمہاری مسکراہٹ دیکھنے کے لیے دو چار دن اور انتظار کر لیں گے۔ شکریہ، ٹھینکس، دھنیو اد۔ اب تم کہو گی کہ شکر یہ کس بات کا؟ نہیں بھابی! یہ سب تکلف کی باتیں ہیں۔ اتنے بڑے حالات میں بھی تم نے مسکرا کر وعدہ کیا، یہ کوئی معمولی بات نہیں۔۔۔ سچ، میرا جی چاہتا ہے کہ خوشی سے انٹی قلابازیاں لگاؤں اور میں صرف محاورے نہیں کہہ رہا۔ میں لگا بھی سکتا ہوں، یہ تو میرا پروفیشن ہے۔ اگر تم کہو بھابی تو میں لگا کے بھی دکھا سکتا ہوں۔“

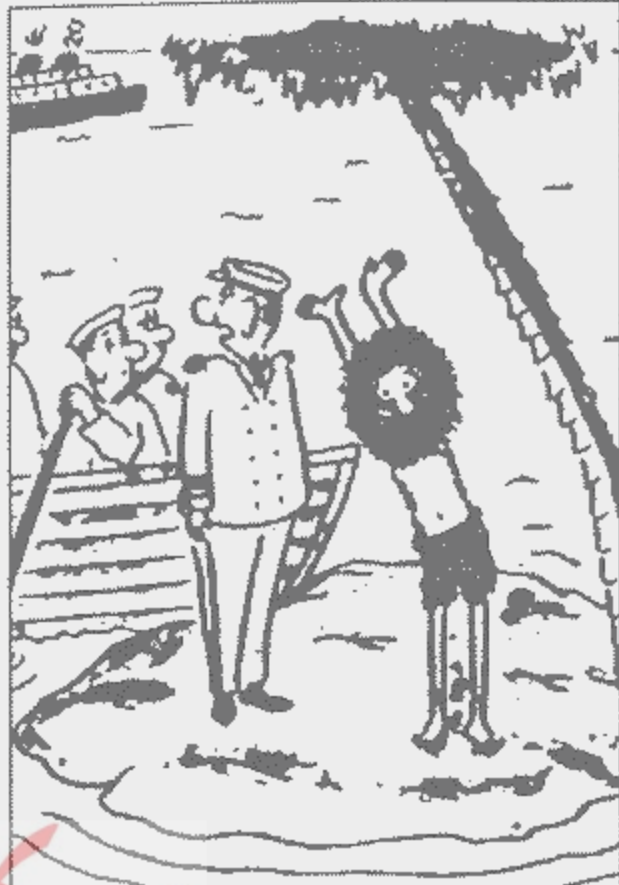
اس سے پہلے کہ سلطانہ کوئی رد عمل ظاہر کرتی، وہ طلال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”خاموشی کا مطلب ہے نیم رضامندی۔۔۔ یہ دیکھو۔“

وہ بیٹھے بیٹھے کسی حاکم اور اسپرنگ کی طرح اچھلا اور ہوا میں دو الٹی سرسالت لگا کر عین اسی جگہ لینڈ کر گیا جہاں سے فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس کی مہارت قابل دید تھی۔ میرے اور اقبال کے سوا کبھی دنگ رہ گئے۔ گرد کا چہرہ حیرت کی تصویر نظر آنے لگا۔ ہوشیار سنگھ جو اپنی سوچی ہوئی گردن پر گھور کر رہا تھا، آنکھیں پھاڑ کر عمران کو دیکھتا چلا گیا۔ ”واہ۔۔۔ واہ۔ آپ تو بڑے کاریگر نکلے ہو جی۔“ وہ ششدر لہجے میں بولا۔ ”ایسا کام تو رومی سرکس والے کرتے ہیں یہاں انڈیا کے وڈے وڈے شہروں میں۔ یا پھر جمناسٹک والے کھلاڑی ہوتے ہیں۔“

”میں تمہیں کیا لگتا ہوں۔۔۔ کھلاڑی یا سرکس والا؟“ وہ مسکرایا۔ ”میری مت نہیں ماری ہوئی کہ آپ کو سرکس والا کہہ کر آپ سے جھانپڑ کھاؤں۔ میرے خیال میں تو آپ کھلاڑی ہی ہیں۔“

”اور مجھے لگتا ہے کہ تم بچے سردار ہی نہیں ہو کیونکہ میں نے سنا تھا کہ سردار چغہ ہوتے ہیں۔“

ہوشیار سنگھ بولا۔ ”شاید تھوڑا بہت نام کا اثر ہے جی۔ ورنہ کام تو میرے بھی اکثر بڑے ہائی کلاس ہوتے ہیں۔“ اس نے خاموش بیٹھی سلطانہ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”اب یہی دیکھ لیں۔ بی بی کے ہاتھ میں کھلاڑی تھی لیکن مجھے دور سے یہی لگا کہ یہ ہانڈی میں پھیرنے والی ڈوٹی ہے۔ یہ تو بھلا ہو میری بھین کا کہ انہوں نے انٹی ڈوٹی۔۔۔ میرا مطلب ہے کھلاڑی ماری ورنہ میرا تو بھٹکا ہو جانا تھا کھڑے



ہم دیر سے اس کی مدد کو پہنچے۔۔۔ اب اس کے دماغ میں سا
بچل ہے کہ یہ اس ویران جزیرے کا دوسرا درخت ہے
محمد طہر محباہد پھالیہ سے کلکاریاں

تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم گردو بھاش کو کسی سے بچانے کے
لیے استھان سے نہیں بھاگے تھے بلکہ گردو کو لے کر بھاگے
تھے۔ اور اس لیے لے کر بھاگے تھے کہ گردو کا ”میش بہا علم“
ایک بے قصور لڑکی کو واجب القتل ٹھہرانے والا تھا۔ مکمل
صورت حال جاننے کے بعد اب ہوشیار سنگھ کی ساری
ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہو گئی تھیں اور وہ ایک ساتھی ہی کی
طرح ہمارے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ وہ
خاصا زندہ دل شخص تھا۔

عمران مسلسل اس کوشش میں تھا کہ سلطانہ اور طلال
اپنی افسردہ کیفیت میں سے نکل آئیں۔ اس نے اقبال کو
چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت بھیا تک آواز میں گاسکتا ہے۔
اگر یہ گانا شروع کر دے تو رات بھر کوئی جنگلی جانور ہمارے
قریب نہیں پھٹکے گا۔“

پھر وہ ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ ”ایک بار
ہم ضلع شیخوپورہ میں سور کے شکار پر تھے۔ ہمارے سرکس
کے مالک چودھری اشفاق، اسسٹنٹ منیجر عباس گوجرانوالہ
کے ڈی پی او اور کچھ دیگر لوگ بھی ساتھ تھے۔ ہم اپنا شوق

ان میں کٹ وغیرہ دے کر نمک لگایا گیا اور پھر بڑی احتیاط
سے بھونا گیا۔ یہ ایک مزے دار کھانا ثابت ہوا۔ عمران اسے
چکے چکے میرے دلیسے کا نام دے رہا تھا اور اس حوالے سے
معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ گردو سو بھاش اور رادھانے گوشت
نہیں کھایا اور بس بیٹھے تھوک نکلتے رہے۔ میری اور عمران کی
کوشش کے باوجود سلطانہ نے بھی ایک دو لقموں سے زیادہ
نہیں لیے۔ وہ بدستور گھبر کیفیت میں تھی۔ اس نے مجھ سے
پس اتنا کہا۔ ”کوچیان سے کہیں مجھے معاف کر دے۔ میں
نے اسے کلباڑی مار کر زخمی کر دیا ہے۔“

میں نے اس حوالے سے اسے تسلی دی۔ کھانے کے
بعد سردار ہوشیار سنگھ پھر درختوں کی طرف نکل گیا۔ اس مرتبہ
وہ خشک لکڑیوں کے ساتھ ساتھ خوبانی کی طرح کا ایک جنگلی
پھل بھی لے کر آیا۔ یہ پھل ایک دفعہ میں نے بھی دیکھا تھا مگر
بھوک کے باوجود کھانے کا رسک نہیں لیا تھا۔ یہ نیم مینھا اور
کسیلا پھل گردو اور رادھا کی پیٹ پوجا کے کام آسکتا تھا لیکن
ابھی تک وہ صدمے میں تھے اس لیے کھانے سے انکار کر
دیا۔

سب موجودہ صورت حال سے مطمئن تھے۔ ہوشیار
سنگھ کا بھی یہ خیال تھا کہ ہم استھان اور پھلکاری سے کافی دور
آچکے ہیں اور گھنے درختوں سے گھری ہوئی اس ٹاپو نما جگہ پر
بالکل محفوظ ہیں لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ بوہی نہیں سکتا تھا۔
مجھے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کسی طرف سے گھوڑوں کی
ٹاپیں گونجیں گی اور زرگاں کے ان گنت گھڑسوار ہمیں گھیر لیں
گے۔ یہاں میرے خوف کی وجہ میرے سوا اور کون جان سکتا
تھا؟ ایک منٹوں الیکٹرانک چپ میرے جسم میں موجود تھی اور
ہر جگہ میرے دشمنوں کو میری لوکیشن کا سراغ دے رہی تھی۔
وہ جلد یا بدیر مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔

میں عمران کو جلد از جلد اس صورت حال کے بارے
میں بتا دینا چاہتا تھا لیکن اس سے اکیلے میں اطمینان سے
بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سردیوں کا چھوٹا سادہ
جلد ہی مغربی افق کے پیچھے اوجھل ہو گیا اور اس ویران جگہ کو
کھر آلود اندھیرے نے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ویرانے
میں رات بسر کرنے کے حوالے سے ہوشیار سنگھ کافی ہوشیار
اور تجربہ کار لگتا تھا۔ اس نے گھوڑا گاڑی کے چاروں طرف
درختوں سے تین چار متعلیں باندھ دیں اور دو تین الاؤ بھی
دھکا دیے۔ یوں گھوڑا گاڑی کی اندرونی فضا زیادہ گرم ہو گئی
اور جنگلی جانوروں کی مداخلت کا خطرہ بھی کم سے کم ہو گیا۔
ہوشیار سنگھ ساری صورت حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا

”جی تو چاہتا ہے کہ کبھی یہ انہونی ہو جائے۔“ میں نے
کہا۔
اس کی آنکھوں میں بھید بھری چمک ابھری۔ وہ
سرگوشی میں بولا۔ ”بارودی بیلٹ میں سے نکالا ہے۔“
”بارودی بیلٹ؟ جو رادھا کی کمر سے اتاری ہے؟“
”ہاں۔“
”بارودی بیلٹ میں نمک بھی رکھا ہوا تھا؟“
”یار۔۔۔ بس نمک ہی تو رکھا ہوا تھا۔“ وہ ایک آنکھ میچ
کر بولا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“
”یار! خود ہی تو سچ بولنے کو کہتے ہو پھر کہتے ہو
جانتے ہو۔ اب یہ اپنا بھانڈا جیسا منہ بند کرو۔ کبھی ٹھس جائے
گی اور ہو سکتا ہے کہ گردو کو بھی شک ہو جائے۔ اگر اس کو پتا
چل گیا کہ بیلٹ میں بارود اتنا بھی نہیں تھا، جتنا ہمارے
سیاست دانوں میں خوف خدا ہوتا ہے تو پھر اس کا سارا مزہ
کر کر اہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے، اسے لگے گا کہ اس کا
تمام رونا دھونا بیکار گیا ہے۔۔۔ ہمیں اس طرح کسی کی دل شکنی
نہیں کرنی چاہیے۔“

”اور وہ ریویوٹ کنٹرول؟“ میں نے پوچھا۔
”یار! تم نے اس ہرے طوطے کو غور سے نہیں دیکھا۔
وہ تو ”اڈاپٹر“ ہے ایک واکی ٹاکی کا۔۔۔ یونہی اقبال کو کہیں
سے مل گیا تھا۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔
”مطلب کہ یہ سارا دھوکا تھا؟“
”دھوکا نہیں، تم اسے ڈراوا کہہ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ
استھان میں ہماری بے توجہی نہیں بیٹھی ہوئی تھی، ہمارے لیے
بارودی بیلٹس اور ریویوٹ کنٹرول لے کر۔ جو کچھ آس پاس
سے ملا، ہم نے اس سے کام چلایا۔“

میں بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا۔
”عمران! تم کب سے ہو یہاں؟“
”ایک بار پھر سچ بتاؤں؟“ میں نے اثبات میں سر
ہلایا۔ وہ بولا۔ ”مجھے اور اقبال کو یہاں تقریباً ایک برس ہو چکا
ہے۔ زبردست روداد ہے۔ سرفرامہ“ نکلے تیری تلاش میں“
اور اس طرح کی دوسری کارگزاریاں تو کوئی شے ہی نہیں
ہیں۔ بہت جگہ کی خاک چھانی ہے تمہارے لیے جگہ! آج
رات کو ساری تفصیل بتاؤں گا۔“
اگلے دو تین گھنٹے ہم کافی مصروف رہے۔ بغیر مناسب
ساز و سامان کے شکار شدہ ہرن کو کونکوں پر بھوننا کوئی آسان
کام نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پانچ پانچ پانچ پانچ

کھڑے۔“
”حیرت ہے، تمہیں ڈوٹی اور کلباڑی کے فرق کا پتا
نہیں چلا۔ حالانکہ وہ ٹائم بھی کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔“ اقبال
نے کہا۔
”میں سمجھ گیا جی! آپ بارہ بجے کی طرف اشارہ
کر رہے ہیں لیکن اب وہ بات پرانی ہوئی ہے۔ اب ساری
دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، گلوبل ویج۔ اور
اس ویج میں کہیں نہ کہیں تو بارہ بجے ہی رہتے ہیں۔۔۔ ہو ہو
ہو۔“ وہ خود ہی منہ کھول کر ہنس دیا۔

اقبال نے جیب سے شکاری چاقو برآمد کیا اور تیزی
سے ہرن کی کھال اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ ہوشیار سنگھ
عارضی آنکلیٹھی بنانے کے لیے دو تین پتھر اٹھا لیا۔
”مسئلہ نمک مرچ کا ہوگا۔“ میں نے کہا۔
عمران فٹ بولا۔ ”تو میں یہاں کس لیے ہوں، فساد
پس کا نمائندہ؟ میرا تو کام ہی نمک مرچ لگانا ہے۔ میں تو
چودہ دن کے باسی آلو مٹر کو ایسا تڑکا لگا سکتا ہوں کہ وہ تروتازہ
تندوری چرخاب بن جائے۔ یہ تو پھر ہرن ہے یار۔“
”تو پھر کر داس کو تمکین؟“ اقبال نے کہا۔
”تم اس کی کھال تو اتارو۔ تمہیں پتا ہی ہے کچھ نہ کچھ
ہو جائے گا۔“

”تم بھی کچھ مدد فرماؤ نا۔ کھال ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“
اقبال بولا۔
”مجھے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں چینل کا نمائندہ
ہوں۔ چھوٹے موٹے کاموں سے میری توہین نہ کرو یا رکسی
بال کی کھال اتارنی ہو یا کوئی اس سے بھی باریک شے ہو تو
میرا احسان لینا۔ میں تمہارے لیے نمک کا انتظام کرتا
ہوں۔“

وہ اٹھ کر گھوڑا گاڑی میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک
کاغذ میں، مناسب مقدار میں نمک لے کر آگیا۔ میری طرح
ہوشیار سنگھ بھی حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ نمک کہاں سے
برآمد ہو گیا ہے۔ ہاں، اقبال کو حیرانی نہیں ہوئی۔
الاؤ اب خوب اچھی طرح بھڑک رہا تھا۔ ہوشیار سنگھ
نے گوشت بھوننے کے لیے کافی سارے کوسکے بنا لیے تھے۔
میں نے سرگوشی میں عمران سے پوچھا۔ ”یہ نمک کہاں سے
آگیا؟“
”یار! جادو برحق ہے۔“
”مذاق نہیں۔ یہ کیا کیا ہے تم نے؟“
وہ مسکرایا۔ ”سچ بتاؤں؟“

میں اور عمران ایک ساتھ جیب کی طرف دوڑے۔ وہ گھوم چکی تھی اور اب ہمیں اس کی سرخ ٹیل لائٹس دکھائی دے رہی تھی۔ ”رک جاؤ۔“ عمران دباڑا۔

اس کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ”رک جاؤ۔“ عمران نے پھر کہا اور بھاگتے بھاگتے سیون ایم ایم رائل سے دو فائر کئے۔ ایک گولی جیب کے پچھلے تار میں لگی اور اسے برست کر گئی۔ جیب کنٹرول سے باہر ہو کر لہرائی اور پھر سائڈ کی طرف سے بُری طرح ایک درخت سے ٹکرائی۔

کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ جیب کا دایاں اگلا پہیہ ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ جیب میں سے دو سائے نکل کر بھاگے۔ ایک کا رخ دائیں طرف اور ایک کا بائیں طرف تھا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک تو بھاگ نکلے میں کامیاب ہو جائے۔ ایک کے پیچھے میں بھاگا، دوسرے کے پیچھے عمران لپکا۔ میرے والا کچھ زیادہ پھرتیلا تھا اور وہ غیر مسلح بھی نہیں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے قریب پہنچ رہا ہوں، اس نے ایک دم پلٹ کر مجھ پر فائر کیا۔ دھماکے سے ایک شعلہ نکلا اور گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری۔ یہ پستول کا فائر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا یا میں جوابی گولی چلاتا، اسے بُری طرح ٹھوکر لگی اور وہ دور تک رپٹا چلا گیا۔

میں نے اسے چھاپ لیا لیکن وہ آسان مد مقابل نہیں تھا۔ اس نے بالکل غیر متوقع طور پر لیٹے لیٹے اپنے سر کے عقبی حصے سے میرے چہرے پر ضرب لگا دی۔ میری آنکھوں میں ستارے تاپے اور وہ میری گرفت سے نکل گیا۔ اس نے مجھ پر ٹانگ چلائی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور پھر اس کی دوسری ٹانگ کھینچ کر اسے اپنے برابر گرا لیا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا مگر میرا ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس پر گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پستول کی ضرب اس کے بھاری بھرکم تھوڑے پر لگائی تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ لمبی جنگلی گھاس پر ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر میں نے اس کا سارا دم خم نکال دیا۔ وہ دُہائی دینے لگا۔ ”ہم کو مت مارو، ہمارے پاس زیادہ کچھ نا ہیں۔ جو کچھ ہے، وہ تم لے لو۔“

میں نے عمران کو آوازیں دیں۔ میری تیسری چوٹی آواز پر وہ بھی ایک شخص کو آگے لگائے ہوئے نمودار ہوا۔ تاروں کی روشنی میں غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ مقامی لوگ ہی ہیں۔ انہوں نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی اور کھاتے پیتے

”ہو سکتا ہے کہ کوئی بھٹکے ہوئے مسافر ہوں... یا پھر شکاری...؟“ عمران نے جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ اتفاقاً یہاں پہنچے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں لیکن اگر یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں تو پھر ان کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے تھی، کم از کم بیس بیس لوگ ہوتے... پانچ چھ گاڑیاں ہوتیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ باقی لوگ پیچھے ہوں۔“ میں نے اختلاف کیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑی اب تاریکی میں رک گئی ہے۔ ہیڈ لائٹس بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ گاڑی والوں کا یہ انداز انہیں اور زیادہ مشکوک بنا رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”عمران! ہمیں انہیں دیکھنا ہو گا۔“

عمران میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم بیس رو گھوڑا گاڑی کے پاس ہم دونوں جاتے ہیں۔“

”بیس باس۔“ اقبال نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

میں اور عمران جھاڑیوں کے درمیان احتیاط سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ عمران کے ہاتھ میں رائل اور میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ رگوں میں خون لہریں لے رہا تھا۔ کچھ کرنے اور اپنا حوصلہ آزمانے کو دل چاہ رہا تھا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں جھاڑیوں کے درمیان ایک سیاہ ہولنا سا نظر آیا۔ یقیناً یہ ایک بند جیب تھی۔ اس کی چھت پر کچھ لدا ہوا تھا۔ شاید یہ چھو لدا رہی تھی۔ اچانک میرا پاؤں ایک گڑھے میں گیا اور میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوا گر پڑا۔ میرے گرنے سے دھب کی آواز پیدا ہوئی اور پستول کھٹاک سے کسی تے کے ساتھ ٹکرایا۔

”کون... کون ہے؟“ کہیں پاس سے ایک ٹھٹکی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔

ہماری موجودگی راز نہیں رہی تھی۔ یکا یک بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ قدم ہماری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ پھر دو سائے تیزی سے جیب میں داخل ہوئے... اور جیب آنا فانا اسٹارٹ ہو کر حرکت میں آ گئی۔ وہ جو بھی تھے، بھاگ رہے تھے۔

”ان کو پکڑو۔“ میں نے زمین سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ایک خاص بندے نے مجھے اطلاع دی کہ سیٹھ سراج اور شیرا زبیر زمین جا چکے ہیں اور اب چند مہینوں تک سامنے نہیں آئیں گے۔ میڈم صفورا کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ سے غائب تھی۔ اس کے بااعتماد ملازم بھی کچھ بتا نہیں پا رہے تھے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ کچھ پراسرار لوگ میڈم صفورا کے ارد گرد دیکھے گئے ہیں... اور ان لوگوں کا تعلق بدھا کے اس جسم سے ہے جو پہلے ابراہار صدیقی کے پاس تھا اور اب میڈم صفورا کے پاس آیا ہے۔ پھر یہ انکشاف ہوا کہ میڈم صفورا ہی نہیں، وہ خاص بدھا بھی غائب ہے جسے میڈم نے بڑی کوشش سے میرے ذریعے حاصل کیا تھا۔ کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ بدھا کے ساتھ ساتھ میڈم صفورا اور مولانا ابراہار صدیقی کو بھی انڈیا پہنچایا جا چکا ہے۔ یہ کچھ عیب سی بات لگ رہی تھی...“

ہماری گفتگو جاری تھی۔ اچانک میں بُری طرح چونک پڑا۔ اگر میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے تو میں نے انجی کی مدد آواز سنائی تھی۔ یہ آواز ہوا کہ کسی آوارہ جھونکے پر تیر کر آئی تھی اور یقیناً عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ میں نے عمران کو بھی چونکتے دیکھا... عمران نے اپنا ہاتھ رائل کی طرف بڑھا دیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی اور چونکنا نظر آنے لگا اور یہی وقت تھا جب آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ کافی واضح تھی۔ یہ کوئی جیب نما گاڑی تھی جو ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

”اس ویرانے میں یہ کون ہو سکتا ہے؟“ اقبال نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں موجود تمام تر اندیشے ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ”تم سے کہا تھا کہ پہلے میری خاص بات سن لو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔“

میرے لہجے کی تشویش محسوس کر کے عمران کی پریشانی بڑھ گئی۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اب یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں۔ اب پہلے یہ دیکھو کہ یہ آنے والے کون ہیں؟“ اس دوران میں درختوں کے درمیان سے ہیڈ لائٹس کی مدد سے جھلک نظر آئی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ جھلک اوجھل ہو گئی۔ انجی کی آواز بدستور آرہی تھی اور اب مزید قریب آ گئی تھی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ گاڑی والوں نے ہیڈ لائٹس بجھا دی ہیں۔“ عمران نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ دال میں کافی زیادہ کالا موجود ہے۔“ اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

پورا کرنے کے لیے گھوڑوں پر سوار تھے۔ رات کو ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ جنگلی سوروں کے حملے کا ڈر تھا۔ رات کو اقبال کی ڈیوٹی لگی۔ یہ ایک خالی ٹین بجاتا اور ساتھ ساتھ اپنی کرخت آواز میں گاتا رہا۔ اس کی آواز کے سبب جانور تو دور ہی رہے، ہمارے اپنے گھوڑوں میں سے بھی ٹین ڈر کر بھاگ گئے۔“

عمران اور اقبال کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھوک شروع ہو گئی۔ طلال ان پرمزاج باتوں میں تھوڑی تھوڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی لوگ سونے کے لیے گھوڑا گاڑی میں چلے گئے۔ میں، اقبال اور عمران آگ کے گرد بیٹھے رہے۔ میں نے الاؤ کے شعلوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”عمران! میں تم دونوں کو ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔“

”لیکن تم کچھ خاص باتیں سننا بھی تو چاہتے ہو۔“ عمران نے کہا۔ ”اب فیصلہ کر لو، پہلے خاص باتیں سناؤ گے یا سنو گے؟“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، پہلے تم سناؤ پھر میں بتاتا ہوں۔“

عمران نے کسی کہانی گو کی طرح ایک درخت سے ٹیک لگائی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھللا رہا تھا۔ سرد ہوا میں اڑتی ہوئی چنگاریاں ماحول کو گرم کر رہی تھیں۔ ثروت، عاطف اور فرح کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے میری بے تابی پھر بڑھتی چلی گئی۔

عمران نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ”وہ بڑے دردناک دن تھے تابی! جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے درد سے بھرے ہوئے۔ میں اسپتال میں تھا۔ وہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیفنس والی کوٹھی میں تمہاری والدہ کی ڈیڑھ تھوڑی ہو گئی ہے۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے اور یہ قتل سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ تمہارا بھائی اور بہن فرح دونوں اوجھل تھے۔ ان کے بارے میں امید تھی کہ وہ نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ میں سب سے پہلے انہیں تلاش کر کے کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف چھوٹی میڈم ناویہ اسپتال میں دم توڑ چکی تھی اور میڈم صفورا کا عم وغصہ پورے عروج پر تھا۔ میں زخمی حالت میں ہی اسپتال سے نکل آیا تھا۔ تین چار دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد میں اور اقبال عاطف کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ گوجرانوالہ میں تھا۔ میں نے عاطف اور فرح کو فوراً راولپنڈی پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈھونڈنے اور سیٹھ سراج سے حساب برابر کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میرے

گھرانوں کے نوجوان لگتے تھے۔ ایک کے گلے میں امپورنٹ دور بین لٹک رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ عمران نے ایک کوسر کے بالوں سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”شکار کے لیے نکلے ہیں بھائی، ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ نہ ہی کسی سے کوئی دشمنی ہے۔ میرا نام راہول ہے، یہ میرا چچا زاد بھائی دلپ ہے۔ ہم اکثر ہفتے کی رات کو نکلتے ہیں۔“

”کہاں سے آئے ہو؟“

”بوہرا سے۔ ہمارا وہاں ڈیری فارم ہے۔“

”تم ہمیں دیکھ کر بھاگے کیوں تھے؟“

”سچی بات یہ ہے کہ... ہمیں خطرہ محسوس ہوا تھا کہ آپ ہم سے ہمارا سامان وغیرہ چھین لیں گے۔ پچھلے دو تین مہینے میں کئی شکاریوں کے ساتھ اس طرح کی درگھٹنا ہوئی ہے۔“

”تم نے ہماری جلائی ہوئی آگ دیکھی اور پھر دور ہی گاڑی بند کر کے کھڑے ہو گئے؟“ عمران نے پوچھا۔

”ہم شش و پنج میں تھے۔ جاننا چاہ رہے تھے کہ آپ کون لوگ ہیں۔ بغیر تصدیق کے ہم آپ لوگوں کے پاس جانا نہیں چاہتے تھے۔“

”میں نے بٹے کئے شخص کا گریبان پکڑتے ہوئے عمران کو بتایا۔“ اس نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری ہے۔“

”میں بہت بہت شاکست ہوں۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ کون لوگ ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ اگر میں نے آپ پر گولی نہ چلائی تو آپ مجھ پر گولی چلا دیوں گے۔“ وہ لجاجت سے بولا۔

”کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟“ عمران نے بٹے کے شخص سے پوچھا۔

”ناہیں۔ ہم دونوں ہی ہیں۔ ہمارے دو اور دوستوں نے آج دوپہر ہمارے ساتھ شامل ہونا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ آنا نہیں سکے۔ ہم بہت تھک چکے تھے، یہاں کہیں چھوہلداری لگانے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈ رہے تھے کہ آپ لوگ کی جلائی ہوئی اگنی پر نظر پڑ گئی...“ بٹے کے دلپ نے جواب دیا۔

اندھیرے میں سے یہ مشکل دلپ کا گرا ہوا پستول ڈھونڈا گیا۔ پستول میں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ ہم ان

دونوں کے ساتھ جیب کی طرف واپس آئے۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ لائٹس بھی آن تھیں۔ ایک طرف کی کھڑکیوں کو کچھ نقصان پہنچا تھا۔ جیب کی اندرونی روشنی میں ہم نے دیکھا۔ یہ دونوں کزن تجربہ کار شکاری لگتے تھے۔ جیب کی نشستوں کے پیچھے ہموار جگہ پر کوئی دو درجن شکار کیے ہوئے چھوٹے بڑے پرندے موجود تھے۔ اس کے علاوہ کئی جنگلی خرگوش اور ایک بڑے سائز کا چیتل بھی تھا۔

دونوں افراد سے گفتگو کے بعد ہم کسی حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ ہم نے مل کر جیب کے اگلے پیچے کو لکڑی کے تنے پر سے اتارا اور پھر برست ٹائر کے ساتھ ہی جیب میں بیٹھ کر بڑاؤ میں واپس آ گئے۔ گولی چلنے کی آواز اقبال نے بھی سن لی تھی اور وہ پریشان نظر آتا تھا۔ بہر حال ہمیں بہ خیریت دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ہم نے اقبال کو بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ گفتگو کے دوران میں ہی ہم نے مل کر گاڑی کا ٹائر بھی تبدیل کر دیا۔

یہ دونوں افراد خوش حال گھرانے سے لگتے تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے۔ اپنی گفتگو میں گاہ بے گاہ انگریزی کے الفاظ بھی بولتے تھے۔ ان کی لینڈ روور جیب بھی تقریباً نئی ہی تھی۔ ایک اسٹائش واکی ٹاکی اور مہنگے سگریٹوں کے پیکٹ ڈیش بورڈ پر رکھے تھے۔

عمران نے راہول سے پوچھا۔ ”اس واکی ٹاکی سے پرندوں کو کال کرتے ہو؟“

وہ مسکرایا۔ ”ناہیں جی... آپ کو دوسری پارٹی کا بتایا ہے نا۔ انہوں نے ہمیں جوائن کرنا تھا۔ ان سے رابطے کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ ویسے بھی شکاری مہم کے دوران میں ایسی چیزوں کا فائدہ ہوتا ہے۔“

پھر راہول نے ذرا جھجکتے ہوئے ہم سے ہمارے پارے میں پوچھا۔ عمران نے انہیں بتایا کہ شادی کی ایک تقریب میں شریک ہونے کے لیے زرگاں جا رہے ہیں۔ اسی دوران میں ہوشیار سنگھ بھی آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ وہ ذرا تعجب سے ان دو نئے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کی گاڑی کو بھی۔ وہ اپنی گردن کی چوٹ کی وجہ سے ذرا تکلیف میں نظر آتا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی گردن دیکھ کر دلپ نے پوچھا۔ ”اس سردار کو کیا ہوا ہے؟“

عمران بولا۔ ”وہی ہوا ہے جس کا تم دونوں کو ڈر پڑ گیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”یہاں سفر کرنے والوں کو ڈاکوؤں کا ڈر تو اکثر رہتا

ہے۔ ہمیں بھی ڈر تھا۔ ہمارا ڈر صحیح نکلا۔ پیچھے بوہرا ندی کے پاس تین چار گھڑسواروں نے ہمارا راستہ روکا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جتے ہیں۔ تھوڑی سی مارا ماری ہوئی پھر جب ہم نے رائفلیں نکالیں تو وہ تیر ہو گئے۔“

دلپ ہنسنا۔ ”یعنی جن کو ہم ڈاکو سمجھتے تھے وہ خود ڈاکوؤں کے ڈسے ہوئے ہیں۔“

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“

راہول نے کہا۔ ”ویسے یہ علاقہ آج کل پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ہوا ہے۔ شاید تمہیں پتا ہو، ایک مسلمان راجپوت لڑکی کے لیے بڑی کشش چل رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر زرگاں میں کئی بندوں کی ہتھیا کی ہے۔ اب اسے کسی اور گروہ نے اغوا کر لیا ہے۔ زرگاں والے اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بڑی مارا ماری چل رہی ہے۔“

”چھوڑو مارا!“ اقبال نے کہا۔ ”یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک لڑکی اتنا کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اکیلی ہی سب کچھ کرتی رہی ہے۔ بس پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا اس کے ساتھ ہے۔“

”ہاں، یہ بات بھی کبھی جاوت ہے۔“ راہول نے تسلیم کیا۔ ”وہ کوئی معمولی لڑکی ناہیں ہے۔ اس کی ماں نے حکم جی کی جان بچائی تھی اور اس کے بدلے میں حکم کے بتارائے پر تاپ بہاؤ نے اس راجپوت پر یوار کو بہت کچھ دیا تھا۔ لیکن سچ کہوت ہیں، اچھوں سے بڑے اور مجڑوں سے اچھے جنم لیوت ہیں۔ یہ لڑکی نڈر اور دلیر تو بہت ہے لیکن غلط رستے پر چل نکلی ہے۔ اس نے پہلے ایک دم شادی کی اور راج بھون کی پری بننے سے انکار کیا، اب موہن جی جیسے بندے کی ہتھیا کر کے اس نے سب کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔“

دلپ نے کہا۔ ”پچھلے دنوں میں زرگاں گیا تھا۔ وہاں لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ کچھ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی بری آتما تھی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک کمزور لڑکی اس طرح زرگاں میں دندا سکت ہے؟ اور خون خرابا کر سکت ہے؟ بڑے پنڈت مہاراج کا وچار تو یہ ہے کہ ایسی اپرا دھن ناری کو زندہ جلا دینا چاہیے تاکہ اس کی خوست سے راجواڑے کو چھٹکارا مل جائے۔ مگر...“

”مگر کیا؟“ اقبال نے پوچھا۔

”لگت ہے کہ جارج گورا صاحب، اسٹیل صاحب اور اس جیسے دوسرے لوگ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ کیا جائے قانون کے مطابق ہو۔ اس

پر زرگاں میں چوہرے قتل کا مقدمہ چلے۔“

”اچھا یار! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تمہیں کچھ کھانا پینا ہے تو بتاؤ۔“

دلپ نے کہا۔ ”بھوک تو بے شک لگی ہے لیکن ہم آپ لوگوں کو تکلیف ناہیں دیں گے۔ جو کچھ کریں گے خود ہی کریں گے۔ ہمارے پاس روٹ کرنے کا پورا سامان موجود ہے۔ بس آگ کی کمی تھی، وہ آپ لوگوں نے جلائی ہوئی ہے... بلکہ آپ بتائیں آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟“

عمران چکا۔ ”میں نے کچھ چیزیں زندگی میں کبھی نہیں کھائیں یا اگر کھائی ہیں تو مجھے پتا نہیں چلا۔ مثلاً مچھلی تو بہت کھائی ہے لیکن بھی مچھلا نہیں کھایا۔ بڑا مزے دار خرگوش اور کبوتر کھایا ہے لیکن بڑی مزے دار خرگوشی یا کبوتری کبھی نہیں کھائی... تم لوگوں نے جل مرغ تو شکار کر رکھا ہے۔ اگر کوئی جل مرغی بھی ہے تو میں ضرور کھانا پسند کروں گا۔“

دلپ مسکرایا۔ ”آپ دلچسپ بندے ہیں۔ اس پہلو سے تو ہم نے بھی سوچا ہی نہیں۔ ویسے یہ کافی تحقیق طلب اور مشکل کام ہے۔“

”پرندے یا جانور کی دم اٹھانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بس ہم نے طے کر رکھا ہے کہ ہر چھٹی مونٹ اور ہر خرگوش مذکر ہوتا ہے۔“ ایک تہقہہ پڑا۔

دلپ اٹھ کر اپنی جیب کی طرف گیا اور جیب کی اندرونی لائٹ جلا کر شکار شدہ پرندوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ماہرانہ تھا۔ وہ روٹ کرنے کے لیے شکار منتخب کر رہا تھا۔ میں بھی یونہی ٹھٹھا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کے نیچے اچانک میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جس نے مجھے بڑی طرح چونکا دیا۔ اپنے جسم کا سارا خون مجھے اپنے سر کی طرف دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جو چمکتی ہوئی شے میں نے دیکھی، وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔

میں دلپ سے پوچھے بغیر آگے بڑھا۔ میں نے خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کو دائیں بائیں ہٹایا اور اس چمکتی شے کو وضاحت سے دیکھا۔ میں نے پوری طرح پہچان لیا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی انشیتا تھا جو میں اس سے پہلے رنجیت پانڈے کے لوگوں کے پاس دیکھ چکا تھا۔ ٹیلے کے قریب جب ہمارے اور پانڈے کے درمیان گھمسان کارن پڑا تھا اور پانڈے کو بھاگنا پڑا تھا تو یہ منحوس انشیتا ہمیں دیگر سامان کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ یہ وہی سکتل وصول کرنے والی ڈیوائس تھی جس کے ذریعے پانڈے اپنے



بیشمین، ایک باؤلر کی زبردست پٹائی کر رہا تھا۔ باؤلر کا حوصلہ پست ہو گیا تاہم اس نے اپنے کیپٹن سے کہا۔ ”میں اب اسے اپنی اسٹیشن گیند کراؤں گا۔ آپ دیکھیے گا، وہ پریشان ہو جائے گا۔“ کیپٹن نے سر کو تھپی جھنک دی۔

باؤلر نے اسٹیشن گیند کرائی اور بے بسی سے گیند کو باؤنڈری لائن کے پار جاتے دیکھتا رہا۔ کیپٹن نے قریب آکر اس کے کندھے پر ہتھکی دی۔ ”واقعی، تم نے اسے پریشان کر دیا۔“ اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”وہ ڈبل مائنڈ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گیند پر چوکا مارے یا چھکا؟“

کراچی سے دوریشم کا انتخاب

گھوڑا گاڑی ہمارے آگے جا رہی تھی۔ اس میں سلطانہ اور طلال کے علاوہ گروسو بھاش اور اس کی سندر چنی رادھا بھی موجود تھی۔ ان کی حفاظت و نگرانی کے لیے اقبال سیون ایم ایم رائل کے ساتھ گھوڑا گاڑی کے اندر تھا۔ تاروں کی روشنی میں اونچے نیچے راستوں پر گھوڑا گاڑی درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ اس کے پیچھے تھی۔

”کچھ پتا ہے ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمارا رخ کچے کی طرف ہے اگر ہم...“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جیپ کے عقب نما آئینے پر تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحوں تک آئینے میں دیکھتا رہا، پھر اس نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور جسم میں چیونٹیاں سی ریگ گئیں۔ جتر، کیکر اور جنگلی بیربوں کی گھنی قطاروں کے عقب میں کچھ روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ ساکت نہیں متحرک روشنیاں تھیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ لگانا فی الحال مشکل تھا۔ ”کون ہو سکتے ہیں یہ؟“ عمران نے مستحکم لہجے میں پوچھا۔

”تو تو فیصد امکان اس بات کا ہے کہ حکم جی کے

جہاں میں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کی پوروں کو تھوڑی سی حرکت دی۔ ”کچھ محسوس کیا تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس، ایک ابھار سا ہے۔“

”یہی ابھار ہے جس نے میرے لیے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ جہاں پہنچتا ہوں، میری مصیبتیں میرے ساتھ وہاں پہنچ جاتی ہیں... اور اسی کی وجہ سے پچھلے تین سال سے میں بے شمار کوششوں کے باوجود اس منحوس اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں پایا۔“

”یہ... ہے کیا؟“

”ایک الیکٹرانک چپ... جو میرے اسپائل کینال کے اوپری سرے کے ساتھ پلانٹ کی گئی ہے۔ یہ سگنل نشر کرتی ہے۔ یہ وہی تکنیک ہے جو ریسرچر، جانوروں پر استعمال کرتے ہیں۔ انہیں چپ یا کارلر لگا کر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن وہ آزاد نہیں ہوتے۔ وہ جہاں بھی ہوں، انہیں ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔“

”اوہ گاڈ!“ عمران نے ہونٹ سیکڑے۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولا۔ ”کچھ عرصے پہلے میں نے ایک خاص بندے سے اس سے ملتی جلتی بات سنی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ حکم جی اور جارج گورا اپنے خاص قیدیوں کو کہیں بھاگنے نہیں دیتے۔ سادہ لوح لوگوں کا خیال ہے کہ حکم جی اپنی روحانی شکتی سے ہر وقت ان پر نظر رکھتا ہے مگر پڑھے لکھے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی جدید طریقے سے اپنی نگرانی میں رکھا جاتا ہے۔“

”بس یہی ہے وہ نگرانی... اور اس نگرانی کا انچارج جارج گورا کا بہنوئی ڈاکٹر اسٹیل ہے۔ وہی یہ خاص چپ پاؤں میں پلانٹ کرتا ہے۔ یہ پیچھے جو انٹینا پڑا ہے، اس کا تعلق اسی چپ سے ہے۔“

”کیا تمہارے ذہن میں کبھی اسے لکھوانے کا خیال آیا؟“ عمران نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔

”یہی تو ان لوگوں کی اصل خباثت ہے عمران۔ تم نے تل پانی کے جاپانی سرجن ڈاکٹر لی وان کا نام سنا ہے؟“ عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ”وہ بڑا قابل بندہ ہے۔ میرا ایک ڈاکٹر دوست مجھے اس تک لے کر گیا تھا۔ اس نے چند ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ یہ چپ نکالنے کے لیے زیادہ سہولتیں درکار ہیں اور یہ یہاں اسٹیٹ میں نہیں ہیں۔ یہ چپ نکالتے ہوئے اسپائل میر کو نقصان پہنچ سکتا ہے جو زندگی کے لیے خطرناک ہے۔“

وہاں صرف تاروں کی روشنی باقی رہ گئی۔ اس روشنی میں حکم کے جواں سال ہرکارے کی لاش اوندھے منہ گھوڑا گاڑی کے پیٹے کے پاس پڑی تھی۔ شکاریوں کے بھیس میں یہ لوگ حکم کے کھوجی تھے اور وہ کھوج لگاتے ہوئے ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ اب یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں مثلاً رنجیت پانڈے... یا بلرام رائے وغیرہ کو اپنی کامیابی کی اطلاع دے چکے ہوں۔ مرنے والے کے سر کے عقبی حصے سے بہنے والا خون زمین پر ایک سیاہ نقشہ سا بنا رہا تھا۔ صرف دو منٹ پہلے یہ خون اس شخص کی رگوں میں تھا اور یہ ایک پُر لطف ڈنر کا انتظار کر رہا تھا۔

ہم نے پوری سرعت سے اپنا سامان سمینا اور گھوڑا گاڑی میں رکھ دیا۔ عمران نے جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے اندر سے ایک برائڈی کی بوتل، ایک شاٹ گن، ایک واکی ٹاکی اور کچھ دیگر اشیائیں ملیں۔ جیپ کے اندر کافی مقدار میں فیول موجود تھا۔

عمران نے کہا۔ ”ہم جیپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آگے جا کر فیصلہ کر لیں گے کہ اسے چھوڑنا ہے یا گھوڑا گاڑی کو۔“

میں نے اور اقبال نے اس رائے کی تائید کی۔ تاہم میں نے یہ کہا کہ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا کر رکھیں گے۔ زخمی گھوڑے کو بھی گاڑی میں جوت دیا گیا۔ مردہ شخص کی لاش کو جوں کا توں چھوڑ کر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں عمران کے ساتھ جیپ میں تھا۔ جیپ عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ پوری طرح ایکشن میں تھا اور کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار۔

”یار! کچھ اشارہ تو دو۔“ وہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے پیچھے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

”اشارہ یہ ہے کہ حکم کے کتے ہر جگہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”یہ جدید دور ہے۔ اس میں سب کچھ ممکن ہے۔“

”تم پہیلیاں بکھو رہے ہوتا۔“ عمران کے لہجے میں بے چینی تھی۔ جیپ کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے سرد ہوا فرائے بھرتی اندر آ رہی تھی اور عمران کے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

اس کے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے۔ میں نے اس کا بائیں ہاتھ تھاما اور اٹھا کر اپنے سر کے پچھلے حصے پر رکھا۔ میں نے اس کی انگلیوں کی دو پوروں کو اس خاص جگہ سے منج کیا

خوں خوار ساتھیوں کے ساتھ میرے اور جیپ تک پہنچا تھا۔ ولیپ نے بھی دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیا دیکھا ہے۔ اس کے چہرے نے ایک دم رنگ بدلا۔ وہ پلٹا اور تیزی سے بھاگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ٹانگوں میں جتنی طاقت ہے، وہ ساری استعمال کر کے نکل جانا چاہتا ہے۔ میں نے پستول نکالا اور اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس پر دو فائر کیے۔ میرا ایک فائر اس کے سر میں عین گردن کے بالائی حصے پر لگا۔ وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک درخت سے ٹکرایا اور ساکت ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا دوسرا ساتھی بھی جواپنا نام راہول بتا رہا تھا، اٹھ کر اندھا دھند دوڑا۔ اس جانب درخت قریب ہی تھے۔ وہ ان میں گھس گیا۔ عمران تو لپکتا ہوا میری طرف آ رہا تھا، اس دوسرے شخص کا پیچھا ہوشیار سنگھ نے کیا۔ ہوشیار سنگھ اس پر ہاتھ ڈالنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ اسے سنبھال نہیں سکا۔ اس کی قمیص کا ایک ٹکڑا پھٹ کر ہوشیار سنگھ کے ہاتھ میں رہ گیا اور وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا تاریک درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

یہ سارا واقعہ بس دس پندرہ سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہو گیا۔ شور و غل اور فائرنگ کی آوازوں نے گھوڑا گاڑی میں موجود افراد کو بھی جگا دیا۔ طلال، گروسو بھاش اور سلطانہ وغیرہ بھونچکے سے باہر نکل آئے۔

”یہ کیا ہوا ہے تابی؟“ عمران نے مجھ سے پوچھا۔ ”ہم سب خطرے میں ہیں عمران! ہمیں کسی بھی وقت گھیرا جاسکتا ہے۔ ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ ابھی... اسی وقت...“

”لیکن پتا تو چلے۔“

”میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا اور بتاؤں گا بھی تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس یہ سمجھو کہ یہ دونوں حرا مزادے، حکم کے ہرکارے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ واکی ٹاکی کے ذریعے حکم کے گارڈز کو ہمارے بارے میں اطلاع دے چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

اسی دوران میں اقبال شکار شدہ پرندوں کے نیچے سے وہ چمکیلا انٹینا نکال چکا تھا۔ ”یہ کیا ہے تابی؟“ اس نے پوچھا۔ ”اس کے بارے میں بھی بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے۔“

میرے لب و لہجے کی نشانیوں کو محسوس کرتے ہوئے عمران نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اٹھا کر بڑے الاؤ پر ڈال دی۔ پھر ایک ایک کر کے مشعلیں بھی بجھا دیں۔ کچھ ہی دیر میں

بند ہے۔“

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ہمیں یہ تصدیق کرنی چاہیے کہ یہ حکم کے لوگ ہی ہیں۔ اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اگلے آدھ پون گھنٹے میں ایک دو بار اپنا رخ بدلیں۔“

”تم اب چھینا جھینا بھی کرنے لگے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے میرے منہ کی بات سمجھنی ہے۔“

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ مدھم آوازیں ہم تک پہنچیں۔ یقیناً یہ بوگیر کتوں کی آوازیں تھیں۔ یہ جنگلی کتوں کی آوازوں سے بالکل مختلف تھیں۔ میں اب انہیں پہچاننے لگا تھا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ جیسے کوئی زبردست چال اس کے ذہن میں آرہی ہو۔

اس نے جیب کی رفتار تھوڑی سی بڑھائی اور اسے گھوڑا گاڑی کے برابر لے آیا۔ ہوشیار سنگھ بڑی چابک دستی سے دونوں گھوڑوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگین چابک تھا۔ وہ تن کراہتی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”ہوشیار سنگھ! اب تم ہمارے پیچھے آؤ۔ ہم اپنا راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔“

”کیا کہا جی؟ راستہ تبدیل کر رہے ہیں؟“ وہ ہماری طرف جھک کر بلند آواز میں بولا۔

”نہیں یار! راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔ میں اب تمہارے آگے چلتا ہوں۔ اس کو پنجابی میں کہیں گے۔۔۔ بن میں تیرے آگے آگے چلاں گا۔“

ہوشیار سنگھ نے بیسی نکالی اور اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے لینڈ روڈ کو گھوڑا گاڑی کے آگے لگا دیا۔ ہم بائیں رخ پر مڑ گئے۔ کہیں دور گھنے جنگل میں تیندوے کی مخصوص آواز ابھری اور سنناہٹ بن کر دور تک پھیل گئی۔ ابھی ہم اس آواز کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک اور آواز نے بڑی طرح چونکا دیا۔ یہ کسی دہشت زدہ شخص کے چلانے کی آواز تھی اور یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ کوئی جنتر کے درختوں میں ہمارے نزدیک موجود تھا۔۔۔ اور کرب کے عالم میں آہ و بکا کر رہا تھا۔ مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی۔۔۔

عمران خاموش رہا۔ میں بھی خاموش رہا۔ ہم اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بڑی سنگین سچویشن تھی۔ مجھے لگا کہ میرے سینے میں دھڑکن کسی نفاذے کی طرح گونج رہی ہے۔۔۔ کسی جنگلی نفاذے کی طرح۔ یہ جان کر مجھے دلی راحت ہوئی کہ میرے اندر خوف نہیں ہے۔ اور اگر تھوڑا بہت ہے بھی تو وہ ایک میٹھے میٹھے جوش کی لہروں میں دبا ہوا ہے۔ یہ تو شاید میرے سپنوں کی رات تھی۔۔۔ ایک گھنا جنگل۔۔۔ ایک سرد اندھیری رات۔ اس رات میں سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے خطرات کے سائے۔۔۔ ہر جگہ کے عقب میں موت کی گھات، ہر موڑ پر آہنی پرچھائیاں۔۔۔ اور میرے ساتھ عمران جیسا دوست، میرے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے۔ وہی عمران جو سنگین ترین اندیشوں کو سینے سے لگانے کا فن جانتا تھا۔ جو جان لیوا خطرات کو تھقبوں میں اڑاتا تھا اور جس کا کفن ہر وقت ایک چمکیلی دستار کی طرح اس کے سر سے بندھا رہتا تھا۔ ہاں، میرے پسندیدہ ترین تصورات کی رات تھی۔

اس سے پہلے لاہور کے گلی کوچوں میں بھی کچھ مواقع ایسے آئے تھے جب میں اور عمران ایک ساتھ کسی خطرے میں گھرے تھے مگر تب کی بات اور تھی۔ تب میں ایک اپناج کی طرح عمران کے ساتھ گھسٹتا تھا۔۔۔ یا شاید وہ مجھے اپنے ساتھ گھسٹتا تھا۔ آج میں اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ عمران کا ساتھ دینے کا حق ادا کر سکتا تھا۔

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ واقعی حکم جی کے لوگ ہیں اور الیکٹرانک چپ کے بارے میں جو کچھ تم نے کہا ہے، وہ بھی صحیح ہے تو پھر ایک بات طے ہے۔ ہم جس طرف بھی جائیں گے، یہ لوگ ہمارے پیچھے آئیں گے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔۔۔ لیکن ایک بات ہے۔۔۔ اس سے پہلے میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک زمین دوز سرنگ میں تھا۔ وہاں اس چپ نے کام نہیں کیا تھا۔“

”لیکن ایسی سرنگ اب کہاں ڈھونڈیں گے؟ یا پھر ایک اور طریقہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

سنگین صورت حال کے باوجود عمران کا کھلنڈراپن لوٹ آیا تھا۔ وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا۔

”سرنگ بنا لیتے ہیں۔۔۔ اوس کی وجہ سے زمین نرم ہو رہی ہے۔ گھوڑا گاڑی میں ایک بیلچہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ دو تین چاقو بھی ہیں ہمارے پاس۔“

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے
جانبازوں کی داستان کے بقیہ
واقعات اگلے ماہ مل احظہ فرمائیں